خُطَبات

حکیمُ الاُمّت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون 4540513-4519240

بسلسلہ خطباتِ حکیم الامتؒ جلد۔ ۸

حقیقتِ مال وجاہ

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد **اشرف علی تھانوی** نور اللہ مرقدہ

عنوانات وترتیب

منشی عبدالرحمٰن خان رحمہ اللہ

تصحیح و تزئین
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث
مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

حقیقتِ مال وجاہ

تاریخ اشاعت.................. محرم الحرام ۱۴۳۱ھ
ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت..................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر
قیصر احمد خان
(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمد للہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ... چوک فوارہ... ملتان
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور   دارالاشاعت.......اُردو بازار.........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.......لاہور   ادارۃ الانور..........نیو ٹاؤن..........کراچی
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار .... لاہور   مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار.....پشاور
119-121- HALLIWELL ROAD   ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)   (ISLAMIC BOOKS CENTERE

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۸ ''حقیقت مال وجاہ''
جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی
عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہو رہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی
تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام
محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم
العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی
عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام
حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
محرم الحرام ۱۴۳۱ھ

اجمالی فہرست

المال والجاہ ۱۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا
وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝
يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ
الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

احکام المال ۵۳

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ
النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

احکام الجاہ ۱۲۳

اَلا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ

خیر المال للرجال ۱۲۹

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ
يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ
فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

خیر الاثاث للاناث ۲۲۵

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝

علاج الحرص ۲۵۷

لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنَ الْمَالِ
لَابْتَغٰى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَهٗ اِلَّا التُّرَابُ۔
وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ

وعظ میرٹھ ۲۹۳

وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝

وعظ الحیوٰۃ ۳۳۵

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝

مطاہر الاموال ۳۸۵

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ ورضوان ... ۳۸۵

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

فہرست

المال والجاہ ۱۳
فہم قرآن ۱۴
حکماء امت ۱۶
منافقین کی حالت ۱۹
صل علی النبی کا اثر ۲۰
سماع قرآن کا اثر ۲۲
حقیقی علم ۲۳
آیۃ کریمہ کا شان نزول ۲۴
مقصود بیان ۲۵
علماء اور مال وجاہ ۲۶
جدید طبقہ کے خیالات ۲۷
علماء اور کافرگری ۲۹
اسلام اور ترقی ۳۰
محبوب ترین چیزیں ۳۲
حقیقت حب ۳۴
حقیقت حیات دنیا ۳۶
مقام بزرگاں ۳۷
احبیت اور محبوبیت کا فرق ۳۹
محبت کی علامت ۴۰
احبیت کی علامت ۴۲
رعونت کی علامت ۴۶
ضرورت کی چیزیں ۴۷
تفسیری نکات ۴۸
احکام المال ۵۲
معاملات میں معصیت ۵۳
ریلوے کی حق تلفی ۵۴
ہاتھ کاٹنے کی سزا ۵۵
استعداد نفس اور نور فراست ۔ ۵۶
کید نفس ۵۷
دروغ مصلحت آمیز کے معنی ۵۹
نفس کی نگرانی ۵۹
اہل علم کی بے احتیاطی ۶۱
فقہ اور اہل علم ۶۲
منصور اور علماء ۶۳
علماء اور امراء ۶۴
مال کے حقوق ۶۵
مکافات عمل ۶۷
سودی مال اور محق کی حقیقت ۶۷
رشوت کا حشر ۶۸
برکت کی حقیقت ۶۹

رشوت کی خرابی	۷۰
حضورؐ اور چندہ	۷۱
مقام ابوبکرؓ وعمرؓ	۷۱
چندہ میں بے احتیاطی	۷۲
پیروں کی حالت	۷۳
معاشرت رسولؐ	۷۴
قابل قدر عقل	۷۵
کورانہ تقلید	۷۶
ناجائز آمدنی	۷۸
رائے اور مسئلہ کی قیمت	۷۹
مشائخ کی حالت	۸۱
حلال وحرام کی تمیز	۸۳
دین میں غلو	۸۴
شریعت میں چیزوں کی اقسام	۸۶
مجتہد کا کام	۸۷
شریعت میں وسعت	۸۹
اہل خصوصیت کا تقویٰ	۹۱
ہمارا تقویٰ	۹۳
نیوتہ کے مفاسد	۹۴
میراث کی خرابیاں	۹۵
آمد وخرچ کے معاملات	۹۶
مسلمانوں کی تباہی کا راز	۹۷

زمین کی حقیقت	۹۹
ایک قابل عمل بات	۱۰۴
قرآن اور جمہوری نظام	۱۰۶
شیطان کا مکر	۱۰۸
اہل اللہ کی معاشرت	۱۰۹
ہر چیز میں تفاخر	۱۱۱
یورپ کی اندھی تقلید	۱۱۲
انگریزی طرز اخلاق	۱۱۴
رسم پرستی	۱۱۴
اعتدال کی ضرورت	۱۱۷
اخراجات کی حدود	۱۱۸
نام اور کام کی اہمیت	۱۱۹
احکام الجاہ	۱۲۱
ایک اہم کوتاہی	۱۲۳
شریعت کی آسانی	۱۲۳
علماء سے وحشت	۱۲۴
شریعت میں تنگی کا گمان	۱۲۶
خرگوش کی دانائی	۱۲۷
ہماری کم فہمی اور بے عقلی	۱۲۸
آج کل کے محققین	۱۲۹
تعلق باللہ	۱۳۱
تقریب الی اللہ	۱۳۳

شرط طلب و تقاضا ۱۳۴
تعلق بالمخلوق ۱۳۶
اثر و جاہت ۱۳۷
ترقی کی حقیقت ۱۳۹
جاہ کی حدود ۱۴۳
حکومت اور شریعت ۱۴۴
بادشاہت اور جمہوریت ۱۴۶
جاہل واعظ ۱۴۸
کندہ ناتراش پیر ۱۵۹
شیخ کامل کا معیار ۱۵۱
طلب منصب کی صورت ۱۵۴
حضورؐ کی بدنی قوت ۱۵۶
حضور اکرم ﷺ کا اصلی مذاق ۱۵۷
جاہ طلبی ۱۵۸
جاہ کا مصرف ۱۶۰
حکام اور میاں جی کے لئے دستور العمل ۱۶۱
نسب اور فخر ۱۶۳
باطنی تصرف ۱۶۴
سفارش کا مسئلہ ۱۶۵
خیر المال للرجال ۱۶۷
علم اور عمل ۱۶۸
استحقاق اور فضل ۱۷۰
شغل اور استغراق ۱۷۲
غم اور فکر ۱۷۳
محبت اور عمل ۱۷۴
نادان کی دوستی ۱۷۷
احکام و آثار ۱۷۸
غزوہ احد ۱۷۹
داخلہ جنت کی خوش فہمی ۱۸۱
دین و دنیا کا تعلق ۱۸۲
اہل اللہ کی حالت ۱۸۴
رزق حلال کا اثر ۱۸۷
تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر ۱۸۸
دین اور فہم ۱۸۹
چند غلط فہمیوں کا ازالہ ۱۹۰
مذہب کا اثر ۱۹۳
کورانہ تقلید ۱۹۳
بعثت انبیاء کا مقصد ۱۹۵
کسب حلال اور حب دنیا ۱۹۷
علماء اور کسب دنیا ۱۹۸
علماء اور تنخواہ ۲۰۱
آزمائش علماء ۲۰۳
اہل اللہ کا استغناء ۲۰۵
جمعیت قلب ۲۰۷

طریق تربیت ۲۰۹
طریق عمل ۲۱۱
سختی مشائخ کی حکمت ۲۱۲
عادت اللہ ۲۱۳
ذکر اللہ ۲۱۴
عمل اور اجر ۲۱۷
خیر الاثاث للاناث ۲۲۲
دو قسم کے امراض ۲۲۴
عورتوں کی حرص ۲۲۵
عورتوں کی ناشکری ۲۲۷
عورت اور حب جاہ ۲۲۸
خوارج اور معتزلہ کا مذہب ۲۲۹
حب اللہ و بغض اللہ ۲۳۱
شیطان سے رعایت ۲۳۴
مقام طالب و مطلوب ۲۳۷
کفار کی غلط فہمی ۲۳۸
دولت اور کفار کی خصلت ۲۳۹
حب مال کے اثرات ۲۴۰
مال اور فخر ۲۴۱
عورتوں کا مذاق ۲۴۴
عورت اور زیور ۲۴۵
عورت اور حب زینت ۲۴۶
غریب اور راحت ۲۴۷
ایک آسان مراقبہ ۲۴۸
شادی میں بربادی ۲۴۹
اہل اللہ کی کشش ۲۵۰
علاج الحرص ۲۵۲
عورت اور حرص ۲۵۴
موت اور اختیار ۲۵۵
نکاح بیوگاں ۲۵۷
قناعت کی ضرورت ۲۵۸
تفویض کی اہمیت ۲۵۹
موت کے مشتاق ۲۶۲
راحت کی صورت ۲۶۳
جاہ کی ہوس ۲۶۴
آدم اور انسان ۲۶۵
آج کل کی ترقی ۲۶۶
ترقی خیر ۲۶۷
ہوس اور موت ۲۶۹
گناہ اور طاعت کا کمال ۲۷۱
ماہ رمضان اور شیطان ۲۷۲
خودروائی کا علاج ۲۷۳
معاہدہ بیعت ۲۷۴
ضرورت رہبر و دست گیر ۲۷۶

شفاعت انبیاء اور پیر	۲۷۶
حرص کا صحیح علاج	۲۷۸
تعلق باللہ	۲۸۰
توجہ الی اللہ	۲۸۱
اعمال ظاہرہ	۲۸۲
مفید مستحبات	۲۸۴
حج اور تجارت	۲۸۵
وعظ میرٹھ	۲۸۸
طلب اور ذریعہ	۲۸۹
اسباب اور آخرت	۲۹۰
اسباب اور اثر	۲۹۲
طلب جنت کا ذریعہ	۲۹۳
حال و کمال	۲۹۴
حصول جنت کے طریقے	۲۹۶
محویت اور بے خودی	۲۹۸
مبتدی اور منتہی کا فرق	۲۹۹
طلب جنت کا گر	۳۰۱
افراط خوف اور کفر	۳۰۳
خوف محمود	۳۰۵
ضرورت غور و فکر	۳۰۶
فریب نفس اور اتباع نفس	۳۰۷
اسراف اور فیشن	۳۰۸
احسانات اور کفران نعمت	۳۱۰
معصیت کی دنیاوی مضرتیں	۳۱۲
طاعت کا اثر	۳۱۴
ریا اور عبادت	۳۱۵
معصیت اور مضرت	۳۱۶
ایمانداری کی مثال	۳۱۷
ایثار کی نادر مثال	۳۱۹
اتباع ہوا	۳۱۹
محبت الٰہی اور مصلحت دنیوی	۳۲۰
اتباع حق کی ضرورت	۳۲۱
اتباع کی چیزیں	۳۲۳
صحیح طریق تعلیم	۳۲۴
نئی تراش خراش	۳۲۵
خواہش نفسانی کا علاج	۳۲۶
طاعت کی لذت	۳۲۷
طاعت کی تدبیر	۳۲۸
وعظ الحیوۃ	۳۳۰
فلاح کا طریقہ	۳۳۱
ذکر اللہ اور دنیا	۳۳۲
نیت کی اہمیت	۳۳۴
دنیا کی دھن	۳۳۶
راحت قلب	۳۳۷

ہل حال واہل مقام	۳۳۸
تفویض اور راحت	۳۴۰
ترجیح دنیا کی مذمت	۳۴۴
علامت حب اللہ	۳۴۵
اعمال کی حقیقت	۳۴۹
عبدیت اور رسالت	۳۵۱
عمل اور جنت	۳۵۱
محبت اور اطاعت	۳۵۲
کمالات انبیاء	۳۵۴
شان اولیاء	۳۵۶
حضرت سلیمان اور سلطنت	۳۵۷
ایمان اور تردد	۳۵۸
قرآن اور ترجمہ	۳۵۹
وساوس اور اسباب	۳۶۰
فضیلت آخرت	۳۶۱
مومن اور دنیوی متاع	۳۶۲
تارک الدنیا اور متروک الدنیا	۳۶۳
حب حق	۳۶۴
طریق اصلاح	۳۶۵
بچوں کی تربیت	۳۶۶
اہل اللہ کی صحبت	۳۶۷
علم اور اصلاح علم	۳۶۹
اہل اللہ کی قوت قلبیہ وجسمانیہ	۳۷۰
حیات آخرت	۳۷۲
کچھ عورتوں کے متعلق	۳۷۳
علاج شیخ کی اہمیت	۳۷۵
مداومت کی ضرورت	۳۷۶
مطاہر الاموال	۳۷۸
مال اور مسلمان	۳۸۰
طلب منصب	۳۸۲
مدح میں قدح	۳۸۳
کمالات انبیاء	۳۸۴
بزرگوں کی قسمیں	۳۸۶
ترغیب انفاق	۳۸۷
ایک عجیب سوال وجواب	۳۸۹
تدبیر وتقدیر	۳۹۰
جنت کی کنجی	۳۹۱
مصیبت وراحت	۳۹۲
زیادت مال کے اثرات	۳۹۶
علماء کی کوتاہی	۳۹۸
حفاظت دین کا انتظام	۳۹۹
سادگی اور عزت	۴۰۰
سادگی کی چند مثالیں	۴۰۲
طلب اور اتباع	۴۰۴

بے جا گھبراہٹ ۴۰۵
چندہ کی تحریک ۴۰۷
آیت قتلوہ کا شان نزول ۴۰۸
طہارت ظاہری و باطنی ۴۱۰
اہل اللہ کی اصلاح ۴۱۳
طہارت باطنہ کے حصول کا طریقہ ۴۱۶
ترک معاصی کی ضرورت ۴۱۸
نسبت راسخہ کا اثر ۴۲۰
مجاہدہ کی ضرورت ۴۲۱
مراقبہ موت کی ضرورت ۴۲۲
خاتمہ البیان ۴۲۳
تاسیس البنیان علیٰ تقویٰ من اللہ و رضوان ۴۲۴
اعمال باطنیہ ۴۲۶
اعتدال شریعت ۴۲۷
سہولت احکام ۴۲۷
تنگی اور پریشانی کی وجہ ۴۲۹
مساجد کی عدم خبر گیری ۴۳۲
سفارش کی خرابیاں ۴۳۳
حضورؐ کی تبلیغ اسلام ۴۳۴
نااہل کو منتظم یا مہتمم بنانا ۴۳۵
کام کی برکت ۴۳۶
سادگی اور جاذبیت ۴۳۸
خودداری کا تقاضا ۴۳۹
علماء اور ترقی ۴۴۰
شان علماء ۴۴۰
طاعت اور توفیق ۴۴۱
زکوٰۃ‘ وخیرات اور احسان ۴۴۲
بقاء علم کی صورت ۴۴۳
مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ ۴۴۴
قرآنی طرز نصیحت ۴۴۶
تعمیری بنیاد ۴۴۸
مکان کی اہمیت ۴۴۹
قوم عاد کی تقلید ۴۵۰
اہل فتاویٰ کی غلطی ۴۵۰
مدرسے اور کھالیں ۴۵۱
تعمیر مساجد اور احتیاط ۴۵۲
مکان اور تقویٰ ۴۵۴
مکان اور ضرورت ۴۵۶
عشق اور وظیفہ ۴۵۷
تواضع اور رحم کا فقدان ۴۵۹
عبادات اور نخوت ۴۶۱
تعمیر میں خلوص کا اثر ۴۶۲
قلب اور موت ۴۶۳

المال والجاہ

مال وجاہ کی نسبت یہ وعظ ۱۱ صفر المظفر سنہ ۱۳۳۶ھ کو باغیچہ مکان عبدالباقی خان صاحب الہ آباد میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹہ بیس منٹ میں ختم ہوا۔ مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

مال اسلئے ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جائے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنے کو ضرر سے بچائے۔ نفع وضرر دینی واخروی کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ حب مال وجاہ نہ ہو۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

مّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا ۭ
وَلِلّٰہِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَھُوْنَ ۝
یَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰہِ
الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

(المنافقون آیت۔ ۷-۸)

ترجمہ: یعنی یہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو لوگ جمع ہیں ان پر کچھ خرچ مت کرو یہاں تک کہ یہ آپ منتشر ہو جائیں گے۔ خدا تعالیٰ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے اور زمینوں کے لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دے گا۔ اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی لیکن منافقین جانتے نہیں... !

فہم قرآن

حضرات! یہ آیتیں ہیں سورہ منافقون کی۔ اس میں حق سبحانہ تعالیٰ نے بعض اقوال منافقین

کے بیان فرمائے ہیں اور یہ فرقہ منافقین کا یعنی ان کا حکم اس وقت باقی نہیں رہا اور اس وقت تو کیا خود حضورؐ کے زمانہ کے بعد ہی یہ نفاق جو اصطلاح شرعی میں ہے رفع ہو گیا تھا مگر نفاق بمعنی عدم اتفاق یا بمعنی مطلق ظاہر کا خلاف باطن ہونا موجود ہے مگر اس محاورہ کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اس وقت قرآن مجید کے ترجمے چھپ گئے ہیں اور لوگ دیکھتے ہیں اور اس میں کامیابی ہونا مشکل ہے کہ لوگ ترجمہ دیکھنا چھوڑ دیں اور اس وقت بھی اس مضمون سے کہ ترجمہ نہ دیکھیں شاید وحشت ہوتی ہو۔

مگر بات یہ ہے کہ ان امور میں تجربہ کو زیادہ دخل ہے اور تجربہ ان امور کا اہل علم کو زیادہ ہے تو میں چونکہ ان واقعات کو شب و روز دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں بارہا کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ ترجمہ اگر دیکھنے کو جی چاہے تو اس کی صورت صرف یہ ہونا چاہئے کہ کسی عالم سے اس کو حاصل کیا جائے چنانچہ ہر فن کے ساتھ ایسا ہی عمل کیا جاتا ہے تو علم تفسیر بھی بغیر کسی عالم سے حاصل کئے نہیں آ سکتا۔ تو غرض یہ ہے کہ اگر اول ترجمہ کسی عالم سے پڑھ لے اور پھر دوسری تفاسیر دیکھے تو غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔ اور اگر اول ہی سے ترجمہ دیکھے گا اور کسی عالم سے نہ پڑھے گا تو اس کو مواقع مشتبہ کی تعیین ہی میں سخت وقت ہوگی۔ کیونکہ مبادی (شروع کی باتیں جن پر آگے علوم کا جاننا موقوف ہے) اور اصول (قواعد) کا اس کو علم نہیں اور اگر ہو گا تو بے موقع ہوگا۔

اسی لئے اگر ترجمہ پڑھے بھی تو کسی متبحر عالم سے پڑھے صرف عربی جاننے والے سے پڑھنا بھی کافی نہیں اور متبحر عالم سے بھی سبقاً سبقاً پڑھے پھر ان ہی سے پوچھے کہ میرا فہم قرآن شریف کے مضامین کا متحمل ہے یا نہیں اگر وہ متحمل بتا دیں تو خیر ورنہ چند روز کے لئے چھوڑ دیا جاوے اور پھر علماء سے مبادی اور اصول کو حاصل کرے اور پھر اس کے بعد ترجمہ پڑھے تو قرآن مجید کا ترجمہ دیکھنے کے متعلق یہ تفصیل ہے تو اگر دیکھا جاوے تو اس طرح دیکھیں۔

لیکن ممکن ہے کہ اس پر کوئی عمل نہ کرے اور ایسا شخص اس میں منافق وغیرہ کا لفظ دیکھے جن میں لوگوں کی اصطلاحات بدل گئی ہیں تو اصطلاح بدلنے میں یہ خرابی ہوگی کہ جب آپ قرآن مجید میں دیکھیں گے کہ منافقین جہنم کے نیچے کے درجے میں ہیں اور منافقین کے معنی آپ سمجھیں گے نااتفاقی کرنے والے تو آپ ان گنہگاروں کے لئے یہ حکم دیں گے جو کہ محض غلط ہے۔

اس پر مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے میں حجرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا پوچھنے لگے کیا لکھتے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں۔ تو تصور شیخ کا لفظ

سن کر کہتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ انہوں نے عمر بھر سوائے بوعلی سینا کے اور کسی شیخ کا نام ہی نہیں سنا تھا تو جہاں کہیں شیخ کا ذکر آوے گا وہ تو یہی سمجھیں گے کہ بوعلی سینا مراد ہیں تو جو اصطلاح ذہن میں جمی ہوئی ہوتی ہے ان الفاظ کو ہر جگہ اسی پر محمول کیا جاتا ہے۔

حکماء امت

اسی طرح ایسا ترجمہ دیکھنے والا شخص کرے گا اور آج کل بڑی گلخپ کی وجہ یہ ہے کہ از خود ترجمہ دیکھتے ہیں اور شرعی اصطلاحات اور اصول سے واقف نہیں ہوتے اس لئے لڑتے ہیں اور اول خود لڑتے ہیں پھر علماء کو بھی شریک کر لیتے ہیں کہ ان سے اپنے مقابل کے لئے فتوے لیتے ہیں اور اگر علماء ان کے جہل سے متنبہ ہو کر ان کی اصلاح کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کو کہتے ہیں کہ بڑے بداخلاق ہیں۔ حالانکہ خوش اخلاقی کی بدولت ہی یہ فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً کسی نے استفتاء کیا کہ ایک شخص نے ایسا کہا تو اس کا ایمان گیا یا رہا جیسا کل ہی ایک شخص کا خط آیا ہے کہ زید نے فقہ کی فلانی کتاب کو برا کہا تو زید کا ایمان رہا یا گیا تو اگر میں اس خوش اخلاقی کو کام میں لاؤں جس کو وہ خوش اخلاقی سمجھتے ہیں کہ بدوں اس کے کہ ان کے سوال میں جرح قدح کروں کہ ان کی مرضی کے موافق لکھ دوں جیسا ظاہری عنوان سوال کا مقتضا ہے تو وہ دوسرے کو دکھلاوے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ دیکھنے والے کہیں گے کہ اس کو فلاں شخص نے کافر کہہ دیا بس یہ کافر ہے پھر اس قائل کو خبر ہوگی تو بات بڑھے گی تو خوش اخلاقی سے یہ فتنے برپا ہوئے اور عام طور پر یہی فتنے مولویوں میں پھیل رہے ہیں۔

ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے کہ مولوی لوگ بھی بادشاہوں سے کم نہیں جیسے ان کے یہاں پلٹن اور رسالے ہوتے ہیں اسی طرح ان کے یہاں کتابیں اور رسالے ہیں۔

غرض عوام الناس ترجمے اور کتابیں دیکھ دیکھ کر مولویوں تک میں یہ فتنے پھیلا دیتے ہیں اس لئے محققین ان کو ایسے مطالعہ سے روکتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض بات ظاہر میں تو معمولی سی ہوتی ہے مگر فساد کی جڑ ہوتی ہے حکماء امت کو حق تعالیٰ نے ادراک ایسا عنایت فرمایا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات کو سمجھ لیتے ہیں کہ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہا جاتا ہے کہ جو اوروں کو آئینہ میں نظر آتا ہے اہل نظر کو اینٹ میں نظر آتا ہے سو ایسے مصلحین کو آج کل متعصب کہا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ لوگ ایسی چیز کو جو بظاہر عبادت ہے روک دیتے ہیں تو ان کو خشک بتلایا جاتا ہے اور چاہا جاتا ہے کہ ایسے تر

ہو جاویں کہ ڈوب ہی جاویں۔

خیال تو فرمایئے خود حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم نے بعضے ایسے امور کو روک دیا ہے جو کہ حضورؐ کے زمانے میں ہوتے تھے مثلاً عورتوں کا مسجد میں آنا کہ نصاً ثابت ہے اور صحابہ اس کو روکتے ہیں تو بظاہر یہ نص سے معارضہ ہے مگر حکماء امت نے اچھی طرح اس کا راز سمجھ کر اتفاق کر لیا کسی نے سختی کے ساتھ اور کسی نے ذرا نرمی کے ساتھ۔

چنانچہ ہمارے امام صاحبؒ نے اس باب میں نہایت سختی فرمائی ہے کہ عجوز (بڑھیا) کو بھی مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں۔

لکل ساقطة لاقطة گری پڑی چیز کا اٹھانے والا موجود ہے یعنی ہر عورت کی طرف کوئی نہ کوئی میلان کرنے والا موجود ہے۔

اور دوسرے علماء نے بھی اگرچہ کسی قدر نرمی کی ہو مگر اولیٰ اسی کو سمجھا ہے لیکن کسی نے اس انکار کو رد نہیں کیا۔

غرض علماء بوجہ اپنے تجربہ اور انجام بینی کے بعض ایسے امور کو روک دیتے ہیں جو بظاہر عبادت ہے لیکن چونکہ وہ مفضی الی المعاصی (گناہوں کی طرف پہنچانے والے) ہوتے ہیں اس لئے علماء روک دیتے ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس باب میں ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوا کرتی۔

مثلاً اگر پارلیمنٹ کے ممبر ایک رائے تجویز کریں اور ایک دیہاتی یہ کہے کہ میری رائے اس کے خلاف ہے تو دیکھئے کیا گت بنتی ہے اور معتبر وہی ہوگا جو ممبروں کی رائے ہے۔

اسی طرح دنیاوی معاملات میں وکیل کے سامنے کوئی نہیں بولتا اور اسی رائے کا اعتبار کرتا ہے جو وکیل کی رائے ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر اپنی سمجھ میں وکیل کی رائے نہ بھی آوے جب بھی اسی کی رائے پر اعتبار کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم چونکہ قانون سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مگر عجیب بات ہے کہ دین میں ہر شخص اپنے کو ماہر سمجھتا ہے اور اپنی رائے کو دخل دیتا ہے اور دین میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ چونکہ ہم اس کے اصول اور مبادی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اس لئے ہماری رائے قابل اعتبار نہیں ہے اور علماء کی رائے میں دخل دینا مناسب نہیں غرض ہر شخص کی رائے قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ جیسا اب نرا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو اہل الرائے سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک صاحب نے ترجمہ یاد کیا تھا اور ایک عالم کے پوچھنے پر نضاختان کے معنی بہت جوش مارنے والے بتلائے خیر یہاں تک تو خیر تھی آگے ان عالم نے پوچھا بہت کا ہے کے معنی اور جوش مارنے والے کا ہے کے معنی تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ نضا کے معنی بہت اور ختان کے معنی جوش مارنے والے۔

تو کیا ایسوں کی بھی رائے معتبر ہوگی ابتہ جو لوگ مبادی اور اصول کے ماہر اور علوم عربیہ سے اچھی طرح واقف اور متبحر عالم ہوں ان کی رائے معتبر ہوگی اور دوسروں کو ایسے لوگوں کی تقلید ضروری ہوگی نہ کہ ان کے فتووں پر قیل وقال اور جواب وسوال۔ اور مصلحین کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے سوالات کے جوابات ضابطہ سے دیا کریں۔ عرفی خوش خلقی کو کام میں نہ لایا کریں۔

ایک مرتبہ میرے پاس ایک عہدہ دار کا خط آیا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے میں نے لکھ کہ کافر عورت سے زنا کرنا کیوں حرام ہے اور خلاصہ ان کے اس سوال کا علت کا سمجھنا تھا تو سمجھ لیجئے کہ علت کا سمجھنا خواص کا کام ہے تو ان عہدہ دار صاحب نے علت پوچھی تھی تو اگر میں خوش خلقی کو کام میں لاتا اور کچھ لکھ دیتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ

مغز ما خورد و حلق خود بدرید

ہمارا مغز کھایا اور اپنا حلق پھاڑا۔ یعنی ہمارا دماغ بھی خالی کیا اور خود کوئی فائدہ بھی نہ اٹھایا۔

تو میں نے یہ لکھ دیا کہ زنا کیوں حرام ہے وہ بہت خفا ہوئے اور مجھ کو لکھا کہ علماء کو ایسا خشک اخلاق نہ ہونا چاہیے میں نے اس کو ردی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اتفاق سے وہ مجھے ایک سفر میں ملے اور زبانی گفتگو سے سمجھ گئے اور پھر کبھی کوئی بات فضول نہیں پوچھی۔

اس پر میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اول ہی سے جواب میں ضابطہ کا برتاؤ کیا جائے تو سائلین کی جرات کی یہاں تک نوبت کیوں آئے۔

اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ افریقہ دار الحرب ہے یا دار الاسلام۔ اب اگر میں ان کے ساتھ خوش خلقی کرتا تو چار گھنٹہ تک مغز مارتا۔ اس لئے میں نے ان سے کہا کہ اول یہ بتلا دو کہ اگر دار الاسلام ہونا معلوم ہو جائے تو کیا کروگے اور اسی طرح دار الحرب ہونا بھی۔ بس چپ ہو گئے تو ایسی باتوں کو اس طرح روکنا چاہئے۔

غرض علماء اور حکماء امت کو چونکہ حق تعالیٰ نے نتائج تک پہنچنے کا ادراک عطا فرمایا ہے ان کی نظر نتیجہ پر ہوتی ہے اور اس لئے وہ بعض ایسی چیزوں کو بھی روک دیتے ہیں جو بظاہر مستحسن ہوں اور

اسی طرح سے ترجمہ قرآن مجید میں بھی گو بظاہر کوئی خرابی نہیں لیکن نتیجہ اس کا یہ ہے کہ بغیر مبادی اور اصول کی واقفیت کے جب تک استاد سے نہ پڑھا جائے گا اس وقت تک یہ اندیشہ ہے کہ شاید غلطی ہو جائے جیسے معنی نفاق میں عرض کیا گیا۔

منافقین کی حالت

اب میں پھر اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں تو کافر ہو اور خاص موقعوں پر اس کفر کو ظاہر بھی کر دے اور ظاہر میں مسلمان ہو تو اس وقت ایسے لوگ بھی تھے اور گو حضورؐ کو علم ہو گیا تھا ان کے منافق ہونے کا مگر حکم یہ تھا کہ جو اپنے کو مومن کہے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیجئے کہ اس میں مصلحت تھی اور اس وقت چونکہ کوئی مصلحت نہیں لہٰذا اگر دلیل سے کفر ثابت ہو جاوے گا۔ اس کے ساتھ کفار کا معاملہ کریں گے۔

خیر یہ تو لفظ نفاق کے متعلق کسی قدر بیان ہو گیا اصل مقصود یہ ہے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے منافقین کے مقولہ کو بیان فرما کر ان کا رد کیا ہے اول میں ترجمہ عرض کرتا ہوں۔

وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں اور اللہ ہی کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے ولیکن منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ کر گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ ذلت والے کو (یعنی صحابہ کو) نکال دے گا اور اللہ ہی کے لئے ہے عزت اور اس کے رسولؐ کے لئے اور اہل ایمان کے لئے ولیکن منافقین نہیں جانتے۔

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ عیہ وسلم اور مہاجرین اور انصار وغیرہ سب تھے۔ اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر ساتھ جایا کرتے تھے اور ان کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اسرار (بھید) معلوم کر کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے تھے چنانچہ

وفیکم سمعون لھم یعنی تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جاتے تھے کیونکہ ظاہری اسلام کے سبب مال غنیمت میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا اور حکمت اس کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی کمک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں تو چونکہ یہ لوگ ظاہر میں بطور کمک کے جاتے تھے ان کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور ان سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے یہ برتاؤ

کریں گے۔ اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی تو غرض یہ ہے کہ منافقین بھی جایا کرتے تھے تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا۔

صل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر

تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو بڑھ گئی۔ ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی حضورؐ نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے تو وہ جوش ان لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

اور تعجب نہ ہو کہ اتنی سی بات میں کیوں کر جوش کم ہو گیا تو اس کا نمونہ اب بھی موجود ہے کہ عرب سب سے زیادہ سخت مشہور ہیں خصوص بدوی کہ ان میں محسوسات کا بھی علم نہیں۔

چنانچہ ایک شخص کہتے تھے کہ کسی قافلہ کی لوٹ میں بدوؤں کو ایک گھڑی ملی اس کی آواز سن کر کمیٹی ہوئی کہ اس میں کیا ہے آخر تشخیص یہ تھی کہ اس میں جن ہے پھر اس کو توڑا تو وہ بند ہو گئی تو کہتے ہیں کہ

نحن قتلنا الجنی یعنی ہم نے جن کو مار ڈالا۔

تو ایسی قوم بہت ہی خطرناک ہو گی اور ان کو دین کی بھی اطلاع نہیں بعض ایسے ہیں کہ کنواں موجود ہے اور تیمم کر کے نماز پڑھ لی بعضے نماز ہی نہیں پڑھتے غرض ان میں نہایت ہی جہل ہے۔ غصہ میں فوراً تلوار نکل آتی ہے لیکن باوجود اس کے یہ حالت ہے کہ کیسے ہی جوش میں ہوں اور ایک ادنیٰ سا آدمی بیچ میں جا کر کہہ دے۔

یا شیخ صل علی النبی یعنی اے شیخ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو۔

فوراً تلوار کو نیام میں کر لیتے ہیں اور اللّٰھم صل علیٰ سیدنا الخ پڑھنے لگتے ہیں۔

تو اب بھی ایک داعی (دین کی طرف بلانے والے) کے سبب جوش فرو ہو جانے کا ایک نمونہ موجود ہے اور یہ نمونہ میں نے اس لئے بیان کیا کہ آج کل ہر واقعہ کو نظیر ہی سے مانا جاتا ہے۔

چنانچہ رام پور میں معراج کے متعلق ایک صاحب نے یہی سوال کیا کہ اس کی کوئی نظیر بھی ہے۔ حالانکہ اگر نظیر بھی نہ ہو لیکن نقل صحیح ہو اور عقل کے خلاف نہ ہو تو بس مان لو مگر پھر بھی انکار ہوتا ہے جیسا کہ محدثین کے حافظہ کا انکار ہے کہ دو دو ورق کی حدیث کیسے یاد ہوئی۔ کہتے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ایک مقدمہ کا ضمنی دعویٰ ہے کہ جو سمجھ میں نہ آوے وہ غلط ہے میں کہتا ہوں کہ اگر سمجھ سے کسی

خاص آدمی کی سمجھ مراد لی جائے تو کبریٰ اس قیاس کا غلط ہے کیونکہ کسی خاص کی سمجھ میں نہ آنے سے کوئی بات غلط نہیں ہو جاوے گی اور جو عام مراد ہو تو صغریٰ غلط ہے کیونکہ یہ تو ٹھیک ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا لیکن تمہاری سمجھ میں نہ آنے سے یہ کہاں لازم آیا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بخیل شہد سے روٹی کھا رہا تھا اس کے ایک دوست آ گئے۔ تو بخیل نے یہ خیال کیا کہ یہ بھی کھانے میں شریک ہو جائے گا کوئی ایسی صورت کرنی چاہئے کہ یہ نہ کھاوے۔ تو روٹی چھپا دی۔ اور شہد اس خیال سے پیش کر دیا کہ خالی شہد کیا کھاوے گا۔ مگر وہ لگا چاٹنے تو بخیل کہتا ہے کہ۔ **یا اخی انه یحرق القلب**

یعنی بھائی! یہ قلب کو جلا دیتا ہے۔ بخیل کے دوست نے یہ سنا اور ہنس کر کہتا ہے کہ **نعم ولکن قلبک** ہاں یہ سچ ہے مگر آپ کے دل کو تو جیسے بخیل کا یہ کہنا تو سچ ہے لیکن کس کا قلب اسی طرح یہ تو ٹھیک ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا لیکن کس کی سمجھ میں ہماری تو سمجھ میں آتا ہے گو نمونہ بھی نہ دیکھا جاتا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں ایک نمونہ اس کا بھی ظاہر فرما دیا۔

میں نے متعدد معتبر آدمیوں سے حافظ رحمت اللہ صاحب الہ آبادیؒ کے حافظہ کے واقعات سنے ہیں۔ قاضی وصی الدین صاحب کانپور میں قرق امین تھے اور نہایت ثقہ (معتمد) اور معتبر آدمی تھے گو جنید بغدادیؒ نہ ہوں لیکن تاہم ایک ثقہ اور معزز آدمی تھے اور جو لوگ معزز ہوتے ہیں وہ عادتاً جھوٹ نہیں بولتے وہ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ حافظ صاحب کانپور میں آئے میں نے درخواست کی کہ آپ کا حافظہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کوئی کتاب لا کر میرے سامنے طویل عبارت پڑھ دو وہ کہتے ہیں کہ میں کتب خانہ میں سے افق المبین نکال لایا جو بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور بڑی تقطیع پر تھی اور اس کے دو صفحے ان کے سامنے پڑھے انہوں نے بعینہ تمام عبارت سنا دی۔

اور بھی بعضے علماء کی اس قسم کی حکایت سنی گئی ہے تو حق تعالیٰ کو سب قدرت ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے گو تمہاری سمجھ میں نہ آوے اسی طرح حق تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اخلاق کا نمونہ تھوڑا سا اب بھی باقی رکھا ہے کہ ایسے جاہل عرب بدوی جن میں علم بھی نہیں اور ایسے سخت اور جوشیلے کہ ذرا سی بات میں معمولی غصہ میں تلوار نکال لینا اور آپس میں کشت و خون کر ڈالنا ان کے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے مگر باوجود اس کے چاہے کیسے ہی غصہ میں بھرے ہوں جس وقت **صلّ علی النبیّ** (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجو) سنیں فوراً غصہ کم ہو جاتا

ہے اور **اَللّٰھم صل علی سیّدنا** الخ پڑھنے لگتے ہیں۔ تو اب تعجب نہ ہوگا کہ دو صحابی جو آپس میں بگڑ رہے تھے حضورؐ کے منع کرنے سے ان کا غصہ فوراً کم ہوگیا۔

سماعِ قرآن کا اثر

ہاں تو قصہ یوں ہے کہ وہاں ایک رئیس تھا عبداللہ ابن ابی منافق اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت حسد تھا اور وجہ حسد کی یہ تھی کہ حضورؐ کی تشریف آوری سے قبل لوگوں کا قصد تھا کہ اس کو سردار بنائیں مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو گو آپ کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر من جانب اللہ آپ ہی کو سرداری ملی سچ ہے۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دامِ عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

یعنی اگر شہرت کی خواہش ہے تو گوشہ نشینی اختیار کرو اس لئے کہ گوشہ گیری ہی سے عنقا کی شہرت ہے۔

اور عادت اللہ اسی پر جاری ہے کہ **من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ**[1] (یعنی جو شخص اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مراتب بلند فرما دیتے ہیں) حتیٰ کہ مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو برا نہ کہیے تو آپ جو کچھ کہیے اس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپ کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمائیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابوجہل وغیرہ بھی شریک تھے۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا اس سے حضورؐ کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا جب کفار کہہ چکے تو حضورؐ نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

حٰمٓ تنزیل من الرحمٰن الرحیم کتاب فصلت آیاته قرآناً عربیاً لقوم یعلمون۔ الخ

حٰمٓ یہ کلام رحمٰن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمند ہیں۔

---

[1] الترغیب والترھیب للمنذری ۳: ۵۹۱، ۴: ۱۹۷، مجمع الزوائد للھیثمی ۸: ۲۰۸، کنز العمال ۵۷۳۰، مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۹

جب اس آیت پر حضور پہنچے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقةً مثل صاعقة عادو ثمود

یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد اور ثمود پر آفت آئی تھی۔

تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا بس کیجئے اور وہاں سے بھاگا اور اس کمیٹی میں پہنچا تو ابوجہل اتنا عاقل تھا کہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ سے اور آ رہا ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس نے آ کر بیان کیا کہ بھائیو قرآن سن کر میری تو حالت بدلنے لگی خصوص اس آیت پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے نکلا۔

حقیقی علم

میں اس قصہ سے کہ ابوجہل نے اس شخص کے بشرہ (پیشانی) سے کیا استدلال کیا جو اس کے بڑے عاقل فلسفی ہونے کی دلیل ہے یہ امر بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ علم کو بہت ترقی ہے سو علم کو بے شک ترقی ہے مگر کون سے علم کو یہی ریل تار فوٹوگراف۔ بس ان کو ترقی ہے مگر حقیقت میں خود ان کو علم کہنا ہی غلطی ہے اس کو صنعت کہئے۔ تدبیر کہئے گو بالمعنی الاعم (اعم معنی کے اعتبار سے) علم ہی سہی۔ یوں بعضے علوم وہ بھی ہیں جن کی شان میں حدیث ہے۔

ان من العلم لجهلا بعض علوم جہل ہوتے ہیں مگر علم مطلوب واقعی میں تو وہی ہے کہ

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت — زنگ گمراہی زدل بزدایدت

واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کی راہ پر لگا دے اور تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دور کر دے۔

ایں ہوس ہا از سرت بیروں کند — خوف و خشیت در دلت افزوں کند

خواہشات نفسانی و شیطانی کو تمہارے سر سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت تمہارے دل میں زیادہ کر دے۔

اگر کہا جاوے کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کل ایک مہتر کو بھی حق ہوگا کہ وہ اپنے کو ذی علم کہے کیونکہ صحت کے لئے صفائی کی ضرورت اور مہتر صفائی کے فن کو جانتا ہے مگر آپ اس کو علم نہیں کہتے تو جس طرح آپ اس کو علم نہیں کہتے ہم ریل تار فوٹوگراف وغیرہ جاننے کو علم نہیں کہتے۔ ہاں صنعت ہے اور ضروری ہے بس ایسا ہی ابوجہل فلسفی تھا اور یہی ابوجہل معبر بھی ایسا ہی تھا

تو تعبیر بھی کوئی بزرگی کی بات نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی فراست ہے تو باوجود ان علوم کی مخالفت کے سبب جس کا منشاء علم مطلوب کا نہ ہوتا تھا ابوجہل ہو گیا۔

آیۃ کریمہ کا شان نزول

غرض حضورؐ نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا پس نہ مکہ میں حضورؐ نے سرداری کی درخواست کی اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بڑا بنائیں اس کو کون چھوٹا کر سکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف آوری پر لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار بنالیا تو عبداللہ بن ابی جل مرا کہ میری سرداری آپ کی بدولت گئی اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعۃ الشمس ما یغنیک عن زحل یعنی سورج کے طلوع ہونے سے زحل سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا تو اس واقعہ سے اس کو سخت ناگواری ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پردیسیوں کو اتنی دلیری ہو گئی تو اس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی نے تو ان کو جری کیا تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو۔ اور اس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے پس اس کا پہلا مقولہ ہے کہ

ھم الذین یقولون لاتنفقوا علیٰ من عند رسول اللہ حتی ینفضوا

یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔ ایک مقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ **لیخرجن الاعز منھا الاذل** کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے (اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں)

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا مگر زید بن ارقمؓ نے یہ سن لیا اور جوش بیتابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپؐ نے فوراً عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا تو اس نے آکر قسم کھالی کہ غلط ہے میں نے ہرگز نہیں کہا اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جاءک المنفقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔

زید بن ارقمؓ کے چچا نے ان کو ملامت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا یہ مارے رنج کے گھر میں بیٹھ رہے کہ اب کیا منہ دکھلاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو ان کی یہ حالت رنج کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی حالانکہ صرف ایک شخص کا قصہ تھا مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبداللہ بن ابی کا وہ مقولہ بالتصریح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اس نے ضرور یہ کہا ہے تاکہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ارقمؓ کو بلایا اور ان کی تصدیق کے لئے سورت نازل ہونے کی اُن کو بشارت سنائی زید بن ارقمؓ کھل گئے یہ خلاصہ تھا اس قصہ کا۔

مقصود بیان

اب میں یہ بیان کرتا ہوں کہ مقصود میرا اس قصہ کے ذکر سے کیا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر حکایت سے ایک مقصود ہوا کرتا ہے اور یہی راز ہے کہ قرآن شریف میں قصے زیادہ مفصل بیان نہیں ہوئے۔ بہت لوگ قرآن سے مفصل قصے تلاش کرتے ہیں اور تاریخوں سے دیکھ کر منطبق کرتے ہیں اگر کوئی قصہ مل جاتا ہے تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اگر نہیں ملتا تو اس کو کمی سمجھ کر جواب کے طالب ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے گو قصہ ناتمام ہے مگر واقعہ تو مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود صرف نتیجہ ہے تو جتنے جزو سے نتیجہ نکل آوے وہی مذکور ہونا کافی ہے تو یہاں بھی چونکہ قصہ ذکر کیا ہے یہاں بھی کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور اس کی تعیین اکثر قرآن ہی سے ہو جاتی ہے چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے چنانچہ منافقین کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ

وللہ خزائن السموٰت والارض کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب کچھ ہے۔ اور ان کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین کہ عزت تو اصل میں حق تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کی ہے۔

ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے

اس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعوی کرتے ہیں حالانکہ ان کا دعوی غلط ہے کیونکہ آسمان وزمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ

لیخرجن الاعزمنها الاذل یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی مال کے متعلق ہے اور دوسری جاہ کے متعلق ہے۔

اب یہ بات کہ اس وقت میں نے اس کو کیوں ذکر کیا تو دل یوں چاہا کرتا ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ بتلائی جاوے تو آج کل جو امر زیادہ ضرر رساں اور زیادہ آزاردہ ہے وہ اختلافات ہیں جو باہم مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ بالخصوص جب کہ دونوں طرف بڑے بڑے لوگ ہوں کہ چھوٹے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے ہوں۔ اس لئے بڑا ضروری امر اس وقت اختلافات کا فیصلہ ہے۔

علماء اور مال وجاہ

سو من جملہ ان اختلافات کے ایک بڑی جماعت کا یہ اختلاف ہے کہ مال اور جاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں یا نہیں اور دونوں جانب بڑے بڑے لوگ ہیں ایک جانب تو وہ لوگ ہیں جو اہل الرائے اور معزز طبقہ کے کہلاتے ہیں اور دوسری جانب علماء ہیں اور ممکن ہے کہ دونوں کی کچھ کچھ غلطیاں بھی ہوں اور کوئی زائد غلطی میں ہو۔ چنانچہ آج کل کے عقلاء تو اس میں منہمک ہیں کہ مال اور جاہ قابل تحصیل اور مطلوب ہیں ان کی ترقی ہونی چاہئے۔ اور علماء کی رائے یہ مشہور کی جاتی ہے کہ مال اور جاہ اصلاً قابل تحصیل اور مطلوب نہیں اور ان کی ترقی کی کچھ ضرورت نہیں اور بعض مرتبہ تو قول ہی ناتمام ہوتا ہے اور بعض مرتبہ ناتمام پہنچایا جاتا ہے چنانچہ اسی بناء پر علماء دین کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یوں چاہتے ہیں کہ مسلمان جوتیاں چٹخاتے پھریں چنانچہ عموماً ان پر یہی گمان ہے کہ یہ علماء ترک دنیا کراتے ہیں اور جب یہ گمان ہو گیا تو اس خیال کی بناء پر یہ بھی شبہ ہو گیا کہ علماء کی زیادہ سختی اس لئے ہے کہ یہ زمانہ کی ضرورتوں سے بے خبر ہیں ان کو یہ خبر نہیں کہ کس جگہ مال اور جاہ کو منع کرنے سے ترقی رکتی ہے اور اگر ان کو خبر ہوتی تو اتنی سختی نہ کرتے بلکہ اپنے فتوی میں اس کی رعایت رکھتے ایسا نہ کرتے کہ ہر نوکری بھی **لا یجوز** (جائز نہیں) اور تجارت بھی ناجائز۔ تو ان کے نزدیک نہ حیات کے افعال جائز نہ موت کے افعال۔

چنانچہ قنوج میں ایک صاحب نے کہا کہ ساری شریعت کا حاصل یہ ہے کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو نہ رونے کی جگہ روؤ۔ میں نے کہا سبحان اللہ خوب سمجھے تو شریعت اس طرح بدنام کی جا رہی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ بعض علماء کی تعلیم میں کہیں لفظی اجمال ہو مگر اس اجمال کا مضائقہ بھی نہیں کیونکہ مخاطب مسلمان کم وبیش مسائل دین سے ضرور تعلق رکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ممانعت تو اسی کی ہوگی جو حرام ہو مگر ان کی مناسبت کے اعتماد پر بعض جگہ عنوان میں کچھ ابہام رہ گیا ہو۔

مثلاً اگر کسی مریض کو طبیب مرچ سے منع کرے اور کچھ تفصیل نہ کرے تو وہی درجہ ممنوع ہوگا جو مریض کے لئے مضر ہو۔ تو اس طرح سے بھی غلط فہمی ہوگئی ہے اور اس کی وجہ سے اختلاف ہوگیا۔

پس ایک طبقہ تو حامی ہوگیا تعلیم دین کا جس کی غایت مال وجاہ نہیں ہے اور ایک طبقہ حامی ہوگیا تعلیم دنیا کا جس کا مقصود ہی صرف مال وجاہ ہے۔

جدید طبقہ کے خیالات

اس طبقہ کی طرف سے پہلے طبقہ کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ تو کھانے پینے کے ذریعہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے چنانچہ سب سے اول یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر تعلیم دنیا کا اہتمام نہ ہو تو کھائیں کہاں سے اور علم دین کی ضرورت کا وہ انکار تو نہیں کرتے مگر علم دین صرف نماز روزہ ہی کے مسائل کو سمجھتے ہیں۔

مگر اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کہے کہ قانون گورنمنٹ صرف یہ ہے کہ حکام کی تعظیم وتکریم کرو پھر چاہے رات کو ڈکیتی ہی کا شغل ہو۔ لیکن تعجب ہے کہ ایسے شخص کا یہ اجتہاد تو کوئی نہ سنے گا مگر دین کے باب میں ایسی رائیں مسموع (سنی جانے والی) ہوتی ہیں۔

شاید کوئی شخص کتاب راہ نجات کے نام سے استدلال کرے کہ راہ نجات میں دیکھو نماز روزہ ہی کا بیان ہے اور پھر اس کا نام راہ نجات ہے اس سے معلوم ہوا کہ نجات کا راستہ یہی نماز روزہ ہے بس۔ تو یہ تو ٹھیک کہ نماز وروزہ نجات کا راستہ ہے لیکن یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ وہی ہے اور کسی جزو کی ضرورت نہیں۔

جیسے کوئی شخص سڑک پر جا رہا ہو تو یہ سڑک اس کا راستہ ضرور ہے لیکن یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ پورا راستہ یہی سڑک ہے ممکن ہے کہ کچھ دور کے بعد دوسری سڑک بھی طے کرنا پڑے تو بہت لوگوں نے دین میں بس یہ اختصار کر رکھا ہے حتیٰ کہ بعضے تو قرآن شریف پڑھنے کو بھی تضییع اوقات سمجھتے ہیں۔ چنانچہ رام پور میں ایک صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ تم اپنے بچے کو

انگریزی کیوں نہیں پڑھاتے انہوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھ رہا ہے ختم کر لے تو انگریزی پڑھاؤں کہنے لگے کتنے دنوں میں کتنا قرآن ہوا ہے؟ انہوں نے کہا کہ دو برس میں آدھا قرآن تو آپ کہتے ہیں کہ دو سال تو ضائع ہو گئے دو سال اور بھی کیوں ضائع کرتے ہو۔

اور قرآن سے بے تعلقی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی ایک بیرسٹر کی نسبت فرماتے تھے کہ انہوں نے مولانا سے کہا کہ اس وقت تو علماء اگر سود کو حلال کہہ دیں تو مصلحت ہے مولوی صاحب نے فرمایا کہ توبہ کرو جو چیز قرآن میں حرام ہے اس کو کون حلال کہہ سکتا ہے۔ اور آیت پڑھی۔ احل اللہ البیع و حرم الربو یعنی اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

تو کہنے لگے اے اللہ توبہ! میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مولویوں نے مل کر اس کو حرام کر رکھا ہے تو یہ حالت بے خبری کی ہوگئی ہے اور یہ بڑھتی جاتی ہے۔

یہیں الہ آباد کا قصہ ہے کہ ایک بچہ کی انگریزی تعلیم بہت دور تک ہوگئی تھی مگر وہ الحمد شریف دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکا۔ میں نے حروف پہنچوائے تو معلوم ہوا کہ اس نے الف با تا بھی نہیں پڑھی۔ اور میں نے ایک بہت بڑے شخص کے بچے کو دیکھا کہ وہ میم کی گود پلتا تھا اور باپ کو اس پر فخر تھا کہ وہ کلمہ پڑھ سکتا تھا جیسے ہم اپنے طوطے کو کلمہ پڑھا دیں تو اسلام سے یہ بے خبری کی نوبت ہوگئی ہے اور صاحب آپ نے تو پھر بھی چونکہ ایسے لوگوں کی آغوش میں پرورش پائی ہے جو پرانی روش کے تھے۔ آپ تو خیر اتنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر یہ بچے خواہ آپ کی اور میم کی گود میں پرورش پا رہے ہیں یہ تو اتنی بھی نہیں سمجھیں گے یہ حالت دیکھتے ہوئے مجھے تو خوف ہے کہ چند روز میں شاید لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی پسند نہ کریں گے جیسے کہ اس وقت میں اکثر عربی طلباء کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے کو ایسی وضع سے رکھنا پسند نہیں کرتے جس سے طالب علم سمجھے جاویں صاحب سن لیجئے۔

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

یا تو محبوب حقیقی کے عشق کا دعویٰ مت کرو اور اگر کرتے ہو تو عاشقوں کی وضع کو اختیار کرو۔

یا مکن با پیل باناں دوستی یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

یعنی یا تو فیلبان سے دوستی مت کرو یا اپنا مکان ہاتھی کے موافق بناؤ یعنی یا طلباء اور اللہ والوں میں مت داخل ہو اگر داخل ہوتے ہو تو ان کی وضع اختیار کرو۔

تو جب یہ کیفیت طلباء میں داخل ہوگئی تو اوروں کا تو کیا ٹھکانہ ہے تو جس طرح طلباء کو ایسی

وضع بنانے میں عار ہے جس سے لوگ ان کو طالب علم کہیں گے تو دیکھئے اب یہ اپنے کو طالب کہنا پسند نہیں کرتے اسی طرح اسلام کو بھی عجب نہیں کہ عار سمجھیں چنانچہ نام تو بدلنے لگے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ مسلمان ہیں تو نام بدل گئے وضع بدل گئی خیالات بدل گئے مگر ان کے نزدیک وہ اسلام ہی کچھ ایسا لوہے جڑا ہے کہ کسی طرح الگ ہی نہیں ہوتا۔

بس ایسا ہے جیسے مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ایک سقے کو نماز کی تاکید کی اور وضو کرا کر بتلا دیا غالباً ایک ماہ کے بعد پوچھا کہ نماز بھی پڑھتا ہے معلوم ہوتا پڑھتا ہے فرمایا وضو بھی کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کیوں اس دن کرا نہیں دیا تھا تو جیسا اس کا وضو تھا ایسا ہی آج کل کا اسلام ہے۔

علماء اور کافر گری

پھر اس حالت پر اگر علماء کچھ کہہ دیتے ہیں تو علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ یہ بہت جلد کافر بناتے ہیں مگر یہ الزام سراسر غلط ہے کیونکہ کافر بنانے کا مفہوم تو ایسا ہے جیسا مسلمان بنانے کا اور مسلمان بنانے کے معنی ظاہر ہے کہ یہی ہیں اسلام سکھلانا اسلام کی ترغیب دینا و تحریک کرنا چنانچہ کہتے ہو کہ علماء کو حق تعالیٰ نے اس لئے بنایا کہ وہ کافروں کو مسلمان بنائیں تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو مسلمان کہیں نہیں ہرگز نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروں کو اسلام سکھلا دیں اسلام کی ترغیب دیں اور اسلام کی طرف بلائیں تو اسی طرح کافر بنانے کے بھی یہی معنی ہوں گے کہ کافر ہونے کی تحریک کریں اور جب یہ معنی متعین ہوئے تو اب تم ہی بتلاؤ کہ کون سا عالم کفر کی تحریک کر رہا ہے بس معلوم ہو گیا کہ علماء کافر نہیں بناتے ہاں بے شک علماء بتاتے ہیں کہ فلاں بات سے کافر ہو گیا تو کافر تو خود ہو گیا تھا مگر علماء نے صرف بتلا دیا۔

جیسے کوئی شخص امتحان میں فیل ہو جائے اور کوئی اس کو بتلا دے کہ تم فیل ہو گئے تو کیا یہ کہا جائے گا کہ اس بتلانے والے نے اس کو فیل کر دیا نہیں بلکہ فیل تو خود ہوا اس شخص نے صرف بتلا دیا ہاں اگر کوئی ناحق کفر کا فتویٰ دے تو بے شک وہ برا ہے تو علماء پر یہ الزام محض اس لئے ہے کہ ان لوگوں کو بھی خبر نہیں کہ اسلام کیا ہے اور زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ وہ بے خبر تو نہیں ہیں بلکہ ان کو خبر سب ہے پھر بھی استہزاء (ہنسی مذاق) کرتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کی ان کی ضرورتیں ان کے خیال میں واجب الرعایت ہیں اور شریعت میں ان کے نزدیک ان کی کامل رعایت ہے نہیں اسلئے کھینچ تان کر ان پر شریعت کو منطبق

حلال کرانا چاہئے جب علماء نے موافقت نہ کی تو وہ لوگ بولے بس صاحب اب ترقی کی کوئی امید نہیں۔

اسی طرح اس جماعت نے یہ رائے قائم کی کہ یہ ساری خرابیاں اور مسلمانوں کی پستی اسلام کی قید اور حرام وحلال کی بدولت ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تجارت کرے تو شریعت میں تو روک ہے کہ ناجائز معاملہ نہ کرو سود نہ لو۔ پھر ترقی کہاں اس لئے اس قید سے آزاد ہو جانا چاہئے مگر میں کہتا ہوں کہ اگر شریعت کو چھوڑ بھی دیا مگر آزادی تو پھر بھی میسر نہ ہوئی کیونکہ گورنمنٹ کے قوانین کی قید اب بھی ہے۔

اگر کہو کہ کچھ کچھ تو آزادی ہو گئی تو میں کہتا ہوں کہ اس کچھ قید کچھ آزادی سے تو بالکل قید ہی اچھی۔ ایک طرف تو ہوئے اس لئے چاہیے کہ جو اسلام سے آزاد ہو وہ گورنمنٹ سے بھی آزاد ہو جاوے پھر علاوہ حلاں وحرام کی روک ٹوک کے ایک اور بت سے بھی ان لوگوں کو اسلام سے توحش (نفرت) ہوا وہ یہ کہ انہوں نے دیکھا کہ بعض مسمانوں میں تعصب اتنا ہے کہ کوئی آمین پر لڑتا ہے کوئی رفع یدین پر تو جب اسلام ہی نہ ہوگا تو یہ سب کچھ بھی نہ ہوگا جس سے قوم کو ضرر پہنچ رہا ہے۔

انہوں نے جھگڑوں کے اعتبار سے اسلام کو ایسا سمجھ رکھا ہے جیسے کسی بادشاہ کے بڑے بھائی تھے۔ مجذوب کہ برہنہ رہتے۔ بادشاہ نے کہا کہ پائجامہ تو پہن لیجئے انہوں نے کہا پھر کرتہ بھی لوں گا بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے وہ بولے پھر ٹوپی بھی لوں گا بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے اسی طرح سلسلہ چلاتے چلاتے سلطنت کی ضرورت ظاہر کی بادشاہ نے کہا وہ بھی حاضر ہے کہنے لگے تو میں پاجامہ ہی پہن کر کیا کروں گا جس سے یہ سب جھگڑے پیدا ہوں۔

اسی طرح انہوں نے کہا کہ سارے قصے اسلام ہی کے ہیں تو مسمان ہی کیوں رہیں اور یہ لوگ جو مسلمانوں کو الزام دیتے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں جھگڑا کرتے ہیں چنانچہ آمین ہی پہ دیکھئے کس قدر اختلاف اور جھگڑا ہو رہا ہے تو واقعی اتنے اختلاف کو تو ہم بھی پسند نہیں کرتے مگر یہ دیکھئے اصل سبب اس اختلاف کا کیا ہے تو اصل سبب یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں دین کی تکمیل اتنی ضروری ہے کہ ذرا ذرا سی بات کو بھی وہ جانچتا ہے پھر اس میں کبھی نفسانیت بھی آ گئی جس کی وجہ سے اس میں زیادتی ہونے لگی تو اصل میں خرابی یا ضرر جو کچھ لازم آیا وہ اسلام سے نہیں بلکہ نفسانیت سے مگر انہوں نے اس ضرر کو بھی اسلام کی طرف منسوب کیا۔ تو انہوں نے یہ تجویز کر لیا کہ اسلام کو باقی رکھ کر ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر تجویز ہی تھی اپنے نزدیک اسلام کو ابھی چھوڑا نہیں مگر صاحبو! اسلام نے تو خود انہیں چھوڑ دیا تو یہ لوگ متروک الاسلام (اسلام کے چھوڑے ہوئے) تو

کرتے ہیں اور علماء ان پر انکار کرتے ہیں اس لئے وہ علماء سے الجھتے ہیں۔

اسلام اور ترقی

ان میں بعضے ایسے ہیں کہ یورپ کی تحقیقات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے مگر پھر بھی کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا تو اس جماعت نے دین صرف قوم کا نام رکھا ہے۔

چنانچہ افسوس ہے کہ آج کل ایک طبی وفد ترکوں کی مدد کو گیا ہے تو جہاز میں سوار ہونے کے بعد آپس میں گفتگو ہوئی کہ ہم لوگوں کو داڑھی رکھنا مناسب ہے یا نہ رکھنا تو میں کیسے کہوں کہ یہ اسلام ہے۔ دیکھئے اول تو ایسے دینی کام کو جا رہے ہیں تو یہ دین کے خلاف تجویز کیسی دوسرے ممکن ہے کہ ان کے ایک گولی آ کر لگ جائے تو کیا وہ چاہتے تھے کہ ایسی حالت میں خاتمہ ہو کر جو کہ اسلام کے خلاف ہو تو اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس وقت مذہب سے کوئی مطلب باقی نہیں رہا یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو کسی وقت یہ معلوم ہو جائے کہ اس مذہب کو اختیار کر کے ہماری قومیت باقی نہیں رہ سکتی اور فلاں مذہب اختیار کرنے سے باقی رہ سکتی ہے تو فوراً اس مذہب اسلام کو چھوڑ کر وہ دوسرا مذہب اختیار کریں۔

چنانچہ لکھنؤ میں میرے ایک دوست میرے پاس روزانہ آتے ایک روز آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ آنے کے بعد میں نے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بیان کیا کہ آج ایک کمیٹی تھی اس کے تماشے میں دیر ہو گئی اور گو میں اس کا ممبر نہ تھا اور اس کا ممبر نہ ہونا ہی اچھا تھا کیونکہ بعض کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا ہے۔

چنانچہ مشہور ہے کہ اکبر کے زمانہ میں ایک کمیٹی نبوت کی قائم ہوئی اس میں ملا دو پیازہ بھی حاضر تھے۔ کوئی نبی بنا تھا کوئی ابوبکر کوئی عمر یہ خاموش تھے ان سے پوچھا گیا بھائی تم کیا بنو گے انہوں نے کہا کہ میں ابوجہل بنوں گا تم سب کی تکذیب کروں گا سو واقعی بعضی مجلس کا ابوجہل ہی ہونا اچھا ہے اسی طرح اس کمیٹی کا ممبر ہی نہ ہونا اچھا تھا۔

سو انہوں نے بیان کیا کہ اس کمیٹی میں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں کی ترقی نہیں ہوتی تو اخیر میں تحقیق کے درجے میں یہ طے ہوا کہ اسلام کو باقی رکھ کر مسلمانوں کی جماعت ترقی نہیں کر سکتی اور یہ رائے قائم کی کہ اگر ترقی مطلوب ہے تو اسلام کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس میں حلال و حرام کا بڑا قصہ ہے۔ مثلاً ایک انجمن نے تو ایک تجویز کی کہ مسلمانوں کو یہ کرانا چاہئے تو مذہب اسلام کی رو سے وہ حرام ہے تو اب اس چیز پر عمل کیسے ہو۔

چنانچہ ایک بار میں لاہور گیا تو وہاں کے عقلاء نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ علماء پر زور ڈال کر سود کو

غرض یہاں تک مذاق بدل گیا ہے۔
ہو ہی گئے۔ ایک یہ تجویز ہوئی تھی کہ نکاح بھی فضول ہے۔
ایک اور قصہ ہے رڑکی کا وہاں ایک کمیٹی میں
جو معاملہ ٹھہر جاوے اسی طرح
آزادی تو یہ ہے کہ جیسے اور سودے سلف کا معاملہ ہوتا ہے کہ جس سے
یہ رائے تھی عقلاء کی۔
بیویاں بھی حاصل کرلی جاویں علماء نے اس مفسدہ کو دیکھ کر روکا
تو سبب اس کا فقط یہی ہے کہ ان کی نظر میں دنیا اصل چیز ہے۔
سمجھے گئے کہ علماء کی رائے یہ
اور روکنے کا مطلب یہ تھا کہ اس درجہ کی دنیا کو چھوڑ دو مگر اس کے معنی غلط یہ
گفتگو ہونے لگی کہ آیا اصل میں دنیا مطلوب
ہے کہ دنیا کو بالکل چھوڑ دو۔ اس لئے اختلاف ہوا اور یہ
ہے اور دنیا بقدر ضرورت ہونی
ہے اور دین بقدر ضرورت حاصل کرنا چاہئے یا اصل میں دین مطلوب
اصل مقصود ہے اور مجھے ان آیتوں سے بھی نتیجہ نکالنا ہے۔
چاہئے۔ یہ ہے وہ مسئلہ جو اس بیان سے

محبوب ترین چیزیں

اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب
تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں مال اور جاہ
ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں
ہیں چنانچہ کیمیا جو ہر ایک کو ایسی محبوب
ہے کہ اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا
کہ اس سے انکار کرے تو اس کی یہی وجہ
اکثر جاہ بدوں مال کے تلف
میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اس میں مال اور جاہ دونوں جمع ہوں۔
اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس
کیے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں
ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا
ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی
تو اب دنیا سے مراد ان دونوں کا مجموعہ
کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں اس میں مال و جاہ دونوں آ گئے۔
حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا
ہوگا پس حاصل یہ ہوا کہ مال و جاہ مطلوب ہیں یا نہیں
کے اول مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔
ہے پس منافقین یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمینوں کے۔
وللّٰہ خزائن السمٰوت والارض
مقولہ کے بعد فرماتے ہیں
اس سے تو احکام مال کے بتلانا مقصود ہیں اور دوسرے
یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور
وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین
جاہ کے بتلانا مقصود ہیں۔
مسلمانوں کی اس سے احکام
سو غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ
پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے

کہ مال فی نفسہ محمود ہے۔ دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کا فی نفسہ محمود ہونا تو اس لئے معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرما رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **وللّٰہ خزائن السموت والارض** یعنی آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہ کوئی بری اور معیوب چیز ہوتی تو جس طرح سے خصوص کے ساتھ اپنے کو **خالق الکلاب والخنازیر** نہیں فرمایا اسی طرح اپنے کو خصوص کے ساتھ مالک الخزائن (خزانوں کے مالک نہ فرماتے اور اس میں نقود وعروض (روپیہ و اسباب) سب داخل ہو گئے اور عال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس لئے معلوم ہوا کہ مال سے ان کو یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے اس کو بے موقع استعال کیا چنانچہ کہا کہ

لا تنفقوا علیٰ من عند رسول اللّٰہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوں ان پر کچھ مت خرچ کرو۔

سو اپنے تمول کو وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا موقوف کر دیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی تو یہ سوء (برا) استعمال ہوا مال کا پس حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو خزانے تو سارے ہمارے پاس ہیں پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی پس اس سے دوسری بات بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سوء استعمال ہو تو وہ مذموم ہے۔

اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا۔

وللّٰہ العزۃ و لرسولہ وللمؤمنین یعنی عزت اللہ ہی کی ہے اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی۔

تو یہاں بھی بتلا دیا کہ جاہ فی نفسہ مذموم نہیں مگر سوء استعمال کی وجہ سے مذموم ہو جاتا ہے پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جاہ فی نفسہ محمود ہے دوسرے یہ کہ جب سوء استعمال ہو تو مذموم ہے جاہ کا فی نفسہ محمود ہونا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے **وللّٰہ العزۃ** فرمایا تو اپنے لئے عزت ثابت فرمائی اگر جاہ کوئی بری چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے لئے ہے تو سمجھو کہ آگے **وللمؤمنین** (اور مسلمانوں کی) بھی تو ہے تو پس مسلمانوں کا ذی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے تو یہ شبہ نہ رہا کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہوا اور جاہ کا مذموم ہونا اس لئے معلوم ہوا کہ ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے اس کا بے موقع

استعمال کیا چنانچہ انہوں نے کہا کہ لیخرجن الاعزمنھا الاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ مدینہ سے ذلت والے کو نکال دیگا۔

تو ان کا یہ کہنا سوء استعمال ہوا جاہ کا کہ ذریعہ بنایا جاہ کو مسلمانوں کے ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو کیا چیز معزز تو خدا اور رسولؐ و مسلمان ہیں۔ پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی پس ان دونوں آیتوں سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

تو ان چاروں مسئلوں کو مان لینے سے اگر دونوں جانب انصاف ہو تو سب اختلاف رفع ہو جاوے کیونکہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال بری چیز نہیں ہے تو اب مال کا مطلقاً برا کہنا ٹھیک نہ ہو گا اسی طرح جاہ کو بھی اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے تو وہ لوگ باز آ دیں گے جو مال و جاہ کو علی الاطلاق محمود و مطلوب کہہ رہے ہیں۔ تو اتنے بڑے اختلاف کا فیصلہ ہو جاوے گا اور یہی مقصود ہے مجھے بیان کرنے سے اور یہ اجمال کے درجہ میں تو ثابت ہو گیا مگر میں تفصیل کے لئے کچھ اور بیان کروں گا اور گو مقصود معلوم ہو گیا مگر ابھی بہت مبہم ہے۔ اسلئے اس کا عنوان بھی واضح اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ پس دوسرے عنوان سے عرض کرتا ہوں۔

حقیقت حب

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حب مال اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حب مال کی ہے جس سے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حب مال اور حب جاہ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دینا) کے طور پر فرماتے ہیں۔

ان الذین امنوا و عملوا الصلحت سیجعل لھم الرحمن وداً

کہ ہم مومنین اہل عمل صالح کے لئے محبوبیت پیدا کر دینگے۔

اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ

سے ہماری تعظیم کریں حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمول ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعضے لوگ اپنی نظر میں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سور) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔

ایک مرتبہ دہلی میں میں بیان کر رہا تھا رات کا وقت تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے تو کیا یہ اس کی عزت تھی ہرگز نہیں! تو یہ جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں ہے۔ جاہ تو یہ ہے کہ

صاحب وہ پادشاہ جسمہاست صاحب دل شاہ دلہائے شماست

یعنی گاؤں کا مالک جسموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا بادشاہ ہے۔

تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

سیجعل لھم الرحمٰن ودًا اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کردیں گے۔

پس معلوم ہوا کہ جاہ بری چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ بطور امتنان (نعمت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرمانا جتلا رہے ہیں۔ اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

نعم المال الصالح للرجل الصالح[1] (نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے)

پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حب مال اور حب جاہ ہیں جس کی نسبت حضور فرماتے ہیں۔

ماذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسدلھا من حب المال والشرف لدین المرء[2]

یعنی حب مال اور حب شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیئے بھوکے بھی بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کرسکتے۔

پس حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حب کا لفظ تصریحاً فرما دیا ہے تو حب بری چیز ہے

---

[1] مسند الامام احمد ۴: ۱۹۷، الأدب المفرد للبخاری: ۲۹۹، اتحاف السادة المتقین ۸: ۱۳۹، ۹: ۸۷

[2] سنن الترمذی: ۲۳۷۶، سنن الدارمی ۲: ۳۰۴، ۱۵۰۰، المسند للامام احمد ۳: ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۶۰

اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حب کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرائن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ حب مال ہوتا ہے تو حب مال بھی ہوتی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حب کے درجہ میں ہو۔

جیسے کوئی شخص پوچھے کہ رہن رکھنا کیسا ہے تو چونکہ عادت رہن سے انتفاع کی ہے لہٰذا یہ بھی گنجائش ہے کہ ہم جواب میں اس کو حرام کہہ دیں تو بعض اوقات قرائن پر اعتماد کرنے کی وجہ سے قیود کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی حدیث سے تائید لیجئے حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

لیس من البر الصیام فی السفر[1] یعنی سفر میں ایسی حالت میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

یہ آپؐ نے اس وقت فرمایا تھا جب کہ ایک شخص نے نہایت سختی کی حالت میں سفر کے اندر روزہ رکھا تھا اور گرمی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ سفر میں روزہ ہی رکھنا نہ چاہئے۔ ہرگز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا نہیں پس مراد خاص حالت ہے مگر ایسی حالت کی قید تصریحاً نہیں فرمائی کیونکہ قرینہ تخصیص موجود ہے تو اسی طرح اگر کوئی مال کی مذمت کرے تو مطلب یہی ہوگا کہ حب کے درجہ میں مذموم ہے۔

حقیقت حیات دنیا

اسی طرح قرآن شریف سے اس کی تائید لیجئے **وما الحیوۃ الدنیا الالعب و لھو** (یعنی دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں بجز کھیل کود کے) اس آیت میں حیات دنیا کی مذمت فرمائی ہے اور دوسری جگہ اس کی مدح بھی کی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اولم نعمر کم ما یتذکر فیه یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ سمجھ سکتا اس میں وہ شخص جس کو سمجھنا ہوتا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حیات دنیا جب برے کاموں میں صرف کی جاوے تو وہ لہو ولعب ہے ورنہ اچھی چیز ہے بلکہ حیات تو وہ چیز ہے کہ اس کی فضیلت کے متعلق خود حضورؐ کا فتویٰ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص ساتھ ایمان لائے ان میں سے ایک تو جہاد میں شہید ہو گیا

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصیام ب:۴۳، سنن النسائی ۴: ۱۷۶، ۱۷۷، سنن ابن ماجه ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، سنن الترمذی: ۷۱۰، مسند الامام احمد ۳: ۳۱۹، ۵: ۴۳۴

دوسرے کا اس سے ایک ہفتہ بعد انتقال ہوا۔ صحابہ نے اس کے لئے دعا کی کہ اے اللہ! اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ لاحق کر دیجئے یعنی گو یہ اس کے درجہ کا نہیں مگر اس کے درجہ میں پہنچا دیجئے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنا تو فرمایا کہ اس کے اس ہفتہ کے عمل کہاں گئے۔ واللہ اس کے اور اس کے درجہ میں اتنا فرق ہے جیسے زمین اور آسمان میں۔

تو دیکھئے کہ حیات دنیا ایسی چیز ہے کہ صرف ایک ہفتہ کی زیادہ زندگی سے اس نے اتنی فضیلت حاصل کر لی مگر باوجود اس کے پھر بھی اس زندگی کو لہو ولعب فرمایا تو یہ اسی حالت کے اعتبار سے جب کہ اس کو برے کاموں میں صرف کیا جائے تو دیکھئے حیات کی مذمت ایک خاص حالت کے اعتبار سے ہے حالانکہ وہاں اس قید کی تصریح نہیں ہے پس قرآن سے بھی اس کی تائید ہوگئی کہ بعض اوقات لفظوں میں ایک قید نہیں ہوتی اور ارادہ میں ہوتی ہے۔

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت چونکہ لوگ بہت بے خبر ہو گئے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ مذمت کرتے وقت حب کا لفظ بڑھا دیا کریں اور یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حضور نے

حب الدنیا راس کل خطیئۃ[1] یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

کیوں فرمایا اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ جہاں مطلق دنیا کو فرمایا ہے وہاں بھی یہی مراد ہے ورنہ ارشاد ہے۔

کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ[2] (حلال کمائی فرض ہے بعد فرائض کے)

ہاں یہ قید ہے کہ وہ فرض ہے بعد فرض کے دیکھئے۔ کسب الدنیا کو اس جگہ فرض فرما رہے ہیں پس اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ دنیا کو جو ملعون کہا جاتا ہے اس سے مراد حب دنیا ہے۔

مقام بزرگاں

اب لوگ چونکہ اس کا مطلب نہیں سمجھتے اس لئے کہتے ہیں کہ لو دنیا ہی کو ملعون کہتے ہیں۔ آپ ان سے خفا ہوتے ہیں لیکن خود دنیا ان سے خفا نہیں ہوتی کیوں کہ دنیا خود ان کے پاس آتی ہے تو خفگی میں کیسے آتی اور وہ دنیا طلب کرنے کے لئے کسی کے پاس نہیں جاتے کیا آپ نے کسی بزرگ کو بھی کسی بادشاہ کے دروازے پر دیکھا ہے کہ مانگنے گئے ہوں۔

اگر کہئے کہ گئے ہیں تو وہ ایسے ہی بزرگ ہوں گے جیسے کہ میری تفسیر لکھنے کے زمانہ میں ایک

---

[1] کنز العمال: ۶۱۱۴، مشکوۃ المصابیح: ۵۲۱۳، الدر المنثور ۶: ۳۲۱

[2] حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۷: ۱۶۲

شاہ صاحب بھیک مانگنے آئے تھے۔ بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ کہ ایک جبہ پہنے ہوئے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی اور گلے میں بھی دروازہ پر کھڑے ہو کر آپ نے سوال کیا مکان سے کوئی چیز بھیج دی گئی آپ نے اس کو واپس کر دیا کہ میں کوئی معمولی فقیر نہیں ہوں یہ لوں گا وہ لوں گا۔ غرضیکہ وہ جھگڑا کرنے لگے حتیٰ کہ ان کی آواز مجھ تک پہنچی میں کوٹھے پر بیٹھا ہوا تفسیر لکھ رہا تھا طبیعت پریشان ہونے لگی آخر میں ادھر سے اتر آیا اور میں نے کہا کہ شاہ صاحب! آپ جھگڑا کیوں کرتے ہیں جو توفیق ہوئی وہ پیش کر دیا آپ دھمکا کر کہنے لگے۔

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست   شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

ہر جنگل میں یہ گمان نہ کرو کہ خالی ہے ممکن ہے چیتا سویا ہوا ہو یعنی ہر شخص کی نسبت یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ یوں حقیر و معمولی شخص ہے۔

میں نے کہا حضرت میں بھی یہی شعر پڑھتا ہوں کہ

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست

آپ کو بھی میرے نسبت یہی گمان کرنا چاہئے اس پر وہ بہت جھلائے اور چلے گئے اور پڑوس سے ایک رزائی یا ایک دری لے گئے۔

تو ان گویا ایسے لوگوں کو اگر کوئی بزرگ سمجھے تو اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ بزرگ تو یہ ہیں کہ حضرت غوث پاک صاحبؒ کے پاس ملک سنجر نے لکھا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک جزو آپ کے لئے مقرر کرنا چاہتا ہوں آپ نے اس کو نامنظور کیا اور لکھ دیا۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد   در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم

چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو۔

زانکہ یافتم خبر از ملک نیم شب   من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

مجھے جب سے ملک نیم شب کی سلطنت حاصل ہے۔ نیمروز کی سلطنت میرے نظر میں ایک جو کے برابر بھی نہیں۔

نیم شب اور نیم روز کا کیا اچھا مقابلہ ہے پس بزرگ تو دنیا داروں کے دروازے پر کبھی نہ آئے ہوں گے اور دنیا دار اپنی دنیاوی حاجتیں لے کر پچاس دفعہ ان کے دروزازے پر گئے ہوں گے۔ اب بتلایئے کہ ترک دنیا کیسی چیز ہے کہ تارکین دنیا تو طالبین دنیا کے در پر نہیں جاتے اور

طالبین دنیا کو ان کے در پر جانا پڑتا ہے پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزبان حال دنیادار خود اقرار کر رہے ہیں کہ ترک دنیا اچھی چیز ہے اور

اتته الدنیا وھی راغمة ان کے پاس دنیا خاک ملتی اور ناک رگڑتی آتی ہے کے یہی معنی ہیں کہ دنیادار ان کے پاس آتے ہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ جو شخص دنیا کا طالب ہو اور اس کو حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ تارک دنیا ہو جائے خیر یہ تو اس پر یاد آ گیا تھا کہ لوگ دنیا کو ملعون کہنے سے برا مانتے ہیں۔

احبیت اور محبوبیت کا فرق

اصل مقصود یہ بیان کرنا تھا کہ دنیا کی مذمت نہیں ہے بلکہ حب دنیا کی مذمت ہے دیکھئے اس میں بھی شریعت کا کتنا بڑا احسان ہے کہ حب دنیا کی قید لگا دی اور اسی کی ممانعت کی اور مطلق دنیا کی ممانعت نہیں کی اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہوگی کہ اول تو یہیں سے آنسو پونچھ دیئے پھر اور بھی وسعت کی کہ حب میں بھی تفصیل کر دی یعنی حب کے دو درجے قرار دیئے اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے۔

> **قل ان کان آباؤ کم و ابناؤکم واخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم**
> **و اموال اقترفتموھا و تجارة تخشون کسادھا و مسٰکن ترضونھا**
> **احب الیکم من اللّٰہ و رسولہ وجھاد فی سبیلہ**

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اور ان کے احکام سے زیادہ محبوب ہوں تو عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب ہونے پر نہیں فرمائی پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے اس حب دنیا کی بھی تفسیر کر دی جس کی حدیث۔

حب الدنیا راس کل خطیئة یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

وغیرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اس سے مراد احبیت (زیادہ محبوب ہونا) کا درجہ ہے۔ اس آیت میں تو یہ بات مصرح ہے کہ نفس حب مذموم نہیں اور ایک دوسری آیت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط کیا ہے وہ یہ ہے۔

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة
من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذلک
متاع الحیوة الدنیا والله عندهٗ حسن المأب

یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی یہ دنیاوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں۔ اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب سامان کسریٰ کا آیا تو کروڑوں روپے کا سامان تھا۔ آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے۔ یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور یہ سب حیات دنیا کا سامان ہے۔ سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا بس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ! اس پر تو ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ کی محبت کی معین ہو جاوے مزاحم نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا ہے کہ احبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ نفس محبوبیت اور احبیت کی تفسیر بھی کر دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا اس کا کمانا بھی اچھا اس کی محبت بھی اچھی اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی احبیت بری ہے یعنی دنیا کو خدا اور رسولؐ سے زیادہ محبوب نہ سمجھو۔

محبت کی علامت

اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو اگر کسی صورت میں دنیا کے حاصل کرنے سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس صورت کو چھوڑ دو چاہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا اور رسول کی محبت کی حقیقت کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سن کر رونے لگے

صرف رونے سے کیا ہوتا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

یعنی اگر رونے سے وصال محبوب ہو جایا کرے تو سو برس اس کی آرزو میں رو سکتے ہیں۔ سو یہ محبت نہیں ہے کہ مضمون سن کر تو رو دیتے ہیں لیکن نہ اتباع ہے نہ عمل ہے۔ ہاں یہ بھی محبت کا ایک درجہ ہے مگر یہ درجہ مطلوب نہیں۔

تعصى الرسول وانت تظهر   حبه هذا العمرى فى الفعال بديع
لوكان حبك صادقالا طعته   ان المحب لمن يحب يطيع

یعنی تم رسولؐ کی محبت تو ظاہر کرتے ہو اور پھر ان کی مخالفت بھی کرتے ہو یہ عجیب بات ہے ایسا کب ہو سکتا ہے اگر تم کو واقعی محبت ہوتی تو تم ضرور ان کی اطاعت کرتے کیونکہ جو محبؔ ہوتا ہے وہ محبوب کی اطاعت ہی کیا کرتا ہے۔

سو محبت مامور بہا (جس کا حکم کیا گیا ہو) یہ ہے اور جس کو آپ محبت سمجھ رہے ہیں وہ تو فطری محبت ہے ایسی محبت تو خدا اور رسول کے ساتھ ہر شخص کو ہے۔ حتیٰ کہ کفار کو بھی اور یہ خدا کے ساتھ ہونا تو ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کو پہچانے گا اس کو خدا تعالیٰ کے ساتھ فطری محبت ہوگی باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا سو وہ اس لئے کہ جو لوگ دشمن ہیں وہ آپ کے اخلاق وغیرہ سے واقف نہیں ان کو حضورؐ کی سوانح عمری صحیح طور پر نہیں پہنچی تو حضورؐ کو بھی جو پہچانے گا اس کو آپ کے ساتھ محبت ضرور ہوگی کیونکہ جو محبت کا منشاء ہے یعنی اخلاق حسنہ وہ حضورؐ میں اکمل اور اتم درجہ میں موجود ہیں اس لئے خواہ مخواہ ایک قسم کی محبت ہو جائے گی۔ مثلاً رستم سے ہم کو کیا تعلق ہے کچھ بھی نہیں مگر بچپن میں جو ہم شاہنامہ پڑھا کرتے تھے اس میں اس کی شجاعت و بہادری کا ذکر دیکھ کر دل میں بے اختیار محبت پیدا ہوگئی۔

سو کافر بھی اگر منصف ہو تو ضرور حضورؐ سے محبت کرے گا۔ پس اگر مسلمان نے بھی ایسی ہی محبت کی جیسی کافر بھی کرتے ہیں تو کیا کمال کیا مسلمان کی تو یہ حالت ہونی چاہئے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی فدائے تو

یعنی اگر زندہ رکھیں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہوں۔

پس محبت ایسی ہونی چاہئے لیکن آج کل یہ بات کہاں ہے جب ہم اقوال و افعال میں حضورؐ کی مخالفت کرتے ہیں تو پھر ہم کو محبت کہاں ہوئی صاحبو! اگر کسی کسی پر عاشق ہو جاویں تو پھر دیکھئے کہ کیا حال

ہوتا ہے جو کچھ وہ کہے کرنے کے لئے تیار نہ مال کا خیال نہ عزت کی پرواہ تو کسی کے عشق میں تو یہ حال ہے۔

ترا عشق ہمچوں خودی ز آب و گل   رباید ہمی صبر و آرام دل

یعنی تمہارا عشق اپنے جیسے پانی اور مٹی سے بنے ہوئے کیساتھ دل سے آرام و صبر کو دور کر دیتا ہے۔

اس پر ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ اپنے ہاتھ سے پیٹ بھی لے تو گوارا ہے اور کچھ رنج نہیں ہوتا کیونکہ

نہ سازد عشق را کنجِ سلامت   خوشا رسوائی کوئے ملامت

عشق گوشہ سلامتی کی موافقت نہیں کرتا بلکہ کوئے ملامت کو چاہتا ہے سو محبوب کے کوچہ کی رسوائی بہت اچھی چیز ہے۔

سو یہاں تو یہ حال ہے اور خدا اور رسولؐ کی محبت میں یہ حالت ہے کہ زبان سے تو محبت کا دعویٰ ہے مگر اتباع نبویؐ میں ہزاروں خدشے کہ اگر ایسا کریں گے تو یوں طعن ہوگا سو یہ کیسی محبت ہے۔

اگر واقعی محبت ہوتی تو مخالفت ترک کرنے کے لئے اتنی ہی بات کافی تھی کہ بعض روایات میں آیا کہ ہر ہفتہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو بار امت کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت دعوت سے بھی بہت تعلق تھا تو بھلا امت اجابت سے تو کتنا ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جتنا تعلق ہوتا ہے ویسا ہی اس کی تباہی سے صدمہ ہوتا ہے اور دل دکھتا ہے تو اگر ہم کو حضورؐ کے ساتھ واقعی محبت ہوتی تو ہم محض اس خیال سے کہ جب حضورؐ کے سامنے ہماری نافرمانیاں پیش ہوں گی تو حضورؐ کا دل دکھے گا اپنی ان حرکات سے باز آ جاتے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی محبت مامور بہا یہ ہے کہ عمل اور اطاعت کی محبت ہو پس جب یہ بات معلوم ہو گئی۔

احبیت کی علامت

تو اب یہ سمجھنا چاہئے کہ احبیت جو کہ مطلوب ہے اس کی علامت کیا ہے تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ دو حالتیں ہیں ایک تو وہ کہ جہاں دونوں کا اجماع ہو سکتا ہے یعنی دین و دنیا دونوں حاصل ہو سکتے ہیں تو اس حالت میں تو معلوم نہیں ہوگا کہ ان میں زیادہ محبوب اس کے نزدیک کون سی شے ہے اور دوسری حالت یہ ہے کہ دین و دنیا میں تعارض ہو اور دونوں کا اجتماع نہ ہو سکتا ہو تو اس حالت میں معلوم ہو جاوے گا کہ یہ کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔

دیکھئے اگر آپ کو دو دوستوں سے محبت ہو اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان دونوں میں کس کی محبت زیادہ ہے تو یہ اس وقت معلوم ہوگی جب کہ ان دونوں میں لڑائی ہو جاوے۔ جس سے زیادہ محبت ہوگی آپ اسی کے ساتھ ہو جاویں گے۔

اسی طرح دین و دنیا میں جب تعارض ہوا کہ اگر دین کی رعایت کرتے ہیں تو دنیاوی مقصد حاصل نہیں ہوتا اور اگر دنیا کی طرف جاتے ہی تو دین کے خلاف ہوتا ہے تو اس صورت میں اب جس کا اتباع کروگے اسی کا احب ہونا متعین ہو جاوے گا۔ پس اگر اس صورت میں دین کو ترجیح دی تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دین زیادہ محبوب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دی تو ظاہر ہو جاوے گا کہ اس کو دنیا زیادہ محبوب ہے۔ جس کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص پر یہی واجب ہے کہ ایسی صورت میں دین ہی کو ترجیح دے۔

لیکن اب ایک جماعت اس کے خلاف فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ دنیا کو لو اور دین کو چھوڑ دو۔ مسلمان کے قلم سے یہ فیصلہ نہایت ظلم کا فیصلہ ہے اس پر شاید کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ نہیں یہ تو کون کہہ سکتا ہے کہ دنیا کے مقابلے میں دین کو چھوڑ دینا چاہیے مگر بعض مرتبہ مجبوراً چھوڑنا پڑتا ہے مثلاً ایک نوکری ہے سو روپے کی اور ایک ہے پانچ سو روپے کی مگر سو والی حلال ہے اور پانچ سو والی حرام تو اب یہاں بوجہ اس کے کہ سو روپے میں اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں مجبوراً دین کو چھوڑنا پڑتا ہے تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ دنیا دین سے زیادہ محبوب ہے بلکہ ضرورتوں سے مجبور ہو کر چھوڑتے ہیں گو چھوڑتے ہوئے دل بہت دکھتا ہے تو علماء سے جو اس کے متعلق کہتے ہیں سو وہ ایک فریاد ہے فیصلہ نہیں ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ فریاد عام نہیں بلکہ زیادہ تو وہ جماعت ہے کہ دین کے چھوڑ دینے سے ان کا دل نہیں دکھتا اور نہ حسرت ہوتی ہے نہ ندامت نہ اپنے کو خطاوار سمجھتے ہیں بلکہ نہایت کوشش اور شوق سے یہ رائے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج ہی کیا ہے اور یوں کہتے ہیں کہ اب معاملات کو وسعت ہوگئی ہے لہذا اب احکام کو بھی بدل دینا چاہیے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ اب اخباروں میں بھی اس قسم کے مضمون شائع ہونے لگے چنانچہ مصر سے ایک اخبار آتا ہے اس میں بھی ایک سرخی تھی۔

رعایۃ الاصلح فی الشرع شرح میں اصلح کی رعایت

اور اس سرخی کے ذیل میں ایک مضمون اسی قسم کا لکھا ہوا تھا اور اس کی عبارت عربی تھی تاکہ لوگ یہ

خیال کریں کہ جب یہ عربی میں ہے تو ضرور صحیح ہوگا مگر کیا عربی عبارت میں جو مضمون ہو وہ صحیح ہوتا ہے۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک ہمارے دوست تھے قاری مغیث الدین انہوں نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ جب منیۃ المصلّی پڑھتے تھے اس وقت انہوں نے یہ مسئلہ پڑھا کہ کلام ناس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے پس آپ نے کیا کیا کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز ہو رہی تھی امام کو سہو ہوا کہ پہلے قعدہ کو اخیر قعدہ سمجھ کر بہت دیر تک جلوس کیا آپ نے سوچ کہ اردو میں بتلانے سے تو نماز فاسد ہو جائے گی لاؤ عربی میں کہہ دو پس آپ نے کہا قم (کھڑے ہو جاؤ) خیر ان کے کہنے سے امام کو بھی یاد آ گیا کہ یہ پہلا قعدہ ہے اس لئے وہ کھڑا ہو گیا اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ یہ قم والے کون تھے آپ بولے میں تھا انہوں نے کہا تم نے نماز میں کلام کیا آپ فرماتے کیا ہیں کہ میں نے تو عربی میں کہا تھا یہ کوئی کلام ناس تھوڑا ہی ہے جس سے نماز فاسد ہو جاوے تب ان کو کلام ناس کا مطلب سمجھایا گیا۔

سو بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جو عربی میں ہو وہ سب ٹھیک ہے اجی عربی زبان میں تو گالیاں بھی ہیں تو گالیاں بھی ٹھیک ہیں تو مضمون چاہے عربی میں ہو چاہے انگریزی میں اس میں سب یکساں ہیں کہ جو حق ہے حق ہے اور جو باطل ہے باطل ہے پس اس قسم کے پچے نکلنے لگے ہیں۔

میں نے ایک زمانہ میں اخبار کے متعلق کچھ لکھا تھا کہ اخبار ہرگز نہ دیکھنا چاہئے اس پر اعتراض ہونے لگے کہ لو صاحب اخبار کو بھی منع کرتے ہیں اور واقع میں میں اخبار کو منع نہیں کرتا بلکہ ان انشاءات کو جو ایڈیٹر صاحب کی مثلاً خاص الخاص تحقیقات ہوتی ہیں جو اکثر مذہب کے خلاف ہوتی ہیں چنانچہ میں نے ایک اخبار میں دیکھا کہ یہ رائے دی تھی کہ مذاہب کے اختلاف کو تو بالکل اٹھا دینا چاہیے اس طرح کہ ایک مذہب بیچ بیچ میں تجویز کیا جائے جس میں ہر مذہب کی رعایت ہو اور اس کو تجویز بھی کر دیا کہ شاید اگلی نسلیں مان لیں اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ صرف توحید لیں اور رسالت کو جزو مذہب نہ بنائیں اور دوسرے مذہب والوں کو چاہیے کہ کم از کم توحید کو ضرور مان لیں اور لکھا تھا کہ اگر یہ مذہب عام ہو جائے تو یہ روز روز کی لڑائی مار کٹائی نہ ہو سو ایسے لوگ بھی ہیں میں تو ان کی نسبت کہا کرتا ہوں

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند
ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

یعنی اگر بلی حاکم، کتا وزیر اور چوہا دیوان کر دیا جائے تو یہ ارکان دولت ملک کو ویران کر دیں گے یعنی نااہل کو اگر دین کے کام سونپے جاویں تو وہ دین کو برباد کر دیں گے۔

پس میں جو اخبار دیکھنے کو منع کرتا ہوں تو ایسے اخباروں کو اور ان کو دیکھنا واقعی مذموم ہے اگر

اخبار دیکھنے کا شوق ہو تو ان کے علمی مضامین جن میں ایڈیٹر صاحبان کی تحقیقات اور مذاہب کے متعلق رائیں ہوتی ہیں چھوڑ دیا کرو خیر اس کا ذکر تو استطراداً ہو گیا۔

اصل مقصود میرا یہ تھا کہ زیادہ لوگ اسی قسم کے ہیں کہ وہ شوق سے ایسا کرتے ہیں ان کا دل نہیں دکھتا پس ان کے دل میں تو دنیا کی احبیت ظاہر ہے پس اس کا یہ کہنا تو فریاد ہو بھی نہیں سکتا مگر کچھ لوگ پرانی وضع کے بھی ہیں وہ البتہ اس کو ناجائز ہی سمجھتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں کہ اگر اس صورت میں دنیا کو چھوڑیں تو گاڑی اٹکتی ہے لیکن ان میں دو قسم کے لوگ ہیں کچھ تو ایسے ہیں کہ جتنے اخراجات درحقیقت ضروری ہیں ان کے موافق تو آمدنی ہے مگر فضول اخراجات بڑھا رکھے ہیں اور ان کی ضرورت گھڑ لی گئی ہے اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ گھر میں جا کر دیکھو کہ کتنی چیزیں جمع ہیں اور ان میں کس قدر چیزیں کام کی آتی ہیں عاقل شخص کو عرف کا پابند نہ ہونا چاہئے کہ آج کل مونڈھے کرسیاں وغیرہ بھی ضروری ہو گئی ہیں پس جب آپ اس نظر سے چیزوں کو دیکھیں گے تو آدھی سے زیادہ چیزیں آپ کے گھر میں ایسی نکلیں گی کہ ان کے ہونے کی خبر بھی آپ کو نہ ہو گی تو اب آپ ہی بتلایئے کہ کیا یہ چیزیں بھی ضروری ہیں ضروری تو وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کے نہ ہونے سے تکلیف ہو اور ان کا معیار آسانی کے لئے بتلاتا ہوں کہ جتنی چیزیں سفر میں انسان ساتھ لیتا ہے بس وہ ہیں ضروری سفر میں کیا کوئی ضروری چیز کم ہو جاتی ہے نہیں بلکہ بعض چیزیں اس میں بھی ضرورت سے زائد اور فضول ہو جاتی ہیں پس یہ ہے ضروری سامان سو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے گھر میں اتنا سامان نکلے گا جو اس مقدار سے بہت زیادہ ہو گا اسی کو صائب کہتا ہے۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

یعنی حرص کی وجہ سے قناعت نہیں ہے ورنہ اسباب معاش جو ہمارے پاس موجود ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں ہے۔

پس ضروری اخراجات تو معلوم ہو گئے اب ان سے زائد جو کچھ ہو وہ بیکار ہے سو جن کو اتنا ملتا ہے وہ تو یہ سوال کر ہی نہیں سکتے۔ اب وہ رہ گئے جن کو اتنا بھی نہیں ملتا۔ ان کی فریاد البتہ سنی جاوے گی اور کہا جاوے گا کہ میں آپ سے فی الحال اس نوکری کے چھوڑنے کو نہیں کہتا مگر اتنا تو کیجئے کہ اپنے کو گنہگار سمجھئے اور استغفار کیجئے اور یہ دعا کیجئے کہ اللہ مجھے اس سے نجات دیجئے اور حلال نوکری کی تلاش میں رہئے اگر آپ حلال نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پھر بھی اس میں مبتلا رہیں گے تو بھی کم سے کم اتنا تو فائدہ ہے کہ آپ دنیا کو ترجیح دینے والے تو نہ ہوں گے اور آپ کے اندر دنیا کی

احبیت تو نہ ہوگی اب اس کے بعد ترجیح کا کیا عذر رہا اب تو سارے عذر ختم ہو گئے اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ دنیا کو ترجیح دینا کسی وقت بھی جائز نہیں۔

رعونت کی علامت

ایسے لوگ جن کو اتنا ضروری سامان بھی نہیں ملتا ہو واقع میں بہت ہی کم ہیں ورنہ زیادہ تو ایسے ہی لوگ ہیں کہ ان کو ضرورت نہیں۔

میں نے ایک منصرم کو دیکھا ہے جن کی پچاس روپیہ تنخواہ لیکن کچہری ہمیشہ پیادہ جاتے اور لوگ فٹن میں جاتے تھے اور مدرسوں میں چندے اور رشتہ داروں کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں اور جب ان کی پنشن ہوئی تو اخراجات بھی آدھے کر دیئے اور جتنا مدرسوں اور رشتہ داروں کو دیتے تھے اس کو بھی آدھا کر دیا۔ آخر یہ بھی تو اپنی ضروریات تھوڑے میں انجام دیتے ہی تھے باقی رہا فٹن وغیرہ پر سوار ہونا تو یہ کون سے ضروریات سے ہے۔

میں تو فٹن کو فتن (فتنوں) میں داخل سمجھتا ہوں اور اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں ان میں کوٹ کوٹ کر کبر اور رعونت بھری ہے۔ وضع بھی ایسی سواری بھی ایسی غرض ہر سامان میں سے رعونت ٹپکتی ہے اور جو شخص چاہے اس کا احساس کر سکتا ہے جو لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں ان کی حالت دیکھ لیجئے کہ ان کے اندر کیسی رعونت آجاتی ہے۔

اس رعونت پر ایک قصہ یاد آ گیا ایک شخص ولایت سے پڑھ کر آئے تھے وہ جب اپنے ابا جان سے ملے تو کہتے ہیں ویل بڈھا تم اچھا ہے پھر ایک تیسری بات اور بھی ہے کہ یہ فعل ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ نئے فیشن کی جتنی چیزیں ہیں اکثر اس قسم کی ہیں کہ ان سے خود ہی منتفع ہو سکتا ہے دوسرے کو اس کا نفع نہیں ہوتا چارپائی اور کرسی ہی کا فرق دیکھ لیجئے کہ چارپائی تو ایسی چیز ہے کہ اس پر اگر ایک جماعت بیٹھی ہو اور ایک آدمی اور آجائے اس میں اس کی بھی گنجائش نکل آئے گی اور ایک کرسی ہے کہ اس میں اپنے ساتھ ایک کو بھی نہیں بٹھا سکتے۔ اسی طرح عمامہ کہ اگر ہم چاہیں تو پھاڑ کر ایک حصہ اس میں سے اپنے بھائی کو دے دیں مگر آپ گلوبند میں سے تو پھاڑ کر دے دیجئے غرض نئے فیشن کی اکثر چیزیں وہ ہیں کہ ان میں سراسر خود غرضی ہے تو خلاف ہمدردی ہی سمجھ کر چھوڑ دیجئے یا اگر بالکل نہ چھوڑیں تو کم ہی کر دیجئے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم برا ہی سمجھ لیجئے۔

غرض کہ ان چیزوں میں بہت سے مفاسد ہیں اور سب سے بڑا مفسدہ یہ ہے کہ اخراجات بڑھتے ہیں پس یہ تو ان کا بیان تھا کہ دنیا و دین میں تعارض ہونے کے وقت کیا برتاؤ کرنا چاہئے اور اسی

طرح جاہ میں بھی معمول رکھنا چاہئے کہ جو صورتیں جاہ کی خلاف شریعت ہیں ان سے بچنا چاہئے۔

ضرورت کی چیزیں

بس اب شکایت یہ ہے کہ بچنا تو درکنار اس کو برا بھی نہیں سمجھتے تو اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوگی ایک تو علم کی کیونکہ جب تک ان کی برائی کا علم نہ ہوگا تو اس وقت ان کو برا کیسے سمجھے گا پس علم دین سیکھنا چاہئے خواہ اردو میں ہی ہو اور ایک عمل اور ہمت کی اس پر تو عقلاً موقوف ہے اور ایک تیسری چیز کی ضرورت ہوگی اور وہ ضرورت عادی ہے گو عقلاً وہ موقوف علیہ نہیں ہے اور وہ اہل اللہ کی صحبت ہے کیونکہ جس ہمت کی ضرورت مذکور ہوئی ہے وہ ہمت اہل اللہ کی صحبت ہی سے پیدا ہوتی ہے تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ اہل اللہ کی صحبت میں جاوے پس علم دین بھی حاصل کیجئے اور اہل اللہ کی صحبت بھی اختیار کیجئے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سب ابو حنیفہ اور جنید بغدادی ہو جاویں مگر ضروری علم دین تو حاصل کریں اور جب موقع ملتا جاوے اہل اللہ کی صحبت میں رہا کریں اس سے جذبات روحانیہ میں ایک قسم کی قوت پیدا ہوگی اس سے آپ اپنی پرانی حالت پر آنسو بہائیں گے اور اس کے جاتے رہنے سے آپ کو تاسف ہوگا اور اصلاح کی فکر ہوگی اور یہ بھی اللہ و رسول کی احبیت ہے۔

غرض جاہ ہو یا مال ہو ان کی احبیت نہ ہونی چاہئے اسی پر وعید فرماتے ہیں فتربصوا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ کوئی وبال نازل ہو اور اس کا وبال دنیا میں تو یہ نازل ہوا کہ دنیا ہی سب سے اول برباد ہو رہی ہے چنانچہ دنیا کو جس قدر طلب کرتے ہیں مگر وہی دنیا ہم سے چلی جا رہی ہے اور ہم تو کیا ہماری سلطنتوں کی بھی یہی حالت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے برباد ہو رہی ہے اور وہ د بھی اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہ تباہی دین چھوڑنے کی بدولت ہے اور کیوں نہ ہو دین چیز ہی ایسی کہ اس سے آخرت بھی درست ہوتی ہے اور دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے۔

دیکھئے شیخ سنوسی ایک افریقی بدو تھے جو دین کی حمایت کے لئے آئے تھے۔ اب اس کی صاحب سلطنت ہوگئے اور ایک وہ اسلامی قاہر سلطنت ہے کہ دین کے چھوڑنے کی وجہ سے جا رہی ہے اور دین کا چھوڑنا اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ میں نے سنا ہے کہ اس کی میں ایک مرتبہ یہ گفتگو ہوئی کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہر فرقہ سے ہونے چاہئیں تاکہ رعایا میں ہے پس جب کہ پارلیمنٹ کے اجزاء غیر مذہب کے لوگوں کو بتایا کہ جن پر خیر خواہی کا نہیں محض مساوات کے دعوی میں تو پھر ایسی سلطنت کو کیا عروج ہو سکتا ہے بے شک

شریعت مساوات سکھلاتی ہے مگر مطلق مساوات نہیں بلکہ اس کی ایک حد مقرر ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کا میر منشی ایک نصرانی تھا جب وہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی۔ **لاتتخذوا بطانة من دونکم لایالونکم خبالا** یعنی غیر مذہب کے شخص کو اپنا ہمراز مت بناؤ۔ وہ تم کو ضرر پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ حساب خوب جانتا ہے اس لئے ایسا کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا کام اس پر منحصر ہے اگر وہ مر جائے تو پھر کیا کرو گے آخر یمن میں جا کر دیکھا کہ وہ مر گیا تھا کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی ویسی زبان تھوڑا ہی تھی وہ زبان تھی جس کی شان میں ہے۔ **الحق ینطق علی لسان عمر**[۱] (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر حق بات جاری ہوتی تھی)

غرض کہ غیر مسلم کو ہمراز بنانے کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمائی ہے اور خود عقل بھی تو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ دیکھئے کہ روزمرہ کے معاملات میں کیا ہم پسند کرتے ہیں کہ اپنے راز پر غیر کو مطلع کریں ہرگز نہیں۔ بعض اوقات اپنے اسرار سے بیوی کو بھی مطلع نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دین کو چھوڑا اور اس کی ایسی برکت ہوئی کہ مدتوں بھی اس کا خمیازہ نہ بھولیں گے واللہ لوگ سمجھتے تو یہ ہیں کہ دین کو چھوڑ کر ترقی ہوگی مگر خدا تعالیٰ دکھلا دیتے ہیں کہ وہ بھی حاصل نہ ہوا جس کے لئے انہوں نے دین کو چھوڑا۔ سو اس قاہر سلطنت کی تو دین کے چھوڑنے سے ایسی تباہی ہوئی اور ان بدوی کو دیکھئے جو دین کی حمایت کو آئے تھے کہ وہ صاحب سلطنت ہو گئے اور یہ زندہ نظیریں ہیں اس امر کی کہ طالب دین ہر طرح کی ترقی کر سکتا ہے اور

الحمد للہ کہ اب اس کو عقلاء مان بھی گئے ہیں لہذا تطویل کی ضرورت نہیں۔

پس احبیت دین کی اعتقاداً تو ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اگر ممکن ہو تو عقلاً بھی ور

تاسفا ہی سہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑیئے اور اگر مجبوری کے سبب نہ چھوڑ سکیں تو برا تو

ہے فیصلہ اس کا اب میں اصل مقصود تو عرض کر چکا ہوں صرف آیت کے بعض اجزاء کا حل

ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں۔

تفسیری نکات

کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے اس قول کے جواب کے ختم میں **لاتنفقوا**

---

[۱] کنز العمال: ۳۲۷۱۵، فتح الباری لابن حجر: ۷: ۱۱۴، بلفظ "الحق بعدی مع عمر

عند رسول اللّٰہ حتیٰ ینفضوا یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر مت خرچ کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے۔ **لایفقھون** وہ سمجھتے نہیں ہیں فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں ان کے جواب کے خاتمہ میں **لایعلمون** (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا۔ اس میں ایک نکتہ ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام ہے جلی کے لئے بھی پس اب اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی ہو گی کیونکہ مال کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللّٰہ خزائن السمٰوٰت والارض یعنی آسمان اور زمین کے تمام خزانے خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔

سو اس کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے پس یہاں تامل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھ میں ہیں پس چونکہ یہ ذرا خفی اور استدلال کا محتاج تھا اس لئے یہاں **لایفقھون** فرمایا اور جاہ کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

وللّٰہ العزۃ ولرسولہ و للمؤمنین یعنی عزت اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین ہی کیلئے ہے۔

اور یہ بالکل ظاہر تھا خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عالم کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں مثلاً زلزلہ ہے اور بارش ہے اب اگر کہئے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ طبیعت اور نیچر ذی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو فاعل قرار دینے کی مثال ایسی ہو گی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی اس پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ کس نے بنایا ہے۔ ایک نے تو یہ کہا کہ بالکل اندھے لُنجے لنگڑے بے شعور نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقل مند اور کامل گھڑی ساز نے بنایا ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل سائنس میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو فاعل کہتے ہیں اور اہل سائنس طبیعت کو جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں وہ خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں ورنہ اس کی مثال ایسی ہو گی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کامل اور ایک اندھے نے مل کر بنایا ہے۔ تو اس احمق سے کہا جاوے گا کہ کامل کے ساتھ اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا خدا اور سائنس کو پس خدا کا غلبہ تو اس سے

ثابت ہوگیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ حضورؐ کے واقعات سے ظاہر ہے۔ باقی وللمومنین یعنی مومنین کا غلبہ تو اس کو جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہوگا اتنی ہی عزت بھی ہوگی چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں ان کے ایمان کی حالت یہ تھی کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔

اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کے برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت پرانے ہوگئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں ان کی کتنی عزت ہے خیر خواہان ترقی کی نگاہ میں بھی وہ مخفی نہیں ہے اور وجہ یہ ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے پھر جو لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوں گے ان کی بھی عزت ضرور ہوگی اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو تو دوسری بات ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر مخفی تھا اس لئے وہاں **لایفقھون (وہ سمجھتے نہیں)** فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا اس لئے وہاں **لا یعلمون (وہ جانتے نہیں)** فرمایا۔

نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنے کو ضرر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں پر دباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے۔

اول کی تو یہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خرچ مت کرو تا کہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ رد فرمایا کہ خزائن کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے ان کو منتفع نہ کرو گے تو ہم تو ہم اپنے خزائن سے ان کو دیں گے تا کہ اس سے منتفع ہوں اس سے معلوم ہوگیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے۔

دوسری جزو کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے یعنی چونکہ ہم نے ان کو جاہ عنایت کی ہے اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ مومنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو رفع کر دیں گے اس سے ثابت ہوگیا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے۔

اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں اس لئے جو مضمون بیان سے مقصود تھا اس کا اعادہ پھر کیے دیتا ہوں کہ اس آیت میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ مال اور جاہ تو مذموم نہیں لیکن اگر ناجائز طور پر ان کا

استعمال ہو تو مذموم ہیں بس جو لوگ مال اور جاہ کو علی الاطلاق مذموم کہتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس میں وہ یہ قید لگاویں جو لوگ علی الاطلاق اچھا کہتے ہیں وہ سوء استعمال کی صورت کو مستثنیٰ کریں یہ تو تحقیق علمی تھی۔

مگر چونکہ مقصود عمل ہے اس لئے اب طرز عمل سننا چاہئے کہ جہاں دین و دنیا میں تعارض نہ ہو وہاں خوب کمائے اور جہاں تعارض ہو وہاں قدر ضرورت سے زیادہ کو چھوڑے اور جہاں یہ بھی نہ ہو سکے وہاں تاسف کرے پس اب آپس میں اختلاف بھی نہ رہے گا نہ گناہوں کے پوٹ جمع ہوں گے۔

اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ عمل کی توفیق اور دین کی احبیت عطا فرمائے۔ **وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین**

تتمہ

اور فرمایا کہ اول آیت میں للّٰہ خزائن السمٰوٰت اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے۔

فرما کر اموال کو اپنے ساتھ خاص فرمایا اور آیت ثانی میں عزت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے بھی ثابت فرمایا اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کا مالدار ہونا تو لازمی امر نہیں گو اتنا مال ہر ایک کو ملے گا جس سے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اور اس قدر ملنا بھی خود اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ مقصود رد کا یہ ہے کہ انفضاض (منتشر ہونا) نہ ہو گا۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ حاجات مرتفع ہوتی رہیں ورنہ ان منافقین کا مقصود حاصل ہو جاتا اور صاحب عزت ہونا کامل مسلمان کا لازمی امر ہے۔ فقط!

اشرف علی

احکام المال

مال کی آمد و خرچ کے احکام کے متعلق یہ وعظ ۱۴ رجب سنہ ۱۳۲۷ھ کو بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ ۱۵۰۰ کی حاضری تھی۔ پونے پانچ گھنٹے میں ختم ہوا محمد یوسف ولد مردان علی سکنہ محلہ قاضیاں بجنور نے قلمبند کیا۔

مال کی آمد و خرچ کا بیان۔ سودی مال اور اس کے مٹنے کی حقیقت۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کا چندہ قبول نہ فرماتے تھے۔ آج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے۔ شریعت میں رائے پر محنتانہ لینا جائز نہیں مگر وکلاء و بیرسٹر لیتے ہیں۔ مسئلہ بتانے کی اجرت ناجائز ہے۔ نیوتہ کے مفاسد، میراث کی خرابیاں، مسلمانوں کی تباہی کا راز، اسراف و تبذیر، اخراجات کے حدود۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ آیت.۸۸)

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اور ان کے (جھوٹے مقدمے) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم (بھی) ہو۔

معاملات میں معصیت

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے معاملات مالیہ کی حفاظت اور اس کی تصحیح کے متعلق مضمون ارشاد فرمایا ہے۔ ضرورت اس وقت اس کے اختیار کرنے کی یہ ہوئی کہ کم وبیش دنیا ہر شخص کے پاس موجود ہے اور اس کو معاملہ کرنے کی ضرورت بھی واقع ہوتی ہے اور حق تعالیٰ نے معاملات مالیہ کی تصحیح کا اہتمام فرمایا ہے پس ہر شخص کو تصحیح معاملات کی ضرورت ہے۔ مگر باستثناء شاذ کے کوئی اس کو ضروری نہیں سمجھتا اور یہ نہیں خیال کرتا کہ معاملات مالیہ کی رعایت نہ کرنے سے بھی معصیت ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو معاصی پیدا ہوتے ہیں ان کا ظاہر میں کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا اور ان کے علاوہ جو معاصی ہیں ان کا اثر ظاہر میں بھی محسوس ہوتا ہے پس اگر کسی کی حقائق پر نظر ہے تو وہ ان معاصی کا اثر اور ان کے قبائح دیکھ کر متنبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک غیبت ہی ہے کہ اس کا اثر نااتفاقی ہو جانا آپس میں مناقشات پیش آ جانا اس کی وجہ سے پریشانی ہونا اس لئے اس میں معصیت کا رنگ صاف نظر آتا ہے یا مثلاً ڈاکہ ہے کہ اس میں سزائیں ہوتی ہیں یہ خرابیاں اس میں آنکھوں سے نظر آتی ہیں جو باعث ہو جاتی ہیں ان کے قبیح سمجھنے کا۔ اس لئے انسان ان کو چھوڑ دیتا ہے اور معاملات مالیہ میں یہ صورت پیش نہیں آتی۔ اس لئے ان کے معاصی ہونے پر متنبہ نہیں ہوتا۔ اگر حقوق مالیہ کے تلف ہونے پر بھی آثار ظاہر ہوتے اور رسوائی وغیرہ ہوتی تو ان کے قبح پر بھی متنبہ ہو جاتا جو محرک ہوتا ان کے ترک پر اگر دینی مصلحت کی وجہ سے ان سے محترز نہ ہوتا تو خیر دنیا ہی کی حفاظت کی غرض سے ہوتا مگر یہاں یہ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اور جتنے معاصی ہیں ان پر متنبہ ہونے کے اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اکثر ان پر متنبہ ہو جاتا ہے اور یہاں یہ ہے نہیں اس لئے ان کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔

ریلوے کی حق تلفی

عوام الناس کا تو فتویٰ ہی ہے کہ کفار کا مال جس طرح بھی ملے لے لیا جائے سب روا ہے۔ چنانچہ ریل میں بے احتیاطیوں کا مشاہدہ ہوتا ہے اس طرف توجہ ہی نہیں کہ تعداد سے زیادہ اسباب ریل میں لے جانا چاہیے یا نہیں؟ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کفار کا قانون ماننا ضروری تھوڑا ہی ہے مگر خوب سمجھ لیجئے کہ یہ کوئی قانون ملکی نہیں ہے جو یہ عذر کیا جائے بلکہ یہ قانون اجازت کے متعلق ہے اگر من حیث السلطنت اس کا ماننا ضروری نہ بھی ہو تو من حیث الاستیجار (اجرت کی حیثیت سے) تو ماننا ضروری ہے۔ شرائط اجارہ میں سلطنت اور غیر سلطنت برابر ہیں جن شروط پر اجارہ قرار پائے۔ ان کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے تو ان کا قانون بحیثیت اجارہ تو واجب الامتثال ہے جب انہوں نے قانون مقرر کر دیا ہے کہ پندرہ سیر سے زیادہ کسی کو اسباب بلا کرایہ لے جانے کی اجازت نہیں تو اگر تھوڑا بھی اس سے زیادہ ہوگا تو بوجہ اسکے کہ غیر کی حق تلفی ہے اس کا لے جانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ بہت لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کفار کا مال ہے چاہے جس طرح تصرف کرو یہ ان کی غلطی ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ گھڑی ہے کہ بہت سے حقوق ہمارے گورنمنٹ کے ذمہ رہ گئے ہیں ہمیں جائز ہے کہ ہم خفیہ طور پر سے وصول کرلیں اول تو اس میں یہ بات ہے کہ ساری ریلیں گورنمنٹ کی نہیں ہیں بہت سی ٹرینیں کمپنی کی ہیں دوسرے اگر ساری ریلیں گورنمنٹ ہی کی ہوں تو کیا ہر شخص کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے اور پھر جن کے حقوق گورنمنٹ کے ذمہ ہوں بھی تو کیا اس کا حساب ان کے پاس ہے کہ کتنے حق ان کے گورنمنٹ کے ذمہ ہیں اور کتنے گورنمنٹ کے ان کے ذمہ ہیں۔ یہ سب نفس کی تاویلیں ہیں بلکہ اگر ثابت بھی ہوجاوے کہ اس کا حق گورنمنٹ کے ذمہ رہ گیا ہے تب بھی حفاظت نفس کا مقتضی یہی ہے کہ ایسا نہ کیا جاوے۔

راز اس کا یہ ہے کہ نفس کو جیسی عادت ڈالی جاتی ہے ویسی ہی پڑ جاتی ہے اگر اس کی عادت ڈالی گئی تو اس کا خوگر ہوجاوے گا اور آئندہ حد سے تجاوز کرے گا۔ جہاں قطعاً جائز نہ ہوگا وہاں بھی اس عادت پر کاربند ہوگا نفس کو تو ذرا سا بہانہ چاہئے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا

حدیث میں ہے **لعن اللّٰہ السارق یسرق البیضۃ فتقطع یدہ و یسرق الحبل فتقطع یدہ**[1] (یعنی اللہ چور پر لعنت کرے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے)

اس حدیث میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرمارہے ہیں۔ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے۔ بہرحال اہل مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو اور انڈے اور رسی چرانے پر اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا۔ اس لئے اس حدیث کا ماول کرنا واجب ہوا کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے پس بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے خود لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو سر پر پہن لیتے ہیں تاکہ تلوار اثر نہ

---

[1] الصحیح البخاری۸:۱۹۹،۲۰۰، الصحیح لمسلم کتاب الحدود ب:۱، رقم: ۷ سنن النسائی ۸:۶۵، سنن ابن ماجہ: ۲۵۸۳

کرے وہ اتنی قیمت کی ہوسکتی ہے جس پر قطع ید آوے اسی طرح بعض نے حبل سے مراد حبل سفینہ لیا ہے کہ وہ اتنی قیمت کی ہوسکتی ہے بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا یہ سب بعید تاویلیں ہیں۔ ہمارے استاد رحمہ اللہ نے جو تاویل فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے اور ظاہر حدیث سے کچھ بعید بھی نہیں تو جب تک کہ متبادر معنی بن سکیں غیر متبادر کی طرف کیوں جائیں۔

میرے استاد فرماتے ہیں کہ حدیث میں بیضہ اور حبل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں۔ یعنی انڈا اور رسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے جو چور بدمعاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ پیسہ سے شروع کرتے ہیں جب وہ کھپ گیا آگے جرات ہوئی پھر اور آگے چلے یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا کہ جس پر قطع ید کا حکم آ گیا یہ مطلب ہے اس حدیث کا۔

استعداد نفس اور نور فراست

اسی وجہ سے مشائخ بعض کو روکا کرتے ہیں بعض مباحات سے اور مباحات کی تقلیل کراتے ہیں کہ کہیں نفس مباحات سے گزر کر آگے نہ چلنے لگے۔ گو بعض موقع پر توسع بھی کرتے ہیں وہ تو طبیب ہیں کہیں زیادہ وسعت کرنے سے تزکیہ ہوگا نفس کا رذائل سے اور کہیں تنگی کرنے سے اس لئے جہاں وسعت کا موقع ہوتا ہے وہاں وسعت کرتے ہیں اور جہاں تنگی کا موقع ہوتا ہے وہاں تنگی کرتے ہیں وہ ماہر فن ہیں باقی دو چار لفظ کے جاننے سے کہیں دین کا فن تھوڑا ہی آ سکتا ہے۔ اس کا موقع ہر ایک کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں وسعت کی حاجت ہے اور کہاں تنگی کی۔ مشائخ کی صحبت میں رہ کر خود اس کا مشاہدہ کرو گے اور ان کے یہاں مختلف واقعات دیکھو گے مثلاً کسی کو دیکھو گے کہ وسعت دی جا رہی ہے اور دوسرے شخص کو دیکھو گے کہ اس کو ممانعت کی جا رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جو ان سے اصلاح کا طالب ہوتا ہے وہ اس کے استعداد نفس کو سمجھتے ہیں۔ ان کو خدا تعالیٰ نے اس کی ایسی فراست عطا فرمائی ہے کہ اس فراست میں ان کا کوئی شریک نہیں تمام عقلاء جمع ہو جاویں مگر وہ نور فراست کہاں سے لائیں گے جو ان کو عطا ہوا ہے ان کو یہ فضیلت ہے اوروں سے جس کی وجہ سے وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے لئے یہ مناسب ہے اور اس کے لئے یہ۔

وسعت ایسی جگہ کرتے ہیں جیسے حکایت ہے کہ کسی چور نے ایک بزرگ سے بیعت کی اور چوری سے توبہ کرلی ان بزرگ نے اس کو اجازت دے دی خانقاہ میں رہنے کی۔ مرید صاحب روز رات کو کیا کرتے کہ لوگوں کے جوتے لوٹ پوٹ کیا کرتے کسی کا جوتا کہیں رکھ دیتے اور کسی کا کہیں اب لوگ حیران کہ یہ کون جوتوں کو ادل بدل کر جاتا ہے۔ آخر ایک روز ان کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا اور پکڑ کر صبح کو شیخ کے سامنے لا حاضر کیا اور کہا کہ جوتوں کو الٹ پلٹ کرنے والے یہ مرید ہیں آپ کے شیخ نے ان سے کہا کہ یہ کیا حرکت ہے۔ مرید صاحب نے کہا کہ بات یہ ہے کہ مجھ کو چوری کی عادت تھی میں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کرلی جب رات آتی ہے تو طبیعت میں تقاضا ہوتا ہے کہ چوری کروں۔ بے حد تقاضا ہوتا ہے ہر چند چاہتا ہوں کہ جی سے بھلا دوں مگر نہیں جاتا۔ اور چوری سے کر چکا ہوں توبہ اس لئے میں چوری کی نقل بنا کر جی کو بہلا دیتا ہوں کہ جوتے ادھر کے ادھر اور ادھر کے ادھر کر دیتا ہوں اور کہا کہ لوگوں کو اس سے تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس سے میرے دین کی حفاظت رہتی ہے۔ یہ اندیشہ ہے کہ اگر ایسا نہ کروں تو شاید پھر چوری کرنے لگوں۔ شیخ نے اس کو اجازت دے دی کہ اچھا تم کرلیا کرو اگر کوئی دوسرا شخص اس حرکت کو کرنے لگے تو اس کو روکا جائے گا۔

اسی واسطے شیخ کے ساتھ مزاحمت نہیں چاہئے۔ وہ ماہر اور تجربہ کار ہے جو بھی فیصلہ کرتا ہے بصیرت سے کرتا ہے ہر شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا اس سے الجھتا کہ یہاں ایسا کیوں کیا اور وہاں ایسا نہ کیا یہ مناسب نہیں شیخ کہیں تنگی کرتا ہے اور کہیں وسعت اور وہی اس کو سمجھتا ہے کہ یہاں موقع تنگی کا ہے اور یہاں وسعت کا دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا۔

بہر حال اگر ثابت بھی ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ذمہ ہمارا حق رہ گیا ہے جب بھی زیادہ اسباب نہ لے جانا چاہئے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے نفس کو اس کی عادت پڑتی ہے اور عادت ہونے سے اپنا حق وصول ہو جانے پر بھی نہیں چھوڑے گا پس مقتضا معالجہ کا یہی ہے کہ گو ہمارے حقوق بھی گورنمنٹ کے ذمہ ہوں تب بھی ایسا نہ کریں۔

کید نفس

میرے پاس کثرت سے ایسے خطوط آتے ہیں کہ جن پر یا تو ڈاکخانہ کی مہر ہی نہیں ہوتی یا ہوتی بھی ہے تو ٹکٹ سے بچی ہوئی ہوتی ہے اگر میری بری نیت ہو تو میں ان ٹکٹوں سے منتفع ہو سکتا ہوں کہ دوسرے خطوط پر لگا کر بھیج دوں مگر شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ جو دو پیسے

لفافہ کے دیئے گئے ہیں وہ اجرت کے طور پر ہیں اور وہ لفافہ کی شکل اصل میں رسید ہے ان دو پیسے کی پس جب ڈاک پہنچی تو وہ دو پیسے وصول ہو گئے اب اس رسید سے دوسری بار وصول کرنا حرام ہے پس میں ایسے ٹکٹوں کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں باوجودیکہ مجھ کو اس کی عادت ہو گئی ہے مگر پھر بھی وسوسہ ہوتا ہے کہ شاید تقویٰ ظاہر کرنے کو ایسا نہ کرتا ہوں حضرت نفس کی کیفیت یہ ہے۔

نفس اژدرہاست او کے مردہ است   از غم بے آلتی افسردہ است

نفس اژدھا ہے وہ نہیں مرا۔ غم بے آلتی سے افسردہ ہے۔

نفس کے کید سے کبھی غافل نہ رہنا چاہئے ہر وقت ہوشیار رہے۔

حضرت حاجی صاحب اس قول کے کہ **الحزم سوء الظن** یعنی ہوشیاری یہ ہے کہ اپنے نفس سے بدگمان رہے عجیب معنی ارشاد فرماتے تھے کہ سوء ظن سے مراد **سوء ظن بنفسہ** ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ دوسروں سے سوء ظن رکھے بلکہ اپنے ساتھ تو یہ معاملہ ہو کہ ہر بات میں بدگمان رہے کہ کہیں اس میں نفس کی شرارت نہ ہو اور دوسروں کے ساتھ یہ کہ ہر شخص کو اپنے سے اچھا سمجھے۔ باقی شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بوستان میں جو فرمایا ہے۔

نگہ دارد آں شوخ در کیسہ در   کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بر

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سوء ظن پر آمادہ کر رہے ہیں بظاہر ان کا کلام قرآن و حدیث کے معارض معلوم ہوتا ہے قرآن میں ہے **ان بعض الظن اثم** (بیشک بعض گمان گناہ ہیں) اور حدیث میں ہے **ظنوا المومنین خیراً**[1] (مؤمنوں سے اچھا گمان رکھو) اور پھر ان کے کلام کے بھی معارض ہے کیونکہ گلستان میں فرماتے ہیں۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی   پارسا داں و نیک مرد انگار

جسکو پارسائی کپڑوں میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک سمجھو۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ظاہر اچھا ہو اس کو اچھا سمجھے اور بوستان کے کلام سے یہ پایا جاتا ہے کہ سب کو برا جانے۔ گلستان کی اور تعلیم اور بوستان کی اور یہ کیا بات ہے؟

جواب یہ ہے کہ شیخ کا مطلب یہ نہیں جو تم سمجھے بدگمانی کے دو درجے ہیں ایک بدگمانی ہے

---

[1] لم اجد الحدیث فی "موسوعۃ اطراف الحدیث"

اعتقاد کے درجہ میں کہ دوسرے کو برا سمجھے اور ایک بدگمانی ہے عمل کے درجہ میں یعنی معاملہ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کرتا تو ممانعت تو ہے بدگمانی کی باعتبار اعتقاد کے اور مشورہ ہے بدگمانی کا باعتبار معاملہ کے سو بوستان کے اس مصرعہ کے معنی کہ

داند ہمہ خلق ۔ راکیسہ بر

(ساری مخلوق کو جیب کترے سمجھو)

یہ ہیں کہ معاملہ سب کے ساتھ ایسا ہی کرے جیسا کہ بدگمانی میں کیا کرتے ہیں۔

دروغ مصلحت آمیز کے معنی

داند اعتقاد کی رو سے نہیں بلکہ معاملہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً ایک شخص سو روپیہ قرض لینے آیا مگر ہمیں تجربہ نہیں اس کا کہ یہ شخص معاملہ کا کیسا ہے تو ہمیں اس گمان کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ نہ معلوم یہ شخص کیسا نہیں کیسا ہے۔ دین دار ہے یا نادہندہ۔ اگر ہم جھوٹ بھی بول دیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے تو بھی گناہ نہ ہوگا کیونکہ یہ شخص اپنے کو ضرر سے بچا رہا ہے۔ دوسرے کو ضرر نہیں دے رہا۔ اس جھوٹ سے گناہ نہیں ہوتا یہی معنی ہیں۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

(مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ پھیلانے والی سچائی سے اچھا ہے)

کے اور یہ عام نہیں ہے کہ ہر مصلحت میں جھوٹ بول دیا کرے۔ مصلحت سے مطلق مصلحت مراد نہیں بلکہ جس دروغ میں دوسرے کا ضرر نہ ہو اور اپنا یا کسی اور کا اس سے ضرور دفع ہوتا ہو شیخ نے اس کو مصلحت سے تعبیر کیا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ظالم کے خوف سے چھپا ہوا ہے اور اس کو معلوم ہے اور وہ ظالم تلاش کرنے آیا اور اس سے پوچھا اس نے کہہ دیا کہ مجھ کو خبر نہیں تو یہ جائز بلکہ واجب ہے خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں سے بدگمانی معاملہ کے اعتبار سے ہو نہ اعتقاداً۔ ہاں اپنے نفس سے ہر حالت میں بدگمان رہے۔

نفس کی نگرانی

ہمارے حضرت علیہ الرحمۃ فرماتے تھے کہ کوئی کتنا ہی شیخ کل کیوں نہ ہو جاوے مگر جب بھی مامون نہ رہے نفس پر اس کی طرف سے ہمیشہ بدگمان ہی رہے نفس کی حالت یہ ہے کہ نسبت راسخ ہو

جانے کے بعد بھی وساوس گھیرتے ہیں اور وساوس کی مقاومت نہ کی جائے تو ان پر عمل ہو جاتا ہے۔ پس نفس کو وسعت ہرگز نہ دینی چاہیے۔ وسعت دینے سے عادت ہو جاتی ہے آگے بڑھنے کی نفس کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس لئے اگر پندرہ سیر سے زیادہ اسباب لے جانے میں گنجائش بھی ہو تو بھی اس مصلحت سے بچنا چاہئے کہ کہیں نفس کو عادت نہ ہو جاوے۔ عادت کے بعد نفس کو روکنا مشکل ہے پھر اگر کہیں گنجائش نہ ہو گی تب بھی نفس نہ رکے گا۔ یہ نفس بڑا ہی شریر ہے اس سے تو کبھی غافل ہونا ہی نہ چاہیے اسی واسطے حضرات اہل اللہ باوجود نسبت راسخ ہو جانے کے بھی ہمیشہ نفس کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے کون زیادہ ہوگا جن کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فی الجنۃ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل سچا ہے آپ سے سن لینے کے بعد میں ظاہر ہے کہ ان کو اس کی صحت کا یقین ہو گیا ہوگا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ اگر ہمارے لئے ایسی بشارت ہو تو ایسے بے فکر ہو جاویں کہ کوئی گناہ نہ چھوڑیں۔ سمجھ لیں کہ جنت کے تو مستحق ہو ہی گئے بس خوب مزے اڑائیں اور خیال کر لیں کہ اب ڈر کس بات کا ہے دوزخ سے بچ گئے۔ جنت مل گئی گناہوں سے ضرر ہی کیا ہے مگر ان حضرات کی شان دیکھئے کہ باوجود ایسی قطعی بشارت کے سن لینے کے ان کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدح سے نفس میں ذرا سا تغیر دیکھا تو اس کا علاج کرنے کے لئے پانی عوام کے گھروں میں بھرتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نفس کو اتنی مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں آپ نے فرمایا کہ آج روم سے دو قاصد آئے تھے انہوں نے میری تعریفیں کیں کہ ہم نے آپ کے عدل کی بڑی شہرت سنی ہے اس سے مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے نفس میں عجب نہ پیدا ہو جائے تو نفس کے علاج کے لئے میں پانی بھر کر پلا رہا ہوں نفس مجھ پر ظلم کرتا ہے میں نے اس کی یہ سزا تجویز کی تاکہ اترانے نہ پائے۔

اب حضرت علیؓ کا قصہ سنیے۔ آپ نے ایک دفعہ کرتا پہنا اس کے پہننے سے نفس میں کچھ تغیر ہوا۔ نظر میں بھلا معلوم ہوا بس قینچی منگا کر آدھی آدھی آستینیں کاٹ ڈالیں اس کو بدشکل کر دیا تاکہ نظر میں پسندیدہ نہ رہے ان حضرات کی نفس کی نگرانی میں یہ حالت تھی اور یہ احتیاط تھی کہ ذرا سا بھی تغیر پاتے تھے تو بے چین ہو جاتے اور اس کا علاج کرتے یہاں تو وہ دودھ کا سا معاملہ ہے کہ جو آوے کھپ جاوے۔ جیسے دودھ میں نجاست کھپ جاتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی تاویلیں کر کے کفار کا مال جائز کر لیتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں سہارنپور سے کانپور جاتا تھا میں نے سہارنپور سے پونڈے ساتھ لے جانے کو خریدے۔ وہ تھے وزن میں زیادہ میں نے ان کو تلوانا چاہا تاکہ محصول دے کر لے جاؤں ریل کے بابو نے کہا تھوڑے سے ہیں لے بھی جاؤ۔ میں نے کہا کہ یوں تو آپ کی اجازت معتبر نہیں اور پھر یہ کہ اگر راستہ میں کوئی تولنے لگے وہ بولے کہ میں گارڈ سے کہہ دوں گا میں نے کہا یہ گارڈ کہاں تک جائیگا کہنے لگے کہ غازی آباد تک۔ میں نے کہا کہ آگے کیا ہوگا کہا کہ یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا اور وہ کلکتہ تک جائے گا اور کانپور راستہ میں پڑے گا میں نے کہا کہ کانپور کے بعد کیا ہوگا اس نے کہا کہ آگے تو آپ کو جانا نہیں میں نے کہا کہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا آخرت کا سفر باقی ہے اگر وہاں پکڑ ہوئی تو کیا ہوگا اگر کوئی اللہ تعالیٰ سے کہہ دے تو خیر لے جاؤں غرض میں محصول دے کر گنوں کو لے گیا۔

میں یہ واقعہ بیان نہ کرتا کبھی کوئی کہنے لگے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں اپنی تعریف کرتے ہیں مگر میری غرض یہ ہے کہ واقعات کے سننے سے قلوب میں اثر خوب ہوتا ہے اس لئے اس واقعہ کو بیان کیا ہے اس کام کو کرنے والا میں ہی نہیں اللہ کے بندے بہت کثرت سے ایسے بھی موجود ہیں۔ میں تو ادنیٰ سے بھی ادنیٰ شخص ہوں مگر الحمد للہ مجھ کو اس کا خیال ہے۔ تو جو متقی اور پرہیزگار ہیں وہ کیوں نہ خیال کریں۔

اہل علم کی بے احتیاطی

اکثر کا یہ حال ہے کہ وہ بالکل ان امور میں احتیاط نہیں کرتے عوام الناس تو غفلت سے کرتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں کہ یہ ناجائز ہیں اور اہل علم اس کو جائز کر کے کرتے ہیں چنانچہ میں اس کا ایک قصہ سناتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ میں اور ایک معقولی طالب علم ریل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک شخص نے سنا کہ وہ اس ریل میں سوار ہیں ہم تو درمیانہ درجہ میں تھے اور وہ تیسرے درجہ میں یہ شخص محبت سے ہمارے پاس آ بیٹھے دو ایک اسٹیشن تک بیٹھے رہے اس کے بعد اتر کر اپنے درجہ میں جانے لگے میں نے ان سے کہا کہ تم نے اتنی مسافت درمیانہ درجہ میں قطع کی ہے اور تمہارے پاس ٹکٹ ہے سوم کا اتنی مقدار محصول کی تمہارے ذمہ دین ہے تم اس کو ادا کر دینا اور آسان ترکیب بتلا دی کہ اتنی مسافت کا جس قدر محصول درمیانہ درجہ کا سوم سے زائد ہے اس کا ٹکٹ اسی لائن کا خرید کر چاک کر دینا۔ بس ادا ہو جائے گا اس پر وہ معقولی طالب علم صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

فقہ اور اہل علم

فقہ کا مسئلہ ہے کہ منافع غصب مضمون نہیں ہوتے مثلاً کوئی کسی کے گھوڑے پر زبردستی سوار ہو کر چل دے تو اس کا کرایہ نہ دینا پڑے گا ہاں اگر مغضوب عین ہو اور اس کو تلف کر دے تو ضمان لازم آتا ہے۔

انہوں نے جو یہ بات کہی مجھ کو سن کر حیرت ہوئی کہ جب اہل علم ہی ایسے فتوے دیں گے تو پھر عوام کی کیا حالت ہوگی۔ ایسے ہی لوگ بدنام کرتے ہیں فقہ کو اب جو شخص فقہ ہی کا قائل نہ ہو اس سے تو ہماری گفتگو ہی نہیں اور جو فقہ کا قائل ہے تو وہ فقہ کی کتابیں کھول کر دیکھے کہ فقہاء کا کیا مقصود ہے اصل یہ ہے کہ اس موقع پر دو مسئلے جدا جدا ہیں ایک یہ کہ منافع مغضوب کو تلف کرانے سے گناہ ہوگا یا نہیں اور ایک یہ کہ اس پر ضمان لازم آئے گا یا نہیں تو فقہاء گناہ کی نفی نہیں کرتے صرف ضمان کی نفی کرتے ہیں یعنی یہ نہیں کہتے کہ گناہ نہ ہوگا گناہ ضرور ہوگا لیکن ضمان لازم نہیں آئے گا۔

فقہاء کے پاس اس کی دلیل موجود ہے جس کو اہل علم سمجھ سکتے ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ عقد اجارہ ایک عقد ہے اور عقد کا عقلی مقتضا یہ ہے کہ بدلین میں تناسب ہونا چاہئے اگر کوئی چیز خریدیں تو اس چیز میں اور اس میں جو اس کے عوض میں دی گئی ہو تناسب ہو اور جہاں بدلین میں تناسب نہ ہو تو قیاس کے مقتضا سے وہ مبادلہ صحیح نہ ہوگا۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سنیے کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے قیاس کے بالکل خلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو عین ہے یعنی ثمن اور ایک طرف عرض یعنی منافع کسی چیز کے اور اعیان و اعراض میں تماثل نہیں ہے اس لئے ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتا تو قیاس تو یہ چاہتا تھا کہ منافع کا مبادلہ ثمن سے کسی صورت میں بھی جائز نہ ہو مگر چونکہ عقد اجارہ میں اس مبادلہ کو نص جائز بتلا رہی ہے اس لئے فقہاء نے عقد اجارہ کے اندر قیاس کو چھوڑا اور حدیث کو اختیار کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے سامنے ہمارا قیاس کوئی چیز نہیں اور جہاں عقد نہ ہو جیسے کہ منافع کے غصب کی صورت میں اس کے اندر کوئی نص نہیں ہے جواز کی جو قیاس کے چھوڑنے پر مجبور کرے یعنی غیر عقد میں نص ہی نہیں اس لئے وہاں بمقتضائے قاس اس مبادلہ کی عدم صحت کے قائل ہوئے اور منافع مغضوب کو مضمون نہ ٹھہرایا۔ یہ تحقیق ہے اس مسئلہ کی کہ منافع مغضوب مضمون نہیں۔

ان مولوی صاحب نے اس مسئلہ سے کام لیا مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ گناہ بھی نہ ہو

گا۔ اس پر تو انہوں نے نظر کی کہ ضمان نہیں آتا اور اس پر نظر نہ کی کہ گناہ ہوتا ہے اور اس گناہ کی تلافی یہی ہے کہ اس کا بدل ادا کر دے کیونکہ یہ گناہ حقوق العباد سے ہے جو مال کے متعلق ہے اسی واسطے علم ہر ایک کے لئے نافع نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ اس پر نظر کرتے ہیں کہ کسی کے واسطے علم مضر ہوگا جس کو مضر ہوتا ہے اس کو درسیات سے محروم رکھتے ہیں زبانی تعلیم بقدر فرض عین کے اس کے لئے تجویز کرتے ہیں اسی کے بارے میں تو مولانا فرماتے ہیں۔

بدگہر را علم و فن آموختن　　　دادن تیغ ست بدست رہزن

(بدگہر کو علم وفن سکھانا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے)

یہ تو قاعدہ کلیہ فرمایا۔

منصور اور علماء

اس کے بعد تفریع کے طور پر کہتے ہیں۔

چوں قلم در دست غدارے فتاد　　　لاجرم منصور بردارے فتاد

یعنی دیکھو بدگہر کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک غدار کو جب حکومت کے اختیارات ملے تو اس نے منصور کو دار پر چڑھوا ہی دیا اس شعر میں مولانا نے صرف ایک شخص کو غدار کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے علماء اہل فتوی مراد نہیں ہیں ورنہ وہ تو متعدد علماء تھے اس لئے در دست غداراں کہنا چاہئے تھا۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس شعر میں غدار سے مراد خاص ایک وزیر ہے کیونکہ منصور کو صرف اسی نے قتل کرایا تھا علماء ان کے قتل میں شریک نہ تھے۔

یہ تو ایک تاریخی بات ہے کتب تواریخ میں ان کی شہادت کا قصہ اسی طرح لکھا ہے کہ وزیر کو منصور سے عداوت تھی۔ چونکہ وہ بھی عالم تھا گو مقتداء نہ سمجھا جاتا تھا اس وجہ سے اس نے اپنی عداوت نکالنے کے لئے اس طور پر استفتاء تیار کیا کہ علماء کو قتل ہی کا فتوی دینا پڑا۔ مثلاً یہ کہ زید نے ایک کلمہ کفر کا کہا اور اس کی کوئی عذر کی بھی حالت نہیں اور اس پر مصر ہے تو اس شخص کا کیا حکم ہے ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ وہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے۔ اس لئے علماء پر الزام نہیں کیونکہ ان سے تو جیسا سوال کیا جاوے گا اسی کے مطابق وہ جواب دیں گے یہ تو سائل کے ذمہ ہے کہ سوال کے اندر کوئی بات واقعہ کے خلاف نہ لکھے تو چونکہ علماء بے قصور تھے اور قصوروار صرف وزیر تھا اس لئے غدار کہا۔

یہ میں نے اس لئے کہا تا کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ مولانا علماء کی طرف سے بدگمان ہیں اور

ان کو غدار کہہ رہے ہیں خوب سمجھ لو کہ مولانا وزیر کو غدار کہہ رہے ہیں علماء کو نہیں کہہ رہے۔

بہرحال میرا مقصود پہلا شعر ہے کہ بد گہر کو علم نہ سکھانا چاہئے کیونکہ اس سے بڑا ضرر پہنچتا ہے ان معقولی طالب علم صاحب ہی کو دیکھئے کہ فقہ پڑھ کر انہوں نے اس سے یہ انتفاع حاصل کیا کہ تمہارے ذمہ محصول نہیں چاہیے اور ضرورت نہیں کرایہ دینے کی میں نے کہا **حفظت شیئا وغابت عنک اشیاء** تو مسئلہ یاد کر لیا کہ منافع مضمون نہیں ہوتے اتلاف سے اور دوسری بات یاد نہیں رہی کہ گناہ ہوتا ہے۔ آخر اس گناہ کا تدارک بھی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو اس کا سوائے اس کے اور کیا طریقہ ہے کہ کرایہ دے کر صاحب حق کو راضی کیا جاوے۔ پس اس کو سن کر وہ چپکے رہ گئے حضرت جب اہل علم کی طرف سے یہ گنجائش ملے تو پھر عام لوگوں کو کیا شکایت۔

علماء اور امراء

زیادہ تر ایسی گنجائشیں امراء کی خاطر نکالی جاتی ہیں اسی واسطے حدیث میں بڑی مذمت آئی ہے اس عالم کی جو امراء میں گھسا رہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تساہل ہو جاتا ہے مسائل کے اظہار سے جہاں پلاؤ قورمہ اور عمدہ مال کھانے کو ملے تو وہاں کیا پرواہ رہ سکتی ہے دین کی وہاں تو یہ ڈر ہوگا کہ اگر حق بات کہیں گے تو پلاؤ قورمے جاتے رہیں گے۔ ایسی جگہ امید ہی نہیں کہ صاف بات کہیں بلکہ یہ کیفیت ہوگی کہ اگر امراء ناجائز فعل کو پوچھیں گے تو تاویل کر کے جائز بتلادیں گے۔

چنانچہ امراء کے یہاں شطرنج کا مشغلہ عموماً ہوتا ہے اب جو ان کے ہاں حاضر باش علماء ہیں وہ تاویل کر کے جائز بتلادیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہہ دیتے ہیں کہ شافعی کے نزدیک جائز ہے اور ان کے نزدیک بھی جو شرطیں ہیں ان کا نام تک نہیں لیتے سو امراء کی مخالطت سے یہ حالت ہو جاتی ہے علماء کی اس واسطے حدیث میں ہے۔

العلماء امناء الدین مالم یخالطوا الامراء فاذا خالطوا الامراء فھم لصوص الدین فاحذروھم[1]

یعنی علماء امین ہیں دین کے جب تک کہ وہ امراء سے مخالطت نہ کریں اور جب امراء میں گھسنے لگیں تو وہ دین کے ڈاکو ہیں ان سے لوگوں کو بچنا چاہیے۔

چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جو علماء امیروں سے مخالطت رکھتے ہیں ان کی کیسی خراب حالت ہے اور

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۱:۳۸۸، کنز العمال: ۲۸۹۵۲، ۲۹۰۸۳ بلفظ "العلماء امناء الانبیاء والرسل" الخ

راز اس کا یہ ہے کہ طبائع میں عموماً طمع غالب ہے اس لئے امراء سے جب مخالطت ہوتی ہے تو طمع مانع ہو جاتی ہے اظہار حق سے سو یہ ساری خرابی طمع کی ہے اسی واسطے کہتے ہیں۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد　　صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

جب غرض آجاتی ہے ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے دل سے سینکڑوں پردے آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں۔ اور علماء کو اس سے دنیوی ضرر بھی پہنچتا ہے کہ ان کی عظمت امراء کے قلب میں بالکل نہیں رہتی دل میں وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہماری خاطر سے ایسا فتوی دے رہے ہیں بس وہ ایک آڑ بنا لیتے ہیں ان کو ورنہ حقیقت وہ بھی جانتے ہیں سو جب حالت یہ ہے تو پھر کیا امید ہے ان علماء سے اصلاح کی۔

بہر حال لوگ مال کے بارے میں زیادہ گنجائش نکالتے ہیں عوام اپنے لئے اور علماء ان کے لئے اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے اور امور میں تو خیر کچھ احتیاط کرتے بھی ہیں جس میں احتیاط کرنے سے بظاہر کوئی ضرر نہیں ہوتا اور خالی مفت کرام داشتن ہے وہاں احتیاط سے کچھ کام لے لیتے ہیں بخلاف مال کے کہ اس میں احتیاط کرنے سے دس کے پانچ ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں احتیاط کرنا ذرا مشکل ہے اور نفس پر شاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے کم ہیں جو اس میں احتیاط کرتے ہوں ورنہ نفس تو گنجائش ہی کی طرف بلاتا ہے اور عام طور پر ایسے ہی لوگ ہیں جو ان معاملات میں ذرا احتیاط نہیں کرتے اس واسطے میں مطلع کرتا ہوں کہ مال کے بھی حقوق ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی چونکہ حقوق مالیہ میں بے احتیاطی زیادہ کی جاتی ہے اس لئے میں اس وقت اس کا بیان کرتا ہوں۔

مال کے حقوق

شروع میں جو میں نے آیت تلاوت کی ہے اس سے پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے روزہ کا مسئلہ ارشاد فرمایا ہے جس کا شروع یہاں سے ہے۔ **احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نساء کم** اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے۔ کیونکہ اوپر کی آیت میں تو احکام روزہ کے بیان ہوئے ہیں اور اس آیت میں فرماتے ہیں **ولاتاکلوا اموالکم** کہاں تو روزہ کا بیان اور کہاں یہ کہ حرام مل سے بچو۔ اس میں جوڑ کیا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑ ہے روزہ میں فرماتے ہیں۔

وکلوا واشربوا حتیٰ یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ثم اتموا الصیام الی اللیل

یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اس وقت تک کھاؤ پیو اور جب صبح صادق نکل آوے تو اس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر جب کہ سورج غروب ہو جائے اس وقت روزہ کو ختم کر دو۔

سو روزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑائی گئی ہیں وہ ایک وقت خاص تک کے لئے چھڑائی گئی ہیں کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت سے خاص وقت تک حرام کر دی گئی ہیں مگر حرام مال سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزے کا ذکر فرمایا خیال تو فرمایئے کہ کتنا لطیف ربط ہے۔

غرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لاتاکلوا اموالکم کہ اپنا مال مت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لاتاکلوا اموال اخوانکم کہ اپنے بھائیوں کا مال مت کھاؤ حالانکہ مطلب یہی ہے قرآن شریف کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کا کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور شفیقانہ کلام ہے نرا ضابطہ کا کلام نہیں یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی ہے اور ایک نرا ضابطہ کا کلام ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اس میں نرے ضابطہ کے الفاظ ہوتے ہیں اس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ موثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلب پر اثر کریں ضابطہ کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کے سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی ہے۔ جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا لاتاکلوا اموال غیرکم (اور دوسروں کا مال مت کھاؤ) یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ دوسرے کے مال سے اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرائے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چنداں محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو داعی ہو حفاظت کا اور اس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی لفظ نہ تھا کہ اس کو اموالکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے اس کی ایسی ہی حفاظت

کرو جیسے اپنے مال کی کیا کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا اس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

مکافات عمل

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے۔ واقعی اپنا نہیں مگر لاتاکلوا اموالکم فرمانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہوگا خواہ دنیا میں یا آخرت میں اس معنی کر بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے اگر دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں تو ضرور ہی ہوگا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال وجوہ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی ان کا بھلا نہیں ہوتا۔

چنانچہ کانپور کا قصہ ہے کہ مسجد میں مدرسہ تھا اس کے لئے کچھ زمین کی ضرورت تھی مسجد کے پاس ایک شخص رہتے تھے جو کہ چنداں مالدار تو نہ تھے مگر تھے خاندانی شخص ان کا بہت بڑا مکان تھا ان سے تھوڑی زمین مسجد کے لئے لینی چاہی انہوں نے انکار کر دیا بلکہ کچھ اور مسجد کی زمین دبالی ایک مرتبہ وہاں ایک بزرگ تشریف لائے ان سے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ زمین ان کی زمین کو لینے گئی ہے ان کی زمین کو اپنے ساتھ لے کر آوے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس شخص پر بہت غربت آ گئی حتیٰ کہ اس کو ساری زمین فروخت کرنی پڑی۔ جس کو مسجد والوں نے خرید لیا اور خرید کر مدرسہ بنا دیا۔

حضرت یہ کہیں نہیں ہے کہ آپ کسی کو نقصان پہنچائیں اور آپ کا نقصان نہ ہو تو اس لئے بھی اموالکم فرمایا۔

سودی مال اور محق کی حقیقت

اب وجوہ باطلہ کی کچھ مثالیں سنیئے سو اس میں سے ایک سودی معاملہ ہے جس کے بارہ میں ہے یمحق اللہ الربوا سودی مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مٹ کر رہتا ہے اور حقیقتاً تو مٹتا ہی ہے مگر صورۃً بھی مٹتا ہے ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الٰہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ یمحق اللہ الربوا قضیہ مہملہ ہے جو قوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے اگر

ایک دفعہ بھی مٹ جائے تو وہ صادق آ جائے گا معنی یہ ہیں کہ سود والے اکثر مٹتے ہیں اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اگر کہیں ظاہراً نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محق کی قسمیں مختلف ہیں ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے یہ تو ظاہری محق ہے اور ایک محق ہے۔ معنوی وہ یہ کہ سود والا مال سے خود منتفع نہیں ہوتا۔ فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے سود لینے کا سبب بخل ہے جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا یہ حالت ہوتی ہے۔

سختیاں زاموال بری خورند   بخیلاں غم سیم و زری خورند

سخی لوگ مالوں کو کھاتے ہیں اور بخیل چاندی اور سونا کھاتے ہیں۔

ایک ماسٹر تھے۔ سو روپے ان کی تنخواہ تھی اور پانچ روپے ان کا خرچ تھا۔ لوگوں نے کہا میاں تمہاری اتنی بڑی تنخواہ ہے تم تکلیف کے ساتھ کس لئے گزر کرتے ہو انہوں نے کہا کہ مجھ کو اس تصور میں کہ میرے پاس اتنا روپیہ ہے ایسا حظ آتا ہے کہ میرا دل ہی جانتا ہے وہ اسی میں مست تھے۔

غرض کہیں اس طرح بھی سود میں محق ہوتا ہے کہ اپنے اوپر خرچ نہیں ہوتا تو یہ محق برکت اور انتفاع کا ہوا۔

رشوت کا حشر

ایک وجوہ باطلہ میں سے رشوت ہے کہ لوگ رشوت لے لے کر مال جمع کرتے ہیں پھر دیکھئے اس کا کیا حشر ہوتا ہے میرے ایک عزیز پولیس میں ملازم تھے انہوں نے خوب رشوتیں لے لے کر روپیہ جمع کیا تھا اتفاق سے سرکار کی طرف سے کسی معاملہ میں مقدمہ قائم ہو گیا تھا جتنا کمایا تھا سب اس میں لگ گیا حتیٰ کہ گھر کا زیور بھی نہ رہا۔ بالکل خالی رہ گئے جب خدا خدا کر کے اس مقدمہ سے جان بچی اس کے بعد پھر اسی طرح روپیہ جمع کیا اور اس روپیہ کے نوٹ خریدے اور ایک پرانے تکیہ میں سی دیئے اس خیال سے کہ اسے چور کیا لیں گے ایک روز اتفاق سے وہ تحقیقات میں گئے تھے ان کے مکان میں آگ لگ گئی گھر والوں نے قیمتی اسباب اٹھا اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا۔ اس تکیہ کا کسی نے خیال بھی نہ کیا وہ جب تحقیقات کر کے آئے تو معلوم ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی تھی پوچھا کہ میرا تکیہ کہاں ہے گھر والوں نے کہا کہ جو قیمتی چیزیں تھیں وہ مشکل سے بچائی ہیں وہ پرانا تکیہ بھی کوئی حفاظت کے قابل تھا کہنے لگے میرے تو اس میں نوٹ تھے اور نوٹوں کے نمبر محفوظ تھے نہیں اس لئے سب کمائی جاتی رہی اور اس میں سے کچھ جائیداد خرید لی تھی اس میں اس طرح کسر نکلی کہ کسی کاشتکار

پر نالش کی تھی اس مقدمہ میں اس کاشتکار نے ان حضرت کو قتل کر دیا۔

یہ انجام ہوتا ہے ایسے مال والوں کا دن رات ایسے لوگ فکروں میں مبتلا رہتے ہیں اور ایک شخص ہے جس کی یہ حالت ہے۔ لنگئے زیرو لنگئے بالا جس کی آمدنی بھی کم ہے بس معمولی سا کھا پہن لیتا ہے اور مزے سے پاؤں پھیلا کر رات کو سوتا ہے وہ اچھا ہے یا ایسے لوگ اچھے ہیں یہ رشوت کے انجام ہیں۔

اسی طرح سے قمار ہے نہ معلوم اس میں جیتنے والے کہاں جاتے ہیں۔ جس کو سنو گے کہ ہار گئے۔ یہ کسی کو نہ سنو گے کہ جیت گئے اس کے متعلق کھلے ہوئے واقعات ہیں سینکڑوں کے اس میں گھر بار تباہ ہو گئے ایسے مالوں میں ذرا برکت نہیں ہوتی ہم نے دیکھا ہے کہ رشوت والے ہزاروں جمع کر لیتے ہیں مگر ایک دو پشت کے بعد کچھ بھی نہیں رہتا بالکل محتاج ہو جاتے ہیں۔ آج ایک شخص نوکر تو پچیس روپیہ کا ہے مگر حرام مال خوب سمیٹتا ہے اور اس کے یہاں اولاد بھی ہے مہمان بھی ہیں دوست احباب بھی ہیں۔ تندرستی بھی ہے مکان کی تعمیر بھی ہو رہی ہے یہ اپنی حالت پر نہایت خوش ہیں پھر تھوڑے دنوں میں کچھ نہیں رہتا یہ کیا بات ہے؟ اصل یہ ہے کہ ایسے مالوں میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

برکت کی حقیقت

لوگ برکت کی حقیقت یہ سمجھتے ہیں کہ تھوڑا روپیہ بہت سا ہو جائے حالانکہ یہ اس کی حقیقت نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ہر چیز ایک خاص کام کے لئے موضوع ہوتی ہے اس کا اس کام میں آنا تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ آئے تو بے برکتی ہے۔

مثلاً روپیہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے کھائیں پہنیں دنیا کی راحت حاصل کریں۔ تو اگر وہ کھانے پہننے کے کام میں آئے اور اپنے تن کو لگے تو برکت ہے اور اگر اس کام میں نہ لگے بلکہ فضول اڑ جائے تو بے برکتی ہے تو ایسے مال اکثر اپنے تن پر صرف نہیں ہوتے کہیں عطاروں کے یہاں جاتے ہیں کہیں ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں کہیں یار دوست کھا جاتے ہیں اپنے تن کو کچھ بھی نہیں لگتا۔

ایک شخص تھے اسی قسم کے ان کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی تھی ان کے صاحبزادے پتنگ پر سوار تھے روپیہ دواؤں اور ڈاکٹروں اور طبیبوں میں صرف ہوتا تھا اور پھر نوکر خوب کھاتے اڑاتے تھے چاروں طرف سے لوٹ ہو رہی تھی یہ حالت تھی کہ مہینہ میں پانچ سو روپے آتے ہیں وہ تھوڑے اور ہزار آتے ہیں وہ تھوڑے یہ اس قسم کے مال اتنی بڑی نحوست کی چیز ہیں۔

دیکھئے ہر شخص کے لئے تعطیل راحت کی چیز ہے مگر ان کے لئے مصیبت ہے کیونکہ اس روز لوٹ

کھسوٹ کرنے کی گنجائش نہیں ملتی ایک رشوت خور نے فوٹو میں اپنی تصویر کھنچوائی تھی جس کی شکل یہ تھی کہ وہ اپنی جیبوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔ لوگوں نے جو اس تصویر کو دیکھا تو بہت تعریف کی کہ بالکل اصل کے مطابق ہے ایک گنوار نے وہ تصویر دیکھی اور کہا کہ یہ تصویر تو بالکل غلط ہے لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ فرماتے ہیں کہ تصویر میں ہاتھ اپنی جیب میں دکھائے گئے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاتھ تو دوسروں کی جیب میں رہتے ہیں۔ دیہات کے لوگوں کا دماغ بڑا عمدہ ہوتا ہے اسی واسطے بڑے بڑے علماء دیہاتی ہوئے ہیں الا ماشاء اللہ کیسی گہری بات کہی کہ ان کے ہاتھ تو پرائی جیب میں ہوتے ہیں۔

سو تعطیل کے دن پرائی جیب ملتی نہیں اس لئے وہ ان کے لئے یوم ماتم ہے انہیں انتظار لگا رہتا ہے کہ کب تعطیل کا دن ختم ہو یہ کتنی بڑی نحوست ہے۔ اس رشوت کی۔

رشوت کی خرابی

پھر اس میں ایک اور خرابی ہے وہ یہ کہ دنیا میں بڑی چیز جاہ ہے حتیٰ کہ مال بھی اس عزیز نہیں ہے۔ دیکھئے مال کو جاہ کے واسطے صرف کر دیتے ہیں اور جتنی فضول خرچیاں کرتے ہیں اکثر اسی کے واسطے کرتے ہیں سب اخراجات کی تو حد بھی ہے اور مواقع جاہ میں خرچ کرنے کی کوئی حد ہی نہیں غرض زیادہ حصہ مال کا تفاخر اور ناموری میں صرف ہوتا ہے تو جاہ اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں مال کی بھی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی اور وہ اس رشوت میں بری طرح برباد ہوتی ہے سو اتنی بڑی نحوست عقلیہ ہے اس رشوت میں چنانچہ واللہ! آدمی رشوت لینے سے رشوت دینے والے کی نظر سے بالکل ہی گر جاتا ہے۔ وہ اس کو ایسا سمجھنے لگتا ہے جیسے خانسامہ اور پلہ دار کہ اب ہمارا سارا بوجھ یہ اٹھائے گا پھر کیا وقعت ہوئی ایسے شخص کی بعض لوگ آٹھ آنہ تک بھی نہیں چھوڑتے ایسے بدنیت ہوتے ہیں۔

ایک شخص ڈپٹی تھے اور قوم کے تھے برہمن۔ دورہ میں ایک زمیندار ان کے پاس آیا اور نذر دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اس کی جیب میں ایک روپیہ تھا اور ایک ادھنا ڈپٹی صاحب چونکہ گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے اس وجہ سے اس نے جلدی سے ہاتھ اونچا کر کے نذر پیش کر دی اور یہ دیکھا نہیں کہ میں کیا دے رہا ہوں جب گھر آئے تو دیکھا کہ جیب میں روپیہ موجود ہے اب یہ بڑے شرمندہ ہوئے کہ میں نے اس کو ادھنا دیدیا وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا اب یہ دوسرے پڑاؤ پر پہنچا اور روپیہ پیش کیا اور عذر کیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی میرا وہ ادھنا دے دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم برہمن ہیں ہمارا کام ایسا ہی ہے یہ کہہ کر ادھنا بھی رکھ لیا۔

یہ اوقات ہے ان لوگوں کی خیال فرمائیے بعض لوگ تاویل کر دیتے ہیں کہ لوگ خوشی سے دے جاتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے بھی کبھی خوشی سے رشوت دی ہے اپنے اوپر قیاس کرلیں اور اگر فرض کرلیا جاوے کہ خوشی ہی سے دیتے ہیں تو آخر ہمدردی بھی کوئی چیز ہے اسی کی رو سے ایسی رشوت سے انکار کردیا ہوتا۔

حضورؐ اور چندہ

دیکھئے رعایت وہ چیز ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چندہ آتا تھا۔ آپ بعض مواقع پر واپس کردیتے تھے ہر ایک کا چندہ آپ نہ لیتے تھے کسی چندہ جمع کرنے والے کو ایسا دیکھا ہے حضرت آج کل تو مال حرام تک واپس نہیں کرتے اور حضورؐ کے واپس کرنے کی یہ وجہ ہوتی تھی کہ اس شخص کو دینے کی گنجائش نہ ہوتی تھی اس لئے وہاں اس بات کا اندیشہ ہوتا تھا کہ شاید اس شخص کو فی الحال گرانی ہو یا بعد میں دینے سے پچھتاوے یا تکلیف اٹھاوے اور حضرت ابوبکرؓ کا سارا گھر لے لیا کیونکہ وہ صدیق اکبر بھی تھے۔ وہاں نہ طبع پر ناگواری کا شائبہ تھا نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا اس لئے لے لیا کیونکہ وہ تو آپؐ کے اندر فنا ہوگئے تھے غیریت بالکل اٹھ گئی تھی پھر ان میں یہ احتمالات کس طرح ہوسکتے تھے۔

مقام ابوبکرؓ و عمرؓ

یہی راز ہے اس کا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے تو اس پر ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد نبوت کا مستحق حضرت عمرؓ کو فرمایا حالانکہ حضرت ابوبکرؓ ان سے افضل تھے اس لئے ان کا استحقاق زیادہ معلوم ہوتا ہے تو اس کا راز ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ تو حضورؐ کے اندر فنا ہوگئے تھے وہ من بعدی میں داخل ہی نہ تھے وہ آپؐ کے غیر تھوڑا ہی تھے۔ وہ تو عین ہوگئے تھے یہ وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنے بعد ان کو مستحق نہیں کیا کیونکہ وہ تو معی تھے ان کو من بعدی کیسے کہا جاسکتا ہے۔

یہی راز ہے اس کا کہ حضرت صدیق اکبرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمرؓ پریشان ہوئے پریشانی تو بعد سے ہوتی ہے جو فانی ہوچکا ہے وہ بعد نہیں ہوتا وہ تو ہر وقت مشاہدہ کر رہے تھے پھر کیسی پریشانی حضرت ابوبکرؓ کی تو بڑی شان ہے ادنیٰ اولیاء اللہ کی حکایات لکھی ہیں کہ ان کے احباء کے انتقال پر بالکل رنج نہیں ہوا۔

چنانچہ ایک عورت تھیں ان کے چند اولاد کا انتقال ہو گیا تھا وہ روئیں تک نہیں اور کہا کہ میں روؤں کیوں خدائے تعالیٰ کی قسم میں تو ان کو دیکھتی ہوں میرا دل خوش ہے پھر میں کس لئے روؤں۔ تو جیسے ان کو اپنے عزیز کا مشاہدہ تھا حضرت ابوبکرؓ کو اس سے بڑھ کر حضورؐ کا مشاہدہ تھا۔ گو ان کو ظاہراً بعد ہو گیا تھا مگر بعد باطنی نام کو نہ تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جزو کی مثل تھے۔

چندہ میں بے احتیاطی

حاصل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا سارا مال لے لیا کیونکہ وہ فانی ہو چکے تھے اور ایک غریب شخص مال لایا تو آپ نے واپس کر دیا اور فرما دیا کہ جاؤ اپنا مال اٹھا لو۔ آج ایسے شخص کا چندہ فخر کے ساتھ لیا جاتا ہے جو یوں کہے کہ میں نے اپنے پاس کچھ نہیں چھوڑا۔ اور اس پر کہتے ہیں کہ ان میں ایسی حمیت قومی ہے کہ سارا گھر لا کر رکھ دیا ایسے اور ایسے ہیں۔

میں تو ایسے چندہ دینے والوں کو کہا کرتا ہوں کہ کام ہوش سے کرو۔ جوش سے مت کرو۔ (جوش میں سارا گھر لا دیا اور بعد میں جب ضرورت واقع ہوئی تو ہوئے پشیمان) اگر جوش کو فضیلت ہوتی تو انبیاء علیہم السلام کا زیادہ حصہ مجذوب ہوتا ان میں عقل نہ ہوتی حالانکہ وہ اس قدر ذوی ہوش اور صاحب عقل تھے کہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جب یہ بات ہے کہ لوگ جوش میں آ کر ایسا کر گزرتے ہیں تو اگر کوئی شخص لیکچر دے یا وعظ کہے اور کسی کے پاس صرف دس ہی روپیہ ہیں اور اس نے جوش میں آ کر دس کے دس ہی دے دیئے تو اس کا چندہ لینا درست نہیں اس کو ہوش ہونے دو اس کے بعد اس سے کہو کہ تمہاری آمدنی ایک مہینہ کی دس روپے ہیں ابھی ایک مہینہ پڑا ہے۔ تمہارے اہل وعیال ہیں ان کے خرچ کو چاہیئے وہ اس سے مقدم ہیں اگر بڑا ہی شوق ہے چندہ دینے کا تو ایک روپیہ مہینہ کر دو۔

غرض تمہارے ہی مذاق پر قومی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے آج کل قومی ہمدردی کو ذبح کیا جاتا ہے چکی پیسنے والے تک چندہ سے نہیں چھوڑ جاتے۔

بعض نے سل بٹہ بیچ کر چندہ دیا۔ ایسی بے جا رقموں میں کیا برکت ہوگی نیز چندہ میں بعض ناجائز صورتیں تجارت کی رکھی ہیں جو شریعت میں حرام ہیں۔

مثلاً کسی غریب سے ترغیب ہی کی نیت سے کہا ایک روپیہ چندہ میں دے دینا جب اس نے ایک روپیہ دیا اب اس روپیہ کی بولی بولی گئی کہ اس متبرک روپیہ کو جو کہ نہایت جوش وخلوص سے اپنی

حیثیت سے زیادہ دیا گیا ہے اور اس لئے متبرک ہے کون خریدتا ہے اب کسی نے اس کے دس لگائے اور کسی نے سو اور کسی نے ہزار۔ لوگ جوش میں آ کر بڑی بڑی رقمیں بولتے ہیں۔ تو یہ ربوا ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

نیز اس لئے بھی کہ یہ پالیسی ہے چندہ وصول کرنے والے کسی غریب کو خود کھڑا کر دیتے ہیں اور اس پالیسی سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ شریعت پالیسی کو جائز نہیں کہتی۔ شریعت گندہ سمجھتی ہے ان حرکتوں کا وہاں تو دار و مدار صدق و خلوص و سادگی پر ہے کہ بات سچی ہو اور یہ چندہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ محض نمائش و سازش سے دیا جاتا ہے لوگ جوش میں آ کر ایک روپیہ کو ہزار روپیہ سے خریدتے ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی خلوص سے دے رہا ہے تو وہ ایک روپیہ ہی برکت کا ہے۔ ایسی برکت کی چیز ہاتھ سے دے کر ہزار روپیہ لے لئے تو وہ اس کے مصداق ہیں۔ **اتستبدلون الذی هو ادنیٰ بالذی هو خیر** (کیا تم بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لیتے ہو) جب حقائق پر نظر ہو تو اس کی برائیاں محسوس ہو سکتی ہیں حضرت چندہ میں یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔ یاد رکھو کہ ایسے جوش کی حالت میں جس میں آدمی مغلوب العقل ہو جائے اور بعد میں پچھتائے خود چندہ لینا ہی ناجائز ہے جوش سے جب کوئی دے تو مت لو۔ ہاں جب ہوش درست ہو جائے اس وقت لے لو۔

پیروں کی حالت

اسی طرح آج کل کے پیروں کی حالت دیکھو۔ تو عجیب ہے ان کو تحصیل مال میں بالکل احتیاط نہیں نذرانے معین ہیں تقاضے کر کر کے وصول کرتے ہیں خواہ کسی کے پاس بھی نہ ہو اور دل تنگ ہو کر قرض ادھار کر کے لایا ہو اور دل میں چاہے کوستا ہی ہو مگر انہیں لینے سے کام معمولی دعوت بھی منظور نہیں کرتے۔ دعوت میں کم از کم مرغ تو ہو بلکہ خود فرمائش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو مسی روٹی کی استطاعت ہو تو شاہ صاحب کے منہ میں نہ چلے اس طرح خلق اللہ کے گلے گھونٹتے ہیں۔ حدیث میں ہے **لایحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس**[1] غرض شاہ صاحب مریدین میں جا کر کچھ اور بن جاتے ہیں انسان تھوڑا ہی رہتے ہیں۔ لوگ ان کو جوتا تک اٹھانے نہیں دیتے کیونکہ ان کے ہاتھوں کو اتنا متبرک سمجھتے ہیں کہ جوتے کا ان کے ہاتھوں کو مس ہونا ان کی شان کے

---

[1] کتاب التمهید لابن عبدالبر ۱۰: ۲۳۱

خلاف سمجھتے ہیں اگر یہی ہے تو پاؤں سے بھی نکال لینا چاہئے کوئی جوتا ان کے پاؤں میں نہ چھوڑنا چاہئے یعنی جب جوڑا بدل کر آدیں پاؤں میں سے نکال لینا چاہئے کیونکہ جیسے ہاتھ متبرک ہیں پاؤں بھی متبرک ہیں لہذا جوتے کو ان کے پاؤں کے ساتھ بھی مس نہ ہونے دینا چاہئے۔

یہ ساری خرابی اس کی ہے کہ پیر اپنے کو ہر بات میں ممتاز رکھتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کا ان کے ساتھ ایسا خیال ہو گیا ہے جب وہ ہر چیز میں اپنے کو ممتاز رکھتے ہیں ان کا کھانا اور پہننا اور ہر چیز ممتاز ہے تو ان کی جنت بھی اور ہی ہونی چاہئے اگر کہیں جولاہے تیلی کے ساتھ جنت میں رہے تو قیامت ہی قائم ہو جائے گی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آج کل شاہ صاحبوں کی تو یہ حالت کہ سب سے ممتاز ہو کر رہتے ہیں۔

معاشرت رسول ﷺ

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کیفیت کہ اس طرح رہتے تھے کہ پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ صدر کون ہیں چنانچہ باہر کے ناواقف لوگ آتے تو ان کو پوچھنے کی ضرورت ہوتی اور وہ پوچھتے **من محمد** فیکم صحابہ فرماتے **ھذا الابیض المتکئ** کہ یہ جو گورے چٹے تکیہ کئے بیٹھے ہیں یہ ہیں محمدؐ۔ صحابہ ؓ کے بتلانے سے پتہ چلتا ہے یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویسے پتہ نہ چلتا تھا۔ بیٹھنے میں تو آپ کی یہ حالت تھی۔

چلنے میں یہ حالت تھی کہ کچھ صحابہ ؓ آگے کر دیئے اور کچھ پیچھے کر دیئے کبھی کوئی آگے ہو گیا کبھی پیچھے ہو گیا ملے جلے چلتے تھے پتہ نہیں چلتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ سو آپ کی تو یہ حالت اور آج بزرگی کے یہ معنی ہو گئے کہ سب سے ممتاز ہو۔

بہر حال یہ ہماری ہمدردی اور یہ ہماری محبت ہے کہ ایک شخص نے ہمارے سامنے سارا گھر لا کر رکھ دیا اور ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کیا یہی ہمدردی ہے کہ سب سنگوالو اور اس کو مفلس کر دو۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ ہوش سے کام لو جوش سے مت لو چندہ دینے والے کو بھی نہ چاہیے کہ جوش میں آ کر اپنے کو بالکل خالی کر دے اور چندہ لینے والوں کو بھی اس کا خیال چاہئے کہ ایسا چندہ نہ لیں تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ جوش میں آ کر ایسا کر گزرتے ہیں اور بعد کو پشیمان ہوتے ہیں جوش میں اکثر عقل مغلوب ہوتی ہے اس لئے جلدی نہ کرے جب جوش کا خاتمہ ہو جاوے اس وقت جو کام مناسب سمجھے کرے۔

قابل قدر عقل

عقل ایسی چیز ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمرؓ اس وقت کیا حال ہو گا جب قبر میں رکھے جاؤ گے اور فرشتے کڑکتے ہوئے گرجتے ہوئے تمہارے پاس آویں گے اور تم سے پوچھیں گے من ربک ما دینک اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلا دیجئے کہ عقل بھی اس وقت رہے گی یا نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل تو دنیا سے بھی زیادہ ہو گی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عقل ہمارے پاس ہو گی تو پھر کیا اندیشہ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عقل سے کام لیں گے اور جواب صحیح دیں گے۔

تو عقل اتنی بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی آج کل لوگ عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں بے عقلی کی قدر کرتے ہیں بزرگوں میں بھی لوگوں کو مجذوب ہی پسند ہیں جس میں عقل نہ ہو اور جو عقل سے کام لیتے ہیں ان کو بزرگ نہیں سمجھتے بلکہ ان کو عقل پرست کہتے ہیں۔ اے صاحبو! عقل بڑی نعمت ہے خدا تعالیٰ کی اسی وجہ سے تمام انبیاء عقل میں کامل ہوئے ہیں بتلائیے تو سہی انبیاء علیہم السلام میں کوئی مجذوب بھی ہوئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ چندہ دینے والے بھی عقل سے کام لیں اور چندہ لینے والے بھی یہ انہماک جو چندہ میں ہوتا ہے جس کے پیچھے عقل ہوش سے بھی گزر جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ کام زیادہ پھیلا دیتے ہیں سب سے پہلے اس کی اصلاح کرو یعنی کام جتنا ہو سکے اور جتنی وسعت ہو اتنا کریں۔ جو نہ ہو سکے نہ کریں بہر حال چندہ میں اس کی ضرور احتیاط رہنی چاہئے کہ ناجائز طریقہ سے وصول نہ کیا جاوے۔

اہل چندہ مسجد اور مدرسہ کے لئے بھی تو اس کی احتیاط نہیں کرتے انہیں اس سے غرض ہوتی ہے کہ چندہ ملے چاہے جس طرح بھی ملے۔ اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح چندہ کرنا جائز نہیں تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اپنی ذات کیلئے تھوڑا ہی کرتے ہیں ہم تو خدا کے لئے کرتے ہیں اور بعض چندہ وصول کرنے والوں کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے غیرت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے اور آدمیت سے بھی گذر گئے ہیں۔

چنانچہ جب علی گڑھ یونیورسٹی کا چندہ ہوا ہے اس زمانے میں ہمارے یہاں سے ایک برات

قصبہ جھنجانہ گئی تھی ایک لیڈر صاحب چندہ وصول کرنے والے اس برات میں تھے۔ دستور یہ ہے کہ جب دلہن کو ڈولے میں سوا کرتے ہیں تو ڈولے پر بکھیر ہوتی ہے اور بھنگی اس کو لوٹتے ہیں اور عرفاً انہیں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ جس وقت پیسوں کی بکھیر ہوئی تو لیڈر صاحب پیسے لوٹنے کے لئے بھنگیوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور تین آنے کے پیسے اکٹھے کئے تعجب ہے کہ اگر کوئی مولوی ایسا کرے تو اس کو وحشی اور دون ہمت شمار کریں اور ان کا ہر فعل تمدن و ترقی سمجھا جاتا ہے غرض یہ کہ انہوں نے بھنگیوں کے ساتھ شامل ہو کر پیسے لوٹے پرانے لوگوں کو ان کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اتفاق سے نماز کا وقت آ گیا نماز کے لئے یہ مسجد میں گئے اور جماعت ساتھ کھڑے ہونے لگے جماعت میں ایک ظریف بھی تھے انہوں نے کہا کہ ذرا ہٹ کر کھڑے ہو اس لئے کہ جس وقت آپ پیسے لوٹ رہے تھے تو بھنگیوں کا بدن آپ سے ملتا تھا اور پسینہ آپ کو بھی آ رہا تھا اور ان کو بھی ہٹو الگ کھڑے ہو اس لئے کہ جس وقت آپ پیسے لوٹ رہے تھے تو بھنگیوں کا بدن آپ سے ملتا تھا اور پسینہ آپ کو بھی آ رہا تھا اور ان کو بھی ہٹو الگ کھڑے ہو یہ تو کیفیت تھی ان کی کہ لوگ اپنے پاس بھی کھڑا نہ ہونے دیتے تھے اور ان کو اس پر بڑا فخر تھا اگر ایسی ہی بے حسی ہے تو ایسے موقع پر بھنگی ہی کیوں نہ بن جائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے یہ افعال کون سے اصول پر مبنی ہیں یہ ساری خرابیاں اس کی ہیں کہ علماء کی تقلید کو تو چھوڑ رکھا ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورانہ اختیار کرلی ہے۔

کورانہ تقلید

کورانہ تقلید پر مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی سیاہ تھے وہ کسی خانقاہ میں آکر ٹھہرے۔ وہاں اہل توکل اور اہل تاکل دونوں قسم کے لوگ تھے ان شاہ صاحب کی سواری میں گدھا تھا اس کو تھان پر باندھ دیا سائیں کو حفاظت کے لئے وہاں چھوڑ دیا اس پر جو نیند کا غلبہ ہوا تو وہ پڑ کر سو رہا۔ اہل خانقاہ نے کیا کیا کہ اس گدھے کو وہاں سے کھولا اور بازار میں لے جا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت سے کھانا تیار کیا کھانے کے بعد سماع شروع ہوا اور سماع میں ان لوگوں نے یہ شرارت کی کہ حال لانا شروع کیا اور اس میں کہنے لگے۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت
(گدھا گیا' گدھا چلا گیا' گدھا چلا گیا)

شاہ صاحب اس کا مطلب خاک نہ سمجھے اور ان کے دیکھا دیکھی آپ نے بھی یہی کہنا شروع کیا کہ خر برفت و خر برفت و خر برفت اب سائیں کی جو آنکھ کھلی تو دیکھتا کیا ہے کہ گدھا ندارد۔ وہ گھبرایا ہوا شاہ صاحب کو خبر کرنے دوڑا تو انہیں یہ کہتا ہوا پایا خر برفت و خر برفت و خر برفت۔ وہ سمجھا کہ انہیں گدھے کے چلے جانے کی پہلے ہی سے خبر ہے وہ یہ سمجھا کہ اپنی جگہ جا کر سو رہا اب صبح کو جو شاہ صاحب نے تھان پر اپنا گدھا نہ پایا تو غل مچایا کہ میرا گدھا کہاں گیا۔ اہل خانقاہ نے کہا کہ ہم کو کیا خبر شاہ صاحب بولے کہ مجھ کو کیا خبر تھی پھر سائیں پر خفگی شروع کی کہ تو نے کس واسطے خبر نہیں کی اس نے کہا کہ میں تو خبر کرنے کے لئے آیا تھا یہاں آ کر دیکھا تو آپ خود ہی فرما رہے تھے کہ۔

خر برفت و خر برفت و خر برفت
(گدھا گیا' گدھا چلا گیا' گدھا چلا گیا)

میں سمجھا کہ آپ کو پہلے ہی خبر ہو گئی پھر میں کیا خبر کرتا رونے لگے مجھ کو تو کچھ بھی خبر نہ تھی سب کہہ رہے تھے میں بھی کہنے لگا۔

بہر حال ایک تو کورانہ تقلید ہوتی ہے جس کے یہ نتائج ہیں اور ایک تقلید علماء کی ہے جس پر مدار ہے دین کا تو ان لوگوں کو علماء کی تقلید سے تو عار آتی ہے اور دوسری قوموں کی تقلید کورانہ کرتے ہیں اور یہی جڑ ہے تمام خرابیوں کی پس اس قسم کے لوگ جس طرح چندہ میں غیر قوموں کی تقلید کرتے ہیں اسی طرح قومی ہمدردی میں بھی غیر قوم کے مقلد ہیں۔

جس زمانہ میں جنگ طرابلس اور اٹلی ہو رہی تھی ان حضرات نے طرابلس کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہی تو اس میں بھی غیر قوموں کے مقلد بنے (غیر قوموں کا یہ طریقہ ہے کہ جب اپنے طرف دار کے ساتھ کوئی لڑتا ہے تو مخالف کا مال جو ان کے ملک میں آتا ہو اس کو خریدنا موقوف کر دیتے ہیں تا کہ اس کو ضرر پہنچے تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا) کہ ٹرکی کی ٹوپی جو اٹلی سے آتی تھی اس کی خریداری بند کر دی تا کہ اس کی تجارت میں کمی واقع ہو اور اس سے اس کو ضرر پہنچے اور جو ٹوپیاں پہلے کی خریدی ہوئی تھیں ان کو آگ میں جلا دیا مگر یہ خوب بات ہے کہ غصہ تو اٹلی پر اور اس میں ناس کریں اپنا نیز ان کی خریداری بند کر لینے سے اس کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ یہ ہیں ہی کیا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔

ہم میں اور ان غیر قوموں میں بڑا فرق ہے اور قوموں میں اتفاق ہے وہ جب خریداری چھوڑتے ہیں تو ایک دم سے سب چھوڑتے ہیں اور ہمارے اندر اتفاق نہیں ہم اگر خریداری چھوڑیں گے تو خاص ہی خاص لوگ ہوں گے جو اس میں ساتھ دیں۔ لہذا وہ قومیں جو ایسا کرتی ہیں

تو ان کا فعل موثر ہے اور ہمارا فعل کچھ بھی موثر نہیں بلکہ ہمیں الٹا ضرر پہنچتا ہے یہ لوگ عقل کے مدعی ہیں اور پھر ایسی حماقتیں کرتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ عقل کے کیا معنی ہیں بس آج کل کی عقل دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را   بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(میں نے دور کا سوچنے والی عقل کو بڑا آزمایا پھر اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

ایسے لوگوں نے چندہ میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے اور معاشرت میں بھی وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو غیر قوموں کا ہے۔ ہر بات میں غیر قوموں کے مقلد ہیں اب ایسے جوش کے چندہ کے متعلق ایک مسئلہ سنو خوب یاد رکھو کہ جو شخص جوش میں آ کر اپنی حیثیت سے زیادہ چندہ دیتا ہے وہ مغلوب العقل کے حکم میں ہوتا ہے ایسی حالت میں اس سے چندہ لینا اور اس کو خالی کر کے چھوڑ دینا دین کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ یہ اس کو فقیر کر دینا ہے۔

ناجائز آمدنی

میں رشوت کے متعلق عرض کر رہا تھا درمیان میں چندہ کا بھی ذکر آ گیا۔ ذکر یہ تھا کہ رشوت ایسی ذلیل چیز ہے کہ اس سے آدمی نظر سے گر جاتا ہے یہ نحوست عقلی ہے اس میں اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قومی ہمدردی کے بھی بالکل خلاف ہے اگر شریعت کے حکم کو نہ دیکھا جائے تو خود عقل بھی اس کو ناجائز بتلاتی ہے اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ لوگ خوشی سے دیتے ہیں جو لوگ رشوت دیتے ہیں تو نقصان پہنچنے کے خیال سے دیتے ہیں خوشی سے کوئی نہیں دیتا جو دیتا ہے مجبور ہو کر دیتا ہے اس لئے یہ ہمدردی کے بھی خلاف ہے۔

اسی طرح بیرسٹری کی آمدنی ہے کہ قطع نظر اس کے کہ شریعت کے نزدیک یہ کیسی ہے خود ہمدردی کے بھی خلاف ہے اس کی تو یہاں تک کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی دکانداری ہو گئی کسی پر مقدمہ ہو جاوے اور وہاں کو وکیل بنانا چاہے تو کہتے ہیں کہ ہر پیشی پر پہلے اتنا لے لوں گا جب کام کروں گا اس کا مطلق خیال ہی نہیں ہوتا کہ اس بیچارے کو اتنی مقدار دینے کی گنجائش بھی ہے یا نہیں بلکہ اگر وہ کہتا ہے کہ کچھ کم لے لیجئے تو بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ نرخ بگڑتا ہے یہ تو ہمدردی ہے پھر مذہبی حالت ان حضرات کی قابل دید ہے۔

میرٹھ کا واقعہ ہے کہ ایک بیرسٹر صاحب کے پاس کچھ لوگ عید کے دن ملنے گئے تو آپ کہتے

ہیں کہ وکیل آج آپ لوگوں کی عید ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری عید نہیں ہم اسلام ہی میں داخل نہیں یہ ان لوگوں کی مذہبی حالت ہے۔

پھر مقدمہ کی پیروی پر تو لیتے ہی ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ذرا رائے دے دی اور پانچ سو روپیہ لے لئے شریعت میں رائے پر محنتانہ لینا جائز بھی نہیں۔ یہ رشوت محضہ ہے۔ اس بارہ میں میرا ایک رسالہ بھی ہے اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کو متقوم نہیں قرار دیا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا۔ آپ نے سو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو یہ سو روپیہ واجب الادا ہیں اور حق شفعہ بھی نہیں رہا کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپیہ لے لئے یہ پچاس روپیہ حرام ہیں اکثر لوگ رشوت مقدمات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں حالانکہ یہ سب بھی رشوت میں داخل ہیں حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی اور اگر یہ سب متقوم ہیں تو ان پیر کا مذاق بھی معتبر ہونا چاہئے جن کا قصہ عرض کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ میں بنگالہ میں تھا وہاں ایک شاہ صاحب کی دعوت کی گئی اور کھانے کے بعد ان کو پچاس روپے دیئے گئے وہ اس پر راضی نہ ہوئے آخر مشکل سے دو سو روپیہ پر صلح ہوئی بس دعوت کھانا بھی ایسی محنت مشقت کا کام ہے جس کے کھلانے والوں کو اجرت دینی پڑتی ہے۔

ایک شخص تھے وہ مولود شریف پڑھا کرتے تھے اور پانچ روپیہ ان کا نذرانہ تھا ایک مرتبہ کہیں مولود شریف پڑھنے گئے اور کرتہ ان کا بہت پرانا ہو گیا تھا انہوں نے سوچا کہ کسی طرح نیا کرتہ لینا چاہئے بس انہوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک شعر پڑھا اور اس پر حال طاری کیا اور جھر سے اپنا کرتہ پھاڑ ڈالا میزبان کو شرم معلوم ہوئی کہ بلا کرتے کے رخصت کرے اور اس لئے ان کو نیا کرتہ بنا کر دینا پڑا ان حضرت نے پانچ روپے تو الگ لئے اور کرتہ الگ لیا نقصان اس لئے کیا تھا کہ آمدنی ہو جائے گی بجائے پرانے کرتے کے نیا مل جائے گا یہ ترکیب ہے وصول کرنے کی۔

تو جیسے انہوں نے کرتہ پھاڑنے کا عوض لیا اسی طرح ان شاہ صاحب نے دعوت کھانے کا عوض لیا خوب سمجھ لو کہ ایسے اعمال کی قیمت لینا رشوت میں داخل ہے۔

رائے اور مسئلہ کی قیمت

اسی طرح سے رائے دینا بھی ہے کہ اس کی قیمت لینا جائز نہیں۔ اگر رائے کی قیمت ہے تو جو

بھی کوئی رائے دے دے قیمت لے لیا کرے اگر کہو کہ اوروں کی رائے میں اور ہماری رائے میں فرق ہے کہ ہم قانون دان ہیں۔ ہماری رائے سے لوگوں کا کام چلتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کوئی رائے دے دی تو اس میں کون سی محنت پڑی اور اگر کہو کہ اس میں محنت یہ ہے کہ سوچنا پڑتا ہے یہ دماغ خرچ کرنے کی قیمت ہے تو میں کہوں گا کہ اگر محنت اس کا نام ہے تو پھر رومال میں روپے باندھنے پڑیں گے اور پھر گھر تک لانے پڑیں گے پھر ان کو صندوق میں رکھنا پڑے گا ان سب باتوں کی بھی قیمت ہونی چاہیے کیونکہ ایسی محنت ان کے اندر بھی ہے بس اس کا سارا گھر لے لو۔

اسی طرح مسئلہ بتلانے کی قیمت لینا جائز نہیں کیونکہ اس میں دین فروشی ہے اور وہ حرام ہے البتہ تعلیم دین بطرز تدریس پر اجرت لینا جائز ہے کیونکہ اس میں مشقت ہے لیکن مسئلہ بتلانے کی کیا اجرت بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پانچ روپے لاؤ جب مسئلہ بتلائیں گے۔ یہ جائز نہیں ایک شخص نے تو کمال ہی کر دیا کہ ایک فتویٰ دیا اور ہزار روپیہ لے لیا۔ فتوے میں عجیب تماشا یہ کیا کہ پھیر پھار کے ایسی صورت نکالی کہ ساس سے نکاح کرنا جائز کر دیا۔

قصہ یہ تھا کہ ایک شخص ساس پر فریفتہ ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا مگر ایسی مشہور بات تھی کہ عامی تک جانتا ہے کہ ساس سے نکاح حرام ہے اس لئے اس کی جرات نہ ہوئی وہ شخص ایک دکاندار مولوی کے پاس جو کہ اتفاق سے غیر مقلد بھی تھے پہنچا اور ان سے کہا کہ کوئی ترکیب ایسی بتلایئے کہ ساس حلال ہو جاوے اور ایک ہزار روپیہ سامنے رکھ دیا۔ شیطان تو بڑا استاد ہے اپنے فن کا بڑا عالم ہے۔ اس نے ایک ترکیب سمجھائی آپ نے فتویٰ لکھا کہ ساس وہ ہوتی ہے جو منکوحہ کی ماں ہو تو اس کی بیٹی اگر منکوحہ ہو تو یہ ساس ہو گی ورنہ ساس نہ ہو گی لیکن اکثر جاہل عورتیں بعض اوقات کلمات کفریہ بک دیا کرتی ہیں اسی طرح اس کی بیوی نے بھی نکاح سے پہلے کلمات کفریہ ضرور کہے ہوں گے اور نکاح کے وقت تجدید ایمان کرائی نہ تھی پس اس عورت کا نکاح صحیح نہیں ہوا اس لئے یہ منکوحہ نہیں ہوئی جب یہ منکوحہ نہیں ہوئی تو وہ ساس نہ ہوئی بس نکاح جائز رہی یہ بات کہ زنا اور مس بالشہوت سے حرمت مصاہرت تو ثابت ہو جاتی ہے تو یہ صرف حضرت ابوحنیفہؒ کی رائے ہے جس کو ہم نہیں مانتے کیا ترکیب ہے واللہ! یہود نے بھی ایسی تحریف نہ کی ہو گی۔

یہ ہے دین فروشی رشوت بھی لی تو کتنے برے طریقے سے سچا مسئلہ بتلا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں چہ جائیکہ دین میں تحریف کر کے ہاں کتابت کی اجرت لینا جیسے فرائض لکھنے میں یہ جائز ہے۔

مگر اس کے اثر پر بھی اگر نظر کیجئے تو یہ بھی برائی سے خالی نہیں وہ اثر یہ ہے میں نے خود دیکھا ہے کہ لوگ مفتی سے فرمائش کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھئے گا۔ ایسی فرمائش اس لئے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں ورنہ کیوں ہمت ہو۔

ایک شخص نے میرے سامنے فرائض پیش کی اور یہ کہا کہ جلدی مل جائے اور ایک روپیہ دور سے میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق المحنت ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جایئے وہ جلدی اس لئے مچا رہے تھے کہ ایک روپیہ بھی دیا تھا ورنہ کیوں جلدی مچاتے۔ مجھ کو ان کے جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں پر رنج ہوا کہ نہ وہ لیتے نہ لوگوں کو ایسی جرات ہوتی۔

ایک صاحب رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لائے انہوں نے ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہوگئی جب معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں تو ریاست کیا کرتے ہوں گے تو ان حضرت نے حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو کھانے کے بعد ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے جیسے بھٹیارے کے یہاں پھینک دیتے ہیں اس وقت ایک بزرگ مولوی صاحب بھی مہمان تھے ان کو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا میں نے ان سے کہا کہ بس میں ہی نمٹ لوں گا آپ خاموش رہیے۔ میں نے وہ روپیہ ان ہی پر کھینچ مارا اور میں نے کہا کہ جناب تہذیب سیکھئے آپ کو اتنی تمیز نہیں مجھے ان سے زیادہ اپنے ہم طبقہ لوگوں پر افسوس ہوا کہ ان کے لینے ہی کی وجہ سے یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔

مشائخ کی حالت

آج کل کے مشائخ نے ناس کر رکھا ہے۔ یہ حالت ہے کہ ایک درویش میرے یہاں آئے ان کے ایک خلیفہ بھی ان کے ساتھ تھے جو کہ اہل علم میں سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ پر قرضہ ہو گیا ہے میں نے کہا کیسے ہو گیا وہ بولے کہ مرید کھا گئے دو دو مہینے پڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں میں نے اس توقع پر قرض لے کر کھلا دیا کہ نذرانہ دیں گے نذرانہ دیا نہیں میں نے کہا کہ آپ نے یہ بھی سوچا تھا کہ دوں گا کہاں سے کہنے لگے کہ نذرانے کی امید پر ایسا کرتا رہا اس کے بعد کہا کہ آپ پریذیڈنٹ بہاولپور کو سفارشی خط لکھ دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دے دیں میں نے کہا کہ آپ ادا کہاں سے کریں گے کہنے لگے کہ مریدوں سے جو ملے گا اس سے ادا کروں گا میں نے کہا کہ یا اللہ! ابھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے ان کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی پھر جب انہوں نے میرے عذر کرنے پر بھی اصرار کیا تو میں نے ان کی وجاہت کی وجہ سے خط لکھ دیا اور ان کو دے دیا پھر

میں نے دوسرا خط بذریعہ ڈاک پریذیڈنٹ کے پاس بھیج دیا کہ ایسا ایسا خط لے کر ایک صاحب آپ کی خدمت میں آئیں گے۔ اس پر عمل نہ کیجئے گا بلکہ جیسی آپ کی مصلحت ہو ویسے کیجئے گا چنانچہ ان کے پاس سے میرے ہاں جواب آ گیا کہ آپ اطمینان رکھیں جو مناسب ہوگا وہی کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں مشائخ کی یہ حالت ہو رہی ہے مجھے ایک بزرگ کا قول پسند آیا ایک شخص ان کے پاس روپیہ لایا اور کہا یہ میرے بھائی نے بھیجا ہے اور رسید لینے کو لکھا ہے سو رسید دے دیجئے اور بات یہ تھی کہ بھیجنے والے کو اپنے بھائی پر اعتماد نہ تھا۔ ان بزرگ نے کہا کہ لو اپنا روپیہ کہیں رشوت کی بھی رسید ہوتی ہے۔

جیسے لوگ سررشتہ دار کو دیتے ہیں کہ کچھ کر دیں گے ایسے ہی ہمیں سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں دیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ سے کچھ کہہ دیں گے ہے تو یہ ایک لطیفہ مگر ایک نتیجہ خیز بات ہے سو نذرانہ کی یہ حالت ہو گئی ہے۔

بعض لوگ اس خیال سے دیتے ہیں کہ پیر یوں کہیں گے کہ کیسا مرید ہے۔ نذرانہ ہی نہیں دیا اب تو پیروں کے مہینہ اور فصلانے اور ششماہی معین ہیں بڑے بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے یہاں خالی جاوے خالی آوے یہ ایک جملہ بنایا ہے معنی تو اس کے صحیح تھے مگر بے محل اس کا استعمال کرتے ہیں۔ صحیح معنی اس کے یہ ہیں کہ جو خالی جاوے خلوص سے تو وہ خالی آوے گا فیوض سے اور یہ معنی نہیں کہ جو خالی جاوے فلوس سے بلکہ ایسا قصداً کرنا چاہئے کہ شیخ کو کبھی دو اور کبھی نہ دو۔ اگر ایسا کرو گے تو ان کی نیت بھی نہ بگڑے گی ورنہ یہ حالت ہوتی ہے کہ مرید کی صورت دیکھی اور خیال ہوا کہ اب کچھ دیگا مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں اگر پیر میں حرص پیدا ہو گئی مرید کے عمل سے تو اس نے پیر کا ناس کر دیا۔

پھر تو وہ ایسی پیری مریدی ہوگی جیسے کسی مرید نے اپنے پیر سے کہا تھا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری نجاست سے پیر نے کہا کہ تم ہی ہو اور ہم ہی ہیں۔ مرید نے کہا کہ ابھی خواب ختم نہیں ہوا آگے بھی تو سنئے۔ پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں اس پر پیر صاحب بہت بگڑے اور مرید کو بہت برا بھلا کہا مرید نے کہا کہ حضرت آپ برا مانیں یا بھلا مگر دیکھا تو اسی طرح ہے۔

اب اس میں دو احتمال ہیں یا تو دل لگی کے طور پر اس نے یہ بات گھڑی تھی یا واقعی خواب تھا اگر خواب تھا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ مرید نے تو پیر سے دین کے لئے تعلق رکھا تھا اور پیر نے مرید سے دنیا

کی غرض سے تعلق رکھا تھا۔ اور اگر یہ خواب گھڑا ہوا ہے تو یہ ایک تمثیل ہے ایسے شیخ اور مرید کے تعلق کی اور تمثیل بھی نہایت غضب کی ہے واقعی نذرانہ کی پیری مریدی کی بالکل۔ یہی حالت ہوتی ہے ایسے پیروں سے بڑا ضرر پہنچتا ہے مرید نذرانہ دے کرین سے بالکل سبکدوش ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم نے سب حق ادا کر دیا یہ لوگ ڈاکو ہیں دین کے اور اس دین کے ڈاکو سے وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جرات کر کے بندوق و تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے آپ کو بے جرم جانتے ہیں اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں اس لئے وہ اچھے ہوں گے اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ جامی کا ارشاد ہے۔

گنہ آمرز رندان قدح خوار   بطاعت گیر پیران ریا کار

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں آمدنی کے یہ ابواب ہیں جن کو میں نے بیان کیا اور یہ بے احتیاطیاں ہو رہی ہیں۔

حلال وحرام کی تمیز

اموال کے حاصل کرنے میں حرام وحلال کی بالکل تمیز نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ قلب میں نور نہیں ہوتا۔ نماز پڑھتے ہوئے مدتیں ہو گئیں مگر قلب میں نورانیت نہیں ان میں سے بعض کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ حلال دنیا میں مفقود ہو گیا ہے اسی وجہ سے وہ حلال کی فکر ہی نہیں کرتے۔ شیطان نے ان کو یہ پٹی پڑھائی ہے اور اپنے نزدیک بڑے متقی ہیں کہ کسی چیز کو حلال ہی نہیں سمجھتے مگر اس کا انجام یہ ہے کہ پھر ایسے لوگ بالکل احتیاط نہ کریں گے جو چیزیں صریح حرام ہیں ان سے بھی پرہیز نہ کریں گے۔ سمجھ لیں گے کہ حلال کا تو وجود ہی نہیں اور حرام حرام سب برابر۔ اس لئے کسی چیز کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ بقولے کہ

جو آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یکدست

(جب پانی سر سے گزر گیا تو ایک نیزہ کیا اور ایک ہاتھ کیا)

شیطان کی پٹی پڑھانے کا یہ نتیجہ ہو گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ محض غلط ہے کہ حلال کا وجود دنیا میں نہیں اور یہ صرف شیطانی دھوکہ ہے کہ وہ اس طریقہ سے حرام میں مبتلا کرنا چاہتا ہے میں حرام وحلال کا معیار بتلاتا ہوں اس کو سمجھ لینا چاہئے

معیار یہ ہے کہ فتویٰ فقہی جس چیز کو کہہ دے کہ یہ حلال ہے تو وہ حلال ہے اور جسے کہے کہ یہ حرام ہے تو وہ حرام۔ یہ وہ وقت ہے کہ آج کل مشتبہ چیز کو بھی حلال کہا جاتا ہے نہ کہ حلال کو بھی اس میں شبہات نکال کر حرام کر دیا جائے بس یہ معیار یاد رکھو کہ جس کو فتویٰ فقہی حلال کہہ دے بس وہ حلال ہے اصل میں بعض واعظین نے ایسی ایسی حکایات بیان کر کے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہے۔

ایک حکایت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے ان کا کھیت تھا اتفاق سے ان کا بیل دوسرے کے کھیت میں گھس گیا اور اس کے کھر میں اس کھیت کی مٹی لگ گئی پھر وہ ان کے کھیت میں آ گیا اور وہ مٹی ان کے کھیت میں مل گئی۔ تو انہوں نے اس کھیت کا غلہ کھانا چھوڑ دیا۔

بس لوگ اس قسم کی حکایت کو سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ جب یہ حالت ہے تو حلال کا وجود ہی نہیں نہ ہم سے ایسا ہو سکے گا نہ حلال نصیب ہوگا پھر خوب حرام پر ہاتھ مارتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ حکایت صحیح نہیں اور اگر صحیح بھی ہو تو وہ بزرگ مغلوب الحال تھے اور مغلوب الحال مجنون کے حکم میں ہوتا ہے اس کا فعل قابل تقلید نہیں ہوتا۔

دین میں غلو

میں اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ شریعت کے برابر کسی قانون میں وسعت نہیں۔ دیکھئے شریعت دین میں غلو کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی چنانچہ ارشاد ہے **یاھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم** اور ارشاد ہے **لاتحرموا طیبات مااحل الله لکم** اور دیکھئے حدیث میں ہے کہ تین شخص حضور صلی اللہ عیہ وسلم کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے اور بعض ازواج مطہرات سے حضورؐ کے معمولات دریافت کیے اور جب انہیں بتلائے گئے تو انہوں نے اس کو کم سمجھا اور کہا کہ ہم اپنے کو حضورؐ پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ حضورؐ کے تو اگلے پچھلے سب زلات معاف ہو چکے ہیں ہمیں یہ بات کب نصیب ہے اس لئے ہم کو بہت زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہے پس ایک نے ان میں سے کہا کہ میں اتنی عبادت کروں گا کہ سوؤں گا نہیں۔ ایک نے کہا میں نکاح ہی نہ کروں گا۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ ہی سے رہوں گا افطار نہ کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکان پر تشریف لائے تو آپ کو ان تینوں کی باتیں معلوم ہوئیں آپ کو ناگوار ہوا اور فرمایا یاد رکھو میں سوتا بھی ہوں جاگتا بھی ہوں نکاح بھی کرتا ہوں کھاتا بھی ہوں روزہ بھی رکھتا

ہوں خوب سمجھ لو۔ یہ میرا طریقہ ہے اور جو شخص میرے طریقہ کو چھوڑے گا اس سے مجھے کوئی علاقہ نہیں۔

دیکھئے ان لوگوں پر آپؐ نے غلو فی الدین کی وجہ سے کتنا بڑا تشدد فرمایا کہ ایسے شخص کا مجھ سے کوئی علاقہ نہیں۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے کہ آپؐ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے دیکھا کہ دو ستونوں کے درمیان میں ایک رسی بندھی ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے۔ صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ یہ رسی زینب رضی تعالیٰ اللہ عنہا نے باندھی ہے جس وقت ان کو نوافل پڑھتے پڑھتے نیند ستاتی ہے تو (کسل رفع کرنے کے لئے) اس پر سہارا لگا لیتی ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فوراً اس کو توڑ ڈالا اور فرمایا کہ نفس پر اتنا تشدد نہ چاہئے اور فرمایا کہ جب نیند آئے سو رہو۔ جس کسل رفع ہو جائے پھر مشغول ہو جاؤ۔ شریعت تو یہ ہے۔

ان آیتوں اور احادیث کو فقہاء نے خوب سمجھا ہے۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ طہارت اختیار مت کرو بلکہ تقویٰ طہارت میں خوب کوشش کرو مگر حد سے آگے مت بڑھو۔ اہل ادب نے تو یہاں تک کیا ہے کہ بعض افعال کو اس لئے نہیں کیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ نہ ہو جائے مگر ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا کہ کس بات سے مساوات ہوتی ہے اور کس بات سے نہیں ہوتی۔ یہ کام علماء باطن کا ہے اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چھلنی نہ تھی آٹا چھانا نہ جاتا تھا۔ بس یہ کرتے تھے کہ جو کا آٹا پیسا اور پھونک ماری بھوسی اڑ گئی اور روٹی پکائی۔ یہ طریقہ تھا۔ آپ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے خدام سے فرمایا کہ اب سے اس سنت کے موافق عملدرآمد ہونا چاہئے کہ آٹا جو کا ہو اور چھانا نہ جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور روٹی پکائی گئی اور سب نے کھائی اس کے کھانے سے سب کے پیٹ میں درد ہوا۔ سوئیاں سی چبھنے لگیں حضرت کے پیٹ میں بھی درد ہوا۔ اگر ہمیں یہ صورت پیش آتی تو یوں کہتے کہ سنت پر عمل کیا تھا اس سے یہ ہوا اگر ادب کی وجہ سے بولتے نہیں تو دل میں تو خیال ہوتا اور یہی کہتے کہ اب کبھی سنت کا اتباع نہ کریں گے مگر اہل ادب کے قلب میں نورانیت ہوتی ہے ان حضرات کا ادب دیکھئے آپ نے فرمایا کہ ہم نے بے ادبی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مساوات کا دعویٰ کیا ہم حضور صلی اللہ عیہ وسلم کے درجہ کو کیسے پہنچ سکتے ہیں ہم ضعیف

کمزور ناتواں ہیں۔ آپ سے نچلے ہی درجہ میں رہنا چاہیے۔ پھر خدام سے فرمایا کہ کھائیں گے تو جو مگر چھان کر۔ اب دیکھئے کہ سنت میں کوئی نقص نہیں نکالا بلکہ اپنے کو سنت کے قابل نہ سمجھا۔

شریعت میں چیزوں کی اقسام

اب میں اس مسئلہ کا حل عقلی طور سے کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ شریعت میں دو قسم کی چیزیں ہیں ایک تو وہ چیزیں ہیں جو مقصود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مقصود نہیں ہیں۔ زائد ہیں مگر محمود ہیں لیکن یہاں مجتہد کی رضورت ہوگی کہ وہ تمیز کرے کہ کون مقصود ہے اور کون مقصود نہیں یہ ہر شخص کا کام نہیں اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب نے ایک مریض کو اجازت دی کہ شلجم کھاؤ اس نے مع پتوں کے پکا کر کھائے اور اس کو نفع ہوا اب اس کا فیصلہ کرنا کہ قتلوں سے نفع ہوا یا پتوں سے یا دونوں کے مجموعہ سے یہ طبیب کا کام ہے یہاں دو چیزیں ہیں ایک قتلے اور ایک پتے ممکن ہے کہ مقصود قتلے ہوں اور مریض پتوں کو مقصود سمجھ لے یا مقصود پتے ہوں اور مریض قتلوں کو مقصود سمجھ لے۔ اس لئے اس میں فیصلہ کرنا مریض کا کام نہیں بلکہ یہ کام طبیب کا ہے۔

اسی طرح سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے اور غیر مقصود کون ہے۔ یہ کام مجتہدین کا ہے ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے کہ رفع مقصود ہے اور ترک رفع جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد عدم رفع کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہیے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو۔ (یعنی سلام کے وقت) نماز میں سکون اختیار کرو۔ پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز کے لئے فرمایا اب جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ رفع جس سے منع فرمایا یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ بعض حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ صحابہ جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہ ممانعت حضورؐ نے اس پر فرمائی ہم اس بارہ میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے پس مواقع مختلف فیہا میں

بھی رفع مقصود نہ ہوگا کیونکہ وہاں نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے' اور اس لئے وہ مقصود ہوگا۔

اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

مثلاً آمین کہنا' ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا ہے اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اخفاء ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعا میں اخفاء مقصود ہے اگر پکار کر کبھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ آمین بھی کہا کرتے ہیں اگر کبھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے۔

ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے۔ یہ اختلاف کاہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا اسی بناء پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

یہ بیان استطرادا ہو گیا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ شریعت میں دو چیزیں ہیں مقصود اور غیر مقصود اور یہ مجتہد کا کام ہے کہ وہ یہ بتلائے کہ مقصود کیا ہے اور غیر مقصود کیا ہے۔

مجتہد کا کام

بس سمجھ لیجئے کہ جو کی روٹی کھانا مقصود نہیں ہے۔ کوئی شرعی مصلحت اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہاں بعض موقع پر معین ہوتی ہے مقصود میں۔ اس لئے جہاں ایسا موقع ہوتا ہے وہاں بتلائی جاتی ہے اور بعض طبائع ہیں ضعیف وہ اس کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے انہیں یہ مفید نہیں ہوتی بلکہ مقصود میں مشغول ہونے سے مانع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر اس سے منع کیا جاتا ہے۔

مثلاً ہم نے جو کی روٹی کھائی اور کھا کر پیٹ میں ہوا درد۔ تو جو ہم کو محبت تھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن سے وہ اس حالت میں باقی نہ رہے گی بلکہ وحشت ہو گی اور خطرہ آئے گا کہ اچھا سنت پر عمل کیا کہ پیٹ میں درد ہو گیا۔ آج متشددین ہی کی بدولت شریعت سے لوگوں کو نفرت ہو گئی لیکن مشائخ ہر شخص کی قابلیت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کرتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر کہتے ہیں کہ جو کی روٹی مت کھاؤ۔ اور پہلے چور کی حکایت ایسی ہی گزر چکی ہے کہ شیخ نے اس کو

خانقاہ کے جوتے الٹ پلٹ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے مناسب حال وہی بات تھی۔ دوسرے شخص کو اس کی اجازت تھوڑا ہی دی جائے گی۔

ایک رئیس تھے۔ انہوں نے میرے پاس آنے اور قیام کرنے کا ارادہ کیا اور یہ بھی لکھا کہ میرا جی گاڑھے کے کپڑے پہننے کو چاہتا ہے۔ اس لئے میرے واسطے وہ بھی تجویز کئے جائیں میں نے ان کو لکھا کہ آپ کو مریض ہونے کی حیثیت سے حق نہیں فرمائش کا میں جس طرح چلاؤں گا ویسے چلنا پڑے گا اور اس میں ایک راز تھا۔ وہ یہ کہ شریعت میں یہ اصلی مقصود تو ہے نہیں۔ پھر ان رئیس کے گاڑھے کے کپڑے پہننے سے ایک بڑا ضرر ہوتا۔ وہ یہ کہ اگر ایسا شخص گاڑھے کے کپڑے پہنے گا تو دل میں عجب پیدا ہوگا کہ ہم کتنے متواضع ہیں کہ رئیس ہو کر ایسے کپڑے پہنتے ہیں ہم ایسے اچھے ہیں کہ ہم میں ایسی مسکنت ہے اور مقصود ہے عجب کا ازالہ اور یہاں وہ پیدا ہوگا۔ اس لئے ایسے موقع پر گاڑھے کے کپڑے پہننے کی ہرگز اجازت نہ ہوگی۔ یہ ہے حقیقت اس کی۔

ایسے شخص سے زیب وزینت چھڑائی جائے گی جو زیب وزینت میں مشغول رہتا ہو اور کام نہ کرتا ہو بناؤ سنگھار میں وقت گزارتا ہو۔ اس سے کہا جائے گا لوگ جہاں راستہ چلتے ہوں وہاں جا کر جھاڑو دیا کرو تا کہ کپڑوں پر اور جسم پر گرد پڑے اور زیب وزینت کو چھوڑے اور کام میں لگے تو ایسے شخص سے اس طرح زیب وزینت چھڑا دی جاتی ہے۔

غرض سادھے کپڑے اور جو کی روٹی یا اس کی مثل سنن عادیہ میں سے ہیں اگر کہیں ان کی وجہ سے مقصود فوت ہونے لگتا ہے تو ان کو چھڑا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ سنن عادیہ کوئی مقصود نہیں ہیں بلکہ بعض موقع پر سنن عبادت تک چھڑا دی جاتی ہیں اگر ان سے ضرر ہوتا ہو۔

مثلاً یہ سنت ہے کہ تہجد کی آٹھ رکعت پڑھے۔ اب کسی کو نیند زیادہ آتی ہے اور وہ تہجد کے واسطے زیادہ دیر جاگا اور پھر ایسا سویا کہ صبح کی جماعت فوت ہوگئی تو اس سے کہا جائے گا کہ تم دو رکعت پڑھ کر جلد سو رہو تا کہ صبح کی جماعت نہ جائے اگرچہ آٹھ رکعت سنن عبادت میں سے ہیں مگر جب اس سے بڑھ کر مقصود فوت ہوتا ہے تو اس کو چھڑا دیں گے۔ غرض یہ کام مجتہدین کا ہے کہ وہ مقصود اور غیر مقصود کو جان سکتے ہیں یہ نہیں کہ ترجمہ قرآن کا دیکھ کر اور مشکوۃ پڑھ کر اجتہاد کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

سو یہ راز ہے اس حکایت میں کہ جب شیخ نے دیکھا کہ جو کا آٹا بے چھنا کھانے سے سب کے پیٹ

میں ورد ہوا تو فوراً اس سے منع کر دیا اس خیال سے کہ یہ کوئی سنن عبادت تو ہے نہیں اور اس سے اندیشہ ہے دینی ضرر کا کہ کہیں سنت سے وحشت نہ ہو جائے اس لئے ہمارے لئے اس کا ترک ہی مناسب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی بابت اس کے مجموعی حالات سے ثابت ہو جاوے کہ حج کے راستہ میں اس سے نماز کی پابندی نہ ہو سکے گی تو اس کو حج نفل سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک نماز کے بھی قضا ہونے کا گمان غالب ہو تو اس کو حج نفل کرنا جائز نہیں اسی کے بارہ میں عارف مسعود بک کہتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق در ینجاست بیائید بائید

یعنی تم کہاں چلے حج کرنے تمہارا محبوب یعنی اللہ میاں تو یہاں ہیں۔

اس شعر میں مطلق حج مراد نہیں جس سے شبہ پڑے کہ حج سے روک رہے ہیں بلکہ حج نفل جس سے کوئی فرض چھوٹتا ہو وہ مراد ہے۔ جنہوں نے اس کو مطلق سمجھ لیا وہ اعتراض کرنے لگے کہ لو حج ہی سے منع کرتے ہیں جو ایک بڑی عبادت ہے۔ تو سمجھ لو کہ وہ ان لوگوں کو کہہ رہے ہیں جنہیں حج سے دینی ضرر پہنچتا ہے کہ نفل کو تو ادا کرتے ہیں اور فرض کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ سو ظاہر ہے کہ ایسوں کو حج سے قرب نہیں بڑھتا بلکہ اور بعد ہو جاتا ہے اسی واسطے کہتے ہیں۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　معشوق در ینجست بیائید بیائید

یعنی تم کہاں چلے تمہارا محبوب تو یہیں ہے۔ تمہیں محبوب کا قرب یہیں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے وہاں نہیں حاصل ہو گا۔ غرض یہ کہ سنن عادیہ اور سنن عبادت ایسے شخص کے واسطے ناجائز ہیں جس کا یہ نتیجہ ہو کہ کوئی دینی ضرر پہنچ جائے۔ اسی واسطے حضرت مشائخ کسی کو کچھ بتاتے ہیں اور کسی کو کچھ بتاتے ہیں جو جس کے مناسب ہوتا ہے اس کو وہی بتلاتے ہیں۔ یہ کام ہر شخص کا نہیں اس کام کے وہی حضرات ہیں۔ مطلب میرا یہ ہے کہ لوگوں کو ایسی حکایات (جیسے بیل کے کھر میں مٹی لگ جانے کی حکایت سابق میں گزری) نہ سنانی چاہئیں۔

شریعت میں وسعت

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ شریعت میں وسعت ہے میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر کسی مسئلہ میں مجتہدین کا اختلاف بھی ہو مگر آج کل کے مجتہدین کا اختلاف نہیں اور اس میں ابتلاء عام ہو تو اس کو بھی جائز کہنا چاہئے۔

وجہ یہ ہے کہ معاملات بہت گندے ہو رہے ہیں۔ اگر مختلف فیہ امور کو حرام بتلایا جاوے گا تو اگر اس پر کوئی کرے گا تو اس کو تنگی ہوگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شریعت کو تنگ سمجھنے لگے گا اور اگر عمل نہ کرے گا تو وہ ان کو اور محرمات اجماعیہ کو برابر سمجھے گا۔ اور دونوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس لئے غلو نہیں چاہئے تنگی میں بلکہ وسعت کرنی چاہئے فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ وسعت ہونے سے اعتقاد درست ہوگا کہ شریعت کیسی اچھی چیز ہے اور کیسی رحمت ہے لوگوں کا تو گمان یہ ہوگیا ہے کہ شریعت میں تو سوائے لایجوز کے اور کچھ ہے ہی نہیں حالانکہ شریعت میں لایجوز بہت کم ہے یجوز کثرت سے ہے۔ جو فقہ سے واقف ہے وہ اس کو خوب جانتا ہے غرض یہ کہ وسعت دینے میں ایک تو شریعت سے محبت ہوگی دوسرے جو اس سے منتفع ہوگا آرام سے رہے گا۔ اس سے حق تعالیٰ کی محبت غالب ہوگی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ عاشق احسانی ہیں۔ ہم لوگوں کو جو خدا تعالیٰ سے محبت ہے وہ احسانات کی وجہ سے ہے اسی واسطے ہمارے حضرت کا مسلک یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے آرام سے رہو مگر حد سے نہ نکلو۔ ساری دنیا کے مشائخ تھی دودھ چھڑاتے ہیں اور حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو خوب کھلاؤ پلاؤ اور اس سے کام لو وہ اس صورت میں خوب کام کرے گا۔

کہ مزدور خوش دل کند کار بیش!

ورنہ کہے گا کہ میاں کس برتہ پر کام کریں۔

حضرت حاجی صاحب ایک دفعہ میرا نام لے کر فرمانے لگے کہ میاں اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پیا کرو۔ ٹھنڈا پانی پیو گے تو ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے گا۔ اور اگر گرم پیو گے تو الحمد للہ دل سے نہ نکلے گا بلکہ زبان ہی تک رہے گا۔

میں تو حضرت کے یہاں دن رات دیکھتا تھا کہ حضرت کا قصد یہی تھ کہ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن سے حق تعالیٰ کی محبت بڑھے اس واسطے کہ بعض کو جب خوف غالب ہوتا ہے تو طاعت کم ہوتی ہے۔ خوف کی صورت میں صرف ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے۔ اسی کو تو عراقی کہتے ہیں۔

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی   کہ درازو دور دیدم رہ رسم پارسائی

رہ قلندر محبت کی راہ ہے اور رہ و رسم پارسائی ضابطہ کی طاعت ہے۔ محبت ایسی چیز ہے کہ اس میں آدمی ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں

ناخوش تو خوش بود بر جان من   دل فدائے یار دل رنجان من

محبت کی روح کو راحت ہوتی ہے گو جسم کو تکلیف ہو اور یہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک عارف کہتے ہیں

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

جب محبت ہوتی ہے تو پھر کوئی چیز گراں نہیں ہوتی۔ بعض لوگ رات بھر تو جاگتے ہیں اور محنتیں اٹھاتے ہیں اور پھر ہشاش بشاش رہتے ہیں تو کیا بات ہے؟ یہی محبت ہے اس کی کچھ گرانی نہیں ہوتی میں تو کہتا ہوں کہ جس کو محبت کامل ہوگی اس سے معاصی ہرگز نہ ہوں گے۔ بس جب کسی کو دودھ گھی میسر ہو تو خوب کھائے پیے بشرطیکہ معاصی کی حد تک نہ پہنچے حد کے اندر رہ کر جتنی چاہے وسعت کرے۔ اس سے محبت بڑھے گی، تو معاصی آپ ہی چھوٹ جائیں گے۔

اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ فتویٰ میں تنگی نہ کرنی چاہئے۔ جائز تک رکھے تو غنیمت ہے اولیٰ پر تو کہاں پابندی ہو سکتی ہے۔ اختلافی مسئلہ میں اگر ابتلائے عام ہو تو اس کو بھی جائز ہی بتلائیے۔ مگر یہ معاملات میں ہے نہ کہ شطرنج وغیرہ میں۔ کیونکہ معاملات میں تنگی کرنے سے تو تکلیف ہوتی ہے اور شطرنج وغیرہ سے روکنے میں کیا تکلیف ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حلال کے ابواب کثرت سے موجود ہیں۔

اہل خصوصیت کا تقویٰ

مگر افراط تفریط نہ کرنی چاہئے۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ افراط تفریط کرنے لگتے ہیں اہل حال کی حکایات دیکھ کر اپنے کو ان پر قیاس مت کرو۔ وہ ہوتے ہیں مصاحبین ان سے ذرا سی بات میں گرفت ہو جاتی ہے اور ہم لوگ ایسے ہیں، جیسے رئیسوں کے کاشتکار مصاحب اگر دربار میں بلند آواز سے بھی بولے تو آنکھیں نکال لی جاویں اور کاشتکار اگر باہم گالیاں بھی بکیں تو چشم پوشی کی جاتی ہے۔ ہر ایک کا معاملہ جدا ہے۔ اہل خصوصیت کی باتیں ہی الگ ہیں ان کا تقویٰ بھی جدا ہے۔

ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک طالب علم تھے وہ کہیں پڑھتے تھے ان کے والد ان سے ملنے آئے بیٹے تو اس وقت موجود نہ تھے۔ ایک اور طالب علم تھے جو اس حجرہ میں ان کے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں یہ وہاں بیٹھ گئے اتفاق سے حجرہ میں بازار کی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ بازار کی روٹیاں رکھی ہیں تو بہت ہی برہم ہوئے اتنے میں وہ طالب علم بھی آ گئے اور اپنے والد کو سلام کیا۔ انہوں نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ تم بازار کی روٹی

کھاتے ہو علم دین کا نور اور اس کی برکت تمہیں کیسے حاصل ہوگی۔ بازار کی روٹی منظر عام پر رکھی جاتی ہے اور ہر قسم کے لوگ اس کو دیکھتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی یہ حالت ہوتی ہے۔

کہ بزار چندانکہ گندہ تر   تہی دست را دل پراگندہ تر

روٹی کو دیکھ دیکھ کر ان کا دل لپچاتا ہے اور پاس کچھ ہوتا نہیں اس لئے پریشان ہوتے ہیں اور بعض قحط زدہ ہوتے ہیں کہ ان کا دل روٹی کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوتا ہے اور خالی ہاتھ ہونے سے کھا نہیں سکتے۔ بس دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ تو یہ بازار کی روٹی سبب ہے بعض مسلمانوں کے دل پریشان ہونے کا اور اس سے مسلمانوں کے دل دکھا ہے وہی روٹی جس نے دل دکھایا ہے مسلمانوں کا اس کو تم کھاتے ہو اس طالب علم نے عرض کیا کہ یہ روٹیاں میری نہیں ہیں بلکہ میرے شریک حجرہ کی ہیں اس پر ان کے والد نے کہا کہ تم ایسے حجرہ میں کیوں رہتے ہو جس میں بازار کی روٹیاں کھانے والا رہتا ہے۔

دیکھئے یہ ہے اہل خصوصیت کا تقوی آج کل بتلایئے ایسا کون ہے جو بازار کی روٹی نہ کھاتا ہو۔ جس سے مسلمانوں کا دل دُکھا ہوتا ہے، ہمدرد قوم کے اصل میں یہ حضرات ہیں۔ آج جو ہمدرد قوم کہلاتے ہیں اب ان کی حالت دیکھئے ان کو ہمدرد کیا ہمہ درد کہنا چاہئے۔

ایک جنٹلمین صاحب کا قصہ ہے کہ انہوں نے اسباب اٹھانے کے لئے اسٹیشن پر ایک قلی کیا اور مزدوری میں اس کو دونی دی وہ تھی کھوٹی قلی نے کہا کہ اس کو بدل دیجئے نہیں چلے گی انہوں نے کہا کہ چلے گی کیوں نہیں اس نے کہا کہ صاحب کیسے چلے گی یہ تو بہت کھوٹی ہے اس کا انہوں نے کیسا ظالمانہ جواب دیا کہ جیسے ہم نے چلا دی تم بھی چلا دینا تم نے تو ظلم اور زبردستی سے چلا دی اسے کون سا شخص ایسا ملے گا جس پر ظلم اور زبردستی کر سکے۔ بس وہ روتا ہوا چلا گیا اور یہ فرعون کی طرح بیٹھے رہے پرواہ بھی نہیں کی خدا جانے یہ کیسی ہمدردی ہے۔ بس ان لوگوں میں ہمدردی کے الفاظ ہی ہیں۔ ظاہر کچھ ہے باطن کچھ ہے۔

وجائزۃ دعوی المحبت فی الھوی   ولکن لایخفی کلام المنافق

عشق میں محبت کا دعویٰ جائز ہے لیکن موافق کا کلام پوشیدہ نہیں رہتا۔

یہ لوگ تقلید کرتے ہیں یورپ کی مگر اہل یورپ اتنے بے درد نہیں ہیں جیسے یہ لوگ ہیں ایک عادت ان کی یہ بھی ہے کہ یہ لوگ عموماً ہر بات کے اندر مسلمانوں کے مقابلہ میں غیر اقوام کے طریقہ کو ترجیح دے کر ان کی تقلید کرتے ہیں مگر فضول باتوں میں جیسے کوٹ پتلون پہنتے ہیں حضرت جو اہل کمال ہیں وہ ان فیشنوں کے مقید تھوڑا ہی ہیں اور جن لوگوں کے اندر کچھ کمال نہیں وہ ظاہر کی لیپ پوت کرتے ہیں۔

غرض بازار کی روٹی کھانے کا قصہ تھا کہ ان طالب علم کے والد صاحب نے ایسے حجرہ میں رہنے کی بھی تو اجازت نہیں دی جس میں بازار کی روٹی کھائی جاتی تھی یہ بھی ایسی ہی حکایت ہے جیسے پہلے گزری مگر یہ خوب سمجھ لیجئے کہ ہم اس حکایت کے مخاطب نہیں ہیں۔

ہمارا تقویٰ

ہمارا تقویٰ فتویٰ ہے فتوے پر عمل کر لیں بس یہی ہمارا تقویٰ ہے۔ فتوے سے جو چیز حلال ہو اس کو حلال سمجھو لیکن اتنی وسعت بھی نہیں کہ ہر چیز جائز ہو نہ سود کی پرواہ ہو نہ رشوت کی پرواہ ہو۔

مال کے متعلق ایک امر پر اور مطلع کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ لوگ میراث میں بہت زیادہ بے احتیاطی کرتے ہیں کیونکہ خود مالک تو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا نہیں اس لئے بے تکے قبضہ میں آتا ہے۔ مرنے والا تو مر گیا اب جس کی لاٹھی اس کی بھینس بس جس کے ہاتھ میں کنجی ہوئی وہ مالک بن بیٹھا مال میراث میں لوگوں کو ذرا احتیاط نہیں اکثر تو مخفی کر لیتے ہیں دوسرے وارثوں کو پتہ بھی نہیں دیتے۔ اکثر زبردست ہونے کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور زیادہ بے فکری وہاں ہوتی ہے جہاں قانون سے بھی نہیں کو ملتا ہے۔ جیسے کو اودھ میں قانون ہے کہ میراث کا مالک فرزند اکبر ہے اور دوسرے وظیفہ خوار۔

خوب سمجھ لو کہ یہ مطلق حرام ہے۔ شریعت نے میراث کے احکام خود مقرر کئے ہیں۔ کوئی قانون شریعت کو منسوخ نہیں کر سکتا شریعت نے جس جس کا حق رکھا ہے اس کو پہنچانا واجب ہے دوسرے کے حق سے خود منتفع ہونا یا کسی اور کو دینا حلال نہیں ہے سلف کو دیکھئے ایسے اموال میں کتنی احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ چراغ کی روشنی میں مال وقف کا حساب لکھ رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے ان کو آتے ہوئے دیکھ کر آپ نے چراغ گل کر دیا انہوں نے دریافت کیا کہ اس میں کیا مصلحت تھی آپ نے فرمایا کہ یہ چراغ بیت المال کے تیل کا ہے اگر روشن رہنے دیتا اور آپ سے باتیں کرتا تو باتوں میں اس کا صرف کرنا درست نہ تھا اور اگر آپ سے باتیں نہ کرتا تو مروت کے خلاف تھا۔

اسی طرح میراث میں سلف سخت احتیاط کرتے تھے ایک بزرگ ایک دوست کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہاں گئے تو ان کو نزع کی حالت میں پایا چنانچہ تھوڑی دیر میں ان کا انتقال ہو گیا وہاں چراغ جل رہا تھا آپ نے فوراً اسے گل کر دیا اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگایا اور اس سے چراغ روشن کیا اور فرمایا کہ وہ تیل مرحوم کی ملک اسی وقت تک تھا جب تک کہ وہ زندہ

تھے اور انتقال کرتے ہی تمام ورثاء کی ملک ہوگیا۔ جس میں بعض ورثاء یتیم ہیں۔ بعض غائب ہیں۔ اس لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔

سو یہ تھی ان حضرات کی احتیاط اب تو تیل کیا ہاتھی کے ہاتھی نکل جائیں اور خبر نہ ہو زیادہ افسوس یہ ہے کہ اہل علم بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے مدارس تک میں اس کی احتیاط نہیں مدارس میں قیمتی قیمتی اسباب اس قسم کے ہوتے ہیں مجھ کو یاد نہیں کوئی خط کسی مدرسہ کی طرف سے اس مضمون کا گیا ہو کہ یہ اسباب جو بھیجا ہے تو سب ورثاء کی اجازت سے بھیجا ہے یا نہیں یا اگر کوئی بچہ میت کا نابالغ ہے تو اس کا حصہ نکالا ہے یا نہیں بس یہ حال ہے کہ مال آیا اور رکھ لیا۔

سو جب خواص کی یہ حالت ہے تو عوام الناس کو کیا کہا جائے۔ عوام الناس سے کہو بھی تو کہتے ہیں کہ جب اہل علم ایسا کرتے ہیں تو بھلا ہم کس شمار میں ہیں۔ اہل مدارس دل کو یوں سمجھا لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے دینے میں کون انکار کرتا ہے اس لئے سب ورثاء کی طرف سے اجازت ہی ہے اور اگر کوئی نابالغ بھی ہے تو وہ پھر بڑا ہو کر معاف کر دے گا۔ بعض کی بلکہ اکثر کی یہ حالت ہے کہ میت کی فاتحہ اور کھانا وغیرہ مشترک مال سے کرتے ہیں جس کے اندر نابالغ بچوں کا بھی حصہ ہوتا ہے یہ خبر نہیں کہ جو شخص اس مغصوب مال کو کھائے گا وہ مغضوب ہوگا۔ جی کو یوں سمجھا لیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیتے ہیں پھر اس میں ہم پر الزام کیا ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کوئی شخص مر گیا بس سارا مال بیوہ کو دے دیا بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا اب وہ مالک الملک ہے۔ یتیم بچوں کا مال خوب لٹا رہی ہے کہیں شادی میں کہیں نیوتہ میں۔

نیوتہ کے مفاسد

اول تو نیوتہ کی رسم ایک رسم ہے بے ہودہ اس میں اگر خالص اپنا مال ہو تب بھی نہ لگانا چاہئے پھر یہ تو مشترکہ مال ہے اگر کوئی کہے کہ صاحب نیوتہ تو نہایت عمدہ رسم ہے یہاں نیوتہ دیتے ہیں تو نیوتہ لینے والا اتنے لوگوں کا مقروض بنتا ہے حدیث میں صاف موجود ہے کہ مقروض جنت میں نہ جائے گا تاوقتیکہ اہل حق کا حق ادا نہ ہو جائے۔

دوسرا مفسدہ تو بالکل لاعلاج ہی ہے اس کا علاج ہی نہیں سوائے اس کے کہ اس رسم کو چھوڑا جائے اور وہ میراث کے ایک مسئلہ پر متفرع ہے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ ایک شخص مرا اس نے دو بیٹے چھوڑے اور اس نے مثلاً پانچ روپے نیوتہ میں دیئے تھے تو پانچ روپے بھی مردہ کی میراث ہیں جب

وصول ہوں گے تو ان کا ورثاء پر تقسیم کرنا واجب ہوگا۔ اب وہ آئیں گے کس طریقہ سے اس کی صورت یہی ہے کہ جب ان کے یہاں تھوڑا تھوڑا دینے میں شادی والے کا کام ہو جاتا ہے اور دینے والوں میں سے کسی پر بار نہیں ہوتا تو مستحسن کو قبیح کیسے کہہ دیا۔ غریب کو دیا اس کی شادی ہو گئی یہ تھوڑی بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے ایک فائدہ کو تو دیکھ لیا اور دوسرے مفاسد جو اس کے اندر ہیں ان کو چھوڑ دیا۔ اس میں اگر ایک فائدہ ہے تو مفاسد کتنے ہیں۔ ان مفاسد کو بھی تو دیکھنا چاہئے اور اول تو جو فائدہ اس میں سوچا گیا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ آج کل کی شادیوں میں خرچ اتنا کیا جاتا ہے کہ نیوتہ اس کے لئے کافی نہیں ہوتا اور مفاسد اس کے اندر بہت ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک مفسدہ یہ ہے کہ تو وہ بطور نیوتہ کے دیئے جائیں گے اب ایک بیٹے کی شادی ہوئی اور وہ پانچ روپے آئے تو وہ روپے پانچ روپے اس کے نہیں بلکہ یہ صرف اڑھائی روپے کا مستحق ہے اور باقی اڑھائی روپے دوسرے بھائی کا حصہ ہے۔ لہٰذا وہ اس کو دینے لازم ہیں مگر وہ اس کو نہیں دیئے جاتے اس لئے دینے والے کے ذمہ سے پانچوں روپیہ ادا نہ ہوئے بلکہ صرف اڑھائی روپے ادا ہوئے اور دوسرے بیٹے کے اڑھائی روپے رہ گئے پھر وہ مر گیا تو اب ان اڑھائی روپے کی میراث چلے گی اسی طرح آگے اولاد ہوگی اور یہی سلسلہ چلے گا تو اس اڑھائی روپیہ کے ہزاروں آدمی مستحق ہو گئے قیامت میں اس شخص کی جان پر بنے گی اس لئے ایک ایک پیسہ اور کوڑی کوڑی کا دعویٰ ہوگا آخر اس کا علاج کیا سوچا ہے؟ اس نیوتہ سے تو نا نیوتہ اچھا۔ یہ مفاسد ہیں اس نیوتہ خبیث میں مگر چونکہ لوگوں کو شریعت کا علم نہیں اس واسطے ان خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میراث کی خرابیاں

غرض یہ کہ میراث میں بڑی خرابی ہو رہی ہے بیوہ کو اگر سارا مال مل جاتا ہے تو وہ اس کو اس طرح لٹاتی ہے اور یتیم بچوں کا بھی حصہ نہیں چھوڑتی ہے اور اگر کسی اور کا قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ مالک بن بیٹھتا ہے۔ دوسرے وارثوں کو نہیں دیتا رہیں گھر کے برتنے کی چیزیں سو وہ تو مشترک ہی رہتی ہیں کبھی تقسیم ہی نہیں کی جاتیں۔ یہ گڑبڑ ہو رہی ہے میراث میں۔

بس ان کے بچنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جاوے تو جتنا مال اور اسباب ہو سب تقسیم کرلو اور دیر بالکل نہ کرو دیر کرنے میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بطور نمونہ کے چند واقعات سناتا ہوں۔

میرے والد صاحب کے پاس ایک قلمدان تھا بعد ان کے انتقال کے میں نے لے لیا کیونکہ سارے ورثاء بالغ تھے اور میرے لینے سے سب خوش تھے مگر پھر مجھے کھٹکا ہوا کہ میرے فعل سے دوسروں کو سند ہوگی بس میں نے قیمت کر کے ورثاء کو تقسیم کی اور میں نے کہہ دیا کہ چاہے قلمدان لے لو چاہے پیسے لے لو اور وجہ یہ تھی کہ مجھے اس کو مفت لیتے ہوئے غیرت آئی کہ کیوں ورثاء کی منت لوں کہ ان سے معاف کراؤں۔

ہر کہ نان از عمل خویش خورد   منت حاتم طائی نہ برد

جو شخص اپنی محنت سے روٹی کما کر کھاتا ہے وہ حاتم طائی کا احسان نہیں اٹھاتا۔

دوسرے مجھے سبق سکھانا تھا کہ یوں کیا کرتے ہیں۔

میرے والد کے اسباب میں چکن کے دو چوغے تھے جو لکھنؤ سے لائے تھے ایک میرے لئے اور ایک بھائی کے لئے مگر دینے نہ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا اگر میں لے لیتا تو الحمد للہ! کوئی ان کا مطالبہ کرنے والا نہ تھا اور ان کے کس کام کے تھے خوشی سے سب مجھ کو دے دیتے مگر میں نے کہا کہ ان میں بھی میراث جاری ہوگی یہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ اس سے اوروں کو سبق ملے گا برتن وغیرہ سب کی تقسیم شرع کے موافق کی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں تمام ترکہ تقسیم ہوگیا اور ذرا نزاع نہیں ہوا۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ ترکہ مرتے ہی تقسیم ہو جاوے۔ بعد میں بڑے قصے پھیلتے ہیں اب تقسیم برسوں کے بعد ہوتی ہے بڑی خرابیاں پڑتی ہیں بس خدا سے ڈرنا چاہئے اور ان معاملات کو درست کرنا چاہئے۔

آمد و خرچ کے معاملات

خلاصہ یہ کہ لوگوں نے آمد مال کے ابواب میں سخت بے احتیاطیاں کر رکھی ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ بس شریعت کا تعلق صرف نماز روزہ سے ہے۔ حالانکہ شریعت کا معاملات اور اموالوں سے بھی پورا تعلق ہے قیامت کے روز ایک دانگ کے عوض میں سات سو مقبول نمازیں لے جائیں گے پھر حضرت اگر ایسا ہوا تو بتلایئے ہمارے پاس کیا بچے گا خدا کے لئے معاملات درست کرو ناجائز آمدنی کو چھوڑو رشوت بھی حقوق عباد سے ہے سود بھی حق عبد ہے ان سب سے احتیاط رکھو اور حقوق الٰہی کا بھی خیال رکھو۔

رشوت کے بارہ میں یہ کہنا کہ اس نے تو خوشی سے دیا، یہ محض غلط ہے کوئی اپنا مال خوشی سے نہیں دیتا۔ اپنے اوپر قیاس کر کے دیکھئے کہ اگر آپ کو بھی اتفاق پڑے تو کیا آپ خوشی سے دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اگر معلوم ہو جائے کہ کام ویسے ہی ہو جائے گا تو کبھی نہ دیں۔

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا وہ تحصیل مال کے متعلق تھا جس کو میں نے تفصیل سے عرض کر دیا اب دوسری شق مال کے خرچ کرنے کی باقی رہ گئی کہ اس میں بھی لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں اور مال میں دو ہی تصرف ہیں ایک اس کا حاصل کرنا دوسرے اس کا صرف کرنا۔ ایک جزو کا تو بیان ہو چکا اب دوسرے جزو کو بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ خرچ میں بے احتیاطی دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو یہ کہ کھلے معاصی میں مال خرچ کیا جائے دوسری صورت یہ ہے کہ کھلی معصیت میں تو مال خرچ نہیں کیا مگر خرچ حد سے زیادہ کیا شہوات میں منہمک ہو گئے تنعم اور تفاخر میں اڑانا شروع کر دیا۔

خوب سمجھ لو کہ تنعم اور تفاخر کا انجام ذلت ہے کیونکہ اموال غیر متناہی تو ہیں نہیں کہ کتنا ہی خرچ کرو اور وہ کم نہ ہوں انجام یہ ہوتا ہے کہ مکان تک بکنے کی نوبت آ جاتی ہے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسجد کا سقاوہ بھرا کرتے تھے اور لوگ ان کو نواب کہہ کر پکارتے تھے میں نے کہا' یہ نواب کیسے ہیں۔ معلوم ہوا کہ واقعی نواب تھے اپنے آپ کو تباہ کر کے اس اوقات پر آ گئے ہیں۔ میں نے کہا شاباش! یہ انجام ہے مسلمانوں کا صدہا امراء اور رؤسا فضول خرچیوں کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ جائیدادیں ہندوؤں کے قبضہ میں جا رہی ہیں۔

کانپور میں ایک رئیس کا انتقال ہوا۔ ساری جائیداد ان کے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ اس نے اڑانا شروع کی اس کے والد کے ایک دوست نصیحت کرنے کے لئے آئے اور اس کو بٹھا کر بہت دیر تک سمجھایا وہ چپکا گردن جھکائے بیٹھا رہا وہ اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہ اس پر میری نصیحت کارگر ہوئی جب یہ سمجھا چکے تو اس نے کہا کہ بس آپ کہہ چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے انہوں نے کہا کہ بس جو مجھے کہنا تھا وہ کہہ چکا اور اٹھا اور طاق میں سے ایک لنگوٹی اٹھا لایا اور کہا کہ سنئے فضول خرچی کا زیادہ سے زیادہ انجام یہ ہوتا ہے میں نے جس روز سے فضول خرچی شروع کی اسی روز سے میں اس کے لئے آمادہ ہو گیا ہوں اور یہ بنوا کر رکھ چھوڑی ہے وہ بے چارے اس کا منہ دیکھتے رہ گئے کہ کم بخت نے بیکار ہی میرا دماغ خالی کرایا۔

غرض یہ کہ بعض فضول خرچ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ لنگوٹی سے آگے تو اور کچھ نہیں۔ لنگوٹی باندھ لیں گے۔ سو ایسے باہمت لوگ بھی ہیں۔

مسلمانوں کی تباہی کا راز

میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان دوسری قوم کے ہاتھ سے کبھی تباہ نہیں ہوتے جب تباہ ہوتے ہیں

اپنے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ اسلام ایک قلعہ ہے آہنی دیوار ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بسایا ہے۔ اس دیوار کو کوئی نہیں توڑ سکتا اب اس کا کیا علاج کہ کوئی خود ہی دشمن کے لئے پھاٹک کھول دے۔ اگر یہ طریقہ سے رہیں تو کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ تو حزب اللہ ہیں جن کے بارہ میں ہے۔ **فان حزب اللہ ھم الغالبون** یہ تو غالب ہی رہیں گے مگر خود ہی اپنا ناس کرلیں تو اور بات ہے مسلمانوں پر جب تباہی آئی ہے اپنے ہاتھوں آئی ہے کسی دوسرے کے ہاتھوں نہیں آئی۔ چنانچہ رؤسا کی عموماً یہ حالت ہے کہ چانڈو اور گانجہ اور عیاشی میں اپنی جائیدادوں کو ختم کردیتے ہیں اور پھر فقیر ہوجاتے ہیں۔

ہمارے یہاں ایک نواب تھے کسی ملک کے نواب نہیں تھے بلکہ فضول خرچی سے نواب مشہور تھے۔ یہ حالت تھی فضول خرچی کی کہ نوچندی کا میلہ ہے اور مصاحبوں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم بھی جاتے۔ بس یہ سن کر سو سو روپیہ سب کو دے دیا اور یہ کیفیت تھی کہ جلیبیاں منگائی ہیں۔ مصاحبین میں سے کسی نے کہہ دیا کہ تیل کی ہیں بس بیلوں کو ڈلوادیں۔ وہ جلیبیاں بیل کھا رہے ہیں۔ اور صدہا قسم کی فضولیات ان کے یہاں رہتی تھیں۔

انجام یہ ہوا کہ مفلس قلاش ہوگئے ایک حالت تو وہ تھی پھر دوسری حالت فاقہ کی ہوئی اس میں یہ کیفیت تھی کہ میرے پاس تمہارے پاس پہنچتے ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ آٹھ آنے پیسے دے دیجئے بہت ضرورت ہے جو لوگ پردیس سے آتے ہیں ان کے پاس پہنچ جاتے میرے والد کے پاس بھی اکثر آتے میں اس زمانہ میں پڑھا کرتا تھا میں ان کی یہ حالت دیکھتا مگر لوگ کہاں تک دیں انہوں نے تو پیشہ ہی یہ کرلیا تھا آخر انکار کردیتے۔

جس وقت ان کے پاس جائیداد تھی اس وقت اگر کوئی ان کو نصیحت کرتا کہ اس طرح فضول خرچیاں مت کرو جائیداد کو بیچ بیچ کر مت اڑائے ڈالو دیکھو تمہارے باپ نے کس طرح یہ جائیداد خریدی تھی تو آپ فرماتے ہمارے باپ بیوقوف تھے کہ چاندی دے کر مٹی لیتے تھے (یعنی روپیہ دے کر زمین خریدتے تھے' ہم مٹی دے رہے ہیں اور چاندی خرید رہے ہیں (یعنی زمین بیچ رہے ہیں اور روپیہ لے رہے ہیں۔) مگر انہوں نے اپنی حماقت سے یہ نہ سمجھا کہ مٹی تو چاندی کی بھی ماں ہے جس کے پاس زمین ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائیداد ہو اور اس کو کسی مصلحت سے بیچ دے تو فوراً دوسری خرید لے کیونکہ روپے میں برکت نہیں ہوتی (یعنی وہ رہنے والی چیز نہیں)

اور واقعی ہے بھی یہی کہ روپیہ رہتا نہیں سو اس حدیث میں تو جائیداد کی حفاظت کی رغبت دلائی جارہی ہے اور ایک اور حدیث ہے اس میں جائیداد خریدنے سے حضرت عائشہؓ کو ممانعت فرمائی ہے وہ پیغمبر ایک جگہ رغبت دلا رہے ہیں جائیداد رکھنے کی اور وہی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمارہے ہیں کہ اے عائشہ جائیداد مت خریدنا تو مطلب یہ ہے کہ نہ ہو تو لو مت اور ہو تو دو مت بجز نبیؐ کے کوئی پیشوا ایسا ہے جس کی ایسی تعلیم ہو۔ بس دوسرے پیشوا دو قسم کے ہیں یا تو دنیا کو چھڑائیں گے یا اس میں مبتلا کردیں گے۔ اور یہاں یہ کیفیت ہے۔

بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق ہر ہوسکنا کے نداند جام و سندان باختن

اور خاص اس تعلیم میں ایک راز ہے یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو ذلت سے بچاتے ہیں اور یہ امر شاہد ہے کہ جس کے پاس جائیداد ہو اس کی عزت تو جائیداد سے ہوتی ہے وہ اگر جائیداد بیچ دے گا تو اس کی وہ عزت ہرگز نہ رہے گی اس لئے اس کو رکھنے کے واسطے فرمایا یہاں تک کہ اگر کسی مصلحت سے فروخت کرے تو پھر دوسری فوراً لے لے اور جس کے پاس جائیداد نہ ہو تو اس کی جو عزت ہوگی وہ ویسے ہی ہوگی پھر جائیداد خرید کر کے کیوں جھگڑے میں پڑے یہ خوبی ہے اس قانون میں کوئی قانون ہے شریعت کے سوائے جو عقل سلیم اور فطرت صحیح کے موافق ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ جائیداد ایسی چیز ہے کہ حضورؐ اس کے بیچنے سے منع فرمارہے ہیں دیکھا آپ نے زمین کتنی قدر کی چیز ہے اس سے عزت اور جاہ کی حفاظت ہوتی ہے اور اس کی برکت دیکھئے کہ جس کے پاس یہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے اور خوبی یہ ہے کہ آمدنی کھاتے رہو اور ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے اس میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔

تو ایسی چیز کے لئے ان خرچیلے نواب نے کہا کہ مٹی دے کر ہم چاندی خریدتے ہیں یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے اب میں اس کی تائید میں ایک اور حدیث کی شرح کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوجائے گا کہ زمین کیسی چیز ہے۔

زمین کی حقیقت

وہ حدیث یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جنت میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی۔ حق تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلائیں گے۔ ظاہراً اس حدیث پر کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے اس سے تو دنیا ہی میں اچھے تھے۔ وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور

یہاں ڈھیلے اور پتھر نصیب ہوئے کسی کے حصہ میں کوہ منصوری کا پتھر اور کسی کے حصہ میں کوہ شملہ کا۔ اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں۔ اس حدیث کی شرح بجز اہل اسرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی کہ حق تعالیٰ نے ان کو کیسا فہم دیا ہے حقیقت میں **ظل اللہ فی الارض** کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے سو وہ حضرات یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں یہ کہاں سے آئے۔ زمین ہی سے تو نکلے ہیں۔ اگر اونی کپڑے ہیں تو اون ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے تو اجزا کھائے ہیں جن سے وہ اون پیدا ہوئی ہے۔ غرض جس چیز کو بھی لیجئے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی۔ زمین میں پانچ سیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من تو وہ پانچ سیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں۔ انہی کی تو صورت بدل گئی ہے یا آم کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں آم پیدا ہوئے یا غلہ پیدا ہوا یا کسی قسم کا پھل اترا سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے' اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے پس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں۔ زمین میں انار بھی ہیں' آم بھی ہیں' انگور بھی ہیں' کھٹائی بھی مٹھائی بھی۔ سب چیزیں زمین کے اندر موجود ہیں۔ ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے۔ اور لوگ جائیں گے خدا کے مہمان ہو کر تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھانے کھلا دینگے بس وہ اپنی قدرت کی مشین سے شملہ اور منصوری کے پتھر سے جو فضلہ ہے وہ الگ کر دیں گے اور ان میں جو اجزاء قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دیں گے۔

اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا (میں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزیدار ہو ہی نہیں سکتی اس لئے کہ دنیا میں جتنے بھی مزے ہیں سب زمین ہی کا طفیل ہے خوشبوئیں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں اس سے جو روٹی تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے مزے اور ہزاروں قسم کی خوشبوئیں ہوں گی۔ لہذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزہ دار ہو سکتی ہے۔ جامع)

اب ایک بات اور رہ گئی وہ یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی کہ اس زمین کی روٹی بنائی

جائے یہ جنت کی نعمتوں کے برابر تو ہوگی نہیں پھر جنت ہی کی چیز کھلا دیتے۔

اس کا راز بھی حضرات اہل اللہ ہی نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ اہل اللہ میں سے بعض ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی لذت چکھی تک نہیں یا تو قصداً یا میسر نہیں ہوئی اس لئے وہ موازنہ نہ کر سکتے تھے جنت اور دنیا کی نعمت میں اور جب کہ دونوں کا تفاوت معلوم نہ ہوتا تو جنت میں نعمتوں کی قدر بھی پوری نہ ہوتی اس لئے حق تعالیٰ نے پہلے دنیا کی چیز کو کھلا دیا کہ سب سے زیادہ لطیف غذا دنیا کی یہ ہے اب ہمارے یہاں کی غذا کھاؤ۔

اگر کوئی کہے کہ پھر ایسے ہی لوگوں کو کھلا دیا ہوتا جن کو دنیا کی لذات نہیں ملیں سب کو کیوں کھلایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کریم کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ بعض کو کھلائیں اور بعض کو محروم رکھیں اس لئے ہم سوالیوں کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا یہ راز ہے اس حدیث کا اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ زمین کیا چیز ہے کھانے اس میں میوے اس میں کپڑے اس میں سب چیزیں زمین ہی میں ہیں۔ اس لئے یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔

اسراف و تبذیر

اگر کسی مسلمان کی زمین کسی کافر کے پاس دیکھتا ہوں تو میرا دل بہت دکھتا ہے کسی کے اچھے مکان کو دیکھتا ہوں تو پوچھتا ہوں کہ کس کا ہے اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسمان کا ہے تو خوش ہوتا ہوں۔ اگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کا نہیں تو قلق ہوتا ہے۔

میں ایک ضرورت سے نظام آباد گیا تھا۔ وہاں سے حیدر آباد قریب تھا میں نے سنا تھا کہ وہاں مسلمانوں کو بہت ثروت ہے غیر قوموں سے بھی ثروت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اس لئے میں وہاں سے حیدر آباد بھی گیا تا کہ مسلمانوں کو عزت کی حالت میں دیکھوں۔

میں گو مسلمانوں کے لئے فی نفسہ مالدار ہونا پسند نہیں کرتا مگر اوروں کے مقابلہ میں اس کو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ وہ احتیاط کریں اسی لئے جس کو بھی مال اڑاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کو کیا ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا بلکہ میں تو علاوہ معصیت ہونے کے دنیا کی مصلحت سے بھی اسراف کو پسند نہیں کرتا دنیا کے مصالح بھی تو اسی میں ہیں کہ اس کو بے جا صرف نہ کیا جائے۔

میں سفیان ثوری کا قول عرض کرتا ہوں جو انہوں نے مال کے بارے میں فرمایا ہے ...... اور یہ بزرگ وہ ہیں جو دنی اور دنیا داروں سے انتہا درجہ کی نفرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہارون رشید تخت پر

بیٹھے تو ان کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا جس میں علماء اور فقراء کو بہت کچھ ہدایا دیئے گئے مگر آپ ملنے کو بھی نہیں گئے حالانکہ آپ کی ہارون الرشید کے ساتھ بچپن کی دوستی تھی دونوں ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے اگر ہم سوال ہوتے تو یوں کہتے کہ اس میں ضرر کیا ہے۔ ہارون الرشید ایسے نہیں ہیں کہ ان سے ملنے نہ جائیں' دیندار بادشاہ ہیں مگر وہ جا کر بھی نہ پھرے۔

ہارون رشید جب تخت نشینی کے قصوں سے فارغ ہوئے تو سفیان ثوری کی خدمت میں بڑے ادب سے خط لکھا کہ بھائی سفیان کو یاد ہوگا جو مجھ میں اور تم میں علاقہ تھا تم میرے بھائی ہو میری تخت نشینی سے تمہارا جی خوش ہونا چاہیے تھا مگر تم ملنے بھی نہیں آئے تم آتے تو مجھے خدمت کرنے کا بھی موقع ملتا۔ غرض انہوں نے بڑے ادب سے خط لکھا مگر جس وقت سفیان ثوری کے پاس خط گیا ہے تو انہوں نے اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا بلکہ اس کو ایک لکڑی سے کھولا اور اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا جس کے شروع میں یہ مضمون تھا کہ ظالم ہارون رشید کو واضح ہو کہ جس نے مسلمانوں کے حق پر قبضہ کیا۔ جس وقت قاصد نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ بادشاہ کے خط کی ان کے یہاں یہ قدر ہے تو اس پر بے حد اثر ہوا اور وہ دربار میں پہنچا اور خط ہارون رشید کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ میرا استعفیٰ منظور ہو۔ ہارون رشید اس خط کو دیکھ کر رو پڑے اور کہا کہ افسوس پیام لے جانے والا تو کامیاب ہو گیا اور پیام بھیجنے والا محروم رہ گیا۔

سو جن کو اتنی بڑی نفرت تھی دنیا اور اہل دنیا سے' وہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس پیسہ ہو تو اسے چاہیے کہ اس کی قدر کرے اڑائے نہیں۔ یہ حضرات مربی تھے۔ حدود کے سمجھنے والے تھے۔ آپ فرماتے ہیں کہ **الحلال لایحتمل السرف** یعنی مال حلال میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کو فضول خرچ کیا جائے اور آپ اس کی مصلحت بھی بیان کرتے ہیں۔ **لولا هذه الدراهم لتمندل بنا هؤلاء الامراء** یعنی اگر درہام نہ ہوتے تو یہ حکام ہم کو دستمال اور پامال کر دیتے واقعی جس کے پاس مال ہوتا ہے اس پر حکام دست اندازی نہیں کر سکتے۔ مال والا آن بان کے ساتھ رہتا ہے اس کی وہ عزت ہوتی ہے جو بے پیسے والے کی نہیں ہو سکتی اس کو سر نیچا کرنا نہیں پڑتا۔ بھائی اسی واسطے مال بڑی قدر کی چیز ہے سو آپ نے یہ اس کی حکمت بیان فرمائی۔

اب آپ کو معلوم ہوا کہ مال کیسی چیز ہے کیا یہ نعمت نہیں خدا تعالیٰ کی کہ جیسے غریب سقہ بہشتی وغیرہ پر امراء دست اندازی کر سکتے ہیں' مال والے پر نہیں کر سکتے تمول ہی تو اس کا سبب ہے پس

ایسی چیز کو برباد کرنا کتنی بڑی حماقت ہے اسی واسطے فرماتے ہیں۔

اے بسا امساک کز انفاق بہ   مال حق را جز بامر حق مدہ

اے طالب بہت مرتبہ خرچ نہ کرنا بہتر ہوتا ہے خرچ کرنے سے۔ حق تعالیٰ کے مال کو سوائے امر حق کے خرچ مت کر۔

خوب سمجھ لو کہ یہ مال تمہارا نہیں ہے خدا تعالیٰ کا ہے بس ان کا مال جب دو ان کی اجازت سے دو جب تک کہ ان کی اجازت نہ ہو ہرگز نہ دو نہ کسی مصاحب کو نہ اور کسی کو اگر فضول خرچی کرتے ہیں وہی اس وقت گالیاں دیں گے پس اس کو بہت حفاظت سے رکھنا چاہئے ہاں جو واقعی موقع ہو خرچ کرنے کا وہاں خرچ بھی کرنا چاہیے۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس کہیں سے چھ ہزار روپیہ آیا تھا آپ کو ایک شریف آدمی کے متعلق معلوم تھا کہ ان کو حاجت ہے پس آپ نے ان کو بلا کر چپکے سے تمام روپیہ حوالے کر دیا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے پاس ڈیڑھ سو روپیہ کا ایک پوستین ایک جگہ سے آیا ایک نواب آپ کے یہاں آئے ہوئے تھے آپ نے ان کو دے دیا اور فرمایا کہ یہ پوستین میرے کام کا تو ہے نہیں کیونکہ پوستین ایسا قیمتی ہو تو باقی لباس بھی ویسا ہی ہونا چاہیے اور آپ کے کام آ جائے گا کیونکہ آپ کا سارا لباس ایسا ہی ہوتا ہے۔

مولانا اس طرح نہ رہتے تھے کہ کسی نواب یا امیر سے گردن نیچی کرنی پڑے بلکہ ایسا برتاؤ کرتے تھے کہ اوروں ہی کو گردن نیچی کرنی پڑتی تھی۔ اور جب کبھی آپ عمدہ قسم کا لباس پہنتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی والی ملک اور نواب ہیں۔ بے محل ہزاروں روپیہ بھی نہ لیتے تھے اور ویسے روپیہ دو روپیہ بھی قبول فرما لیتے۔

ایک بادشاہ نے ایک دفعہ شاید دس ہزار روپے بھیجے۔ آپ نے واپس کر دیئے اور فرمایا کہ ضرورت کے لائق میرے پاس روپیہ بہت کچھ موجود ہے میں اس قدر روپیہ لے کر کیا کروں گا۔ سو امیروں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا اور غریبوں سے ایک دو روپیہ بھی لے لیتے تھے۔ ہم خود تو ایسے نہیں ہیں مگر الحمد للہ ایسوں کو پسند تو کرتے ہیں۔

میں ایک اپنا قصہ بیان کرتا ہوں ایک رئیس نے میرے پاس دو سو روپے مدرسے کے لئے بھیجے اور لکھا کہ میرا ارادہ ہے کہ آپ کے یہاں بلانے کی تحریک کروں اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو میں لے لیتا۔ میں

نے لکھ دیا کہ روپوں کے ساتھ بلانے کی درخواست کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روپے بھیجنے سے آپ کا مقصود یہ ہے کہ میں ان سے متاثر ہو کر آپ کی درخواست کو منظور کرلوں اس لئے میں نے وہ روپے نہیں لئے ڈاک خانہ میں جمع کرا دیئے ہیں اگر آپ کے جواب سے یہ شبہ رفع ہو گیا تو لے لوں گا ورنہ واپس کر دوں گا آخر ان کا خط آیا کہ مجھ سے بے تمیزی ہوئی اب میں آپ سے یہ درخواست نہیں کرتا۔

سو میرا یوں جی چاہتا ہے کہ کسی کا احسان رکھ کر نہ لیا جاوے ہمارے بزرگوں کا مذہب یہ ہے کہ اپنی کسی بات سے دین کی عزت میں ذرہ برابر فتور نہ آوے۔ جو بات کی جاتی ہے اس میں نیت یہ ہوتی ہے کہ دین کی عزت ہر طرح محفوظ رہے۔

ایک قابل عمل بات

ایک بات یہ بھی قابل عمل ہے کہ اگر مسلمانوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو اس کی یہ صورت نہیں کہ دستر خوان بڑا وسیع ہو۔ آج بریانی پک رہی ہے آج پلاؤ اور قورمہ تیار ہو رہے ہیں۔ ذرا سے کھانے میں ایک بڑی رقم لگ گئی اس سے تو چار غریب مسلمانوں کا بھلا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ کیا کہ بے حاجت قورمہ بریانی پکائے جا رہے ہیں اپنے عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہو تو بس روپیہ نقد دے دیا یہ نہیں کہ جوڑے عمدہ عمدہ دو۔

ایک ڈپٹی صاحب تھے تین سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی مگر وہ ان کو کافی نہ ہوتی تھی ان کے یہاں یہ کیفیت تھی کہ کوئی عزیز دو مہینے سے پڑا ہے پھر تنخواہ کس طرح سے کفایت کرتی مجھے اس کی اطلاع ہوئی میں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ کیا بکھیڑا کر رکھا ہے ان سب کو ترک کرو اگر ایسا ہی عزیزوں کے ساتھ احسان کرنا ہے تو سب کی تنخواہ کر دو ان کے بعض عزیز چولہے میں شامل تھے میں نے کہا سب کے چولہے الگ کرو سوائے میاں بی بی کے اور میں نے یہ کہہ دیا کہ دیکھو میرا نام مت ظاہر کرنا کہ یہ اس کی رائے ہے مگر اس پر عزیزوں نے ان کا بہت پیچھا کیا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے میرا نام لے دیا کہ یہ میں نے ان کی رائے سے کیا ہے۔ تب کہیں وہ لوگ چپ ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ اپنے اعزہ کے ساتھ سلوک کرنا چاہے تو نقد دے دے کھانے وغیرہ کا قصہ نہ پھیلائے اس میں بڑی خرابیاں پیش آتی ہیں۔

ایک دوست نے مجھے لکھا' تمیں روپے میری تنخواہ ہے اور مہمان بکثرت آتے ہیں۔ تنخواہ میں خرچ پورا نہیں ہوتا میں بہت پریشان ہوں میں نے لکھا کہ عرف کو تو طاق میں رکھو جو تمہارا کھانا

ہے وہ سب کے سامنے رکھ دیا کرو اور کہہ دیا کہ بس یہی کھانا ہے سب مل کے کھالو انہوں نے ایسا ہی کیا بس سب نے آنا چھوڑ دیا اور میں نے لکھا کہ اہل اللہ کا مذہب رکھو۔ وضعدار لوگوں کا مت رکھوان کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد   زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند

پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے۔

اہل اللہ بالکل آزاد ہیں۔ رسم ورواج کے ذرا مقید نہیں ان کا بڑا اچھا مشرب ہے ہر ادا ان کی محبوب ہے۔ بس میں نے لکھ دیا کہ اپنا کھانا سب کے سامنے رکھ دیا' پیٹ بھرے چاہے نہ بھرے۔ آدمی ارادہ کرلے تو سب کچھ ہوجاتا ہے انہوں نے اس پر عمل کیا اور اس کے بعد لکھا کہ خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے بڑی اچھی تدبیر بتلائی میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

ہم تو یہی تعلیم کریں گے کہ بلا ضرورت مقروض مت ہو گو رسم ورواج کے خلاف کرنا پڑے مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت برا ہے اہل اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اس میں بڑی راحت ہے ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے۔

امراء کو ایک بات یہ چاہئے کہ جس سے اسراف سے نجات ہو اور انتظام درست ہو کہ سب سے اول اپنے اسباب کا انتخاب کریں کہ کون سا ضروری ہے اور کون سا فضول ہے امراء میں یہ آفت ہے کہ جو چیز پسند آگئی خرید لی اس سے بحث نہیں کہ اس کی حاجت بھی ہے یا نہیں؟ ہر چیز کے خریدار ہوجاتے ہیں جب کسی دکان پر جاتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور خریدتے ہیں ان کے نزدیک یہ عار کی بات ہے کہ کوئی یوں کہے کہ دکان پر آئے اور لیا کچھ بھی نہیں۔ گھر میں بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ بیکار رکھی رہتی ہیں۔ عمر بھر بھی کسی کام میں نہیں آتیں کسی نے خوب کہا ہے۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش   آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

حرص کی وجہ سے قناعت نہیں ورنہ اسباب معاش جو ہمارے پاس موجود ہیں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت نہیں۔

پس سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دو اور جتنی کام میں نہ آئیں خارج کردو یا مساکین کو دے دو۔ نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوۃ ہی میں دے دو۔

میں ایک اور مفید ترکیب بتلاتا ہوں فضول خرچی نہ ہونے کی وہ یہ کہ گھر کا معائنہ کیا کرو گھر میں

بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں کسی کو دیمک لگ رہی ہے پس ایسی چیزوں کو اپنی ملک سے الگ کر دو تا کہ گھر میں رونق ہو ایک دفعہ ایسا کر گزرو گے تو آئندہ ایسی چیزیں کبھی نہ خریدو گے۔

ایک بات یہ ہے کہ روزمرہ کی معاشرت میں یہ مقرر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرڈ بے تامل مت کر رڈالو اور ایک بات یہ کہ کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو بس اپنی رائے پر عمل کرو میرے ایک ماموں صاحب تھے انہوں نے نظم گل بکاؤلی میں یہ شعر پسند کیا تھا۔

سن لاکھ کوئی تجھے سناوے ۔۔۔ کیجو وہی جو سمجھ میں آوے

قرآن اور جمہوری نظام

قرآن شریف میں مشورہ کی تاکید ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کرنا وہی جو اپنی سمجھ میں آجاوے۔ حضرت قرآن شریف میں سب کچھ ہے اس کی شان ہے **تبیانا لکل شیء** کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو اس کے اندر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن شریف میں مشورہ کا بھی امر ہے **وشاورھم فی الامر** کہ آپ مشورہ کیجئے اور آگے یہ بھی ہے **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** یعنی جب خود آپ کا قصد ہو جائے تو آپ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کام کو کر ڈالئے یہ نہیں فرمایا **فاذا عزموا** کہ وہ جب عزم کریں یا **فاذا عزم اکثر به** کہ ان میں سے اکثر عزم کریں۔ مطلب یہ ہے کہ مشورہ تو ان سے کیجئے اور عزم اپنا ہو کہ مشورہ کے بعد جس بات پر آپ کی رائے قرار پائے وہ کیجئے۔

یہاں سے سلطنت جمہوری کا قلع قمع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جدھر کثرت رائے ہو اس جانب کو لیا جاوے سو قرآن شریف کی تعلیم اس کے خلاف ہے ورنہ یوں ہوتا **فاذا عزم اکثرھم** مگر یہ نہیں فرمایا بلکہ **فاذا عزمت** فرمایا کہ جب آپ کا عزم ہو تب کیجئے۔

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مشورہ تو سب کا ہو اور عزم آپ کا ہو مشورہ کے بعد جو آپ کی رائے ہو وہ کیجئے دوسروں کی رائے پر عمل کرنا آپ کو لازم نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اہل ہی ہوں اور آج کل کے تو اہل الرائے ماشاءاللہ اہل بھی نہیں ہوتے۔

کانپور میں ایک صاحب نے ایک مہاجن سے کہا کہ فلاں بات کی ہم کمیٹی میں تحریک کریں گے تم اس کی تائید کرنا۔ اس نے کہا کہ میں کیسے تائید کروں گا مجھ کو تو تائید کرنی آتی ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ جب میں کہہ چکوں تو بس تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں اس کا خوب سبق یاد کرا دیا کمیٹی میں پہنچے تو مہاجن صاحب کو سہم چڑھا ان لفظوں کو بے چارہ دل ہی دل میں

گھونٹ رہا تھا کہ کہیں بھول نہ جاؤں غرض ان صاحب نے تحریک کی اس کے بعد مہاجن صاحب کھڑے ہوئے گھبراہٹ میں وہ لفظ تو یاد رہا نہیں آپ کہنے لگے صاحبو! میں بھی تارید کرتا ہوں ان صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو آپ کہتے ہیں کہ میں تردید کرتا ہوں پھر انہوں نے آہستہ سے بتلایا کہ یوں کہو میں تائید کرتا ہوں تو آپ کہتے ہیں صاحبو! میں تاکید کرتا ہوں آج کل ایسے ایسے اہل الرائے ہوتے ہیں کمیٹیوں میں۔

ایسا ہی ایک اور قصہ ہے کہ ایک جاہل مجسٹریٹ ہو گیا اسے کچھ آتا جاتا خاک نہ تھا اس لئے آپ کو فکر ہوئی کہ میں فیصلے کس طرح کروں گا آخر آپ فیصلہ دیکھنے کے لئے ایک اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پہنچے جو کہ ان کے برابر کا تھا اتنے میں دو شخصوں نے عرضیاں پیش کیں اتفاق سے اس نے ایک کو منظور کر کے دائیں طرف دے دیا اور ایک کو نامنظور کر کے بائیں طرف دے دیا انہوں نے دل میں یہ کہا کہ بس فیصلہ اسی طرح ہوتا ہے یہ کوئی مشکل بات نہیں میں بھی اسی طرح فیصلہ کر دیا کروں گا۔ پس آپ بھی فیصلہ کرنے کے لئے اجلاس میں جا بیٹھے اب جو عرضیاں پیش ہوتی ہیں تو آپ طاق نمبر میں تو کہہ دیتے ہیں منجور اور دائیں طرف رکھ دیتے ہیں اور جفت میں نامنجور اور بائیں طرف رکھ دیتے ہیں بس ایک کو منجور اور ایک کو نامنجور عرضی پیش کرنے والوں کی کم بختی آئی۔

سو ایسی ایسی لیاقت کے لوگ پریذیڈنٹ ہوئے ہیں نفرین کے قابل ہیں۔ ایسے لوگ کمیٹیوں میں ایسے ایسے ممبر ہوتے ہیں جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہوتی واقعات بتلا رہے ہیں کہ آج کل کی کثرت رائے تو بالکل ہی مہمل ہے۔ اور اس میں اتنا غلو ہوا ہے کہ اب تو امراء کے یہاں کھانا بھی کمیٹی ہو کر کھایا جاتا ہے جب کھانا آتا ہے اور بھوک نہیں ہوتی تو مصاحبین سے پوچھتے ہیں کہ اس وقت کھانا چاہیے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ حضور تھوڑا سا تو کھا لیجئے۔ بالکل نہ کھایئے گا تو ضعف ہو جائے گا اور ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ کھائیں گے تو ہمیں بھی مل جائے گا بس وہ دوسروں کے ہاتھ میں پھنس گئے ہیں جیسے بچے ہوتے ہیں۔

مصاحبین کی یہ حالت ہے کہ ہر بات میں بجا اور درست کے سوا کچھ کہتے ہی نہیں خواہ بے جا ہی ہوتی کہ اگر امیر صاحب کا وضو ٹوٹتا ہے جس کو محاورہ میں وضو ٹوٹنا کہتے ہیں تو اس پر بھی مبارک بادی دی جاتی ہے جہاں ایسے مصاحب ہوں پھر عقل کیسے ٹھکانے رہ سکتی ہے بس سب سے مقدم کام یہ ہے کہ ایسے مصاحبوں کو بالکل حذف کرو۔

شیطان کا مکر

میں صرف امراء کو ہی نہیں کہتا بلکہ یہی حالت مشائخ اور علماء کے یہاں بھی ہو رہی ہے پیروں کی عقل تو مریدوں نے لے لی اور علماء کی عقل شاگردوں نے پیر صاحب بلا مریدوں کے کوئی کام نہیں کر سکتے اور مریدوں کی یہ حالت ہے کہ پیر صاحب کسی کی غیبت کرتے ہیں تو وہ آمنا وصدقنا کے سوا کچھ نہیں کہتے۔ مصاحبین نے پیروں کو خراب کر رکھا ہے امراء کی ہم کیا شکایت کریں پیروں اور علماء کے یہاں بھی ایسے ہی مصاحب ہوتے ہیں بعض خدام کو اپنا مقرب بنا لیتے ہیں پھر وہ مزاج میں ایسے دخیل ہو جاتے ہیں کہ جس سے چاہیں راضی کرا دیں اور جس سے چاہیں ناراض کرا دیں۔ بس پیر صاحب بالکل ان کے قبضہ میں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تقریب کا نتیجہ خود ان مقربین کے لئے یہ ہوتا ہے کہ اور لوگ ان سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ مقرب ہو کر کیا کرتے ہیں کسی کی تعریف کر دی کسی کی برائی کر دی اور پیر صاحب ایسے بھولے بھالے ہیں کہ جو انہوں نے کہہ دیا اسی کو مان لیا۔

خوب سمجھ لو کہ بزرگوں میں زیادہ کامل وہ ہے جس کی حالت نبیؐ کے زیادہ مشابہ ہو۔ سو نبیؐ کوئی بھولا نہیں ہوا۔ جتنے نبیؐ ہوئے ہیں سب نہایت ہوشیار اور بیدار مغز تھے۔ پس زیادہ کامل وہی ہوگا جو نہایت ہوشیار اور متیقظ ہو۔ بھولا ہونا کوئی کمال نہیں۔ بھولا آدمی بھی سمجھے گا کسی کے مکر کو۔ جب انسان ہی کے مکر کو نہ سمجھے گا تو شیطان کے مکر کو کیا خاک سمجھے گا۔ کیونکہ شیطان کا مکر تو انسان کے مکر سے زیادہ سخت ہے یوں وظیفہ پڑھنا اور بات ہے باقی تربیت جس کا نام ہے یہ بھولے شخص سے نہیں ہو سکتی تربیت اور اصلاح دوسروں کی وہی کر سکتا ہے جو نہایت ہوشیار اور بیدار مغز ہو لہٰذا بیعت بھی انتخاب کر کے ایسے ہی شخص سے کرنی چاہئے

بعض لوگ بھولے پن سے ہر شخص کا نذرانہ قبول کر لیتے ہیں ان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس میں کیا خرابی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نذرانہ خلوص سے نہیں دیا جاتا بلکہ اس میں دینے والے کی کوئی غرض فاسد ہوتی ہے اس لئے بلا تامل ہر شخص کا نذرانہ نہ لینا چاہئے۔

ایک تحصیلدار میرے پاس آئے انہوں نے مجھ کو پچیس روپے دیئے میں نے اس میں سے دس روپے تو لے لئے باقی واپس کر دیئے وہ تو چلے گئے اور بعض لوگ ان کے ساتھ آئے تھے وہ رہ گئے انہوں نے کہا کہ صاحب آپ نے دس روپے قبول کئے اور عجیب بات ہے کہ دس ہی روپے اول انہوں نے تجویز بھی کئے تھے مگر پھر کہنے لگے کہ اتنے روپے نہ میری شان کے لائق ہیں اور نہ ان کی

شان کے اس لئے پندرہ اور نکالے بس دس روپے تو انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اور پندرہ وضع داری سے اور خدا تعالیٰ کی قدرت کہ جتنے انہوں نے خلوص سے نکالے تھے اتنے ہی میں نے لئے۔

اس کی ظاہری وجہ یہ ہوئی کہ میں نے اس روز دس روپیہ کی لکڑیاں قرض لی تھیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کو ادا کر دیجئے۔ میرے ذہن میں ان کے دینے کے وقت یہ بات آئی کہ تو نے دس روپے کے لئے دعا کی تھی اس کا بندوبست خدا تعالیٰ نے کر دیا اس سے کم لینا ناشکری ہے اس خیال سے میں نے دس روپے لے لئے باقی واپس کر دیئے اس میں یہ بات بھی نکل آئی کہ دس ہی انہوں نے خلوص سے دیئے بھی تھے۔

غرض نذرانہ قبول کرنے میں بہت ہوش سے کام لینا چاہئے اس وقت جو میں نے دس روپے لئے تھے اور باقی واپس کر دیئے تھے اس کا زیادہ وجہ تو وہ تھی جس کو میں نے بیان کیا باقی میرا مذاق بھی یہی ہے کہ زیادہ نذرانہ نہ قبول کیا جاوے چنانچہ میرا اکثر معمول ہے کہ ایک مہینہ کی آمدنی میں سے ایک روز کی پیش کرے تو خوشی سے لے لیتا ہوں اور پھر دوسری بار اگر نذرانہ دینے لگے تو اس کے لئے یہ شرط ہے کہ دونوں کے درمیان کم از کم ایک ماہ کا فصل ہو یہ ہے میرا مذاق۔

اہل اللہ کی معاشرت

مجھے امراء پر بہت رحم آتا ہے کیونکہ ان کے اخراجات ایسے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کی آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی پھر ان پر یہ مصیبت ہے کہ دعوت بھی کریں گے تو ایسی کہ بدوں قرض لئے نہ ہو سکے۔ بھلا گھر کا معمولی کھانا کس طرح کھلاویں تاوقتیکہ رنگ برنگ کے کھانے دسترخوانوں پر نہ ہوں دعوت ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مختلف رنگ کے کھانوں سے سادہ کھانا زیادہ لذیذ ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ مختلف رنگ کے کھانے عادت کے خلاف ہوتے ہیں دوسرے متعدد کھانے طبیعت کو مشوش کر دیتے ہیں۔

موجز میں صراحۃً لکھا ہے کہ **کثرة الالوان محیر للطبیعة** یعنی کئی قسم کے کھانوں سے طبیعت کو حیرت ہوتی ہے۔ ہضم میں طبیعت حیران ہوتی ہے کہ پہلے کس میں عمل کروں یہ حیرت تو کھانے کے بعد ہوتی ہے اور ایک حیرت کھانے سے قبل بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر کھانا کہتا ہے کہ اول مجھے کھاؤ اس میں سوچنا پڑتا ہے اجتہاد کر کے متعین کرنا پڑتا ہے کہ کس کو پہلے کھائیں اور کسے بعد میں۔ بعض کھانوں میں طبعاً ترتیب ہوتی ہے اور ہر شخص اس سے واقف نہیں ہوتا اس لئے ترتیب کے خلاف کھائے جاتے ہیں

جو کہ مضر ہوتا ہے پس سب سے اچھی دعوت یہ ہے کہ جو گھر میں ہو وہ کھلا دیا۔

اہل اللہ کی معاشرت دیکھئے مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کا قصہ ہے کہ آپ دہلی میں ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ ان سے مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی نے فرمایا کہ مولانا آپ دہلی سے جب وطن جایا کریں تو راستہ میں مجھ سے مل کر جایا کریں۔ (کیونکہ کاندھلہ راستہ ہی میں پڑتا ہے) انہوں نے منظور کیا مگر شرط یہ لگائی کہ میری منزل میں حرج نہ ہو۔ مولانا مظفر حسین صاحب نے اس کو منظور فرمایا۔ مولانا مملوک علی صاحب جب دہلی سے تشریف لاتے تو مولانا مظفر حسین صاحب سے راستہ میں ضرور ملتے اور مل کر سوار ہو جاتے۔

ایک مرتبہ کا قصہ ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی سے آ رہے تھے جب کاندھلہ پہنچے تو مولانا مظفر حسین صاحب سے ملنے کے لئے سواری ٹھہرائی اور سواری وہیں چھوڑ کر مولانا سے ملنے گئے۔ مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی گھر کے رئیس تھے۔ مگر آپ کی سادگی دیکھئے کہ آپ نے پوچھا کہ کھانا کھا چکے ہو یا کھاؤ گے۔ مولانا مملوک علی صاحب نے کہا کھائیں گے انہوں نے فرمایا کہ تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہے وہی لے آؤں۔ مولانا مملوک علی صاحب نے فرمایا کہ جو موجود ہو وہی لے آیئے بس آپ مٹی کی رکابی میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا رکھا ہوا تو یہ ہے وہ بھی ایسے ہی تھے۔ بس انہوں نے اسی کو کھالیا اور پانی پی کر رخصت ہو گئے۔ یہ حالت تھی ان حضرات کی کہ جو ہوا وہ سامنے رکھ دیا۔

ایک دفعہ مولانا مظفر حسین صاحب گنگوہ تشریف لے گئے مولانا گنگوہی کے مہمان ہوئے صبح جب رخصت ہونے لگے تو مولانا گنگوہی نے کھانے کے لئے عرض کیا مولانا مظفر حسین صاحب رام پور جانے والے تھے۔ فرمایا کہ میری منزل کھوٹی ہوگی کیونکہ کھانا تیار ہونے میں دیر لگے گی ہاں اگر رات کا رکھا ہوا ہو تو لا دو۔ مولانا نے ماش کی دال اور باسی روٹی لا دی آپ نے رکابی کی دال روٹی پر الٹ کر پٹے میں باندھ لی اور رخصت ہو گئے۔ حالانکہ آپ رئیس تھے جب رام پور پہنچے تو حکیم ضیاء الدین صاحب سے کہا کہ مولوی رشید احمد بڑے اچھے آدمی ہیں حکیم صاحب نے کہا کہ ہاں واقعی بڑے بزرگ ہیں۔ آپ فرمانے لگے کہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں اور آپ کہتے ہیں بڑے بزرگ ہیں۔ میں ان کے بزرگ ہونے کی تعریف نہیں کر رہا میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ اگر خود نہیں سمجھتے تو پوچھ ہی لو۔ انہوں نے کہا کہ اچھا حضرت فرمایئے۔

آپ نے کہا کہ دیکھو کیسے اچھے آدمی ہیں انہوں نے مجھے کھانے کے لئے کہا پھر میرے کہنے سے جو کھانا رکھا ہوا تھا بے تکلف لا دیا میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔

افسوس ہے کہ آج ان افعال کو ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ صاحبو! اگر وقت پر باسی روٹی مل جاوے تو وہ پلاؤ اور زردہ اور قورمہ سے اچھی ہے۔ اکثر ہمارے قصبات کے رئیسوں میں بھی سادگی ہے چائے تک کے عادی نہیں بعض جگہ تو اس قدر تکلف ہے کہ ایک جگہ دعوت ہوئی صبح کو چائے پلائی اس میں اس قدر تکلف کیا کہ بیس روپے لگ گئے پھر کھانے میں اتنا بکھیڑا کیا کہ عصر کے وقت کھانا ملا بھلا کیا نفع ان باتوں سے خوب سمجھ لیجئے کہ دین کے چھوڑنے سے دنیا کی بھی تکلیف ہوتی ہے اور عقل بھی مسخ ہو جاتی ہے۔

ہر چیز میں تفاخر

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا دے تو برا کھاؤ برا پہنو نہیں اچھا کھاؤ اچھا پہنو مگر حد کے اندر رہو۔ حضرت اب تو ہر چیز میں تفاخر ہے۔ کپڑا تفاخر کے لئے پہنتے ہیں کھانا ہے تو تفاخر کے لئے مکان ہے تفاخر کے واسطے۔ بعض نئے فیشن کے شیدائی ہیں ان کو کپڑے بھی نوکر ہی پہناتا ہے بٹن تک اپنے ہاتھ سے نہیں لگتے روزمرہ ان کے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ فیشن ہی میں گزرتا ہے۔

ایک شخص ہر وقت جوڑے ہی بدلا کرتے تھے ہر وقت کے لئے ایک جوڑا الگ کر رکھا تھا سواری کے وقت کا جوڑا اور دوستوں سے ملنے کا اور حتیٰ کہ پاخانہ میں جانے کا جوڑا اور تھا ایک مرتبہ میں بھائی کے پاس گیا اتفاق سے وہ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے میں انہیں ہر وقت اسی مشغلہ میں لگا ہوا دیکھتا ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ نیچا کرتہ اور اس کے نیچے جانگیہ پہنے ہوئے پاخانہ میں جا رہے ہیں اور گھٹنے اور رانیں سب کھلی ہوئی ہیں حالانکہ ویسے مہذب شخص تھے ایک روز مجھ سے بھی ملنے آئے اور عذر کرنے لگے کہ مجھ کو فرصت نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے آپ سے نہ مل سکا میں نے کہا جی ہاں میں خود دیکھتا ہوں کہ آپ ہر وقت کام میں لگے رہتے ہیں اس پر بہت شرمندہ ہوئے۔

آج کل یہ حالت ہے کہ لباس بھی دوسری قوم کا کھانا بھی دوسرے ہی لوگوں کا ہر بات میں دوسری قوموں کی تقلید کرتے ہیں۔ اے مسلمانوں! آپ کے گھر میں سب کچھ ہے دوسرے کے گھر سے لینے کی آپ کو مطلق ضرورت نہیں ہماری یہ حالت ہو رہی ہے۔

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر
تو ہمیں جوئی لب ناں دربدر

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے اور تو روٹی کے ایک ٹکڑے کیلئے در بدر مارا پھر رہا ہے)

ایک اور نیا طرز نکلا ہے جو امراء میں بھی بہت شائع ہو گیا کہ خالی برتن سامنے رکھ دیئے اور ایک ڈونگے میں کھانا لا کر بیچ میں رکھ دیا۔ اب وہ ایک ڈونگا ساری مجلس میں گھوم رہا ہے جن کا یہ اصل میں طرز ہے ان کے یہاں خود کھانا پہنچاتے ہیں یہاں یہ بے تمیزی کہ جو مانگے اسے دے دو اور جو نہ مانگے اسے مت دو۔ اس میں یہ توجیہ گھڑی ہے کہ کھانا خراب نہیں ہوتا جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے لے لیتا ہے جوٹھا کھانا نہیں بچتا حالانکہ یہ توجیہ بالکل لغو ہے کیونکہ اس کا دوسرا طریق ممکن ہے کہ تھوڑا تھوڑا کھانا رکھو اور جس کے سامنے نہ رہے اور دے دو اسی طرح لباس میں توجیہات گھڑی ہیں چھری کانٹے میں یہ وجہ گھڑی ہے کہ انسان کے ناخن میں زہر ہوتا ہے اس لئے ہاتھ سے نہیں کھاتے۔

یورپ کی اندھی تقلید

میں کہتا ہوں کہ تاویلیں کیوں کی جاتی ہیں سیدھی بات کیوں نہیں کہتے کہ اہل یورپ کا جو طرز ہے وہ پسند ہے اسی کے مقلد ہیں۔ اگر آج اہل یورپ اس طرز کو بدل لیں تو یہ بھی فوراً بدل دیں گے یہی وجہ ہے کہ جو فیشن وہ اختیار کرتے ہیں اسی کو یہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی فیشن کا کوٹ وغیرہ سلوایا اور ابھی پہنا نہیں کہ فیشن بدل گیا تو وہ کوٹ بیکار ہو گیا اب دوسرے فیشن کا تیار کرا کے پہنا جائے گا جوتے ہیں تو وہ چھ چھ جوڑے داڑھی صاف کرانے کا منشاء اہل یورپ ہی کی تقلید ہے۔ اگر آج وہاں داڑھی رکھ لی جائے تو یہ بھی اپنے طرز کو بدل دیں۔

ایک مرتبہ یہ خبر سنی گئی تھی کہ داڑھی منڈانے کے نقصانات دیکھ کر اب اہل یورپ کی یہ رائے ہو رہی ہے کہ داڑھی رکھ لینی چاہئے۔ میں نے ایک وعظ میں کہا کہ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ داڑھی جلد رکھ لیں کیونکہ لندن سے داڑھی رکھنے کا فتویٰ آنے والا ہے اگر بعد میں رکھی تو طعن ہو گا کہ خدا رسولؐ کے فتوے کو تو نہ مانا اور اہل یورپ کے فتوے پر عمل کیا اس سے پہلے ہی رکھ لو تا کہ کسی کو طعن کی گنجائش نہ ملے۔

میں تو کہتا ہوں کہ غیر قوم کا طرز اختیار کرنے میں قطع نظر اس سے کہ کفار کے ساتھ تشبہ ہے جو حرام ہے دنیا کا بھی کتنا بڑا نقصان ہے اس فیشن کی بدولت حالت یہ ہو رہی ہے کہ دو سو کی آمدنی ہو وہ خرچ کو کافی نہیں، پانسو کی آمدنی ہو وہ کافی نہیں اس فیشن میں بے طرح روپیہ برباد ہوتا ہے۔ کیا یہ اسراف نہیں ہے ہم نے بہت سے لوگ دیکھے کہ پانسو کے ملازم ہیں۔ مگر اس فیشن کی وجہ سے مقروض ہیں۔

ایک جنٹلمین صاحب تھے وہ ہمیشہ بی بی کے بے طور سر رہتے کہ تم کپڑوں میں اتنا صرف

کرتی ہو زیور میں اتنا صرف کرتی ہو۔ تمہارے خرچ کی وجہ سے آمدنی کا پتہ ہی نہیں لگتا۔ بی بی کو سنتے ہوئے مدت ہوگئی کہاں تک سنے مکھی کو بھی پتہ ہوتا ہے آخر ایک روز اس کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے خوب لتاڑا کہ تم ہمیشہ میرے پیچھے تو پڑتے رہتے ہو کہ یہ فضول خرچی کرتی ہے اور یوں کرتی ہے ذرا اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو کہ فیشن میں کتنا صرف ہوتا ہے۔ چھ جوڑے جوتے ولایتی کتنے کے ہوتے ہیں۔ کوٹ پتلون میں کیا لگتا ہے مکان کی سجاوٹ کا انگریزی سامان کتنی قیمت میں آتا ہے ایک ایک چیز اس نے ان حضرت کو گنوائی چونکہ جواب معقول تھا ان کو خاموش ہونا پڑا جب کہیں اس بیچاری کا پیچھا چھوٹا۔

بس ان کے مقتدا تو اہل یورپ ہیں۔ انہی کی تقلید میں انہوں نے اپنے دین کا بھی ناس کیا ہے اور دنیا کا بھی۔

بعض عورتوں نے سایہ پہننا شروع کیا ہے میم صاحب بننا چاہتی ہیں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں، کان ننگے، ان میں بالیاں تک نہیں۔ جو طرز میموں کا ہے وہ اختیار کیا ہے یہ نیا فیشن نکلا ہے عورتوں میں۔

میں کہتا ہوں کہ قطع نظر اس کے کہ تشبہ ناجائز ہے اخلاق پر اس کا بہت برا اثر پڑتا ہے وہ یہ کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے جو سبب ہو تکبر کا۔ وہ بھی ناجائز ہوگا اور اس تشبہ میں کبر کی یہاں تک خاصیت ہے کہ حضرت پلنگ اور کرسی پر بیٹھنے تک میں تفاوت ہے۔ جو وجہ ان سے مدرک ہے۔

ایک ڈاکٹر کہتے تھے کہ جب ہم حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر واپس ہوئے تو اپنے دل میں ایک نور لے کر آئے تھے۔ مظفر نگر جب آئے تو ایک شخص فٹن لے کر آئے کہ ہمارے مریض کو چل کر دیکھ لیجئے انہوں نے فٹن میں بیٹھنے سے بہت انکار کیا مگر اس کے اصرار کرنے پر آخر بیٹھنا پڑا۔ کہتے تھے کہ جس وقت فٹن میں قدم رکھا ہے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ نور سلب ہوگیا وجہ اس کی یہ ہے کہ ان چیزوں کی نسبت ہے دوسری قوم سے اس لئے ایسا ہوا یہ دوسری قوم کی وضع سمجھی جاتی ہے اس لئے اس میں بیٹھنے سے وہ نور سلب ہوگیا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غیر قوم کی ہر چیز ناجائز ہے بلکہ وہ ناجائز ہے جس کو خصوصیت ہے دوسری قوم کے ساتھ اور جس کو خصوصیت نہیں دوسری قوم کے ساتھ وہ جائز ہے۔ مونڈھے کرسی میں امتیازی شکل

نہیں رہی وہ کسی خاص قوم کی وضع نہیں سمجھی جاتی اس لئے جائز ہے اور سایہ وغیرہ میں امتیازی شکل باقی ہے اس لئے ناجائز ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دیکھ کر طبیعت کھٹک جائے کہ یہ تو فلاں قوم کا طرز ہے تو تشبہ ہے ورنہ تشبہ نہیں۔ چنانچہ سایہ وغیرہ دیکھ کر فوراً دیکھنے والے کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ یہ تو میموں کا طرز ہے اور کرسی موڑھے میں ایسا نہیں ہے اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کر لو۔

انگریزی طرز اخلاق

غرض یہ ہے کہ یہ طرز اخلاق کے اعتبار سے بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس کا اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ خاص کر ملانوں کو ان لوگوں نے نیم وحشی کا خطاب دے رکھا ہے۔ حاصل یہ کہ یہ طرز اخلاقی لحاظ سے بھی اچھا نہیں مگر پھر بھی اس میں مصالح گھڑی جاتی ہیں۔

ایک شخص ریل میں تھے اور آپ کی وضع یہ تھی کہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے اور کتا بغل میں اسی گاڑی میں بقول ان کے ایک نیم وحشی بھی آ کر سوار ہوئے مگر انہوں نے ان کو سلام نہیں کیا تو آپ کہتے ہیں مسلمان کو کم از کم سلام تو کر لینا چاہئے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو مسلمان ہی نہ سمجھا تھا۔ اس لئے سلام نہ کیا۔ جنٹلمین صاحب نے کہا کہ میرے اندر ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے کہا تم نے ساری وضع تو کافروں کی سی بنا رکھی ہے پھر میں تمہیں مسلمان کیسے سمجھتا۔ انہوں نے کہا کہ کیا لباس سے مسلمان ہوتا ہے اس لباس میں تو مصلحت ہے اس لئے ہم نے اس کو اختیار کیا ہے وہ یہ کہ ڈھیلے پاجامہ میں گر پڑنے کا خوف ہے اس پر انہوں نے کہا کہ اس میں تو یہ مصلحت ہے اور کتا بغل کے اندر لینے میں کیا مصلحت ہے۔ جنٹلمین صاحب کہنے لگے کہ اس میں بڑی مصلحت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں فرشتہ نہیں آتا اس لئے ہم کتے کو ساتھ رکھتے ہیں تا کہ عزرائیل سے بچے رہیں ان صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا کہا کہ آخر کوئی کتے کی جان بھی تو قبض کرتا ہوگا وہی آپ کی قبض کرے گا اس پر بڑے جھلائے۔

رسم پرستی

میں لباس کے بارے میں ایک فتویٰ عجیب نقل کرتا ہوں حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا فتویٰ نہیں کیونکہ یہ لوگ ابو حنیفہ کا فتویٰ کاہے کو ماننے لگے ہیں جب کہ اللہ و رسول کا فتویٰ نہیں مانتے بلکہ وائسرائے کا فتویٰ نقل کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک صاحب وائسرائے سے ملنے گئے اور گئے

اپنے ہی وضع میں وائسرائے نے اثنائے گفتگو کہا کہ مولوی صاحب اس لباس میں آپ شہزادہ معلوم ہوتے ہیں ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں اس لئے ایسا لباس نہیں پہن سکتے ورنہ ہم بھی اسی کو پہنتے۔ خوش نما بھی ہے اور راحت بھی اس میں ہے۔ لیجئے جناب اب تو وائسرائے کا فتویٰ بھی ہو گیا اللہ ورسول کا فتویٰ نہ مانو تو وائسرائے ہی کا مان لو۔

ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگ لباس وغیرہ میں تو غیر قوم کی تقلید کرتے ہیں اور بعض باتیں جو غیر قوموں میں خوبی کی ہیں ان سے کوسوں دور ہیں۔ مثلاً ہمدردی قوم کی یا خرچ کا ایک حد سے باہر نہ ہونا۔ معاملہ کا صاف ہونا اس کے پاس بھی نہیں جاتے بس آج فخر اس پر ہوتا ہے کہ ایک شخص کہتے تھے کہ چار روپیہ کا تو کوٹ کا کپڑا ہے اور سولہ روپیہ اس کی سلائی دی ایک یورپین نے اس کو سیا ہے۔ خواہ تکلیف ہو اور سراسر مال کا نقصان ہو مگر انہیں نقل سے کام ہے۔

ایک مولوی صاحب ریل میں سفر کر رہے تھے اتفاق سے اس گاڑی میں ایک جنٹلمین صاحب بھی تھے اور چلے کے جاڑے کا موسم تھا ایک انگریز نے برف ڈال کو سوڈے کا پانی پیا اس کی ریس میں آ کر آپ نے بھی پیا اور کوئی گرم کپڑا آپ کے پاس تھا نہیں کیونکہ یہ بھی فیشن ہے کہ سفر میں بستر بچھونا ساتھ نہ لے جائیں اور وہ کپڑے بھی کچھ گرم نہ پہنے ہوئے تھے گبرون کے کپڑے پہنے ہوئے تھے جو کچھ ایسے گرم نہیں ہوتے بس پیتے ہی کانپنے لگے بری حالت ہوئی مولوی صاحب کو رحم آیا اور اپنی رزائی ان کو دی اور کہا کہ حد کے اندر رہئے دوسروں کی ریس نہ کیجئے۔

وہی مثل ہے کہ کوا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ ریس تو کریں اہل یورپ کی اور مزاج اور قوت ویسی ہے نہیں۔ مگر کچھ بھی ہو انہیں نقل سے کام وہ لوگ غذائیں بھی ایسی کھاتے ہیں کہ ان پر اسکی چیز کا اثر نہیں ہوتا اور پھر شراب پیتے ہیں اور پھر ان میں قوت اور ان کے مزاج بھی ایسے ہی ہوتے ہیں!

ایک قصہ اور سنئے ایک مولوی صاحب ریل میں سوار تھے ایک جنٹلمین صاحب بھی اسی درجہ میں تھے۔ مولوی صاحب کے پاس مٹی کی صراحی تھی اس میں پانی تھا۔ جنٹلمین صاحب بولے کہ یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن رکھ چھوڑا ہے۔ مولوی صاحب نے اس وقت کوئی جواب نہ دیا اس خیال سے کہ موقع پر جواب دوں گا۔ آگے چل کر ان جنٹلمین صاحب کو پیاس لگی۔ اتفاق سے اسٹیشن پر بھی پانی نہیں ملا۔ اب پیاس بڑھی مولوی صاحب نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ پیاس کا غلبہ ہے چونکہ ان حضرات پر شان کرم غالب ہوتی ہے اس لئے انہیں ان پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کسی طرح یہ پانی پی لیں انہوں نے یہ تدبیر کی کہ اپنے آپ کو سوتا بنا لیا۔ جنٹلمین صاحب اوپر تختہ پر تھے اب ان کا

عروج سے نزول ہوا اور مولوی صاحب کو جھک کر دیکھا کہ آنکھیں کھلی ہیں یا بند ہیں۔ انہوں نے قصداً بند کر رکھی تھیں۔ جب خوب اطمینان ہو گیا کہ سو رہے ہیں تو صراحی منہ سے لگالی۔ یہ کچھ بولے نہیں اس خیال سے کہ پی لینے دو پیاسے نہ رہیں۔ جب صراحی رکھنے لگے تو فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ آپ نے بھنگیوں کے برتن میں کیوں پانی پیا اور پھر خوب لتاڑا۔

میں ایک دفعہ ریل میں تھا۔ ایک جنٹلمین صاحب کا ساتھ ہو گیا میرے پاس لوٹا تھا میں نے اس میں پانی لے لیا۔ یہ لوگ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہی نہیں یہ بھی فیشن ہے جب سٹیشن قریب آیا تو آپ بولے کیا میں اس لوٹے کو لے سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ لے سکتے ہیں۔ آپ نے اسی وقت اس کو اٹھا کر اس کا پانی پھینک دیا اس پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے دل میں کہا کہ پانی نہ ملے تو خوب تماشا ہو۔ اتفاق سے پانی کہیں نہیں ملا تو آپ کہتے ہیں کہ بڑی غلطی ہوئی جو میں نے پانی گرا دیا۔

بس ان لوگوں میں رسم پرستی ہے اور کچھ نہیں غیر قوم کی تقلید میں ان لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اگر وہ ناک کٹوانے لگیں تو یہ بھی کٹوا دیں گے۔ داڑھی بھی غیر قوم کی تقلید میں ہی صاف کراتے ہیں حالانکہ داڑھی ایسی چیز ہے کہ جن کی تقلید میں یہ منڈاتے ہیں خود وہ اس کو پسند کرتے ہیں۔

ایک کوچوان کو ایک انگریز چار روپیہ ماہوار صرف داڑھی کے دیتا تھا کہ اس کو خوب بناؤ سنوارو۔ داڑھی بہت لمبی تھی۔ جب ہوا میں اڑتی' تو وہ انگریز دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔

مولانا اسماعیل شہید سے ایک دہری شخص نے کہا کہ داڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے کیونکہ پیدائش کے وقت نہیں ہوتی۔ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو پیدائشی ہوتی۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہی ہے تو دانت بھی نکلوا دینے چاہئیں۔ وہ بھی تو پیدائشی نہیں ہیں۔ مولانا عبدالحئی صاحب اس کو سن کر فرمانے لگے واہ مولانا خوب دندان شکن جواب دیا۔

ایک صاحب کہنے لگے داڑھی رکھنے میں کیا حکمت ہے میں نے کہا کہ ہمیں عقلی حکمت کی ضرورت نہیں ہے ہمارے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ و رسول کا حکم ہے ہمارا مذہب تو یہ ہے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو!

آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے۔

ایک حکمت انگریزی لباس سے منع کرنے میں یہ ہے کہ اس کو پہن کر جی یوں چاہتا ہے کہ دوسروں کو دکھاویں۔ اگر عورتیں ایسا لباس پہنیں گی تو لازمی بات ہے کہ پردہ کم ہو جاوے گا۔ کیونکہ وہ چاہیں گی کہ دوسروں کو دکھائیں اور عورتوں کو دکھا کر ان کے حظ ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ عیب سمجھتی ہیں اس

لئے لامحالہ مردوں کو دکھانا چاہیں گی اور بے پردگی اختیار کریں گی یہ ساری خرابیاں تفاخر اور فضول خرچی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پس تفاخر اور فضول خرچی کے چھوڑ دینے سے ساری خرابیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔

میں اسراف کا بیان کر رہا تھا کہ مسلمان سمجھے ہوئے ہیں کہ آمد و خرچ کے متعلق کوئی قانون نہیں خوب سمجھ لو جیسے نماز روزہ کا قانون ہے اسی طرح اس کا بھی قانون ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اسی مسئلہ کو حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے کا مال آپس میں مت کھاؤ اس سے حرام آمدنی کو روکتے ہیں!

اعتدال کی ضرورت

آگے فرماتے ہیں کہ مت لے جاؤ حکومت کی طرف یعنی مقدمات مت کرو آج کل اس کی بھی بڑی کثرت ہے ذرا سی کوئی بات ہوئی اور مقدمہ دائر خوب سمجھ لو کہ اگر حاکم کسی کو دوسرے کا حق ثبوت ظاہری ہونے سے دلا بھی دے تو واقع میں وہ اس کا حق نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کا حق کسی کو دلا دوں تو وہ خوب سمجھ لے کہ میں اس کو آگ کی چنگاری دلاتا ہوں پس سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی حاکم کسی کا حق دوسرے کو دلا دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہو جائے گا۔ ملک ہونے نہ ہونے کی یہاں بحث نہیں۔ **ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل** میں ناجائز آمدنی کو روکا ہے یہاں خرچ کا ذکر نہیں ہے۔ مگر یہ بھی یہیں سے سمجھ میں آتا ہے کہ کیونکہ ناجائز طور پر جو مال حاصل کیا جاتا ہے اکثر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ خرچ اس قدر بڑھا لیتے ہیں کہ حلال آمدنی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی پس جب کہ ناجائز طور پر مال حاصل کرنے سے روکا تو جو اس کا باعث ہے یعنی اسراف اس کی بھی ممانعت ہو گئی پس اس آیت سے تو یہ اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ اور دوسری آیات واحادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حدیث میں ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ کھڑا کر کے دریافت فرمائیں گے کہ جوانی کاہے میں خرچ کی اور مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ مال اپنا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا مال ہے کسی نوکر کو اگر آپ خزانہ سپرد کر دیں تو کیا وہ مالک اور خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے اپنا مال آپ کو بطور خزانچی کے دے دیا ہے پس جب تک کہ اجازت شرعی نہ ہو آپ کو دینے کا اختیار نہیں۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی فہرست بھی دی ہے کہ اس موقع پر خرچ کرنے کی اجازت ہے اور اس موقع پر نہیں اور غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اصل حق ہمارا تو صرف اتنا تھا کہ ہم کو بقدر ضرورت ملتا۔ اب جو ضرورت سے زیادہ مل رہا ہے تو وہ حق اوروں کا ہے اور لوگوں کو پہنچانا منظور ہے مگر وہ قواعد کے موافق ہونا چاہئے یہ نہیں کہ جس کو چاہا دے دیا اور جہاں چاہا خرچ کر دیا۔ حد سے زیادہ

خرچ کچھ اختیار نہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ آدمی اپنا خرچ شرع کے موافق منضبط کرے۔

اخراجات کی حدود

شادی بیاہ میں لوگ آنکھیں بند کر لیتے ہیں کچھ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس موقع پر خرچ کرنا چاہئے بھی ہے یا نہیں۔ سو سمجھ لو کہ خرچ کرنے کے بھی حدود ہیں جیسے نماز روزہ کے حدود ہیں۔ اگر کوئی نماز بجائے چار رکعت کے چھ پڑھنے لگے یا کوئی روزہ عشاء تک رکھنے لگے تو گنہگار ہوگا اسی طرح مال کو حد سے زیادہ خرچ کرنے سے بھی گنہگار ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں۔ پس حدود کو معلوم کرنا چاہئے علماء سے پوچھو..... ایک بات تو یہ یاد رکھو۔

دوسرے یہ یاد رکھو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو۔ اگر ان دونوں باتوں پر عمل کرو گے تو حقوق ضائع نہ ہوں گے اور جس میں لوگوں سے زیادہ غلطیاں ہوتی ہیں وہ حقوق مالی ہیں اس کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔

ایک خرابی مسلمانوں میں یہ ہے کہ قرض لے کر ادا نہیں کرتے قرضے ادا کرنے کی بالکل عادت ہی نہیں۔ اس لئے ان کا اعتبار نہیں رہا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہر ایک سے قرض مانگتے ہیں اور کوئی نہیں دیتا۔ حالانکہ قرض دینے کا بڑا ثواب ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور قرض دینے سے اٹھارہ۔ آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ قرض وہی مانگتا ہے جسے سخت حاجت ہوتی ہے (کیونکہ اسے پھر واپس کرنا پڑتا ہے) بخلاف صدقہ کے تو قرض دینے کا اتنا بڑا ثواب ہے ....!

مگر جب کوئی لے کر ادا ہی نہ کرے تو پھر کون دے حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرض دے کر وصول نہیں ہوتا حتیٰ کہ قرض دار سامنے آنا تک چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی واسطے مولانا جامی فرماتے ہیں۔

مدہ شان قرض و مستان نیم حبہ   فان القرض مقراض المحبۃ
(امتوں کو آدمی پائی بھی قرض نہ دے کیونکہ قرض بے شک محبت کی کینچی ہے)

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ کسی مقدمہ میں مظفر نگر آئے اتفاق سے جتنا روپیہ پاس تھا سب ختم ہو گیا اب بہت پریشان آخر وہیں کے ایک صاحب کے پاس گئے اور اپنی پریشانی بیان کی اور کہا کہ دس روپیہ قرض دے دیجئے میں گھر پہنچتے ہی بھیج دوں گا۔ انہوں نے ترس کھا کر دے دیئے انہوں نے گھر پہنچ کر خبر بھی نہ دی۔ کچھ دنوں کے بعد پھر کہیں ان سے ملاقات ہو گئی تو انہوں نے تقاضا کیا

انہوں نے کہا کہ میں ابھی دو ایک روز میں ادا کر دوں گا اسی طرح مدتوں تک ٹال مٹول کرتے رہے یہاں تک کہ سال بھر گزر گیا پھر جو تقاضا کیا تو کہتے ہیں کہ کیا آپ کے پاس کوئی رقعہ ہے یہ حالت ہے مسلمانوں کی اس کو ہلکی بات سمجھتے ہیں اسی لئے اس میں بہت ہی تساہل ہو رہا ہے۔

ایک مانگی ہوئی چیز میں بڑا تساہل ہے یہ حالت ہے کہ چیز منگائی اور کام بھی ہو گیا مگر یہ توفیق نہیں ہوتی کہ واپس کر دیں جب دینے والا خود طلب کرتا ہے تب دیتے ہیں اور اگر خود بھی دیں گے تو مدت کے بعد اس میں بہت چیزیں گم بھی ہو جاتی ہیں خراب بھی ہو جاتی ہیں، بعض جگہ مہینے گزر جاتے ہیں واپس ہی نہیں ہوتیں اگر کسی نے طلب کیا تو دے دی، ورنہ پروا بھی نہیں ہوتی۔ نیت مارنے کی نہ ہو مگر تساہل اس قدر ہے کہ حد سے زیادہ.....!

ایک اس بارہ میں بے احتیاطی ہے کہ کھانے کے ساتھ جو برتن چلے جاتے ہیں انہیں واپس کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی بس اپنے یہاں ان کا استعمال کرتے ہیں اسی طرح مدت ہو جاتی ہے جب خود منگاتے ہیں تب ملتے ہیں۔ خود میرے گھر میں تساہل ہے حالانکہ شرع نے اس میں اتنی احتیاط کی ہے کہ فقہاء لکھتے ہیں کہ کھانا کوئی بھیجے تو اس برتن میں کھانا حرام ہے اپنے برتن میں الٹ لو تب کھاؤ ہاں ایک صورت میں جائز ہے کہ وہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہو جاتا ہو یا اس کی آب جاتی رہے تو اگر ایسا کھانا ہو تب اس برتن میں کھانا جائز ہے ورنہ نہیں ہاں اگر مالک استعمال کی اجازت دے دے تو جائز ہے۔

دلیل فقہاء کے اس قول کی یہ حدیث ہے کہ **لایحل مال امرء مسلم الابطیب نفس منه**[1] کھانا بھیجنے والوں کو ان برتنوں کا استعمال ناگوار ہوتا ہے اور جب کہ کھانا ایسا ہو جو برتن بدلنے سے خراب ہوتا ہو یا اس کی آب جاتی رہتی ہو تو وہاں دلالۃ اذن ہے اس برتن میں کھانے کا پس خلاصہ فقہاء کے کلام کا یہ ہوا کہ جہاں اجازت ہو قرائن سے تو جائز اور اگر قرائن سے اجازت نہ ہو تو جائز نہیں۔

غرض لوگ اموال کے بارے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں قرآن شریف میں کتنی سخت وعید ہے اس پر میں پھر اصل مسئلہ کا اعادہ کرتا ہوں وہ یہ کہ ناجائز آمدنی سے احتراز کریں اور خرچ گھٹائیں امراء اس میں بالکل احتیاط نہیں کرتے اس پر عمل ہو گا تو زندگی بڑے عیش و آرام سے کٹے گی۔

نام اور کام کیا اہمیت

رؤسا شادی وغیرہ میں بے بے احتیاطی کرتے ہیں دیوبند میں ایک رئیس تھے انہوں نے شادی کی

---

[1] کتاب التمهید لابن عبدالبر ۱۰: ۲۳۱

اور بے انتہا خرچ کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ ان کے یہاں آئے اور کہا کہ ماشاء اللہ! آپ نے بہت ہی خرچ کیا۔ آپ کی عالی حوصلگی میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف اتنی کسر ہے کہ آپ نے اتنا خرچ کر کے ایسی چیز خریدی کہ اگر حاجت کے وقت اس کو فروخت کرنے لگیں تو اسے کوئی پھوٹی کوڑی کو بھی نہ لے وہ کیا نام باقی ویسے بڑا کام کیا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جتنی نام کی کوشش کرتے ہیں اتنی ہی بدنامی ہوتی ہے۔

ایک مہاجن نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی بہت خرچ کیا من جملہ اس کے یہ بھی کیا کہ براتیوں کو فی کس ایک اشرفی بھی دی جب برات واپس ہوئی تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ ہر گاڑی میں میرا ہی تذکرہ اور تعریف ہو رہی ہو گی اس کو کسی حیلہ سے سننا چاہیے چنانچہ وہ ایک موقع پر پوشیدہ کھڑے ہو گئے۔ برات وہیں کو گزری مگر کسی بہلی میں اپنا تذکرہ نہ پایا آخر ایک بہلی میں انہوں نے دیکھا کہ دو شخص میرا تذکرہ کر رہے ہیں انہوں نے بڑے شوق سے کان لگائے ایک نے کہا کہ دیکھو تو کیسے نام کا کام کیا کہ ایک ایک اشرفی سب کو دی یہ کام کسی نے نہیں کیا دوسرے نے کہا سسرے نے ایک ایک دی کون سا کمال کیا اگر دو دو دیتا تو کیا مر جاتا۔

غرض یہ کہ نام کے لئے مال برباد کرتے ہیں مگر وہ بھی میسر نہیں ہوتا اور جن کے واسطے خرچ کرتے ہیں جس وقت مصیبت آتی ہے ان میں سے کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا بلکہ تباہی ہونے پر یوں کہہ دیتے ہیں کہ مال برباد کرنے کو کس نے کہا تھا۔ اپنے ہاتھوں برباد ہوئے ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ آسودگی میں یہ کہتے ہیں تھے کہ جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں ہم خون گرانے کو تیار ہیں جس وقت تباہی آتی ہے ان میں سے ایک بھی پاس کھڑا نہیں ہوتا سب آنکھیں بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے حال پر بڑا افسوس ہے کہ وہ کچھ آگے پیچھے کا خیال نہیں کرتے۔ بے طرح فضول خرچی کرتے ہیں یہاں تک کہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ بعضوں کے لنگوٹی بندھ جاتی ہے۔ یہ حالت مسلمانوں کی اسی وجہ سے ہوئی کہ آہنی قلعہ (اسلام) کا پھاٹک خود کھول دیا ورنہ اسلامی اصولوں پر چلنے سے کبھی ذلت نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ حقوق مالیہ کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ اور شرع نے اس سے بھی تعرض کیا ہے اور اس کی تاکید کی ہے حفاظت نہ کرنے پر مواخذہ ہوگا۔

اب وقت بھی بہت ہو چکا ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ بیان بھی بقدر ضرورت کافی طور سے ہو گیا دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اشرف علی!

احکام الجاہ

جاہ کے منافع و مضار کے متعلق یہ وعظ ۱۵ رجب سنہ ۱۳۳۷ھ کو بارہ بنکی میں کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا۔ پونے چار گھنٹہ میں ختم ہوا۔ تخمیناً ایک ہزار کی حاضری تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری نے قلمبند فرمایا۔

جاہ کا معنی ہے قدر و منزلت جس کا حاصل اور لازم ہے اثر شریعت میں اس اثر کے حاصل کرنے اور اس کے استعمال کرنے کے متعلق احکام ہیں۔ قیامت میں اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا هَادِیَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ[۱]

تمہید: یہ ایک بڑی حدیث کا ٹکڑا ہے جس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہوا ہے جس کی ہر وقت ہر شخص کو کم وبیش ضرورت ہے اول تو اس وجہ سے یہ مضمون ضروری ہے کہ ارشاد فرمودہ ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی ہر فرد اور ہر فرد کا ہر جزو ضروری ہے پھر حضورؐ کے فرمودہ مضامین میں بھی بعض وجوہ سے باہم تفاوت ہوتا ہے پھر اوقات مختلفہ کے لحاظ سے بھی بعض مضامین کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ کسی وقت کسی مضمون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور کسی وقت کسی مضمون کی غرض ضرورت کے اسباب مختلف ہیں اور جیسے اسباب ضرورت میں سے کسی مضمون کے منافع کا زیادہ ہونا یا مضرت سے زیادہ محافظ ہونا ہے ایسے ہی اسباب ضرورت میں سے ایک قوی سبب غفلت بھی ہے یعنی کوئی مضمون واقع میں تو ضروری ہے مگر پھر بھی اس سے غفلت ہے اس سے بھی ضرورت بڑھ جاتی ہے چنانچہ یہاں یہ وجہ بھی موجود ہے اور اس وقت اس عارض کی وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا گیا ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ جو مضمون اس مقام پر اس حدیث کا مدلول ہے وہ ایسا ہی ہے کہ باوجود ضروری ہونے کے ہم لوگوں کو اس کی طرف التفات نہیں اس وجہ سے بھی اس کا بیان کرنا زیادہ ضروری ہو گیا یہ تو ضرورت کے اصل اسباب ہیں... ۱۲

---

[۱] الصحیح للبخاری ۹.۷۷، الصحیح لمسلم کتاب الامارۃ: ۲۰، سنن الترمذی: ۱۷۰۵ مشکوۃ المصابیح: ۳۶۸۵

ایک اہم کوتاہی

باقی اس وقت ایک اتفاقی نکتہ اور لطیفہ بھی ہو گیا وہ لطیفہ یہ ہوا کہ اس سے قبل جو لکھنؤ میں بیان ہوا تھا اس میں میں نے حقوق مالیہ کو بیان کیا تھا یعنی یہ بتلایا تھا کہ مال کے حقوق کیا ہیں اور اس کے متعلق ضرورت کے موافق بیان ہو گیا تھا جس کا حاصل یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو مال کے حقوق سے اس حیثیت سے غفلت ہے کہ مال کہاں سے حاصل کرنا چاہئے اور کہاں استعمال کرنا چاہئے۔

علماء سے اگر احکام پوچھے جاتے ہیں تو نماز روزہ کے پوچھے جاتے ہیں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ ہے آیا یہ حلال ہے یا حرام یا میں نوکری کرتا ہوں اور میرا فرض منصبی یہ ہے اور منصب کے علاوہ میں فلاں فلاں کام منافع حاصل کرنے کے لئے کرتا ہوں یہ وسائل آمدنی کے ہیں۔ آیا یہ حلال ہیں یا حرام یا میں زراعت کرتا ہوں اور زمیندار سے یہ معاہدہ کرنا پڑتا ہے آیا یہ جائز ہے یا ناجائز۔ یا میں زمینداری کرتا ہوں اور میرا کاشتکاروں سے یہ معاملہ ہے فلاں فلاں صورتیں پیش آتی ہیں۔ آیا یہ صورتیں جائز ہیں یا ناجائز۔ ان امور کی طرف کسی کو التفات نہیں الا ماشاءاللہ!

بعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو دنیا کی کارروائی ہے اس میں شریعت سے کیا واسطہ؟ شریعت نے تو صرف نماز روزہ سکھلایا ہے اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تو نہیں کہ شریعت کو ان امور سے تعلق نہیں مگر وہ یہ گمان پکائے ہوئے ہیں کہ پوچھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حکم تو ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ لایجوز کا فتویٰ ملے گا۔ (مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علماء سے پوچھیں گے بھی تو وہ یہی بتلائیں گے کہ جائز نہیں پھر پوچھنے سے کیا نتیجہ یہ تو ہم پہلے ہی سے جانتے ہیں۔)

خیال تو فرمایئے کہ یہ کتنا بڑا غلط گمان ہے اور لوگوں نے شریعت کو کیسا دشوار سمجھ لیا ہے حالانکہ شریعت بہت آسان ہے وہ تو سرتاسر رحمت ہی رحمت ہے خدا تعالیٰ کی۔

شریعت کی آسانی

چنانچہ ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ یہ آیتیں یعنی **یایها الذین امنوا اذا تداینتم بدین الخ** جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہیں۔ یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ظاہر کرتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ معاملہ کبھی نقدا نقدی ہوتا ہے کہ اس ہاتھ دیا اور اس ہاتھ لیا اور کبھی تداین کے طور پر ہوتا ہے کہ نقد دام نہیں دیئے جاتے یا قرض لیا جاتا ہے تو اس آیت میں دونوں کو ظاہر فرما دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

واشهدوا اذا تبايعتم کہ نقد انقدی معاملہ میں گواہ ضرور کر لیا کرو کیونکہ اگر کسی وقت منازعت واقع ہو تو چار آدمی فیصلہ تو کر دیں گے۔ اور جو معاملہ دین کا ہو تو مزید ارشاد یہ ہے کہ اس کو لکھ بھی لیا کرو تا کہ غلطی سے امن ہو۔ خیال تو فرمایئے کہ جب حق تعالیٰ نے ایک پیسہ اور ایک روپیہ کا ضرر دنیوی اپنے بندوں کے لئے گوارا نہیں فرمایا حالانکہ ساری دنیا مچھر کے پر کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی تو اپنے بندوں کیلئے بڑے بڑے ضرر ان کو کیسے گوارا ہوں گے پھر یہ کیا تھوڑی دلیل ہے رحمت کی۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے حق تعالیٰ کے احکام دیکھے ہی نہیں جو معلوم ہوتا کہ ان میں کتنی سہولت اور کس قدر مصالح ہیں۔ ابواب فقہ کو نہیں دیکھا۔ قرآن وحدیث کو نہیں دیکھا۔ قرآن شریف کا ترجمہ علماء سے پڑھتے تو معلوم ہو کہ احکام میں کس قدر سہولت ہے چنانچہ حق تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتے ہیں۔

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر کہ حق تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں اور تنگی کرنا نہیں چاہتے۔ اور فرماتے ہیں۔

ماجعل عليكم فى الدين من حرج کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔

اور حدیث میں ہے **الدين يسر** کہ دین آسان ہے اجمالاً یہ نصوص کافی ہیں باقی اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا وقت اس کی تحقیق میں صرف کیجئے مگر آپ تو رات دن دنیا کی تحصیل میں منہمک ہیں آپ کو اس طرف توجہ ہی نہیں اور توجہ اس واسطے نہیں کہ اس کے لئے آپ کو ایک دوسرے مجمع میں آنا پڑے گا یعنی مجمع علماء میں ایسوں کے پاس اس کے لئے آپ کو جانا ہوگا جن سے آپ کو وحشت ہے جس کے اسباب مختلف ہیں۔

علماء سے وحشت

چنانچہ بعض کو تو علماء سے اس لئے وحشت ہے کہ شاید کچھ چندہ مانگنے لگیں اور بعض کو اسلئے کہ ہمارے اوپر کفر کا فتویٰ لگاویں گے۔ اس لئے وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھتے ہیں یا اپنی جماعت کے ساتھ رہتے ہیں بعض کو اس لئے وحشت ہوتی ہے کہ وہ زراعت وتجارت حرام طریقہ سے کرتے ہیں۔ اس لئے کسی عالم کے پاس نہیں جاتے کہ وہ اس کو حرام بتلائے گا۔

صاحبو! میں کہتا ہوں کہ علماء کے ساتھ جو آپ کو بدگمانی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ علماء مسائل کو نقل کرتے ہیں یا اختراع کرتے ہیں۔ (یعنی گھڑتے ہیں) اختراع کا گمان تو غلط ہے کیونکہ ان کے

پاس ہر فتویٰ کی دلیل شرعی موجود ہے اور اگر یہ گمان نہیں تو پھر ان کی طرف تختی کا گمان کیسا یہ گمان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے (کیونکہ احکام تو حضورؐ کے بیان فرمائے ہوئے ہیں نہ کہ علماء کے) اور حضورؐ کی طرف اس گمان کا غلط ہونا صاف ظاہر ہے آپ کا تو لقب رحمۃ العالمین ہے آپ تو رحمت مجسمہ بنا کر بھیجے گئے ہیں تمام جہان کے واسطے پھر یہ کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ تو آپ کو رحمت فرمائیں اور یہ شخص آپ کو زحمت سمجھے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ

حق سبحانہ تعالیٰ اس آیت میں احسان جتلاتے ہیں کہ ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جن کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ کی آیتیں سناتے ہیں اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور تم کو پاکیزہ بناتے ہیں۔

پس اگر معاذ اللہ آپؐ کے احکام موجب زحمت ہیں جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے تو پھر حضورؐ کے ارسال میں کیا منت ہوئی جو من اللہ میں مذکور ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں حق تعالیٰ۔

یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث و یضع عنھم اصرھم

کہ ہم نے ایسا نبی بھیجا ہے جس کی شان یہ ہے کہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپ گندی اور مضر چیزوں کو حرام کرنے آئے ہیں اور سختیوں کو موقوف کرتے ہیں جب آپ کی یہ شان ہے تو پھر آپ پر تختی کا گمان کیسا.........؟

اس غلطی کے رفع ہونے کی سہل تدبیر یہ ہے کہ کسی متبحر عالم سے قرآن و حدیث پڑھئے زیادہ نہیں تو ان سے اردو ہی کے رسالے دیکھ لیجئے مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اس کام کے لئے آپ کو ایسوں کے پاس جانا پڑے گا جن سے آپ کو وحشت ہے لیکن اگر اپنے دین کی حفاظت چاہتے ہو تو ایسے لوگوں کے پاس جاؤ خواہ تھوڑے ہی زمانے کے لئے جاؤ پھر یہ حالت ہوگی کہ تمام عمر وہاں سے کسی اور جگہ جانا پسند نہ کرو گے اسی کو تو مولانا فرماتے ہیں۔

خواب را بگذار امشب اے پسر یک شبے در کوئے بیخواباں گزر

ایک رات کے لئے ذرا سونا چھوڑ دو اور اللہ والوں کے پاس جا کر رہو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ رات کو کیا کرتے ہیں ان کی شب بیداری کا لطف دیکھ کر اپنی نیند کا لطف بھول جاؤ گے اور غفلت بھی خواب ہی کے حکم میں ہے۔ اور اعتقاد سے نہ آؤ تو امتحاناً ہی آ کر دیکھ لو ان حضرات کی صحبت میں رہ کر معلوم ہوگا کہ کتنی وسعت ہے شریعت میں۔

شریعت میں تنگی کا گمان

باقی آج کل جو بعض لوگوں کو شریعت میں تنگی کا گمان ہے اس کا بھی ایک منشاء ہے وہ یہ کہ اکثر لوگوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ وہ مولانا کے پاس مسئلہ پوچھنے گئے مولانا نے جواب دیا کہ یہ جائز نہیں۔ کوئی تجارت یا زراعت کی صورت پیش کی تو انہوں نے لایجوز کہہ دیا کسی نے چار مسئلے پوچھے تو انہوں نے ہر دفعہ لایجوز (جائز نہیں) ہی فرمایا اس سے انہوں نے سمجھا کہ بس شریعت میں لایجوز ہی ہے اور کچھ نہیں۔

اس واقعہ کی تکذیب کوئی نہیں کر سکتا مگر اس کی حقیقت سمجھنا چاہئے کہ مولوی صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات میں جو لایجوز کہا ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ آیا اس کا سبب شریعت کی تنگی ہے یا آپ کے طرز معاشرت کی خرابی اور آپ کی آزادی و وارستگی ہے۔ سو حقیقت یہ ہے کہ آپ کے معاملات اکثر فاسد ہو گئے ہیں آپ ایسے حال میں پھنسے ہوئے ہیں جس کو کوئی عاقل بھی پسند نہیں کر سکتا اب شریعت ان کو ناجائز نہ کہے تو کیا کہے اب فرمایئے تنگی آپ کے اندر ہے یا شریعت میں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بیمار حکیم کے پاس آیا اور حکیم سے کہا کہ مجھے کھانے کو بتلا دیجئے حکیم صاحب نے کہا کہ بکری کا گوشت کھاؤ مریض نے کہا کہ وہ تو ہمارے گاؤں میں ہوتا ہی نہیں حکیم نے کہا کہ کبوتر کھاؤ فاختہ کھاؤ، کدو ککڑی کھاؤ، پالک کھاؤ، غرض جو چیز حکیم بتلاتا رہا اس کے جواب میں مریض کہتا رہا کہ یہ چیز ہمارے گاؤں میں نہیں ہوتی اور ہمارے ہاں تو بینگن ہوتے ہیں آلو ہوتے ہیں بھینس کا گوشت ہوتا ہے۔ غرض تمام مضر چیزیں گنا ڈالیں۔ حکیم صاحب نے ان سب کے جواب میں بھی یہی کہا کہ تو تو ان چیزوں کے پاس تک نہ جانا اب اگر یہ مریض یوں کہنے لگے کہ طب یونانی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں میرے واسطے ایک غذا بھی جائز نہیں اس میں تو لایجوز ہی ہے۔ ہم تو اب ڈاکٹری علاج کریں گے تو کیا اس کا یہ کہنا درست ہوگا ہرگز نہیں کیونکہ منشاء اس کا قواعد طبیہ کی تنگی نہیں بلکہ اس کے گاؤں کی پیداوار کی تنگی ہے۔ یقیناً اس شخص سے یوں ہی کہا جائے گا کہ قواعد طبیہ میں تو تنگی نہیں اس میں تو صدہا قسم کی جائز غذائیں موجود ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس ظالم کے گاؤں میں تمام مضر ہی مضر چیزیں پیدا ہوتی ہیں تنگی کا الزام طب پر جب ہو سکتا ہے جب کہ طب کی کتابوں میں دیکھو کہ کوئی غذا اس کے مزاج کے موافق ملے ہی نہیں جب یہ نہیں تو تنگی کا شبہ طب پر نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح شریعت کا قانون تنگ نہیں کتابیں دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شریعت نے معاملات کی کتنی صدہا صورتیں جائز کی ہیں اور ماسوائے چند چیزوں کے ناجائز کہا ہے فقہ کی

کتابوں میں معاملات کو دیکھئے کتاب البیع دیکھئے خیار شرط ملاحظہ کیجئے کتاب العرف پر نظر ڈالئے کتاب الدعویٰ دیکھئے کتاب المساقات مطالعہ کیجئے ان سب کی تحقیق کر کے پھر شمار کیجئے کہ کتنے واقعات میں یجوز ہے اور کتنے میں لا یجوز یقین کیجئے اگر آپ سو معاملات دیکھیں گے تو ساٹھ میں یجوز اور چالیس میں لا یجوز نکلے گا اگر ہم کتابوں سے دکھا دیں کہ شریعت نے اتنے ذرائع آمدنی کے جائز کئے ہیں اور چند کو ناجائز کیا ہے تو پھر شریعت پر تنگی کا الزام کیسے ہو سکتا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی معاشرت ہی خراب ہے آپ نے حلال طریقے چھوڑ کر زیادہ تر حرام ہی ذرائع آمدنی کے اختیار کر رکھے ہیں۔ تو یقیناً شریعت یہی کہے گی کہ اگر کوئی کسی پر ظلم کرے کسی کا مال زبردستی چھینے سود لے، رشوت لے تو یہ حرام ہے ناجائز ہے۔ مگر اس حالت میں یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ شریعت میں تنگی ہے بلکہ یہ تنگی تو ہماری طرف سے ہے وہ یہ کہ سب نے مل کر آمدنی کے وسائل وہی اختیار کئے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں ہو سکتے ہم نے ان کو اپنی طرز معاشرت کا جزو بنا رکھا ہے اب جب اس کے خلاف شریعت میں نکلتا ہے تو کہتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے انصاف سے بتلایئے کہ تنگی کدھر سے ہوئی افسوس ہے کہ تنگی ہمارے افعال بے جا سے ہوئی اور الزام ہے شریعت پر ہماری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد　　ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(شیر نے اپنے نزدیک دوسرے پر حملہ کیا تھا مگر حقیقت میں وہ حملہ اپنے اوپر تھا)

خرگوش کی دانائی

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی جنگل میں ایک شیر آ گیا تھا اور اس نے نخچیروں کو (یعنی شکار کے جانوروں کو) پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ جانور یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور جمع ہو کر اس کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضور کو تکلیف کرنے کی کوئی حاجت نہیں یہی حضور کے واسطے ہم میں سے ایک جانور روزانہ بلاناغہ نمبروار آ جایا کرے گا۔ چنانچہ معاہدہ ہو گیا اور ایک جانور روزانہ آتا رہا۔ ایک دن ایک خرگوش کی نوبت آئی یہ جاتا نہ تھا دوسرے جانوروں نے کہا کہ خدا کے لئے تو چلا جا کہیں معاہدہ کے خلاف کر کے سب پر آفت نہ آ جائے۔ جبراً و قہراً مچل مچل کر گیا چونکہ جانے میں بہت دیر ہو گئی تھی شیر بھوک کے مارے غصہ ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی کہنے لگا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم سے عہد پورا نہ ہو سکے گا اب میں سب کو خوب ٹھیک کروں گا۔

خرگوش پہلے ہی سے شیر کی ہلاکت کی تدبیر سوچ کر گیا تھا بولا حضور پہلے قصہ تو سن لیجئے آپ اپنے نخرہ ہی میں تل رہے ہیں آپ کو خبر ہی نہیں کہ یہاں کیا سے کیا ہو گیا آج ایک بڑا زبردست واقعہ ہو گیا ہے میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں اسی واسطے دیر بھی ہو گئی۔ چلا تو تھا میں وقت ہی پر مگر اس جنگل میں ایک دوسرا شیر آ گیا ہے آج ہم حضور کے واسطے دو بھائی آئے تھے راستہ میں حملہ کر کے اس نے ایک کو تو پکڑ لیا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آپ تک پہنچا ہوں۔ میں نے حضور کا نام لے کر اس کو ڈرایا بھی دھمکایا بھی مگر اس نے ذرا پرواہ نہ کی اور کہا کل سے ہمیں راتب دیا کرو اس کو نہ دیا کرو بس پہلے آپ اس کا انتظام کیجئے ورنہ کل سے آپ کا روزینہ بند ہے وہ راستہ ہی میں آپ کا راتب چھین لیا کرے گا۔

شیر نے غصہ میں آ کر کہا کہ اس کو ہمیں بتلاؤ۔ خرگوش راستہ میں ایک کنواں دیکھ کر گیا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا وہاں لے گیا اور کہا حضور وہ شیر اس میں رہتا ہے مجھ کو تو خوف معلوم ہوتا ہے آپ مجھ کو اپنی آغوش میں لے لیں تو میں اس کو دکھا دوں۔ چنانچہ شیر نے ایسا ہی کیا خرگوش نے کہا کہ کنویں میں جھانک کر دیکھئے اس خرگوش کو آغوش میں لئے ہوئے وہ کھڑا ہے کنویں میں شیر نے جو جھانکا تو اس کا عکس پڑا دیکھا کہ ایک شیر خرگوش کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ شیر شجاع تو ہوتا ہی ہے اس کو پھینک کر کنویں میں کود پڑا۔ جب خرگوش نے دیکھا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے تو آپ کہتے ہیں تسلیمات آداب عرض ہے۔ شیر پانی میں ڈوب کر مر گیا اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ بر خودے کنی اے سادہ مرد ہم چو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

شیر نے اپنے نزدیک دوسرے پر حملہ کیا تھا مگر حقیقت میں وہ حملہ اپنے اوپر تھا۔

ہماری کم فہمی اور بے عقلی

جیسے ایک حبشی کی حکایت ہے کہ راستہ میں چلا جا رہا تھا ایک آئینہ پڑا ہوا ملا اسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں اپنی شکل نظر آئی سیاہ رنگ موٹے موٹے ہونٹ آپ اپنی شکل کی زیارت سے تمام عمر میں اسی وقت مشرف ہوئے تھے خفا ہو کر آئینہ کو پتھر پر دے مارا اور کہا کہ کم بخت! جب تو ایسا بدشکل تھا جب ہی تو تجھ کو راستہ میں کوئی پھینک گیا۔

اسی طرح ایک احمق کی حکایت ہے کہ اس کا لڑکا ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا لئے رہتا تھا اتفاق سے

وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ سے لوٹے میں گر پڑا جس میں پانی بھی تھا اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کو اپنی شکل نظر پڑی تو وہ کہتا ہے کہ ابا ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا باپ نے جو اس میں جھانک کر دیکھا تو اس کو اپنی شکل نظر پڑی دیکھا کہ ایک شخص ہے بڑی سی داڑھی والا آپ کہتے ہیں کہ اتنی بڑی داڑھی لگا کر بچے کا ٹکڑا چھینتے ہوئے شرم تو نہ آئی۔

ایک اور حکایت ایسی ہی یاد آ گئی متعدد مثالوں سے مضمون خوب واضح ہو جاتا ہے اس لئے بیان کی جاتی ہیں وہ یہ کہ ایک دفعہ لوگ چاند دیکھ رہے تھے اور اس وقت ایک عورت بچہ کو پاخانہ کرا رہی تھی جلدی جلدی اس سے فارغ ہو کر بچہ کو پونچھ پانچھ کر وہ بھی چاند دیکھنے لگی اتفاق سے اس کی انگلی میں پاخانہ لگا رہ گیا تھا عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ ناک پر انگلی رکھ کر بات کرتی ہیں تو وہ عورت چاند دیکھتے ہوئے ناک پر انگلی رکھ کر کہتی ہے اے ہے! آج ایسا سڑا ہوا چاند کیوں نکلا یہ خبر نہیں کہ وہ خود ہی سڑی ہوئی تھی۔

صاحبو! اسی طرح شریعت میں جسے تنگی نظر آتی ہے وہ خود تنگ ہے پھر میں اخیر بات کہتا ہوں کہ اگر فرض کرلو شریعت میں تنگی ہوتی بھی تو سوال یہ ہے کہ آپ کو اس صورت میں کیا کرنا چاہئے تھا میں کہتا ہوں کہ ہم لوگ جس گورنمنٹ کی عملداری میں رہتے ہیں اگر وہ گورنمنٹ کوئی سخت قانون مقرر کر دے تو آپ کیا کریں گے اس صورت میں تین شکلیں ہیں یا تو اس قانون کو تسلیم کرو یا گورنمنٹ سے لڑو یا اس کا ملک چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ تینوں شکلوں میں سلامتی کی بات یہ ہے کہ تسلیم کرلو۔

اسی طرح خداتعالیٰ کے احکام اگر کسی کو سخت یا تنگ نظر آتے ہیں تو یا تو حق تعالیٰ سے لڑے یا خدا کا ملک چھوڑ کر کہیں چلا جاوے مگر یہ بتلاؤ کہ لڑو تو کیسے لڑو اور وہ کون سا ملک ہے جہاں چلے جاؤ گے تو یہ دونوں شکلیں یہاں محال ہیں بس تیسری ہی شکل رہ گئی کہ تسلیم کرلو باقی آپ نے جو تجویز کر رکھا ہے کہ جو قانون سمجھ میں نہ آیا اسے چھوڑ دیا یہ تو بالکل ہی بے عقلی ہے۔

آج کل کے محققین

آج کل بعض لوگوں نے کمال کیا ہے کہ انگریزی کے بی اے ایم اے ہو کر شریعت مقدسہ کے محقق بنتے ہیں ان لوگوں کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جس نے پچاس برس دین کی خدمت میں صرف کر دیئے ہوں اور چراغ کا دھواں سیروں اس کے دماغ میں سما گیا ہو تو وہ محقق نہ ہو اور یہ حضرت

تھوڑی سی انگریزی پڑھ کر محقق ہو گئے۔

آج کل کے محققین اور مدققین کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص گلستان دیکھ کر اس کا محقق ہو گیا تھا اتفاق سے دو شخصوں میں لڑائی ہو گئی ایک ان میں سے ان حضرت کے دوست تھے وہ پٹ بھی رہے تھے اور پیٹ بھی رہے تھے آپ نے یہ دیکھ کر دوست کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے انجام یہ ہوا کہ ان کے دوست صاحب خوب پٹے اور آپ اپنی اس حرکت پر بڑے خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے گلستان میں جو پڑھا تھا۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشاں حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو پریشان حالی اور درماندگی میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑے)

آج اس پر عمل کرنے کا اچھا موقع ملا اور اپنے نزدیک دوست کا پورا حق ادا کر دیا تو جیسے وہ گلستان کے محقق تھے ایسے ہی یہ لوگ آج کل قرآن وحدیث کے محقق ہیں۔

ان ہی میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ انہوں نے امام مقیم کے ساتھ نماز پڑھی جب امام دو رکعت پڑھ چکا آپ دونوں طرف سلام پھیر کر بیٹھ گئے امام نماز میں ہے اور مقتدی پہلے ہی فارغ ہو گیا میں دیکھ کر سمجھا قیام سے کوئی عذر ہو گا جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں مگر میں نے دیکھا ہر رکن میں بیٹھے ہی نظر آتے ہیں اب میں سمجھا کہ آپ نے امام مقیم کے ساتھ بھی قصر کیا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے ان سے کہا کہ آپ نے پوری نماز کیوں نہیں پڑھی تو آپ فرماتے ہیں کہ میں مسافر تھا آج کل کے ایسے محققین ہیں جنہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ اگر امام مقیم ہو تو مقتدی مسافر کو بھی امام کے ساتھ چار ہی رکعت پڑھنی چاہئیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ہے ایک بڑے لیڈر کا۔ مگر آج کل کے لیڈر کیا ہیں' گیدڑ ہیں وہ سفر میں تھے پانی ملا نہیں تیمم کا ارادہ کیا مگر کبھی تیمم کرتے ہوئے کسی کو دیکھا نہیں تھا اجتہاد شروع کیا تقدم تو اس جماعت کے لوازم سے ہے ہر بات میں سب سے پہلے ٹانگ اڑاتے ہیں آپ نے کیا کیا کہ مٹی لے کر پہلے ہاتھ کو ملی پھر چلو میں مٹی لے کر منہ میں دی غرض وضو کی طرح تیمم کیا وہ بھی زندہ ہیں سلمہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ان کا اقتداء کرنے کو تیار ہیں۔

افسوس ان لوگوں کو دین کی تو خبر نہیں اور پھر لیڈران قوم بنے ہوئے ہیں ایسوں ہی پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم   سیھدیھم طریق الھالکین

(جب کسی قوم کا اپنی کوا ہو وہ ان کو ہلاکت کے راستہ کی طرف لے جائیگا)

اور دین سے واقفیت کا ذریعہ صرف یہی تھا کہ علماء سے سبق حاصل کیا جائے مگر اس سے ان کو عار ہے۔

تعلق باللہ

میں عرض کر رہا تھا کہ جب کوئی قانون نافذ ہوتا ہے تو تین حالتیں ہوتی ہیں جیسا اوپر بیان ہوا تینوں میں سلامتی کی بات یہی ہے کہ اس کو تسلیم کر لو۔ خاص کر جب کہ حاکم سے دوسرا تعلق بھی ہو اور ہمیں اتنا بڑا تعلق ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ اگر وہ منکشف ہو جائے تو خدا کی قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں اور پھر قسم کھاتا ہوں کہ ہم احکام الٰہیہ سے ایسے منصبغ اور رنگین ہو جاویں کہ دوسرا رنگ ہی نہ رہے۔

وہ تعلق کون سا ہے وہ تعلق محبت اور محبوبیت کا ہے کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو محبت کرنا لازم نہیں؟ کوئی مسلمان ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ ہاں لازم نہیں ہے اگر کسی کو ایسی ہمت ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس کو دنیا میں کسی سے بھی محبت ہے یا نہیں بی بی سے، بچوں سے، مکان سے، معشوق سے، عورت سے، لڑکے سے، یقیناً کسی ایک چیز سے تو محبت ضرور ہو گی۔

اب یہ سوچو کہ بناء کیا ہے اس محبت کے سو بناء محبت کے کبھی فضل وکمال ہوتا ہے جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ میں فضل وکمال کی شان ہے کہ وہ ان سے محبت کا باعث ہوا ہے اسی طرح حضرات شیخین سے محبت ہے یا اہل بیت سے محبت ہے تو ان کے ساتھ بھی فضل وکمال کی وجہ سے محبت ہے کبھی محبت ہوتی ہے عطا ونوال کی وجہ سے جیسے محسن سے محبت ہوتی ہے کبھی حسن وجمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے جیسے کسی لڑکے یا عورت سے محبت ہو اور ایسی محبت ہوتی ہے کہ عشق کے مرتبہ کو پہنچ جائے بس یہ اسباب ہیں محبت کے۔

ایک فضل وکمال............ایک عطا ونوال ..... یک حسن وجمال

اب اگر کہیں یہ تینوں اسباب جمع ہوں تو پھر محبت نہ ہونے کے کیا معنی؟ اب بتلایئے اللہ تعالیٰ میں کس چیز کی کسر ہے۔ کیا ان میں فضل وکمال نہیں یا عطا ونوال نہیں یا حسن وجمال نہیں۔ ان میں تو سب چیزیں موجود ہیں۔ عطا کی تو یہ کیفیت ہے کہ آپ کو دل دیا، عقل دی، زبان دی، آنکھ ناک دی۔ اگر خدا تعالیٰ قلب نہ دیں زبان نہ دیں تو کوئی آپ کو یہ چیزیں کیونکر دے سکتا ہے۔ معطی حقیقت میں وہی ہیں اگر کسی میں فضل وکمال علم کا ہے تو وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے انہی کا دیا ہوا حسن و جمال بھی ہے جب ان کے بنائے ہوئے ایسے ہیں تو وہ خود کیسے ہوں گے ان کی تو یہ شان ہے

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرہ سے ظاہر کرتا ہے عاشقوں کی آنکھ میں پانے آپ کو تماشا بنایا ہے)

واقع میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور دیوار پر دھوپ پڑی مگر ایک احمق کو آفتاب کی خبر نہیں اس کی نظر دیوار پر ہی ہے اور اس کو دیکھ دیکھ خوش ہو رہا ہے شیخی بگھار رہا ہے کہ میرے گھر کی دیوار کیسی چمک رہی ہے مگر شام ہونا تھی کہ دھوپ سمٹنا شروع ہوتی ہے اور آفتاب اپنے ساتھ اس کو لے جاتا ہے تو دیوار تاریک کی تاریک رہ جاتی ہے نور صفت اصلی آفتاب کی ہے دیوار کی نہیں اگر وہ حسن و جمال دیوار کی اصلی صفت ہوتی تو اس سے زائل کیوں ہوتی ایسی ہی چیزوں کے بارہ میں کہ جن کا حسن و جمال ان کی اصلی صفت نہیں مولانا فرماتے ہیں۔

عشق بامردہ نباشد پائیدار   عشق را باحی و باقیوم دار
عاشقی بامردگاں پائندہ نیست   زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشق ہائے کز پئے رنگ بود   عشق نبود عاقبت ننگے بود

مردہ کے ساتھ عشق کی پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی و قیوم کا عشق اختیار کرو۔ مرنے والوں سے عشق دائمی نہیں ہے۔ جو مرنے والا ہے وہ ہمارے سامنے آئندہ نہیں ہے۔ جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے اس کا انجام حسرت وندامت ہے وہ دراصل عشق ہی نہیں۔

آگے فرماتے ہیں

غرق عشقے شو کہ غرق ست اندریں   عشق ہائے اولیں و آخریں

عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اسمیں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے۔

پس عشق حق تعالیٰ ہی کا حق ہے ان سے ہی عشق کرنا چاہئے مگر اس میں بعض اوقات یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ محب ومحبوب میں مناسبت ہونی چاہئے اور ہم میں اور حق تعالیٰ میں مناسبت ہی کیا پھر دہاں تک ہماری رسائی کیونکر ہوگی مولانا آگے اسی شبہ کو رفع فرماتے ہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست   بر کریماں کارہا دشوار نیست

تو یہ خیال نہ کر ہماری پہنچ اس دربار تک کہاں ہے کیونکہ کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔

یعنی یہ مت سمجھ کہ اس شاہنشاہ کی بارگاہ میں تیرا کیونکہ دخل ہوگا اس لئے کہ بر کریماں کارہا دشوار نیست۔

یعنی کریموں پر یہ کام دشوار نہیں جواب کا حاصل یہ ہوا کہ رسائی کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ

تم خود وہاں پہنچو اور ایک یہ کہ وہ تم کو پہنچا دیں سو کہتے ہیں کہ گو تم خود وہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر انہیں تو پہنچانا مشکل نہیں ہے جب یہ ہے تو پھر مایوسی کیسی؟

تقریب الی اللہ

چنانچہ حدیث شریف میں ہے **من تقرب الی شبراً تقربت الیه ذراعاً و من تقرب الی ذراعاً تقربت الیه باعاً**[1] **الخ** کہ جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ذراع جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک ذراع آتا ہے میں اس کی طرف ایک باع آتا ہوں اور جو میری طرف آہستہ چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ راستہ تو غیر متناہی ہے کہ کسی کے قطع کرنے سے قطع ہی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدن ہا　　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدن ہا

محض دوڑنے سے طریق عشق ہرگز طے نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ مثل انگور کے کاٹنے سے خود بخود بڑھتا رہتا ہے۔

یہ ہمارے چلنے سے قطع نہیں ہوتا بلکہ ادھر ہی سے عنایت ہوتی ہے تو قطع ہوتا ہے اسی کی نسبت حدیث میں بشارت ہے **من تقرب الی شبرا الخ** کہ جو ایک ذراع ہماری طرف آتا ہے ہم اس کی طرف ایک باع جاتے ہیں خیال تو فرمایئے کیسی عنایت ہے کیسا کرم ہے؟ مگر طلب شرط ہے جس کی خاصیت مولانا فرماتے ہیں۔

آب کم جو تشنگی آور بدست　　　　تا بجو شد آبت از بالا و پست

مطلب یہ کہ بدوں پیاس پانی نہیں ملتا پیاسے بنو تو پانی تم تک خود ہی آجائے گا راز اس کا کیا ہے راز یہ ہے۔

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　　　آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

یعنی پیاسا ڈھونڈتا پھرتا ہے پانی کو۔ اسی طرح پانی بھی ڈھونڈتا ہے پیاسے کو۔

یعنی حق تعالیٰ خود تم کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور بلانے کے ساتھ پہنچاتے بھی ہیں کوئی محبوب ایسا ہے کہ محب کو خود بلائے اور خود پہنچائے غور تو کیجئے کہ عاشق کو محبوب خود بلا رہے ہیں یہ عنایت نہیں تو اور کیا ہے ایسی عنایت پر شبہ ہی نہیں ہوسکتا کہ ہماری رسائی خدا تک کیسے ہوگی۔

---

[1] مسند الامام احمد ۲: ۳۰۲، ۳۴۴، ۴۰، الترغیب والترهیب ۴: ۱۰۴، کنز العمال: ۱۱۷۹

ایک بزرگ تھے ان کو بادشاہ نے کچھ دریافت کرنے کی غرض سے بلانا چاہا۔ بادشاہ محل کے اوپر تھے اور یہ نیچے سے گزر رہے تھے بادشاہ نے اوپر سے کمند پھینک دی اس کے ذریعہ سے محل پر پہنچ گئے بادشاہ نے پوچھا کہ بندہ کی رسائی خدا تک کیسے ہوسکتی ہے کہاں خدا کہاں بندہ انہوں نے برجستہ فرمایا کہ ایسے ہوسکتی ہے جیسے میری رسائی آپ تک ہوگئی۔ اگر میں دروازہ سے آتا تو کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے کہیں دربانوں سے واسطہ پڑتا کہیں مصاحبین سے کہنا ہوتا کتنے درجے طے کرنے پڑتے۔ اس کے بعد کہیں آپ تک رسائی ہوتی اور شاید نہ بھی ہوتی اگر دربان روک دیتا غرض ایک صورت تو آپ تک پہنچنے کی یہ تھی کہ میں آپ کو تلاش کرتا اور سو دقتیں اٹھا کر کہیں آپ تک پہنچتا اور ایک صورت یہ ہے کہ خود آپ نے مجھے کھینچ لیا پس جیسا اس وقت آپ نے کیا اسی طرح خدا تک رسائی ہوسکتی ہے۔

شرط طلب و تقاضا

مگر طلب شرط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کھینچتے اسی کو ہیں جو کھنچنا چاہے اور جو اعراض کرتا ہے اس سے وہ بھی اعراض کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

انلزمکموھا و انتم لھا کارھون یعنی تم کراہت کرو تو ہمیں کیا غرض پڑی ہے جو خواہ مخواہ اپنی رحمت کو تم پر لادیں۔

لیکن اگر کوئی طلب کرے تو اس کی طرف نہایت توجہ اور رحمت فرماتے ہیں............!

اس کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ ماں کی آغوش میں دوڑ کر آنا چاہتا ہے مگر گھٹنوں سے چلا نہیں جاتا وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور گر پڑا اس کا گرنا تھا کہ ماں نے دوڑ کر خود اٹھا لیا بس اس کا کام تو اتنا ہی ہے کہ اپنی ہمت کے موافق چلے اور گر پڑے۔ جب وہ اپنا کام کر چکتا ہے تو فوراً ہی آغوش میں اٹھا لیا جاتا ہے اگر بچہ ایسا نہ کرے تو اس کی طرف ماں کو ایسا تقاضا نہیں ہوتا اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید   خیرہ یوسف وار می باید دوید
تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن   تا نگرید ابر کے خندد چمن

(اگر چہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے جب تک بچہ روتا نہیں ماں کی چھاتیوں میں دودھ جوش نہیں مارتا جب تک ابر نہ برسے چمن سرسبز نہیں ہوتا)

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زلیخا مکان میں لے گئیں تو سات قفل سات دروازوں میں ڈال دیئے تھے تاکہ نکلنے نہ پائیں جب انہوں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا کہ اپنا کام مجھے کرنا چاہئے پھر حق تعالیٰ اپنا کام کریں گے۔ دروازہ کھلنا نہ کھلنا میرا کام نہیں بس خدا پر توکل کر کے دروازہ کی طرف بھاگے۔ دروازہ کے پاس پہنچنے نہ پائے تھے کہ سب دروازے کھلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ساتوں دروازوں سے باہر نکل گئے انہوں نے خیال کیا کہ گو بھاگنے کا راستہ تو نہیں ہے لیکن بھاگنا تو میرے قبضہ میں ہے چنانچہ اس قصد سے بھاگے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ باہر نکل گئے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگر چہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح مقدور بد کوشش کرنی چاہئے)

غرض یہ تو مسلم ہے کہ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے مگر پھر بھی کوشش شرط ہے جیسے وضو نماز کے لئے شرط ہے گو تنہا وضو سے کچھ نہیں ہوتا جب تک نماز نہ پڑھے لیکن بدوں وضو کے نماز بھی نہیں ہوتی ایسے ہی خدا تعالیٰ محض اس کی کوشش سے نہیں ملتے وہ اپنی مرضی سے ملتے ہیں۔ مگر کوشش شرط ہے۔

ان ہی دو مثالوں کو بیان کر کے میں کہتا ہوں کہ قرآن میں اسی لئے ارشاد فرمایا ہے۔

جزاءً بما کانوا یعملون اور جزاءً بما کانوا یعملون

کہ عمل کرنے والے اپنے عمل کا بدلہ دیئے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عمل ضروری ہے اور یہ جو حدیث میں ہے کہ بدوں رحمت کے کوئی جنت میں نہ جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل علت تامہ نہیں ہے مگر شرط ہے اس کے بعد میں قرآن شریف ہی سے یہ مسئلہ ثابت کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان رحمت اللہ قریب من المحسنین کہ اللہ کی رحمت محسنین سے قریب ہے۔

پس اتنی طلب تو چاہیے کہ عمل میں مشغول ہو جائے اور خلوص کے ساتھ مشغول ہو جاوے۔ جس سے محسنین کا مصداق ہو جائے اس کے بعد یہ مشاہدہ ہو جائے گا۔

با کریماں کارہا دشوار نیست　　(کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا)

تمہارے عمل کرنے پر خدا تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی۔ بس کامیاب ہو جاؤ گے۔ اب تو معلوم ہو گیا

کہ خدا تعالیٰ تک رسائی ممکن ہے جب رسائی ممکن ہے تو پھر خدا تعالیٰ سے کیوں نہ محبت کی جائے بلکہ ان سے محبت کرنا واجب اور فرض ہے اور میں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب ہے ہی نہیں تعجب ہے کہ عشق مجازی کو دین وایمان سمجھا جائے اور خدا تعالیٰ کے عشق کی طرف ذرا دھیان بھی نہ ہو۔

تعلق بالمخلوق

بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو خدا سے پوری محبت ہی نہیں اس لئے اس کے احکام کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے جو خدا کا عاشق ہوگا وہ تو ہر حکم کو سر اور آنکھوں پر رکھے گا اور جو حالت بھی اس کو خدا کی طرف سے پیش آئے گی اس میں خوش ہوگا۔ اس کی تو یہ کیفیت ہوگی۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دلشدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں۔ اور اس کا یہ مذہب ہوگا۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اس پر اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔

بلکہ یہ حالت ہوگی۔

بجرم عشق توام می کشند وغو غایست تو نیز برسر بام آنکہ خوش تماشایست

تیرے عشق کے جرم میں مجھے کھینچ لے جاتے ہیں اور بھیڑ لگی ہوئی ہے تو بھی تو کوٹھے پر آ کر دیکھ کہ کتنا اچھا تماشہ ہو رہا ہے۔

یہ ہوتا ہے اثر تعلق عشق کا مگر افسوس ہے ہمارے حال پر کہ محبت کا تو دعویٰ اور اتنا بھی تعلق نہیں کہ اگر احکام سخت نازل ہوں تو ان کو دل سے مان لیا جائے معلوم ہوا کہ برائے نام ہی محبت ہے پھر اگر ہم یہ دیکھتے کہ آپ سخت احاکم کے نہ ماننے میں ایسا پختہ ہیں کہ دنیا میں کسی کے ہی سخت احکام نہیں مانتے تو ہم بھی سمجھتے کہ یہ لوگ اصول کے بڑے پابند ہیں۔ اس لئے ان پر الزام نہیں مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ مخلوق کے تعلق ہی میں یہ لوگ ان اصول کو توڑ دیتے ہیں۔

چنانچہ طبیب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیجئے اس نے ایسا کڑوا نسخہ لکھا کہ جس کا منہ تک جانا بھی دشوار ہے تو اس سے یہ نہیں کہتے کہ ایسا کڑوا نسخہ کیوں لکھا۔

علی ھذا کتنا ہی قیمتی لکھا ہو یہ کبھی نہیں کہتے کہ اتنا قیمتی کس واسطے لکھا ہے بلکہ بعض اوقات اس سے فرمائش ہوتی ہے کہ اچھا نسخہ لکھئے گا۔ قیمت کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ اور باوجود ان سارے قصوں کے پھر بھی تندرستی کے بعد کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا احسان ہوا جس کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور کڑوے نسخہ کو غٹ غٹ پی جاتے ہیں۔ سب طرح کی مشقت گوارا کرتے ہیں اگر حکیم کہے کہ عصر کے وقت کھچڑی کھانا تو اسی کو خوشی کے ساتھ کھاتے ہیں غرض وہ جو بھی بتلائے خواہ نفس پر کیسا ہی گراں ہو سب قبول کرتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اس وقت آپ کے یہ اصول کہ سخت احکام کو نہ مانا جائے وغیرہ وغیرہ کہاں گئے۔ طبیب کے ساتھ یہ معاملہ نہ کیا' جو خدا کے ساتھ کرتے ہو۔ معلوم ہوا کہ صرف بہانہ ہے نفس کا اور کچھ نہیں بس آپ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح دنیا کا کام بنا اسی طرح کرلیا اصول کے اختیار کرنے سے کام چلا یوں کرلیا اور جو اصول کے چھوڑنے سے کام چلا تو ایسے کرلیا یہ نہیں سوچتے کہ اس بے ڈھنگے پن کا انجام کیا ہوگا۔

بہرحال اول تو احکام شرعیہ سخت نہیں اور اگر سخت ہوئے بھی تو ان کو برداشت کیجئے آپ کا فرض ہے کہ ان کو بجالائیں۔ جیسے دنیا کے احکام اور آقاؤں کے سخت احکام برداشت کئے جاتے ہیں اسی طرح احکام خداوندی کے ساتھ معاملہ کیجئے پس اگر شریعت میں حقوق مالیہ سخت بھی ہوں تب بھی ان پر عمل کرنا چاہئے مگر اس کی طرف کسی کو التفات ہی نہیں نماز روزہ کے مسائل تو کبھی پوچھ بھی لیتے ہیں حقوق مالیہ کو کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ اس سے پہلے بیان میں ان حقوق مالیہ کا بیان بقدر ضرورت ہوا تھا۔ دیکھئے اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔

اثر وجاہت

اب اسی کے ساتھ اس کا ایک قرین ہے جس کا نام جاہ ہے یا اثر وجاہت اور یہ اس کا قرین اس لئے ہے کہ جیسے مال حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اسی طرح جاہ بھی حوائج کے پورا ہونے کا ذریعہ ہے اور اصل غرض حوائج کا پورا ہونا ہے اور چونکہ یہ دونوں چیزیں اس کا ذریعہ ہیں اس لئے لوگ رات دن انہی کی طلب میں سرگرم رہتے ہیں غرض یہ کہ حوائج کے پورا ہونے میں مال وجاہ دونوں کو دخل ہے بعض کام مال سے چلتے ہیں اور بعض جاہ سے اور بعض اعتبار سے بلکہ غور کیا جائے تو جاہ اثر میں مال سے بھی بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بعض اوقات جاہ سے بلا مال کے ہی کام چل جاتا ہے بعض کام جاہ کی وجہ سے ایسے ہو جاتے ہیں جو مال سے ہو ہی نہیں سکتے۔ بعض لوگوں کی مالی

حیثیت زیادہ نہیں ہوتی مگر ان کی جاہ زیادہ ہوتی ہے۔

قصبات میں بعض رئیس ہوتے ہیں کہ ان کا قصبہ میں اثر ہوتا ہے کہ چارپائی پر بیٹھے ہیں، حقہ سامنے رکھا ہے، تکیہ لگائے ہوئے ہیں۔ کسی شخص کو دور سے بلاتا ہے مزدور بھیجنے میں پیسہ خرچ ہوتا ہے بس کوئی ان کے سامنے سر گٹھڑی لئے ہوئے نکلا اس کو کہا گٹھڑی کو تو یہاں رکھ دے اور فلانے کو بلا لا۔ اگر مزدور بھیجتے تو دو آنے خرچ ہوتے بس ان کا کام مفت میں ہی چل گیا تو یہ کیا ہے جاہ کا اثر ہے کہ اس سے بدوں پیسہ خرچ کئے ہوئے کام چل رہا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ مثلاً اہل کمال ہوتے ہیں لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں ان کو عیش و آرام ہوتا ہے۔ لوگوں کو ان پر حسد بھی ہوتا ہے حالانکہ ان کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہوتا تو یہ کیا ہے جاہ ہی کا تو اثر ہے ان حضرات کی جاہ پہلے عند اللہ ہوتی ہے اور پھر عند الخلق ہوتی ہے۔

مجھ کو اس وقت اس سے بحث نہیں کہ جاہ کیسی چیز ہے اور اس کا کیا حکم ہے بلکہ یہ بیان کرنا ہے کہ جاہ بھی ایک ذریعہ ہے حوائج کے پورا ہونے کا جیسے مال ایک ذریعہ ہے اور حوائج دو قسم کے ہیں جلب منفعت و دفع مضرت اور مال کے یہ دونوں اثر ہیں اسی طرح جاہ کے بھی یہ دونوں اثر ہیں گو غالب اور زیادہ مال میں جلب منفعت ہے اور جاہ میں دفع مضرت مگر ایک امر مشترک تو دونوں میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مال و جاہ دونوں میں تقارن ہے۔

چونکہ پہلے مال کے متعلق بیان ہو چکا ہے تو جی یوں چاہا کہ اس کی قرین کا ذکر بھی ہو جائے تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے اس جلسہ میں بعض لوگ تو وہ ہیں جو پہلے بیان کو سن چکے ہیں۔ اس لئے ان کے تو اذہان میں دونوں مضمونوں کا اقتران اسی وقت ہو جائے گا اور جو لوگ ایسے نہیں تب بھی چونکہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں دونوں اشاعت کے بعد دیکھتے وقت ان کا اقتران ہو جائے گا اور چونکہ یہ حدیث (جو شرع وعظ میں پڑھی گئی ہے) اس کے لئے کافی تھی اس لئے اس حدیث کو اس وقت اختیار کیا گیا۔

سو سنئے! جاہ کے معنی ہیں قدر و منزلت (کما فی القاموس) جس کا حاصل اور لازم ہے اثر چونکہ صاحب جاہ کا قلوب میں اثر ہوتا ہے اسی لئے صوفیہ نے اس کی حقیقت ملک القلوب بتائی ہے چونکہ اثر کا لفظ مشہور ہے اس لئے جاہ کو لفظ اثر سے تعبیر کرنا سمجھنے کے لئے زیادہ سہل اور مناسب ہو گا۔ پس میں کہتا ہوں کہ اس حدیث میں اسی اثر مذکور کے متعلق بحث ہے تو اب سمجھ لیجئے کہ مال کے جیسے دو حق ہیں ایک مال کا حاصل کرنا ایک مال کا صرف کرنا اور شریعت میں دونوں کے جدا جدا احکام ہیں بعض

احکام تحصیل مال کے متعلق ہیں اور بعض استعمال مال کے متعلق ہیں اسی طرح اس اثر کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک تو یہ کہ اثر کے حاصل کرنے کا کیا حکم ہے ایک یہ کہ اس کے استعمال کا کیا حکم ہے مگر باوجود اس کے کہ اس کے متعلق بھی احکام ہیں پھر بھی آج کل اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں میں اس جاہ کے احکام سے زیادہ غفلت ہے بلکہ عجب نہیں کہ بعض لوگ جو شریعت کو صرف نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھ رہے ہیں دل میں یوں کہتے ہوں گے کہ کیا شریعت میں اس کے بھی کچھ احکام ہیں۔

ترقی کی حقیقت

صاحبو! مصیبت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب کچھ ہے مگر ہمیں خبر نہیں اس لئے کثرت سے کی خبر نہیں۔ اسی باب میں ہماری وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

ایک شخص روٹیوں کا ٹوکرا سر پر رکھے ہوئے ہے اور در بدر یوں کہتا پھرتا ہے کہ خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو۔ میں بھوکا ہوں حالانکہ ٹوکرے میں اتنی روٹیاں ہیں کہ اگر یہ شخص سارے محلہ میں تقسیم کر دے جب بھی کمی نہ پڑے مگر اس کو خبر نہیں۔

بس ایسی ہماری حالت ہے کہ ہمارے قانون شرع میں سب ہی کچھ موجود ہے یعنی ضروریات دین مگر ہمیں خبر نہیں۔ اور یہ قید ضروریات کی اس لئے لگائی کہ شاید سب ہی کچھ کا لفظ سن کر کسی کو یہ خیال ہو کہ پھر شریعت کے علم سے ہم کو ریل چلانا بھی آ جائے گا اس میں اس کی ترکیب بھی لکھی ہو گی کہ اس طرح اوزار ڈھالو اور ایسے انجن بناؤ' گاڑیاں تیار کرو۔ اس قید سے یہ چیزیں خارج ہو گئیں۔ (مطلب یہ کہ دین کے متعلق جتنی باتیں ہیں وہ شریعت میں سب موجود ہیں) باقی یہ گمان جو بعض لوگوں کا ہے کہ شریعت میں تجارت کے طریقے بتلائے گئے ہیں کہ اس طرح کماؤ کارخانے جاری کرو محض غلط ہے......!

چنانچہ اس مذاق کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے دنیا کمانے کے متعلق سب کچھ سکھایا ہے ان میں ایک قوم وہ بھی ہے جس کو قرآن شریف میں صرف یہی حکم پسند آیا ہے۔ احل اللہ البیع کہ اللہ نے بیع یعنی تجارت کو حلال کیا ہے جس میں سب ذرائع تجارت کے آ گئے۔ بھلے مانسوں نے یہ نہ دیکھا کہ جیسے احل اللہ البیع فرمایا اسی طرح وحرم الربوا بھی تو قرآن ہی میں موجود ہے اور اسی جگہ موجود ہے۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک حریص سے کسی نے پوچھا تھا کہ بھائی تمہیں قرآن شریف میں کون سا حکم پسند ہے تو اس نے کہا کہ **کلوا واشربوا** کہ کھاؤ پیو پھر پوچھا کہ دعا کون سی پسند ہے تو کہا **ربنا انزل علینا مائدۃ من السمآء** کہ اے ہمارے رب ہمارے اوپر آسمان سے خوان نازل فرما۔

تو جیسے اس حریص کو تمام احکام میں سے کھانے اور پینے ہی کا حکم پسند آیا تھا اور تمام دعاؤں میں سے کھانے پینے ہی کی دعا پسند آئی تھی اسی طرح ان کو صرف **احل اللہ البیع** ہی پسند آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں ترقی کی اجازت دی ہے۔ یہ حاشیہ چڑھایا ہے قرآن شریف پر اور ترقی کے معنی بھی وہ لئے جو انہوں نے خود ہی سمجھے ہیں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ شریعت نے ترقی کی اجازت دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ ترقی کے معنی کیا ہیں آیا وہ جو انہوں نے سمجھے ہیں یا کچھ اور اگر ترقی کے صحیح معنی بیان کئے جائیں گے تو ہم تسلیم کریں گے کہ شریعت نے اس کی اجازت دی ہے لیکن کسی چیز کا نام ترقی رکھ لینے سے اس کی حقیقت تھوڑا ہی پائی جائے گی۔ کوئی شراب کا نام شراب الصالحین رکھ لے تو اس سے وہ حلال تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ آج کل جس چیز کا نام ترقی رکھا گیا ہے اس کی حقیقت ہے حرص طول امل خود غرضی اور قطع نظر شریعت سے یہ چیزیں تو عقلاً بھی ناجائز ہیں۔ مگر لوگوں نے حرص وغیرہ کا ایک خوبصورت نام ترقی رکھ لیا مگر صرف نام رکھ لینے سے کیا ہوتا ہے اس سے حقیقت تو نہ بدلے گی۔

میں اس کو مفصل بیان کرتا مگر یہ جلسہ اس کے لئے کافی نہیں اس کے لئے خاص طور پر مستقل جلسہ کی ضرورت ہے لیکن میں اجمالاً ایک مختصر بات کہتا ہوں وہ یہ کہ عقلاء اول اس کا فیصلہ کرلیں کہ ترقی کی حقیقت کیا ہے پس خوب سمجھ لو کہ ترقی کی حقیقت وہی ہے جس کی قرآن شریف اجازت دیتا ہے یعنی حلال طریقہ سے بڑھنا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ جائز ترقی محدود ہے یا غیر محدود ہے اگر محدود ہے تو اس کے حدود بیان کیجئے اور ان شاء اللہ شریعت سے بہتر اس کی حدود کوئی بھی نہ بیان کر سکے گا۔ اور اگر غیر محدود ہے یعنی اس میں کوئی قید نہیں ہے اگر اس میں مضرتیں بھی ہوں تو اس کی بھی اجازت دی جاوے۔ تو کیا خدا تعالیٰ سے جو کہ بوجہ علیم وخبیر ورحیم وحکیم ہونے کے سب سے زیادہ نصائح عباد کی رعایت فرماتے ہیں اس ترقی غیر محدود کی اباحت کی توقع رکھ سکتے ہو حالانکہ گورنمنٹ سے بھی جس کی نظر نصائح کو اس قدر محیط نہیں تم اس کی توقع نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر گورنمنٹ صرف محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے اور آپ کو مقید بناتی ہے ترقی غیر محدود کی کوئی گورنمنٹ اجازت نہیں دے سکتی تو خدا تعالیٰ کو یہ حق نہیں کہ وہ آپ کو مقید کریں اور اگر کوئی عدم

احاطہ واقعات کے سبب یہ کہے کہ گورنمنٹ تو غیر محدود ترقی کی اجازت دیتی ہے چنانچہ بہت سے ذرائع غیر مشروع کی قانون میں اجازت ہے تو چاہے آج سے ڈکیتی کیجئے دوسروں کے مال چھین چھین کر خوب اپنا مال بڑھایئے اس کے بعد اگر آپ عدالت میں پکڑے ہوئے جاویں تو صاف کہہ دیں کہ ہم تو ترقی کرتے ہیں میں پوچھتا ہوں کیا عدالت اس کو قبول کرلے گی اگر نہیں قبول کرے گی تو پھر ثابت ہو گیا کہ گورنمنٹ نے ترقی کی یہ حد قائم کی ہے کہ ڈکیتی نہ ہو چوری نہ ہو غصب نہ ہو۔

پس جب گورنمنٹ ترقی کے لئے حدود قائم کرسکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ حدود قائم نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ گورنمنٹ سے تو غیر محدود ترقی کی امید نہ رکھیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے یہ امید ہو کہ ترقی غیر محدود کی اجازت دیں اور اگر ترقی غیر محدود مطلوب ہے تو اجازت دیجئے کہ میں آپ کا کرتہ اتارلوں اور آپ کا مکان اور جائیداد چھین لوں کیونکہ آپ کے نزدیک ترقی کے لئے کوئی حد تو ہے ہی نہیں اگر آپ کو یہ گوارا ہو تو میں ادب سے عرض کروں گا کہ آپ میرے خطاب کے قابل نہیں ایسا شخص تو مجنون ہے جس کو ڈاکٹر سے جنون کا سرٹیفکیٹ لینا چاہئے۔ غرض یہ کہ ترقی اور تمدن کی حقیقت اتنی ہی ہے جتنی شریعت نے اجازت دی ہے اور اس میں شریعت نے تنگی نہیں کی شریعت نے اجازت دی ہے ترقی کی مگر اس کے حدود ہیں۔ میں اس کو عرض کر رہا تھا کہ شریعت میں ضرورت دین سب مذکور ہیں ان ضروریات میں خصوص جاہ کے متعلق بھی ذکر تھا اس کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں اس پر ایک سوال کے جواب میں کہ کیا جاہ کے متعلق بھی احکام ہیں، یہ گفتگو درمیان میں آ گئی تھی کہ ہاں احکام سب چیزوں کے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ ہمیں خبر نہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن شریف کو ہم نے اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ اس میں کس کس چیز کی تعلیم ہے پس اس میں سرسری نظر سے یہی دیکھ لیا کہ نماز روزہ ہے جنت و دوزخ کا بیان ہے لوگوں نے ساری شریعت کا یہی حاصل سمجھ لیا اور یہی خلاصہ نکال لیا حالانکہ قرآن میں ضروریات میں سے سب کچھ موجود ہے مگر قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند　　　نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند

(جو شخص آئینہ بنانا جانتا ہے ضروری نہیں وہ سکندری بھی جانتا ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص چہرہ کو برافروخت کرے اس میں شان دلبری بھی ہو)

یہ کافی نہیں کہ ترجمہ دیکھ لیا اور قرآن کو سمجھ لیا قرآن کا سمجھنا خاص درجہ کے علماء کا کام ہے وہ

درجہ حاصل کرو تو معلوم ہو کہ اس میں سب کچھ ہے مگر فہم کی ضرورت ہے ورنہ بدفہم لوگوں نے محض ترجمہ دیکھ کر تو بہت سی آیتوں کا مدلول غلط سمجھ لیا ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے۔

فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً کہ ہنسنا کم چاہیے اور رونا بہت چاہیے اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں۔ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے **فلیضحکزا** میں ھم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے۔ اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے۔ یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھے ہیں اور قلیلا سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے مقابل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روو گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ **جزآءً بما کانوا یعملون** خود اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے۔ **فلیضحکوا ولیبکوا** امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنیً۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے **ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً** بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آئیں گے پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ مشاہدہ کا کیا انکار مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں یہ تو آخرت کے متعلق ہے۔ کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے۔ ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ **فاللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً** مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مومنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود۔ **فاللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمۃ** بتلا رہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے اب کوئی اشکال نہیں۔

جاہ کی حدود

اب میں اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ شریعت میں جاہ کے احکام بھی ہیں اور اس میں دو درجے ہیں ایک تحصیل جاہ یعنی جاہ کا حاصل کرنا اور ایک بذل جاہ یعنی اس کا صرف کرنا جیسے مال میں دو درجے تھے ایک اس کا حاصل کرنا اور ایک اس کا صرف کرنا اور اس کا جامع فیصلہ یہ ہے کہ جاہ کے چند مراتب ہیں۔

ایک مرتبہ یہ ہے کہ جاہ بدوں حاصل کئے حاصل ہو گئی ہے وہ تو خالص نعمت ہے خدا تعالیٰ کی جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی جاہ ہوتی ہے کہ وہ خود گرتے چلے جاتے ہیں اور پستی اختیار کرتے ہیں مگر وہ جتنے گرتے ہیں اتنے ہی بلند ہوتے ہیں کیونکہ حدیث شریف میں ہے۔

من تواضع للہ رفعہ اللہ[1] (کہ جو شخص اللہ کے واسطے تواضع اختیار کریگا اللہ اس کو بلند کریگا)۔

اس کو جو جاہ ملی ہے اس نے خود حاصل نہیں کی بلکہ اللہ کی طرف سے ملی ہے اس جاہ کے خالص نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ایک یہ صورت ہے کہ جاہ اس نے تو حاصل کی نہیں یعنی اس کے اسباب کا استعمال خود اس نے نہیں کیا مگر دوسروں نے کیا ہے اور اس سے اس کو جاہ حاصل ہو گئی مثلاً چار آدمیوں نے مل کر اس کو بادشاہ بنا دیا اب یہاں جاہ تو حاصل ہوئی اسباب سے مگر اس نے وہ اسباب جمع نہیں کئے بلکہ اور لوگوں نے اسباب جمع کر کے اس کو بادشاہ بنا دیا ہے۔

پہلی صورت اور اس صورت میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں تو اسباب ظاہری جمع ہی نہیں کئے گئے نہ اس کی طرف سے نہ اوروں کی طرف سے بلکہ محض وہبی طور سے جاہ مل گئی اور یہاں گو اس نے اسباب کو جمع نہیں کیا مگر دوسروں نے تو جمع کیا ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اس صورت میں صاحب جاہ انکار کرنے سے جاہ سے بچ سکتا ہے۔ بخلاف پہلی صورت کے کہ وہاں بچ نہیں سکتا کیونکہ وہ غیر اختیاری ہے اور یہاں قبول کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو اس جاہ سے متمتع ہونا جائز ہے مگر دو باتوں کا دیکھ لینا ضروری ہے ایک تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچا سکے گا یا نہیں دوسرے یہ کہ اپنا دین تو کسی حال میں برباد اور تباہ نہ ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر نظر کر کے اس جاہ کا قبول کرنا اور اس سے منتفع ہونا جائز

---

[1] الترغیب والترھیب للمنذری ۳: ۵۶۰، ۴: ۱۹۷، مجمع الزوائد للهیثمی ۸: ۸۲، کنز العمال: ۵۷۳۰، مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۹

ہے اور اگر یہ شرطیں نہ پائی جاویں تو قبول کرنا حرام ہے۔

تیسری قسم جاہ کی یہ ہے کہ نہ کسی نے بادشاہ بنایا ہے نہ قدرتی طور پر جاہ ملی ہے بلکہ خود کوشش کرتا ہے جاہ کے حاصل ہونے کی جیسے عالمگیر نے حصول سلطنت کی کوشش کی تھی اس حکم یہ ہے کہ بجز خاص خاص حالات کے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

حکومت اور شریعت

بلکہ اصل قانون تو یہ ہے کہ اپنے لئے خود کوئی منصب تجویز کرنا اور اس کی خواہش کرنا جائز نہیں ہے اسی میں سب عہدے حکومت کے داخل ہیں درحالیکہ وہ فی نفسہ شرعاً جائز بھی ہوں سو جائز ہونے کی صورت میں بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس کی خواہش کی جائے کیونکہ حکومت کی درخواست اور خواہش کرنا جائز نہیں ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو حکومت کی درخواست کرے ہم اس کو کبھی حکومت نہ دیں گے راز اس میں یہ ہے کہ حکومت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے اور بڑا بوجھ اٹھانا ہے اگر دس پر حاکم ہے تو دس کا بوجھ اٹھانا اور پچاس پر حاکم ہے تو پچاس کا بوجھ اٹھانا اور ایک پر حاکم ہے تو ایک کا بوجھ اٹھانا اور یہ بوجھ اٹھانا اور ان کی راحت کی فکر کرنا نہایت دشوار کام ہے جیسا تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مقام پر پہنچے آپ کو ایک خیمہ جنگل میں نظر آیا آپ اس خیمہ کے باہر کھڑے ہو گئے دیکھا کہ اس میں بچوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے اور گو یہ تجسس تھا مگر امام وقت کو تفتیش اور تجسس جائز ہے دوسرے کو جائز نہیں۔ غرض آپ کو معلوم ہوا کہ ایک خاندان باہر سے آ کر ٹھہرا ہے ان کے بچے بھوک سے چلا رہے ہیں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ بی بی نے ایک خالی دیگچی چڑھا رکھی ہے اور بچوں سے کہہ رہی ہے کہ سو جاؤ کچھ دیر میں کھانا پکا کر تمہیں اٹھا لیں گے۔

اس حالت کو دیکھ کر آپ بے حد دلگیر ہوئے پھر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے وہاں کوئی فیشن تو تھا نہیں جس سے شناخت ہوتی معمولی وضع سے جو کھڑے ہوئے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کون ہیں۔ آپ نے ان سے خود فرمایا کہ عمر کے پاس جا کر اپنے حال کی اطلاع کرو۔ وہ تمہیں کھانے پینے کا سامان دیں گے تو وہ عورت کہتی ہے سبحان اللہ! یہ ہمارے ذمہ ہے یا ان کے ذمہ ہے کہ وہ خود ہماری خبر رکھیں۔ انہوں نے خلافت کیوں اختیار کی ہے جب ان سے انتظام نہیں ہو سکتا آپ نے کہا کہ عمر غیب دان نہیں ہے ایک شخص تمام باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا اس عورت نے

کہا کہ پھر کیوں خلافت کا منصب اختیار کیا ہے چھوڑ دیا ہوتا۔ بس یہ سن کر آپ واپس ہوئے اور رات ہی کو بیت المال کا قفل کھولا اور کچھ آٹا اور جنس اپنے ساتھ لیا غلام نے کہا کہ یہ سامان میرے حوالے کیجئے میں لے چلوں گا تو آپ فرماتے ہیں۔

لاتزر وازرۃ وزر اخری فرمایا یہاں کا بوجھ اٹھانا سہل ہے آخرت کا بوجھ اٹھانے سے۔

آپ لے کر وہیں پہنچے اور ان سے کہا کہ اس کو کھاؤ پیو۔

میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ اسی طرح آپ شب کے وقت ایک بار گشت کرتے پھر رہے تھے ایک خیمہ دیکھا اور اس میں سے دردناک آواز سنی تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک عورت کے دردزہ ہو رہا ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے کسی دایہ کو نہیں بلایا وہ لوگ بولے ہم پردیسی ہیں ہمارے پاس کون ہے بلانے والا بس آپ فوراً اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی کو وہاں لائے اور ان سے کہہ دیا کہ یہ ظاہر نہ کرنا کہ میں خلیفہ کی بیوی ہوں اس کے جتلانے کی ضرورت نہیں غرض یہ کہ بچہ پیدا ہوا اور ان کے منہ سے بے اختیار یہ کلمہ نکل گیا۔

ابشر یا امیر المومنین بشارت ہو آپ کو یا امیر المومنین!

اس سے ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ یہ امیر المومنین ہیں خیال تو فرمایئے کہ یہ خلیفہ کی بیگم ہیں۔

پس حاکم ہونے کا اس کو حق ہے جو دوسروں کی راحت رسانی کی اتنی ذمہ داری کر سکے نہ یہ کہ نام لکھا لیا اور حاکم ہو گئے حاکم پر بڑی ذمہ داری ہے اور بڑی مشقت ہے جس کو کوئی شخص خوشی سے اپنے لئے گوارا نہیں کر سکتا پھر باوجود اس کے جو شخص درخواست کر رہا ہے حکومت کی تو ظاہر ہے کہ اس کی غرض جلب مال اور جلب جاہ وغیرہ ہے۔ راحت رسانی خلق مقصود نہیں.....!

مثلاً ایک رئیس ہیں جو تحصیلدار بنے ہوئے ہیں حالت ان کی یہ ہے کہ کسی کو جیل خانے بھیج دیا کسی پر جرمانہ کر دیا کسی کے بید لگا دیئے باوجودیکہ اپنے گھر کی آمدنی پانچ سو اور ہزار ماہوار کی ہے مگر پھر درخواست ہے تحصیلداری اور ڈپٹی کلکٹری کی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلب جاہ یا جلب مال مقصود ہے اور کچھ بھی نہیں اور اکثر غرباء کو حکومت سے جلب مال مقصود ہوتا ہے اور امراء کو جلب جاہ اور حکومت کے حقوق سنئے۔

حضرت عمرؓ نے انتظام کیا تھا کہ میری خلافت میں بنی عدی میں سے کوئی حاکم نہ بنایا جائے (بنی عدی حضرت عمرؓ کا قبیلہ اور خاندان ہے) کیونکہ وہ میرے اثر سے دوسروں کو ستا سکتا

ہے۔ مگر ایک شخص کو لیاقت کی وجہ سے حاکم بنا دیا تھا اس نے کچھ اشعار کہے تھے جس میں اپنی بیوی کو خطاب تھا کہ وہاں رہیں گے اور عیش و عشرت کریں گے وہ اشعار آپ کے پاس پہنچ گئے آپ نے اس کی حاضری کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تمہارے اشعار ہیں۔ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیت یہ ہے کہ خوب عیش اڑائیں گے اس نے کہا کہ حضرت یہ تو زبانی شاعری تھی دل سے کوئی واقعی مضمون نہ تھا آپ نے فرمایا کہ زبان پر کسی بات کا تذکرہ اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک دل میں نہ ہو۔ تم قابل حکومت نہیں ہو اور معزول کر دیا اسی واسطے قانون ہے شریعت کا کہ صاحب غرض کو حکومت نہ دی جائے گی کیونکہ ایسے شخص کی غرض جلب مال اور جلب جاہ ہوگی۔ راحت رسانی خلق مقصود نہ ہوگی تو جو مقصود ہے حکومت سے وہ حاصل نہ ہوگا۔

اب لوگ اپنے اپنے دلوں میں ٹٹول کر دیکھ لیں کہ عہدوں کی درخواست کرنے سے کیا غرض ہوتی ہے آیا یہ مقصود ہوتا ہے کہ مال و جاہ حاصل ہو یا یہ کہ خلق کو آرام پہنچے اگر یہ ہوتا تو اس کے آثار بھی تو ہوتے جب آثار نہیں تو یقیناً مطلوب جاہ و مال اور کچھ نہیں۔ اور اگر سو میں ایک ایسا ہو بھی گیا تو وہ کس شمار میں ہے۔ اگر یہ بات ہوتی (یعنی جاہ مقصود نہ ہوتی بلکہ خدمت خلق اور ان کی حفاظت اور راحت رسانی مقصود ہوتی تو جو شخص تحصیلداری کر رہا ہے اور اس کی وہی ڈپٹی کلکٹری کی جگہ ہوتی تو وہ اس جگہ پر نہ جاتا کیونکہ اس کی غرض تحصیلداری میں بھی حاصل ہو رہی ہے۔ (وہ کیا ہے خدمت خلق) بلکہ سب انسپکٹری میں تحصیلداری سے بھی زیادہ حفاظت کر سکتے ہیں اگر خدمت مدنظر ہے تو اسی کو اختیار کرتے کیونکہ مقصود اس میں زیادہ حاصل ہے حالانکہ ایسا نہیں کرتے تو یہ علامت اس کی ہے کہ مقصود خدمت خلق نہیں بلکہ مقصود جاہ ہے اور جو تحقیق میں نے ڈپٹی کلکٹری وغیرہ کے متعلق بیان کی کچھ اسی میں منحصر نہیں ہے۔

بادشاہت اور جمہوریت

میں دینی مناسبت والوں کو مثلاً واعظین کو بھی کہتا ہوں کہ اس میں بھی وہی تفصیل ہوگی جو اسباب جاہ میں مذکور ہوئی وہ یہ کہ کبھی تو خود واعظ بنے گا اور کبھی لوگ بنائیں گے اور اس کے متعلق بھی احکام کی وہی تحقیق ہے جو اوپر آچکی مثلاً اپنے طور پر تو خود واعظ بننا جائز نہیں اور اگر بنا دیا جائے تو جائز ہے۔ حدیث نے یہی فیصلہ کیا ہے حدیث میں ہے۔ **لایقص الامیر او مامور او مختال** یعنی واعظ کون بنے گا ایک امیر یعنی امام المسلمین ایک اس کا مامور یعنی جس کو امام المسلمین

نے اس کام کے لئے تجویز کیا ہو۔ ایک مختال یعنی متکبر ریاکار جو یوں سمجھتا ہے کہ ہم بڑے ہیں یا بڑا بننا چاہتے ہیں۔ یہ حدیث دلیل ہے میرے دعوے کی اب آج کل کے واعظین سوچ لیں کہ آیا آپ کو کسی نے واعظ بنایا ہے یا خود بنے ہیں۔ اگر کسی نے بنایا ہے تو مامور میں داخل ہیں اور اگر نہیں بنایا تو مختال ہیں۔ کیونکہ امیر نہ ہونا تو ظاہر ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ تم بھی تو اسی میں داخل ہو تمہیں کس نے واعظ بنایا ہے؟ اس لئے تم بھی مختال ہوئے اور اگر یہی ہے تو کوئی بھی ہندوستان میں وعظ نہ کہے' کیونکہ یہاں نہ تو کوئی امیر ہے نہ مامور ہے بس تیسری شق رہ گئی لہذا سب کے سب مختال ہوئے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اول حدیث کی حقیقت سمجھنا چاہیے اس سے جواب معلوم ہو جائے گا سو اس کے لئے ایک مقدمہ سمجھئے وہ یہ کہ بادشاہ کے جو اختیارات ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ میزان کل ہے تمام رعایا کے اختیارات کی یعنی فرادیٰ جو اختیارات رعایا کو تھے سب کی میزان بادشاہ کو سپرد کر دی ہے اس کا حاصل یہ ہوا کہ بادشاہ کے اختیارات مستفاد ہوتے ہیں رعایا سے یعنی عوام الناس اختیار دیتے ہیں بادشاہ کو اب چونکہ تمام عوام الناس کا اجتماع تو عادۃً محال ہے اس لئے ان کے قائم مقام اہل حل وعقد ہوں گے نئی اصطلاح میں اس کو پارلیمنٹ کہتے ہیں اور اس میں یہ ضرور نہیں کہ عوام الناس زبان سے کہیں کہ یہ لوگ ہمارے قائم مقام ہیں۔ بلکہ عوام الناس ان کے ساتھ برتاؤ ایسا کرتے ہیں جس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کو اپنا پیشوا اور دل سوز سمجھتے ہیں۔ یہ برتاؤ شہادت اس کی ہے کہ عوام الناس نے ان خواص کو اپنی طرف سے اختیارات دے دیئے ہیں وہ گویا وکیل ہیں عوام الناس کے بس وہ مل کر بادشاہ کو بادشاہ بناتے ہیں۔ اور ان کا بنانا سب کا بنانا ہے۔ بس اہل حل وعقد کی جماعت سب کی قائم مقام ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ خود اختیارات میں مستفید ہے عوام سے اور بادشاہ کے بنانے والے بھی عوام ہی ہیں بواسطہ اہل حل وعقد کے تو بس اہل حل وعقد ہی سب کچھ ہوئے جیسا وہ کریں گے وہی سب کی طرف سے سمجھا جائے گا پس یہاں اگرچہ امام المسلمین کا وجود نہیں ہے مگر اہل حل وعقد تو موجود ہیں یعنی علماء وصلحاء اس لئے صلحاء کا تسلیم کیا ہوا واعظ صحیح طور پر سے واعظ ہو گا گویا اس کو بادشاہ ہی نے واعظ بنایا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر بواسطہ ایک فعل صحیح ہے تو بلاواسطہ بدرجہ اولیٰ صحیح ہوگا۔ (مطلب یہ ہے کہ جو واعظ بادشاہ کے واسطہ سے بنایا گیا ہے جب وہ

صحیح ہے تو اہل حل وعقد کا بلا واسطہ بادشاہ کے کسی کو واعظ بنا دینا بدرجہ اولیٰ درست ہوا)

بس فیصلہ یہ ہوا کہ جس کو صلحاء و اتقیاء وعظ کے لئے تجویز کریں وہ مامور میں داخل ہو جاوے گا اور اس کو وعظ کہنا جائز ہوگا اور جس کو یہ جماعت تجویز نہ کرے اس کو وعظ کہنا جائز نہیں ہوگا۔ اگر اس معیار پر نظر ہو تو جو گمراہی پھیل رہی ہے قوم میں وہ سب جاتی رہے گی مگر آج کل تو کوئی معیار ہی نہ رہا۔ ہر شخص واعظ ہے مقتدا ہے۔

جاہل واعظ

دیوبند میں ایک نابینا صاحب تشریف لائے آنکھوں کے تو اندھے تھے ہی دل کے بھی اندھے تھے۔ سورہ جمعہ میں جو ان کنتم تعلمون ہے اس کا آپ نے عجیب ترجمہ کیا وہ یہ ہے کہ اے لوگو! بہتر ہے تمہارے لئے کہ تالا لگا کر جمعہ کی نماز کو چلے جایا کرو آپ نے تعلمون کو تالا موند سمجھا اس کا یہ ترجمہ کیا میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا اور مولانا رفیع الدین صاحب بھی موجود تھے مولانا نے دھکا کر وعظ کہنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حکایت ہے کانپور کی کہ مدرسہ جامع العلوم میں ایک واعظ صاحب تشریف لائے اور سورہ الرحمٰن کے تیسرے رکوع کا وعظ شروع کیا جنتان کو تو جنتن پڑھا اور یہ ترجمہ کیا کہ جنت میں ایک ایک تخت پایا ہزار ہزار کوس کا ہوگا۔ کوس بڑے شین سے فرمایا پھر اس کی تفسیر بھی فرمائی کہ ایک کوس ہوتا ہے چھوٹے سین سے وہ چھوٹا ہوتا اور ایک کوش ہوتا ہے بڑے شین سے وہ بڑا ہوتا ہے اور بھی بہت واہی تباہی روایات غلط بیان کیں بے چارے کو اس وعظ میں ایک آنہ ملا۔

میرے چھوٹے ماموں صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ایک جامع مسجد میں ایک جاہل پہنچا اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں وعظ بھی ہوا کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نہیں ہوتا۔ تو بعد نماز کے خود ہی پکارا کہ صاحبو! اس وقت واج (واعظ) ہوگا اور نماز کے بعد وعظ کے لئے منبر پر جا بیٹھے تو آپ نے یاسین کو یٰسین پڑھا یہاں تک بھی غنیمت تھا ترجمہ کیا تو نور علی نور ترجمہ یہ کہ اے محمد! اگر تو نہ ہوتا تو آسمان و زمین کچھ نہ ہوتا یہ ترجمہ یاسین کا کیا اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو تھکے ماندے ہیں اس لئے آدھا وعظ آج کہا ہے آدھا کل ہوگا۔ اس جلسہ میں ایک نابینا عالم بھی موجود تھے انہوں نے کہا ذرا ان واعظ صاحب کو میرے پاس لانا جب وہ آئے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا کہ آپ کی تحصیل کہاں تک ہے تو آپ کہتے ہیں کہ ہماری تحصیل ہے ہاپوڑ۔ اتنے بڑے عالم تھے اور وعظ

فرماتے تھے وہ بولے کہ مولانا میں حکومت کی تحصیل کو نہیں پوچھتا بلکہ یہ پوچھتا ہوں آپ نے پڑھا کیا کیا ہے۔ تو آپ فرماتے ہیں ہم نے سب کچھ پڑھا ہے وفات نامہ، ساپن نامہ، ہرنی نامہ اور اس کے بعد کہا اور تو کیا جانے اندھے۔ حالت تو ان کی یہ تھی اور بڑے خوش تھے کہ ہم واعظ ہیں۔

حضرت یہ واعظین کی آج کل کیفیت ہے۔ بعض لوگ لفاظ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں۔ ان کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سی بات صحیح ہے کون سی غلط۔ بس روپے سیدھے کرنے کے لئے وعظ کہتے ہیں۔ شریعت نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ واعظ کون ہو سکتا ہے جس کی تفصیل میں نے عرض کر دی ہے۔

کندہ ناتراش پیر

اسی طرح پیر بن جانا بھی ہے اس میں یہی شرط ہے کہ مامور ہو یعنی کسی شیخ کامل نے اس کو اجازت دی ہو بیعت کرنے کی۔ مگر آج کل تو یہ حالت ہے پیری مریدی کی زبان سے واہی تباہی بکتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقیری کے راز بیان ہو رہے ہیں۔

دارا شکوہ کا قصہ سنا ہے کہ اس نے ایک شاہ صاحب سے پوچھا کہ جناب کی عمر کتنی ہے کہا کہ جب تمہارے دادا صاحب کی لڑائی محمد صاحب سے ہوئی تھی تو فقیر کی اتنی عمر تھی۔ سعد اللہ خان وزیر نے کہا' ماشاء اللہ آپ مورخ بھی بہت بڑے ہیں۔ دارا شکوہ بولے ایسا نہ کہو بزرگوں کے اسرار ہوتے ہیں یا اور کسی کا قصہ ہو۔

کاندھلہ میں ایک شاہ صاحب آئے مولانا مظفر حسین صاحب ان سے ملنے گئے شاہ صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب اتہائی میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھوں گا مولوی صاحب نے دل میں کہا کہ خدا جانے تصوف کا کون سا دقیق مسئلہ پوچھیں گے۔ اب سنئے شاہ صاحب کیا مسئلہ پوچھتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ محمد صاحب کی جو اتنی شہرت مشرق و مغرب میں ہوئی ہے وہ کس کے مرید تھے۔ کیا بڑے پیر صاحب سے آپ نے بیعت کر لی تھی۔ مولوی صاحب نے کہا' کم بخت! فقیر بنا پھرتا ہے۔ لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے ملعون تو کیسا مسلمان ہے؟ تجھ کو اتنی خبر بھی نہیں کہ بڑے پیر صاحب تو حضور کی اولاد ہیں اور آپؐ کے امتی ہیں غرض قصبہ سے نکلوا دیا۔

ایک صاحب قنوج میں تشریف لائے لوگوں کو مرید کرنا شروع کر دیا اور سب کو یہ تعلیم کی کہ نماز میں قراءت زبان سے مت پڑھو دل میں خیال کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید تھی کہ کسی سے کہنا

نہیں غرض لوگوں کی نمازیں خوب تباہ کیں آخر کسی طرح وہاں کے روسا کو خبر ہوگئی تب اس کو نکلوایا۔

غرض پیری مریدی کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں رہا صرف معیار یہ رہ گیا ہے کہ جس طرف مخلوق جا رہی ہے اسی طرف ہو لئے۔

اشعب طماع کا قصہ ہے کہ لڑکے ان کو بہت چھیڑا کرتے تھے جب زیادہ پریشان ہو جاتے کہہ دیتے کہ یہاں کیا رکھا ہے فلاں امیر کے گھر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے یا کھانا بٹ رہا ہے وہاں جاؤ۔ لڑکے یہ سن کر امیر کے گھر کی طرف دوڑتے تو کچھ دیر میں آپ بھی اسی طرف کو دوڑتے کوئی کہتا کہ میاں تم کیوں چلے تو کہتے کہ شاید مٹھائی تقسیم ہی ہو رہی ہو کیونکہ لڑکے بھاگے جا رہے ہیں حالانکہ آپ ہی نے ان کو بھگایا تھا۔

یہی حال یہاں ہے کہ عوام الناس کہہ دیتے ہیں کہ جب اتنے آدمی اس کے پاس جاتے ہیں تو پیر میں کچھ تو ہوگا اور پیر صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنے آدمی میرے معتقد ہیں تو میں بھی کچھ ہوں گا۔ حالانکہ خود ہی ان کو دھوکہ دیا ہے مگر خود بھی اپنے دھوکہ میں آ گئے۔ آج کل بزرگی کا معیار اکثر تو یہ رہ گیا ہے کہ بڑے بڑے لوگ جس کے مرید ہوں تو بس وہ پیر ہے یا جس کو کشف ہوتا ہو وہ پیر ہے اگر کشف ہی پر دارومدار ہے تو شیطان کو ایسا کشف ہوتا ہے کہ بڑوں بڑوں کو بھی نہیں ہوتا۔

دیکھئے بدر میں بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضور صلی علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ شیطان بھی کفار کے لشکر میں تھا اور ان سے آ کر کہا کہ میں تمہارا حامی ہوں لوگ کوئی سردار سمجھے۔

فلما تراء ت الفتان نکص علیٰ عقبیه و قال انی بریٔ منکم انی اریٰ مالا ترون

کہ جب دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور فرشتوں کا نزول ہوا تو شیطان صاحب گھبرا گئے اور کہا کہ مجھے ایسی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں کہ تمہیں نظر نہیں آتیں۔ یہ حالت دیکھ کر شیطان تو بھاگ گیا اور بہت سے کفار کے بھی قدم اکھڑ گئے۔ اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو فرشتوں کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا۔

قبر میں جب عذاب ہوتا ہے تو جانوروں کو معلوم ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کتوں اور بلیوں کو کشف قبور ہوتا ہے۔ مگر آج کل پیری کی یہ خاص علامت ہے بھلا جو چیز حیوانات تک میں مشترک ہو وہ کیسے انسانی کمال ہو سکتی ہے۔ افسوس یہ لوگ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

بعضوں نے بزرگی کا معیار یہ مقرر کیا ہے کہ تصرف کر کے لوگوں کو لوٹ پوٹ کر دے بس وہ

بزرگ ہیں۔ اگر یہی معیار ہے تو ایسا تو جوگی بھی کر دیتے ہیں جو کافر محض ہیں۔ مسمریزم والے کیا کیا نہیں کرتے عجیب عجیب کام کر کے دکھلا دیتے ہیں تو چاہیے یہ سب بھی بزرگ ہو جائیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس سے خرق عادت صادر ہو وہ بزرگ ہے اگر یہی حال ہے تو خرق عادت دجال سے زیادہ کسی سے بھی صادر نہ ہوگی۔ زمین کے خزانے تک نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چلیں گے ایک صالح شخص اس کی خدائی کا انکار کرے گا۔ پس وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ پھر اس کو زندہ کرے گا وہ پھر انکار کرے گا مگر وہ پھر اس پر قادر نہ ہوگا۔ اگر تصرفات اور خوارق دلیل بزرگی کی ہیں تو دجال بڑا بزرگ ہونا چاہئے۔ پس یہ سب معیار تو غلط ہیں۔

شیخ کامل کا معیار

شیخ کامل کے معیار کی چند صفات ہیں ان صفات کو سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔

ایک یہ کہ بقدر ضرورت اس کو علم دین حاصل ہو۔ جاہل محض نہ ہو۔ دوسرے اس کو علماء سے موانست ہو نفرت نہ ہو۔ اگر پیر جاہل ہے اور اس کو علماء سے نفرت ہے تو جب اسے مسائل کی ضرورت ہوگی، تو اپنی رائے پر عمل کرے گا اور گمراہ ہوگا۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ عامل ہو شریعت پر متبع سنت ہو، شریعت کے خلاف عمداً نہ کرتا ہو کیونکہ جو شخص کو صحیح تعلیم پر قادر ہو خود عمل نہ کرتا ہو تو اس کی تعلیم میں برکت نہ ہوگی۔

چوتھے یہ کہ کسی شیخ مسلم عندالعلماء سے مجاز بھی ہو۔

پانچویں یہ کہ اس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ روز بروز دنیا سے دل افسردہ ہوتا جاتا ہو اور آخرت کی رغبت بڑھتی جاتی ہو۔

مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

کار مردان روشنی و گرمی ست　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

اور مکار پیروں کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

تو یہ منصب بھی بہت بڑا ہے اس میں بھی وہی تفصیل ہے کہ کسی شیخ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہو اب تو پیری بھی ایک رسم ہو گئی ہے وہ یہ کہ کسی خاندان میں کوئی ان کے بڑے پیر ہو گئے۔ بس

ان کی نسل میں پیری چل پڑی۔ جب ان میں کسی کو صاحب سجادہ بناتے ہیں تو سب لوگ جمع ہو کر ان کے سر پر پگڑی باندھتے ہیں۔ گویا یہ مرید لوگ پیر کو پیر بناتے ہیں۔ (کیونکہ پیر کی نسل تو خود پیر ہوتی ہے پھر ان کے سر پر پیری کی پگڑی باندھی تو اور زیادہ پیر ہو گئے) پھر ان میں جو اہل ہوتے ہیں وہ تو کسی شیخ کامل کی طرف بغرض اصلاح رجوع کر لیتے ہیں ورنہ دو کا ندار تو ہیں ہی۔

چنانچہ گنگوہ میں ایک پیرزادہ تھے انہوں نے اپنی بی بی کو مجھ سے بیعت کرایا کسی نے ان سے کہا کہ تم تو خود پیر ہو خود کیوں نہ بیعت کر لیا انہوں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہم تو اس کے پیر ہیں (یعنی کھانے کمانے کے پیر ہیں) ہم کہاں سے پیر ہوئے تھے تو بعضے ایسے منصف مزاج بھی ہیں مگر شاذ۔

غرض حضرت یہ بہت ہی بڑا منصب تھا مگر اس منصب کی اب یہ درگت ہو رہی ہے کہ عوام الناس اس کی دستار بندی کرتے ہیں جب دستار بندی ہو گئی اور بڑے ہو گئے مگر ہیں جاہل تو اب ان کو تعلیم حاصل کرنے اور کسی کامل کی طرف رجوع کرنے سے عار آتی ہے کیونکہ بڑا ہو کر چھوٹا نہیں ہوا جاتا ایسے پیر قابل اس کے ہیں کہ ان کو خیر خواہی سے یہ خطاب کیا جاوے۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی   تا راہ بیں نہ باشی کے راہبر شوی
در مکتب حقائق پیش ادیب عشق   ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر تا کہ صاحب خبر ہو جب تک راہ صحیح دیکھنے والا نہیں بنے گا راہبر کیسے بنے گا۔ حقائق و عارف کے مدرسہ میں ادیب عشق کے سامنے کوشش کر کہ اے لڑکے ایک روز تو خود پدر بن جائے گا)

باقی بدوں شرائط کے محض اپنی رائے سے پیر بن جانا خود رائی ہے اور سلوک میں خود رائی وہ چیز ہے جس کی بابت کہتے ہیں۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست   کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی فکر اور رائے کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

دیکھئے عارف شیرازی ایسے لوگوں کو کافر کہتے ہیں یعنی کافر طریقت۔ بس ایسے مشائخ جو حقیقت میں خود رائے ہیں وہ خود رو پیر ہیں حقیقی پیر نہیں۔ ایسے پیروں کی علمی تحقیقات دیکھئے تو قابل دید ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر والضحیٰ کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ اے نفس تیری یہی سجا (سزا) ایک مسئلہ وحدۃ الوجود کا ان کو مشق کیلئے مل گیا اس کا وہ ناس مارا ہے کہ خدا کی پناہ۔ وحدۃ الوجود جو حق کے موافق ہے اس میں تو کلام نہیں۔ باقی یہ لوگ جو اس کے متعلق

تحقیقات بیان کرتے ہیں باطل ہونے کے ساتھ مضحکہ آمیز بھی ہیں۔

ایک ایسے ہی پیر کہتے ہیں کہ وحدۃ الوجود قل یا سے ثابت ہے کسی نے کہا کہ قل یا سے کیسے ثابت ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ دیکھو قل یاایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیں کہ جس کی تم عبادت کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کرتا) اس میں لا زائد ہے۔ یعنی اعبد ما تعبدون ہے مطلب یہ ہے کہ اے کافرو! میں بھی اسی چیز کی عبادت کرتا ہوں تو دونوں کے معبود یعنی بت اور خدا تعالیٰ نعوذ باللہ ایک ہوئے۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ دلیل کیا ہے لا کے زائد ہونے کی سو وہ دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک دفعہ نماز میں قل یا پڑھی تھی تو لا چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے اس ترک سے قصداً اس بات کو ظاہر کردیا کہ لا زائد ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ حالت سکر میں ترک ہوگیا تھا۔ اس کا جواب یہ عطا ہوا تھا کہ برائے نام شراب پی لی تھی تاکہ خشک مولویوں کے فتویٰ سے بچ جاؤں اور سکر وغیرہ کچھ نہ تھا۔ خدا کی پناہ پھر ان خرافات کو فقیری کے نکات سمجھتے ہیں۔

نکات پر یاد آیا ہمارے یہاں ایک رئیس تھے قاضی امیر احمد وہ کہتے تھے کہ میں ایک دفعہ پیران کلیر میں موجود تھا ان کو دو درویشوں نے پکارا او مرغے ادھر آ ان کو خیال بھی نہ ہوا کہ مجھ کو کوئی پکارتا ہوگا۔ پھر پکارا او مرغے ادھر آ اس پر انہوں نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ آخر یہ کس کو کہہ رہے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ ابے ہم تجھ ہی کو تو بلا رہے ہیں۔ ان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کرکے تماشا دیکھنے چلے گئے کہ دیکھوں کیا بات ہے جب ان کے پاس پہنچے تو کہا بیٹھ جا دیکھ مرشد کا نکتہ سن کہنے لگے کہ جب خدا نے بندوں سے احکام کا اقرار لیا تھا تو درویش تھے اگلی صف میں اور مولوی تھے پیچھے کی صف میں۔ خدا نے (نعوذ باللہ) بھنگ بوزہ کا حکم فرمایا تھا چونکہ مولوی دور تھے بھنگ بوزہ کا نماز روزہ سن لیا اور درویشوں نے بھنگ بوزہ ہی سنا اس لئے ہم اس میں مشغول ہوگئے۔ اور وہ اس میں مشغول ہوگئے اس کے بعد کہا کہ جا مرشدوں کا یہ نکتہ یاد رکھنا۔ بھولنا مت۔

ایک اور قصہ ہے ایک درویش نے مولوی فیض الحسن صاحب سے کہا کہ مولوی بتلا چار میم کون سے ہیں۔ وہ اس مہمل بات کو سن کر خاموش ہوگئے بقول شخصے کہ

جواب جاہلاں باشد خموشی (جاہلوں کا جواب خاموشی ہے)

درویش نے کہا کہ تمہیں بتلاتا تو چوغہ مولویت کا اتار کر رکھ اور اس کو فقیر سے سن کہ چار میم کون

سے ہیں۔ مولا محمدؐ مکہ مدینہ یہ ہیں چار میم اور اس نکتہ کو یاد رکھ۔ بھولیو مت!

ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ ایک فقیر نے ان سے کہا بتلا! محمدؐ کا مرتبہ بڑا ہے یا رزق کا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے اس پر انہوں نے کہا کہ بے پیرا معلوم ہوتا ہے اور سونٹا سر پر گھما کر (جیسے ان لوگوں کی عادت ہے) کہنے لگا دیکھ اذان میں ہے **اشهد ان محمداً رسول الله** (میں گواہی دیتا ہوں کہ بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) اس میں ان پہلے ہے اور محمدؐ بعد میں۔ ان رزق کو کہتے ہیں اس لئے رزق کا مرتبہ بڑا ہے۔

یہ تصوف کے محققین ہیں ایسے ہی لوگوں نے ناس کر رکھا ہے لوگوں کا بس یہ عوام الناس کا دیا ہوا منصب ہے کہ چند جاہل باہم جمع ہو گئے اور کسی کو پیر بنا لیا ظاہر ہے کہ اس سے تو ایسے ہی جاہل پیر پیدا ہوں گے۔ حقیقی پیر اس طرح تھوڑا ہی بنتا ہے میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ واعظ اور پیر خود بننا جائز نہیں۔ بلکہ کسی محقق کے امر و اذن کے بعد اس منصب کو قبول کرنا جائز ہے۔

طلب منصب کی صورت

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ حکومت کی خود درخواست کرنا جائز نہیں بلکہ اسلامی قانون تو یہ ہے کہ **طالب التولية لا يولى** جو خود حکومت کی درخواست کرے اس کو حاکم نہ بنایا جائے۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ جب اصل قانون یہ ہے کہ خود حکومت کی درخواست کرنا درست نہیں اور ہر شخص اس پر عمل کر کے کوئی بھی رخواست نہ کرے اور جو درخواست کرے وہ حاکم نہ بنایا جاوے اور دوسروں کو اس کی اہلیت وصلاحیت کی اطلاع نہ ہو تو پھر دنیا کا انتظام کس طرح ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک استثناء ہے وہ یہ کہ اگر کوئی کام ضروری ہو اور کوئی اہل موجود نہ ہو اور ظاہراً یہ شخص اس کا اہل ہے اور اس کو امید ہے کہ میں کام کر سکتا ہوں ایسے شخص کو درخواست کرنا درست ہے۔ دلیل اس کی حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے ان سے کہا تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظام کون سر دھرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں کر سکتا ہوں چنانچہ ان کا مقولہ یہ ہے کہ۔

اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم یعنی مجھ کو ملک کے غلہ کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں اس کی خوب نگرانی کروں گا۔ میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں لاؤ حکومت مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں۔ اس لئے آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا ورنہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی بلکہ آپ نے اظہار نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرما دیئے تا کہ بادشاہ کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ ہاں یہ کام آپ خوب کر سکتے ہیں۔ آپ کو بھروسا تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کر سکتا ہوں اس لئے آپ نے خود درخواست کی پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت پہنچا سکتا ہوں اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت و انتظام کر سکتا ہوں اور اس کو مال و جاہ کی بالکل پرواہ نہ ہو تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے۔ اور ہمارے نزدیک عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی سلطنت کے لئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے تھا یا یہ صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی بری گت بنائی جائے گی تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔ دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔

یہ اور بات ہے کہ مال و جاہ از خود حاصل ہو جائے مگر مقصود نہیں لیکن اب تو یہ کیفیت ہے کہ مال و جاہ ہی مقصود ہو گئے ہیں۔ حق و ناحق سے بھی کچھ بحث نہیں رہی نہ اہلیت و عدم اہلیت سے۔

چنانچہ ایک حکایت ہے کہ ایک جاہل بدلیاقت آنریری مجسٹریٹ ہو گئے تھے بوجہ عدم لیاقت کے حیران تھے کہ فیصلے کیسے کروں گا۔ فیصلہ کا طریقہ دیکھنے کسی حاکم کے اجلاس میں پہنچے اور اتفاقاً اس حاکم کے پاس دو شخصوں نے اپنی اپنی عرضیاں پیش کیں۔ حاکم نے ایک کو کہہ دیا منظور اور دوسری کو کہا نامنظور۔ آپ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ جب یہ اپنے اجلاس میں بیٹھے بہت سی عرضیاں پیش ہوئیں آپ نے کیا کیا کہ ایک کو منظور اور ایک کو نامنظور کرنا شروع کر دیا طاق سلسلہ میں تو منظور اور جفت میں نامنظور۔ بعض لوگ قیاسی فیصلہ کر دیتے ہیں جیسے بعضے مدرس کیا کرتے ہیں کسی طالب علم کا خط اچھا دیکھ لیا بس اور باتوں میں بھی اس کو پاس کر دیا اس میں بڑی خیانت ہوتی ہے حضرت ساری خرابی اس کی ہے کہ کام نااہلوں کو سونپ دیا گیا ہے اگر کوئی کام کسی کے سپرد کیا جاوے تو اس کی لیاقت اس کو ہونا چاہئے۔

حضورؐ کی بدنی قوت

حکومت میں بڑی مشقت اور دلسوزی کرنی پڑتی ہے یہ آسان کام نہیں ہے۔ حاکم اگر قصد کرے مخلوق کی نفع رسانی کا تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے تمام کاموں میں مدد ہوتی ہے مگر دلسوزی کی ضرورت ہے میں تجربہ کی بناء پر کہتا ہوں مشائخ کو بھی اطباء کو بھی عہدہ داروں کو بھی کہ دوسروں کو وہی شخص راحت پہنچا سکتا ہے جو اپنے اوپر تکلیف اٹھائے اور جو شخص خود آرام طلب ہوگا وہ شخص دوسروں کو آرام نہیں پہنچا سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون محبوب ہوگا آپ کے ساتھ صحابہؓ کی یہ جان نثاری تھی کہ جہاں آپ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو تیار تھے۔ آپؐ کی ذرا سی تکلیف بھی ان کو گوارا نہ تھی مگر بایں ہمہ آپ کو دوسروں کی راحت رسانی کی کتنی فکر رہتی تھی اس کو احادیث سے معلوم کرو۔

ایک دفعہ سفر میں اونٹ کم تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب باری باری اترتے چڑھتے چلو۔ اور سب سے پہلے اس قانون پر حضورؐ نے عمل کیا ہر چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ آپؐ نہ اتریں مگر حضورؐ نے نہ مانا اور فرمایا کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور میں تم سے زیادہ ثواب سے مستغنی نہیں۔ ثواب کی حاجت مجھ کو بھی ہے (کہ پیادہ چلوں اور ثواب ملے) اور میں کچھ کمزور نہیں کہ چل نہ سکوں۔

آپ کے قویٰ ظاہری بھی سب سے اچھے تھے آپؐ میں تو سب ہی کمال کی صفتیں تھیں۔ آپ کی تو شان یہ تھی۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری   آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسن یوسف علیہ السلامؑ دم عیسیٰ علیہ السلام اور ید بیضا رکھتے ہیں جو تمام اوصاف انبیاء رکھتے ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی قوت کا یہ حال تھا کہ عرب میں ایک پہلوان تھا رکانہ نامی جو کہ ایک ہزار آدمیوں کا مقابل سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت اس نے کہا کہ میں ایک شرط سے مسلمان ہوتا ہوں کہ آپ مجھ کو کشتی میں پچھاڑ دیں۔ بھلا کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کہاں کشتی! آپؐ نے کشتی کی کہاں تعلیم پائی تھی مگر آپؐ نے فرمایا اچھا چنانچہ کشتی ہوئی اور آپؐ اس پر غالب آئے۔ اس نے کہا ایک دفعہ نہیں بلکہ دوبارہ پھر کشتی ہو اگر یہ پچھاڑنا اتفاقاً ہوتا تو حضورؐ دوبارہ ہرگز منظور نہ فرماتے مگر دوبارہ پھر کشتی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دفعہ بھی اس پر غالب آئے وہ مسلمان ہوگئے اور سمجھ گئے کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مؤید من اللہ ہیں۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بدنی قوت بھی بہت تھی۔ اس لئے آپ ؐ نے فرمایا میں کمزور نہیں پیادہ چلوں گا۔ غرض آپ ؐ دوسروں کی راحت کے لئے خود تکلیف برداشت فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں یہی رنگ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تھا۔

دیکھئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ شریف پہنچے تو آپ ؐ جس وقت مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ بھی خدمت میں حاضر تھے لوگ زیارت کو آتے تھے چونکہ حضرت ابوبکر ؓ ذرا زیادہ بوڑھے معلوم ہوتے تھے لوگوں کو حضرت صدیق ؓ کی صورت دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ حضور ؐ یہ ہوں گے۔ اس لئے ان سے مصافحہ کرتے رہے اور حضرت صدیق ؓ نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ سے نہیں بلکہ حضور ؐ سے مصافحہ کرو۔ کیونکہ اس سے حضور ﷺ کی راحت میں خلل پڑتا۔ جب ذرا آفتاب بلند ہوا اور دھوپ آئی تو صدیق اکبر ؓ چادر تان کر آپ پر سایہ کرنے کی غرض سے کھڑے ہو گئے اس وقت لوگوں کو پتہ چلا کہ حضور ﷺ آپ ہیں۔ دیکھئے ابوبکر ؓ نے آپ ﷺ کو مصافحہ کی بھی تکلیف نہیں ہونے دی مصافحہ کی تکلیف کو خود گوارا کر لیا۔ یہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا غایت ادب تھا کہ آپ وقایہ ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ ﷺ کو تکلیف نہ پہنچے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خود پیدل چلے اور فرمایا کہ میں قوت میں کم نہیں پھر کیوں نہ پیادہ چلوں کہ ثواب ملے۔ غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے کو اتنا محتاج بنانا چاہتے ہیں خدا تعالیٰ کا (کہ ذرا ذرا سے ثواب کے طالب ہیں) مگر بعض لوگوں کی آج کل یہ حالت ہے کہ آپ ﷺ کو خدائی کے رتبہ تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ آپ ؐ کے لئے وہ اوصاف ثابت کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خاص اوصاف ہیں (مثلاً علم غیب محیط کو آپ ؐ کے لئے ثابت کرتے ہیں)

حضور اکرم ﷺ کا اصلی مذاق

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق نہیں دیکھتے کہ میں خدا تعالیٰ کا محتاج رہوں اور مجھے ثواب ملا کرے حضرت عاشق کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس کو کسی حالت پر بس نہیں ہوتی اس کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے۔

دلارام در بر دلارام جوئے   لب از تشنگی خشک و بر طرف جوئے
نگویم کہ بر آب قادر نیند   کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ حضور ؐ ثواب کے طالب ہوئے خدا کے طالب نہ ہوئے اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جس چیز کو مطلوب قرار دے دیں گے عاشق کو اس

کی بھی طلب ہوگی اور وہ خدا ہی کی طلب ہے اور اس لئے اس کو ان چیزوں کی رغبت کرنا بھی لازم ہے چنانچہ ارشاد ہے **وفی ذلک فلیتنا فس المتنافسون** (اور حرص کرنیوالوں کو ایسی چیز کی بہت حرص کرنا چاہئے) عشاق کا یہی مذہب ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں
(جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثواب حاصل کرنے کے لئے پیدل چلتے ہیں تو اب کون شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہو مگر آج کل لوگ اپنے کو بڑا بنانا چاہتے ہیں اور یہی دلیل ہے کہ بڑے بننے کے لائق نہیں اور اسی پر متفرع ہوتا ہے کہ منصب حکومت ہر شخص کے مناسب نہیں بلکہ اس شخص کے لئے جائز ہے کہ اپنے کو تکلیف اور دوسروں کو راحت دینا چاہتا ہو۔

جاہ طلبی

بہر حال جاہ کی دو قسمیں ہوئیں ایک یہ کہ دوسرے کی جانب سے حاصل ہو خواہ من جانب المخلوق ہو یا من جانب الخالق اور دوسری قسم یہ ہے کہ اپنی جانب سے ہو پس جو اپنی جانب سے ہو اس طرح کہ اس کے ذرائع خود بہم پہنچائے جائیں وہ بجز خاص حالات کے ناجائز ہے مگر آج یہ کیفیت ہے کہ عوام الناس سے ممبری وغیرہ کی درخواست کی جاتی ہے کہ ہمارے واسطے پرچہ دینا پرچوں کے واسطے تیری میری خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کے لئے مال بھی خرچ کرتے ہیں رشوتیں دیتے ہیں خوب سمجھ لو کہ اس میں برکت نہیں ہوتی اور خدا کی مدد بھی نہیں ہوتی البتہ اگر کسی کو بلا طلب کوئی عہدہ مل جائے تو اس کو خدا کی مدد ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو قضا کا عہدہ ملتا تھا مگر آپ نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ جیل خانہ میں بھیجے گئے۔ دیکھئے آپ کو اس قدر نفرت تھی قضا سے اور عجیب لطیفہ یہ ہوا کہ خلیفہ جعفر بن منظور نے اس جبر حاکمانہ کے ساتھ آپ سے عالمانہ مباحثہ بھی کیا۔ اس طرح سے کہ جب آپ سے منصب قضا قبول کرنے کے لئے کہا گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اس لائق نہیں ہوں بادشاہ نے کہا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو جھوٹ بولنے والا بھی حکومت کے لائق نہیں ہوتا تمام دربار میں اس جواب سے سناٹا ہو گیا اور کسی سے جواب نہ بن پڑا۔

صاحبو! ہمارے سلف تو اتنا ڈرتے تھے قضا اور حکومت سے مگر آج اس کی درخواست کی جاتی ہے اور اس کے لئے ذرائع پیدا کئے جاتے ہیں کہیں سفارش کرائی جاتی ہے کہیں دباؤ ڈالا جاتا ہے سو

ان ذرائع کا استعمال جائز نہیں ہاں اگر من جانب اللہ مل جاوے تو خیر مگر بے عزتی کیوں اختیار کی جائے۔ (وہ یہ کہ لوگوں کی خوشامد کی جاوے اور مال خرچ کیا جاوے سو بکھیڑے کئے جائیں) اس وقت تو یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک شخص کا نمبر بھی مقدم ہے اور وہ غریب حاجت مند بھی ہے مگر پھر بھی دوسرا شخص اس کے مقابلہ میں عہدہ کے لئے درخواست کرتا ہے حالانکہ قابلیت میں بھی اس کے برابر نہیں اور نہ غریب محتاج ہے مگر پھر یوں ہیں کہ عہدہ ہم کو ہی ملنا چاہیے کیونکہ ہم زمیندار ہیں اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں حالانکہ یہی وجہ دوسرے کے استحقاق اور اس کے عدم استحقاق کی تھی۔

جو لوگ آج کل ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں کیا وہ اس کی کوئی نظیر پیش کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی درخواست کو اپنے بھائی کے مقابلہ میں منسوخ کرا دیا ہو اور ایثار اور ہمدردی سے کام لیا ہو۔ غالباً وہ ایسی ایک نظیر بھی پیش نہیں کر سکتے وجہ اس کی صرف یہی ہے کہ ان کو صرف مال و جاہ مقصود ہے اور کچھ نہیں زبان پر ہمدردی کے الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ حقیقت کچھ نہیں آج کل ہمدردی کیا ہمہ دردی ہے۔ جس میں خلوص کا پتہ ہی نہیں۔

حضرت علی خواص ؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی جگہ کوئی عالم ہو اور دین کا کام کر رہا ہو اور سمجھتا ہو کہ میں یہ کام ثواب کے لئے کر رہا ہوں یا کوئی پیر ہو اور وہ تربیت باطنی کر رہا ہو اور دل میں یہ سمجھتا ہو کہ میں دین کے لئے یہ کام کر رہا ہوں۔ ان دونوں کو ایک علامت سے اپنے خلوص کا امتحان کرنا چاہیے وہ علامت یہ ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص آ جاوے اور وہ بھی اس جیسا یا اس سے اچھا کام کر سکتا ہو تو دیکھنا چاہئے کہ یہ شخص کام کو اس کے سپرد کرتا ہے یا نہیں اگر اس کے سپرد کر دے اور خود اس کام سے الگ ہو جائے اور کسی دوسرے کام میں لگ جاوے تو وہ مخلص ہے اور اگر اسی فکر میں ہو کہ یہ کہاں سے آ مرا نکلواؤ اس کو تو مخلص نہیں ریاکار ہے۔

اسی طرح جاہ و مال کے مقصود نہ ہونے بلکہ خدمت خلق مقصود ہونے کی علامت یہ ہے کہ اگر یہ دیکھو کہ ہمارا بھائی ہم سے اچھا کام کرے گا تو تم کوشش چھوڑ دو تا کہ وہ دوسرا شخص اس منصب پر فائز ہو جائے دوسرے کو بنانا یہ ہے کہ خود اس کام سے الگ ہو جاؤ اور جو شخص ایسا ہوگا وہ اپنی میعاد ملازمت بڑھانے کے لئے یا عہدہ حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کیوں حاصل کرے گا مگر آج کل تو اس حکومت اور منصب کے لئے روپیہ خرچ کر کر کے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ حاصل کئے جاتے ہیں یہ صاف علامت ہے اس کی کہ خدمت خلق مقصود نہیں بلکہ جاہ و مال مقصود ہے یہاں تک تو جاہ کے حاصل کرنے کی تفصیل تھی۔

جاہ کا مصرف

اب باقی رہا جاہ کے صرف اور استعمال کرنے کا قاعدہ کہ جاہ کہاں صرف کی جاتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ صرف جاہ کے مواقع مختلف ہیں اور ہر ایک کا جدا حکم ہے اور اس کے متعلق شرعی قاعدہ یہ ہے کہ جہاں استعمال جاہ سے دوسرے شخص کی منفعت مقصود ہو یعنی جس دوسرے پر جاہ کا اثر ڈالا جا رہا ہو اور اس منفعت کی تحصیل اور اس شخص پر واجب ہے تو اس صورت میں جاہ سے کام لینا جائز بلکہ واجب ہے۔ مثلاً ایک شخص نماز نہیں پڑھتا اور ہم اپنی جاہ کے اثر سے اس کو نماز پڑھنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو اس موقع پر صرف جاہ واجب ہے حاکم اپنے ملازموں سے بادشاہ اپنی رعایا سے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ استاد شاگردوں سے، شوہر بیوی سے، باپ اولاد سے حکومت کے ساتھ یہ کام لے سکتا ہے تو ان لوگوں پر واجب ہوگا کہ اپنی جاہ سے کام لیں اور ماتحتوں سے نماز پڑھوائیں۔

ایک صورت اس کے مقابل یہ ہے کہ استعمال جاہ سے دوسرے کی مصلحت مقصود نہیں بلکہ اپنی ہی منفعت مقصود ہے اس صورت میں جاہ سے کام لینا جائز نہیں جیسے رئیسوں کی عادت ہوتی ہے کہ ریل پر جانے کو تانگہ منگایا اب اس سے اجرت طے نہیں کرتے ویسے ہی تانگہ میں سوار ہو لیتے ہیں اسٹیشن پر پہنچ کر ایک آنہ دو آنہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ وہ غریب ان کی جاہ کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا یہ صورت حرام ہے بلکہ یا تو ابتداء میں اجرت طے کر دیا عرف عام کے موافق اس کو پوری اجرت دو۔

اسی قبیل کی ایک صورت یہ ہے کہ تحصیلدار صاحب تھانیدار صاحب کسی جگہ پہنچے اور لوگوں نے ان کے واسطے سواری خود ہی پیش کر دی ظاہر میں یہ ہدیہ کی صورت ہے مگر حدیث میں حکام کو رعایا سے ہدایا لینے کی ممانعت ہے اور شریعت کا فتویٰ ہے **هدايا الامراء غلول**[1] ہاں اگر کسی کا تعلق آپ کے ساتھ پہلے سے دوستی یا قرابت کا ہو کہ وہ پہلے بھی آپ کو ہدیہ دیا کرتا ہو تو ایسے شخص کا ہدیہ لینا حکومت کے بعد بھی جائز ہے کیونکہ اس صورت میں یہ ہدیہ جاہ سے نہیں آیا بلکہ چاہ سے یعنی محبت سے آیا ہے غرض شریعت نے صاحب جاہ کو زور ڈالنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں خوش دلی سے محبت سے کوئی ان کی خدمت کرے تو اس کا مضائقہ نہیں مگر محبت اور خوش دلی کو پہچاننے کی سخت ضرورت ہے کہ حکام سے محبت لوگوں کو کم ہوتی ہے خوف اور غرض کا تعلق زیادہ ہے۔ اس لئے حکام کو سخت احتیاط کی ضرورت ہے اور ان ہی حکام میں میانجی لوگ بھی داخل ہیں جو اپنے اثر کو بے جا محل میں صرف کرتے ہیں یہ

---

[1] السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰: ۱۳۸ کتاب التمہید ۲: ۱۰۹، ۱۲ مجمع الزوائد ۴: ۱۵۱

لوگ خوب کان کھول کر سن لیں کہ شاگردوں سے ہر قسم کی خدمت لینا ان کو جائز نہیں۔

مثلاً شاگردوں سے کہتے ہیں کہ ذرا پانی پلا دینا' ذرا پنکھا جھل دینا بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت سخت کام شاگردوں سے لیتے ہیں اور مقصود محض استخدام ہوتا ہے بھلا یہ لوگ کس معاوضہ میں شاگردوں سے کام لیتے ہیں۔ کیا پانی پلانے کے عوض میں ان کو شاگرد بنایا تھا۔ ان صورتوں میں بھی ایسے شخص سے کام لیا گیا ہے' جس سے کام لینا جائز نہیں ہاں مصلحت تادیب سے جائز ہے' بشرطیکہ غرض بھی تادیب ہو نہ کہ اپنے آپ کو راحت پہنچانا بلکہ مقصود یہ ہو کہ شاگرد کو کام کا سلیقہ آ جاوے اور اس کے لئے بھی ولی سے اجازت لینا شرط ہے اور ولی کے واسطے یہ قانون ہے کہ جس میں اس شاگرد کی مصلحت ہو اس کی اجازت دینا ولی کو جائز ہے جب ایسی صورت ہو تو بے شک استاد کو شاگرد سے کام لینا جائز ہے نہ یہ کہ اپنی راحت کے لئے ٹھنڈی ہوا پنکھے سے کرا رہے ہیں۔ اس بیچارہ کو کئی کئی گھنٹے پنکھا جھلتے (چلاتے) ہو جاتے ہیں نہ پڑھتے ہیں نہ یاد کرتے ہیں۔ گھنٹوں ان سے پاؤں دبواتے ہیں بڑی بڑی خدمتیں لیتے ہیں۔ ایسا تصرف کرنے کا تو خود ولی کو بھی اختیار نہیں۔ پھر جس کو ولی سے اجات لینے کی بھی ضرورت ہو اس کو تو ایسا تصرف کرنا کب جائز ہوگا۔ بس استاد تو آج کل بچوں کو اپنی ملک سمجھتے ہیں جیسے عام جہلاء یوں کہتے ہیں کہ جان خدا کی اور ہڈیاں ماں باپ کی اور گوشت استاد کا۔ خوب سمجھ لو کہ استاد کو شاگرد پر حق ملک نہیں ہے بلکہ اس کے لئے شریعت میں خاص حدود ہیں۔

میاں جی لوگوں کی یہ حالت ہے کہ بی بی پر تو خفا ہو کر آئے اور بچوں پر غصہ نکالا اور قمچی بجانی شروع کر دی ایسے ظالموں کو شاگرد بھی ایسے ہی مل جاتے ہیں۔ جو در حقیقت ان کی عقوبت ہیں چنانچہ ان میں بعض طلباء تو وہ ہیں جن میں ادب ہی نہیں ہوتا استادوں کا جیسے تعلیم جدید کے طلباء ہیں کہ وہ استاد کو استاد ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسکول کا نوکر سمجھتے ہیں اور بعض شریر لڑکے ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں تو ادب کرتے ہیں مگر دل سے ادب نہیں کرتے اور بعض استادوں سے خیانت بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ لوہاری میں ایک میانجی تھے لڑکے ان کی چیزیں چرا کر کھا جاتے ان کے پاس کسی جگہ سے بہت سے بتاشے آئے تھے۔ انہوں نے لڑکوں سے بچانے کے لئے ایک بدھنے میں ان کو بھر کر اوپر سے چپنی ڈھانک کر تالا لگا دیا لڑکوں نے کمیٹی کی کہ کسی طرح بتاشے کھانے چاہئیں۔ مگر اس میں حیران تھے کہ کیا تدبیر کریں کیونکہ لوٹے کے منہ کو تالا لگا ہوا ہے آخر یہ رائے ہوئی کہ اس میں ٹونٹی سے پانی بھر کر شربت بنا کر پی جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا کئی روز کے بعد میانجی صاحب کا بتاشے کھانے

کو جی چاہا بدھنی منگوا کر جو کھولی بالکل میدان صاف سوا سیوں کو ایسے ہی مل جاتے ہیں۔

غرض یہ میانجی لوگ بہت ہی ظلم کرتے ہیں بچوں پر حالانکہ ظلم کرنا کسی پر بھی ہو حرام ہے خاص کو عاجز بچوں پر اگرچہ باپ بھی اجازت دے دے۔ پھر غضب یہ کہ قصور تو ہو کسی کا اور ایک طرف سے سب کو گھڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ غصہ میں ان کو خبر نہیں رہتی کہ کون قصوروار ہے اور کون بے قصور ہے کوئی مقدمہ ہوتا ہے تو بلا تحقیق سب کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں اور مارتے اس قدر ہیں جس کی انتہا نہیں ہے۔

حکام اور میاں جی کے لئے دستور العمل

میں عہدہ داروں کو بھی اور میاں جی کو بھی ظلم سے بچنے کا ایک دستور العمل بتلاتا ہوں وہ یہ کہ غصہ میں کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ کیا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہی سکھلایا ہے۔

لایقضی القاضی و ھو غضبان[1] (کہ قاضی کو چاہیے کہ غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے)

میاں جی وغیرہ کو بھی چاہیے کہ غصہ میں نہ ماریں جب غصہ آئے تو خاموش ہو جائیں جب غصہ اتر جائے تو غور کریں کہ کتنی سزا دینی چاہیے اور ہر جرم پر چھڑیا قمچیوں کا عدد مقرر کر لیں یہ نہیں کہ بے طرح مارنا شروع کر دیا خواہ ہاتھ ٹوٹے یا ٹانگ کہ جو شخص اس دستور العمل کا لحاظ رکھے گا اس کے ہاتھ سے ظلم نہ ہوگا۔

اب رئیسوں کی کیفیت سنئے کہ ذرا ملازم نے تین پانچ کی اور ان کو غصہ آیا اور لگے اس پر بے بھاؤ جوتے پڑنے بلکہ ملازم تک بھی محدود نہیں ہے۔ بے تعلق لوگوں پر بھی ظلم سے نہیں رکتے۔

ہمارے یہاں کا قصہ ہے ایک شخص رئیس تھے اور بڑے متکبر ایک غریب قوم کے آدمی ہمارے حضرت حاجی صاحب کے مریدان کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آرہے تھے۔ وہ رئیس صاحب بھی راستہ میں بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر بہت ہی ناگوار ہوا کہ اس نے بھی ہمارے جیسے صاف کپڑے پہنے ہیں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ معلوم ہوا کہ قصائی ہے اور حاجی صاحب کا مرید ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے ہی اس کا دماغ خراب کیا ہے بڑے ولی ہو گئے بس اس غریب کو پاس بلا کر پانچ جوتے لگائے اس بیچارے نے کہا کہ شیخ جی خدا کے یہاں جا کر اس کا مزہ چکھو گے۔ یہ بات سن کر آپ کو اور مسخرہ پن سوجھا کہ آپ نے اس کے سامنے جوتا رکھ دیا کہ تو اب میرے مار لے۔ اس نے کہا' میری کیا مجال ہے جو ایسی گستاخی کروں تو آپ کیا کہتے ہیں کہ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہمیں خدا تعالیٰ کا ہی حکم ہے کہ تمہارے جوتے لگائیں جس کی دلیل یہ

---

[1] سنن النسائی' آداب القضاء ب. ۳۱' سنن ابن ماجہ : ۲۳۱۶، کنز العمال: ۱۵۰۳۰

ہے کہ ہم نے تو بلا اجازت بھی تم کو مار لیا اور تم اجازت سے بھی ہم کو نہیں مار سکے اور تمہیں حکم نہیں۔

پھر اس ظلم کا سبب کیا تھا صرف تکبر یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کہ یہ قصائی ہے اور ہم شیخ ہیں میں کہتا ہوں کہ سب خدا تعالیٰ کے بندے ہیں خواہ قصائی ہوں یا اور کوئی ہو ان باتوں کے انسداد کا طریقہ یہی ہے کہ بے وجہ کسی پر غصہ مت کرو اور غصہ میں فیصلہ مت کرو۔

نسب اور فخر

نسب پر یا منصب پر فخر کرنا چھوڑ دو آخرت میں اس کو کون پوچھتا ہے خوب فرماتے ہیں۔ حضرت علیؓ

الناس من جهة التمثال اکفاء ابوهم آدم والام حواء

(لوگوں کیلئے یہ مثال کافی ہے کہ انکے والد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور اماں حضرت حوا علیہا السلام) جس کی نسبت فرماتے ہیں۔

مالفضل الا لا هل العلم انهم علی الهدی لمن استهدی ادلاء

(فضیلت سوائے اہل علم کے کسی کو نہیں جو ہدایت پر ہیں اور جو ہدایت طلب کرے)

ہاں شرافت نسبی بھی خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اگر کوئی شریف النسب ہو تو خدا تعالیٰ کا شکر کرے۔ نہ یہ کہ جس کے پاس نعمت نہیں اس پر ظلم کرے بلکہ اس نعمت کے شکر میں تو چھوٹوں کے ساتھ احسان کیا کرو۔

ایک رئیس صاحب تھے ان کا برتاؤ چھوٹوں کے ساتھ دیکھئے کہ ایک بھنگن ان کے گھر کمانے آئی بچی کو ایک جگہ بٹھلا کر کام میں لگ گئی بچی رونے لگی تو انہوں نے بے تکلف اس کو گود میں اٹھا لیا حالانکہ بھنگن کی بچی تھی جو لوگ واقعی شریف ہیں ان میں شرافت سے تواضع پیدا ہوتی ہے غرور پیدا نہیں ہوتا یہ سب صورتیں تھیں جاہ کے استعمال کی۔

ان ہی میں ایک صورت جاہ سے کام لینے کی چندہ کے بارہ میں اثر سے کام لینا بھی ہے اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس پر ہم زور ڈال رہے ہیں اس پر شرعاً انفاق واجب ہے۔ مثلاً ایک شخص کے ذمہ زکوٰۃ ہے اور ہم اس پر اثر ڈال سکتے ہیں تو ہمارے ذمہ واجب ہے کہ اس پر ایسا اثر ڈالیں کہ زکوٰۃ ادا کرے مگر یہ زور ڈالنا حرام ہے کہ فلاں مدرسہ میں یا فلاں انجمن ہی میں دو۔

ایک صورت یہ ہے کہ جس پر ہم چندہ کے لئے زور ڈال رہے ہیں اس پر انفاق واجب نہیں اور جس کام کے لئے چندہ کیا جا رہا ہے وہ کسی خاص شخص کے ذمہ نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہے تو اس میں اثر اور جاہ سے کام لینا جائز نہیں خواہ چندہ کسی مدرسہ کے لئے ہو یا قومی کام کے لئے یا مسجد کے لئے دلیل اس کی یہ ہے۔

لایحل مال امرأ مسلم الا بطیب نفس منہ[ل]

کہ کسی مسلمان کا مال لینا حلال نہیں مگر اس کی خوش دلی سے ہے۔

میاں بی بی کے علاقہ کو سب جانتے ہیں کہ کیسا کچھ ہوتا ہے کہ دونوں میں تعشق کا علاقہ ہوتا ہے مگر اسکے بارہ میں بھی حق تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے۔

واٰتوا النساء صدقٰتھن نحلۃً فان طبن لکم عن شیء منہ نفساً فکلوہ ھنیئاً مریئاً

اگر وہ خوشی سے مہر کا کچھ حصہ معاف کر دیں تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

یعنی بی بی کا اتنا کہہ دینا کہ میں نے مہر معاف کر دیا کافی نہیں بلکہ خوشی سے معاف کرنا معتبر ہے۔ دیکھئے میاں بی بی کا ایسا تو علاقہ مگر وہاں بھی یہ حکم ہے کہ ظاہری معافی کافی نہیں ہے یہ بھی دیکھ لو کہ ایسے قرائن بھی موجود ہیں جن سے اس کی خوش دلی پائی جاتی ہو تو دوسروں کے عطایا میں تو اس کا لحاظ بہت ہی زیادہ ضروری ہوگا پس چندہ میں اس کا بہت ہی خیال کرنا چاہیے۔

مثلاً ہم ایک شخص سے چندہ مانگنے گئے اور اس نے مجمع میں ہم کو دو روپے دیئے اور ظن غالب یہ ہے کہ اگر ہم اس سے خلوت میں مانگتے تو ایک ہی روپیہ دیتا اس صورت میں ایک روپیہ تو حلال ہے اور ایک روپیہ حرام ہے ہمارے کہنے سے تو اس نے ایک روپیہ دے دیا اور اگر اسی کام کے لئے دوسرا کہتا ہے تو کچھ نہ دیتا تو اس صورت میں ایک روپیہ بھی جائز نہیں۔

باطنی تصرف

اسی طرح اگر کوئی درویش باطنی تصرف سے کسی کے قلب میں یہ خیال ڈال دے کہ فلاں شخص کو ایک ہزار روپیہ دیدو تو اس کا لینا بھی حرام ہے لوگ اس کو کمال سمجھتے ہیں گر یہ صورت حرام ہے کہ باطنی تصرف سے کسی کا مال لیا جاوے۔ تجربہ ہے کہ ایسی صورت میں آدمی دب کر کچھ دے دیتا ہے پھر بعد میں پچھتاتا ہے یہ اس کی علامت ہے کہ خوش دلی سے نہیں دیا تھا۔

ایک مسئلہ یاد آ گیا اثر باطنی کے متعلق وہ یہ کہ بعض لوگ بددعا کیا کرتے ہیں کہ فلاں شخص ہلاک ہو جاوے۔ تو اگر کسی نے کسی کے واسطے بددعا کی اور وہ اتفاق سے مر گیا تو اس کا کیا حکم ہے۔ تفصیل اس میں یہ ہے کہ یہ بددعا کرنے والا صاحب تصرف ہے یا نہیں اگر واقعات سے اس کو اپنا صاحب تصرف نہ ہونا معلوم ہے تو اس کو اگر بددعا کرنا جائز نہ تھا تو صرف بددعا کا گناہ ہوا قتل کا گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر واقعات سے اس کو اپنا صاحب تصرف ہونا معلوم ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جس وقت اس نے بددعا کی ہے آیا اس وقت یہ خالی الذہن تھا یا دل اس بات پر متوجہ تھا کہ یہ مر جائے۔ اگر خالی الذہن تھا تو بھی

[ل] کتاب التمهید لابن عبد البر ۱۰ : ۲۳۱

بد دعا ہی کرنے کا گناہ ہوا قتل کا نہیں ہوا اور اگر دوسری شق تھی یعنی اس کے ہلاک کرنے کی طرف باقاعدہ توجہ تھی تو قاتل ہونے کا بھی گناہ ہوا کیونکہ اس نے اپنے فعل سے اس کو قتل کیا۔ تصرف نفس سے قتل کرنا اور زہر دے کر مارنا برابر ہے۔ اور تجربہ سے ثابت ہے کہ نفس بھی فاعل ہوتا ہے جیسے ہاتھ پاؤں فاعل ہیں تو جیسے ہاتھ پاؤں سے قتل کرنا قتل ہے ایسے ہی قلب سے قتل کرنا بھی قتل ہے کیونکہ دونوں کا فعل برابر ہے۔ قتل کے سب احکام جاری ہوں گے البتہ اس قتل میں شبہ عمد کے احکام جاری ہوں گے۔

ایک مسئلہ اسی کے متعلق اور ہے وہ یہ کہ کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور وہ نہیں چاہتی اور اس پر نکاح کرنا واجب بھی نہیں، تو اس نے کسی سے تعویذ کرایا اس غرض سے کہ وہ نکاح کرلے تو یہ بھی جائز نہیں نہ ایسا تعویذ دینا جائز ہے کیونکہ اس میں بھی عامل کی قوت خیالی کا اثر ہوتا ہے اور قلب سے کسی کو مجبور کرنا جائز نہیں البتہ میاں بی بی کی موافقت کے لئے تعویذ کرنا جائز ہے کہ دونوں میں موافقت ہو جائے اور شوہر حقوق کو ادا کرنے لگے مگر عامل یہ تصور نہ کرے کہ شوہر اس پر فریفتہ ہو جاوے بلکہ صرف تصور ادائے حقوق واجبہ کا رکھے اور جس کو آج کل تسخیر کہتے ہیں اس کا قصد نہ کرے۔ تعویذ دینے والے اور لینے والے سب کو یہی لحاظ رکھنا چاہیے۔

سفارش کا مسئلہ

اسی استعمال جاہ کے فروع میں سے ایک جزئیہ آج کل کی سفارش کا بھی ہے جو حقیقت میں زور ڈالنا ہے لوگ زور ڈال ڈال کر اپنے کام کے لئے دوسروں کو مجبور کرتے ہیں اور جو چیز دوسرے کے ذمے واجب نہ تھی اس کو اس کے ذمہ لازم کرتے ہیں سو یہ جائز نہیں کیونکہ یہ دوسرے کو مجبور کرنا ہے ہاں اگر سفارش اس طریقہ سے ہو کہ دوسرے پر بار نہ ہو اس کی آزادی میں خلل نہ پڑے تو جائز بلکہ سنت ہے۔

دلیل اس کی حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قصہ ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا کہ اے بریرہ تم مغیث سے نکاح کرلو یہ ان کے شوہر کا نام ہے جن سے یہ خیار عتق کے سبب جدا ہو چکی تھیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا حکم نہیں سفارش ہے اس پر انہوں نے عرض کیا تو میں اس سفارش کو نہیں مانتی اس سے معلوم ہوا کہ سفارش کی حقیقت کے لئے یہ لازم ہے کہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ پڑے چنانچہ آپ نے پھر ان کو مجبور نہیں کیا نہ ان کے صاف جواب سے آپ کو ناگواری ہوئی بہرحال سفارش میں یہ صورت ہونا چاہیے کہ جس سے سفارش کی ہے اس کی آزادی میں خلل نہ ہو نہ اس پر بار ہو اور اگر وہ ان کی سفارش قبول نہ کرے تو سفارش کرنے والا برا نہ مانے۔

اب تو کہا جاتا ہے کہ صاحب جب تک زوردار الفاظ نہ ہوں تو سفارش سے کیا ہوتا ہے اس لئے خوب زوردار الفاظ لکھو تاکہ اثر پڑے صاحب یہ تو جبر اور کراہ ہے۔

یہ چند صورتیں جاہ سے کام لینے کی جو آج کل رائج زیادہ ہیں مع ضروری احکام کے بیان کر دی گئیں اور بھی اس کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں مگر سب کا استیعاب ایک جلسہ میں دشوار ہے اس لئے اب میں بیان کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور جس حدیث کی خطبہ میں تلاوت کی تھی اسکا ترجمہ کر کے ختم کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیته** ہر شخص راعی اور حاکم ہے کوئی اپنے گھر والوں پر کوئی نوکروں پر اور بھی کچھ نہیں ہے تو اپنے نفس اور ہاتھ پاؤں پر ضرور حاکم ہوگا اور سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی رعیت کے بارہ میں کیا کیا یعنی ہم نے یہ جاہ اور اثر جو تم کو ماتحتوں پر دیا تھا اس کو کہاں استعمال کیا۔

یہ سوال تو اس صورت میں ہے جب کہ جاہ اور اثر خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہو۔ بدوں اس کے کسب کے اور اگر اس کے کسب اور اسباب سے حاصل ہوا ہے تو یہ سوال بھی ہوگا کہ تم کس ذریعہ سے راعی بنے تھے۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہوگیا کہ جاہ کے بھی حقوق ہیں قیامت میں ان کی بازپرس ہوگی کہ کہاں سے حاصل کی اور کہاں صرف کی جیسے مال کے متعلق پوچھ ہوگی کہ

من این اکتسبته و این انفقته (کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا)

اسی واسطے میں نے نمونہ کے طور پر متعدد جزئیات بیان کر دیں مزید جزئیات اور ان کے متعلق احکام تحقیق سے معلوم ہو سکتے ہیں مگر میرے اس مختصر بیان سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ جاہ اور اثر جس کا نام ہے اس کا خود حاصل کرنا بجز مستثنیٰ صورتوں کے جائز نہیں اور جو بدوں تحصیل کے حاصل ہو جائے اس کا ہر جگہ استعمال کرنا جائز نہیں ہے اب لوگ شریعت کو نماز روزہ ہی میں منحصر سمجھتے ہیں حالانکہ شریعت نے سب چیزوں سے بحث کی ہے یہ دوسری بات ہے کہ کسی کو فکر اور تلاش ہی نہ ہو مگر حجت الٰہیہ قائم ہو چکی ہے اب کوئی عمل نہ کرے گا تو عند اللہ اس سے مواخذہ ہوگا۔

اب دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین۔

و صلی اللہ علیٰ خیر خلقه محمد و علیٰ آله
و اصحابه اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین
و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین.

خیر المال للرجال

تجارت اور آخرت کے متعلق یہ وعظ ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۷ھ کو قلی بازار، کانپور میں فرمایا جو سوا چار گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضری قریباً ۵۰۰ کی تھی۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا ...!

(حدیث) المرء مع من احب[1] کا صحیح مطلب، اصلی مال اعمال صالحہ ہیں۔ جن سے دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ مال کے لغوی معنی اعمال صالحہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا سے تعلق ضرور کم ہو جاتا ہے۔ جو مفید ہے۔

---

[1] الصحیح للبخاری ۸.۸۳'۹۳، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ ۱۶۵، سنن ابی داؤد ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ یَخَافُوْنَ
یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ
فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ

ترجمہ: خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں قلوب اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گے۔ ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیں گے اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں۔ روزی بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

علم اور عمل

یہ ایک آیت ہے جو ماقبل سے مرتبط ہے مگر میں نے اس وقت اسی پر اکتفا کیا ہے کیونکہ جس مضمون کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے اس کے لئے یہ آیت کافی ہے رجال ترکیب میں فاعل ہے ایک قراءت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقدر کا جس پر یسبح ماقبل کا فعل دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس جگہ قراءتیں دو ہیں یسبح بصیغہ معروف اور یسبح بصیغہ مجہول ہے اس قراءت پر یہاں یسبح بصیغہ معروف

مقدر کیا جائے گا اس بناء پر میں نے اس کو تلاوت میں یہاں شروع کیا مگر ہر حال میں مطلب ایک ہی ہے یہ سب اس لئے عرض کر دیا تاکہ ترکیب معلوم ہونے سے ترجمہ میں آسانی ہو۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں ان خاص بندوں کی جن میں یہ خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہیے کہ وہ خاص صفات اپنے اندر پیدا کریں مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے فقط تذکرہ میں تو ان صفات کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں لیکن وہ ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا۔ بتلایئے کہ نری مدح سے اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا ہاں تعریف بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آ جاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے سب کے منہ تک رہا ہے مگر کھاتا نہیں بس تعریف کرنے کو ہی کافی سمجھ رہا ہے۔ انصاف سے کہئے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل قرار دے گا ہرگز نہیں! مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملے میں عقلاء اور اہل الرائے اپنے کو عاقل تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بزرگوں کے اخلاق کی مدح نہ کرتا ہو کہ فلاں ایسے بزرگ تھے اور فلاں ایسے تھے ان میں ایسی اچھی اچھی صفات تھیں کسی مسلمان سے اس کے خلاف نہ سنا ہوگا مگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ تم نے بھی ان خوبیوں کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو صاف جواب ملے گا تو کیا محض ان کا معتقد ہو جانا کافی ہے پھر اس سے بڑی سخت غلطی یہ ہے کہ لوگ اس کوتاہی کی تاویلیں کرلیں گے مگر غلطی کا اقرار نہیں کریں گے اگر آدمی غلطی کا اعتراف کرے تو اصلاح کی بھی امید ہے مگر ہم نے تو کلمہ حق ارید بہ الباطل (اس سے باطل مراد لیا جاتا ہے) کے طور پر یہ حدیث یاد کرلی ہے۔

المرء مع من احب قالہ صلی اللہ علیہ وسلم فی جواب من سالہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف تقول فی رجل احب قوما ولم یلحق بھم[1]. رواہ الشیخان

جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۴۸، ۴۹، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلۃ: ۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶

کے جواب میں ارشاد فرمایا جس نے آپ ؐ سے دریافت کیا آپ ؐ اس کے بارہ میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

یعنی جو شخص جس قوم سے محبت رکھے وہ انہیں میں سے ہے کسی نے اس کا ترجمہ نظم میں کر دیا ہے وہ یہ کہ

احب الصالحین ولست منهم　　لعل اللہ یرزقنی صلاحا

میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو نیکی کی توفیق عطا کر دیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر کھانے سے کسی کو محبت ہو تو کیا محض محبت سے پیٹ بھر جائے گا وہاں نہیں کہتے۔

احب الاٰکلین ولست منهم　　لعل اللہ یرزقنی رغیفا

کھانے والوں سے محبت کرتا ہوں اور میں ان میں سے نہیں ہوں شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو روٹی عنایت کر دیں۔

کہ میں کھانے والوں کو دوست رکھتا ہوں اسی سے میرا پیٹ بھر جائے گا میں اس شعر کے مصنف پر اعتراض نہیں کرتا اور حاشاہ وکلا حدیث پر تو کون اعتراض کر سکتا ہے میں تو استدلال باطل کرنے والوں پر اعتراض کرتا ہوں اور ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس کے یہ معنی ہوتے جو آپ نے سمجھے ہیں کہ محبت ہی کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں جیسا آج کل لوگوں نے سمجھ رکھا ہے تو وہ پہلے لوگ بھی یوں ہی رہا کرتے کچھ بھی نہ کرتے بس محبت ہی کا سلسلہ رہتا اور اخیر والے بھی صرف محبت کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ بس کوئی بھی عمل نہ کرتا بس صرف آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی عمل کر لیتے اور دوسرے لوگ صرف محبت کو کافی سمجھ لیتے مگر ایسا تو نہیں ہوا۔

استحقاق اور فضل

اب رہی یہ بات کہ پھر المرء مع من احب[1] کے کیا معنی ہیں سو بات یہ ہے کہ اس میں عمل کرنے والوں کے لئے ایک تسلی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جس کو اہل سلوک سمجھ سکتے ہیں باقی جس کو درد ہی نہ ہوا ہو وہ درماں کی قدر کیا جانے وہ تسلی یہ ہے کہ اہل طریق عبادت کرتے ہیں کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کمی رہ گئی اور واقع میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے اگر کمی محسوس نہ ہو تو یہ بھی برکت عمل اور ترقی کے لئے مانع ہے اس لئے لازم ہے کہ بندہ عمل کے بعد بھی کمی کو محسوس کرے چنانچہ کاملین اس کو محسوس

---

[1] الصحیح للبخاری ۸:۴۸، ۴۹ الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶

کرتے ہیں حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمی کا احتمال فرماتے ہیں۔

لاحصی ثناء علیک میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

کہ میں آپ کی ثناء کا حق ادا نہیں کرسکتا حالانکہ آپ میں فی الواقع کمی نہیں مگر عظمت حق پر نظر کرکے آپ فرماتے ہیں کہ میں حق ادا نہیں کرسکتا سو یہ کمی اضافی ہے حقیقی نہیں کیونکہ جو درجہ ثناء کا آپ سے مطلوب ہے اور جو طاعت خدا تعالیٰ کو آپ سے مقصود ہے۔ آپؐ سے اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی مگر آپ جب عظمت خداوندی پر نظر کرتے ہیں یعنی عظمت حق جس درجہ کو مقتضی ہے جس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکلف نہیں ہوئے اور وہ امکان بشر سے خارج بھی ہے اس کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں۔ **لاحصی ثناء علیک**[1] اس سے یہ معلوم ہوا کہ کمی کا اپنے اندر محسوس ہونا کمالات میں سے ہے پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے تو پھر اولیاء تو کیا چیز ہیں پھر عوام تو کوئی چیز ہی نہیں بہر حال ہم میں طاعت کی کمی ضروری ہے اور اگر اس کمی پر نظر نہیں تو ہمارے اندر خود ایک کمی یہ ہوگی کہ اپنے نقص پر نظر نہیں بہر حال جب ہمارے اعمال پورے نہیں تو ضابطہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ جزا اور اجر بھی نہ ملے ویسے اللہ تعالیٰ فضل فرما دیں تو وہ اور بات ہے ان کے فضل کو کون روک سکتا ہے۔ باقی ہم ضابطہ سے جزائے موعود کے کسی طرح مستحق نہیں اور واقع میں مستحق تو اتنی کے بھی نہیں تھے اگرچہ اعمال میں کمی نہ ہوتی جتنا وعدہ ہے وعدہ کے اعتبار سے غیر لازم استحقاق ہے مگر اب کمی کی صورت میں اس کے بھی مستحق نہیں میں تو کہا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم نے کام ہی کیا کیا ہے پھر جزاء کیسے ملے گی اور یہ سب باتیں موٹی ہیں مگر چونکہ ہم کو فکر نہیں اس لئے ذہن میں نہیں آتیں ورنہ جن حضرات کو فکر ہے ان کی حالت دیکھو۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کیسے متواصل الفکر تھے۔ کسی وقت قلب مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے چینی سے خالی نہ تھا۔ باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان تھی کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام ملائکہ سے افضل اور پھر احتمال بازپرس کا بھی نہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کوئی بات بازپرس کی تھی ہی نہیں اگر شاید خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتمال بھی ہوتا بازپرس کا تو اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اطمینان کردیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں فرما دیا۔

---

[1] مسند الامام احمد ۵۸:۶، اتحاف السادة المتقین ۱۷:۲

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تاخر تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں۔

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا حالانکہ واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے یہ ایسا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔

شغل اور استغراق

اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں جن سے باوجود کمال عشق کوئی امر خلاف عقل اور دین کے صادر نہیں ہوا شیخ عبدالحق ردولوی باوجود غایت استغراق کے فرماتے ہیں کہ۔

منصور بچہ بود کہ از قطرہ بفریاد آمد　　اینجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند

منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ (شراب عشق) سے شور و غل کرنے لگا۔ یہاں ایسے (بہادر) مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے۔

حضرت شیخ علی احمد صابر صاحبؒ بارہ سال تک مراقبہ میں مشغول رہے کچھ ہوش نہ تھا حتیٰ کہ پیر کے یہاں سے مزاج پرسی کے لئے ڈوم آیا تو آپ کو خبر دی گئی کہ شیخ کے یہاں سے ڈوم آیا ہے آپ نے سر اٹھا کر اتنا فرمایا کہ پیر اچھے ہیں کہا جی ہاں! خیریت سے ہیں اور اس کی یہ خاطر کی کہ آپ گولر پھیکے بلا نمک کے کھایا کرتے تھے اس روز فرمایا کہ آج گولروں میں نمک ڈال دینا اس بیچارے کے تو زخم پر نمک چھڑکا گیا وہ تو بڑی بڑی خاطروں کا خوگر تھا اس نے واپس ہو کر شیخ سے بڑی شکایت کی کہ حضرت انہوں نے تو آپ کو بھی زیادہ نہیں پوچھا۔ صرف کچھ دیر کو آنکھیں کھول کر اتنا پوچھا تھا کہ شیخ اچھے ہیں اس کو سن کر شیخ پھڑک گئے اور فرمایا ان کی محبت ہے کہ ایسی حالت میں مجھ کو یاد رکھا۔

دیکھئے حضرت صابر صاحبؒ اس قدر تو مشغول و مستغرق تھے مگر بارہ سال تک ایک وقت کی نماز وقت سے ٹلی نہیں۔ عوام الناس اہل کمال کو کیا جانیں وہ تو بھنگڑوں کو جانتے ہیں جو نماز بھی نہ پڑھیں۔ استغراق محمود وہ ہے جو سنت کے دائرہ سے خارج نہ ہونے دے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان تھی اولیاء اللہ ایسے ایسے گزرے ہیں جن کا دین غالب تھا عشق پر اور ان کو استغراق میں بھی دین سے غفلت نہ ہوتی تھی۔

غم اور فکر

مگر چونکہ ہم خالی ہیں اس غم سے کیونکہ ہمارے اوپر دوسرا غم ضرر رساں مسلط ہو گیا ہے۔ (یعنی غم دنیا) اسلئے ہم کو دین کے کاموں میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی باقی جن کو یہ غم حاصل ہے انکی تو اس غم سے یہ حالت ہے۔

خوشا وقت شوریدگان غمش   اگر ریش بینند وگر مرہمش

اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں تو اس پر مرہم رکھتے ہیں۔

گدایانے از پادشاہی نفور   بامیدش اندر گدائی صبور

ایسے فقیر کی بادشاہ سے نفرت کرنے والے ہیں اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں۔

دما دم شراب الم در کشند   وگر تلخ بینندم در کشند

ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔

ان اشعار کی بندش بتلا رہی ہے کہ سچا مضمون ہے کیونکہ ان اشعار کا قلب پر اثر پڑتا ہے اور جمتا ہے جو بات دل سے نہیں ہوتی اس کا اثر اول تو ہوتا نہیں اگر عارضی طور پر ہو جاتا ہے تو باقی نہیں رہتا چنانچہ رنگین وعظ سن کر بعض لوگوں کو رونا آ جاتا ہے مگر مجلس سے اٹھے اور سب اثر جاتا رہا۔

غرض اہل غم کی یہ حالت ہے مگر ہمیں دین کا غم ہی نہیں اسی لئے اگر ہم تقویٰ بھی اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی نام ہی کا ہوتا ہے ورنہ اس کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ کسی چیز سے ٹوٹتا ہی نہیں ہمارا تقویٰ کیا ہے؟ بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ فسق فجور سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔

ایک بی بی تمیزہ تھی فاسقہ فاجرہ کسی بزرگ نے اس کو وضو کرایا نماز پڑھوائی اور نصیحت کی کہ نماز پڑھتی رہنا ایک عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو پھر ادھر آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا جی ہاں! فرمایا وضو بھی کرتی ہو؟ تو کہتی ہے کہ آپ جو وضو کرا گئے تھے میں اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔

یہ حکایت تو کتابی ہے ایک حکایت مولانا رفیع الدین صاحب کی بیان کی ہوئی ہے کہ ایک سقہ کو وضو کرا دیا اور خیال کیا کہ یہ تو ہر وقت پانی میں رہتا ہے اس کو کیا مشکل ہے وضو کرنا۔ اس لئے کوئی خاص تاکید نہیں کی کچھ روز کے بعد دیکھا کہ وہ سقہ بے وضو نماز میں آ کھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا کہ یہ کیا تو وہ کہتا ہے کہ جی اس دن وضو کرا نہیں دیا تھا۔

وضو پر ایک لطیف بات یاد آ گئی اللہ تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کو بتلائے ہیں کہ اگر نہ بھی بتلاتے تو ضرورت کی وجہ سے ان کو ویسے بھی دھوتے ہیں سو کوئی کام بڑھایا نہیں حق تعالیٰ کے احکام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض طبیب کے پاس گیا اور کہا کہ گوشت

کھانے کو طبیعت چاہتی ہے طبیب نے کہا کہ گوشت تو مضر ہوگا مگر طبیب شفیق بھی ہے۔ اس نے کہا گوشت کھالینا مگر اس میں دھنیے کی پوٹلی ڈال لیا کرو ایسا طبیب کہاں ملے جو طبیعت کے موافق دوا اور غذا ابتلائے حق تعالیٰ کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے چنانچہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کا حکم دیا جن کو ہم خود بھی دھوتے ہیں کیونکہ ان ہی پر گرد و غبار کا زیادہ اثر ہوتا ہے مگر اتنا بتلا دیا کہ اس ترتیب سے دھولیا کرو جو امور فطرت کے مناسب تھے وہی تجویز فرمائے بشرطیکہ فطرت سلیمہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اس کو کہہ رہا تھا کہ بعض کا تقویٰ ایسا ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں چاہے کچھ ہی کرلیں (ہنس کر فرمایا کہ) ہاں پیروں کے توڑنے سے نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔

اس پر ایک پیر کی حکایت یاد آئی کسی مرید نے نکاح پڑھنے کے لئے ان کو نہ بلایا دوسرے کسی آدمی سے نکاح پڑھوالیا پیر نے سمجھا کہ یہ تو بری رسم نکلی اس سے تو بڑا نقصان ہوگا وہ اس کے گھر پہنچے اور کہا کہ بغیر ہمارے کس نے نکاح پڑھایا ہے بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میں ابھی اس کو ادھیڑتا ہوں بس بیٹھ گئے پڑھنے **والشمس والضحھا** (قسم آفتاب کی اور اس کی روشنی کی) ادھیڑ بے نکاحا تمام آیتوں میں اسی طرح جوڑ لگاتے چلے گئے اور کہا ایک دو آیت اور ہی ہے بس ادھڑا ہی چاہتا ہے اس بیچارے نے پانچ روپے نکال کر دے دیئے اور کہا جی ایسا مت کرو۔

سو ہم جو اپنے تقویٰ طہارت کو ایسا سمجھتے ہیں کہ زوال کا خوف ہی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو وہ غم نہیں جس سے فکر ہو اسی غم کو ان اشعار میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ صاحب مشاہدہ کا سچا مضمون ہے اس لئے موثر ہوتا ہے ان کا اثر دل پر پڑتا ہے غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں اثر نہیں ہوا کرتا ہے۔ عارف شیرازی کے کلام میں بھی اسی لئے بے حد اثر ہے کہ وہ صاحب مشاہدہ ہیں ان اشعار کو پھر دہراتا ہوں۔

خوشا وقت شوریدگان غمش　　اگر ریش بینند دگر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور　　بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند　　اگر تلخ بینند دم در کشند

(اسکے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا غم ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا اسکے زخموں پر مرہم۔ وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہت سے نفرت ہے اور اسی کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں۔ دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہوجاتے ہیں)

محبت اور عمل

یعنی اہل اللہ اس غم میں بھی خوش رہتے ہیں یہ غم ایسی نعمت ہے کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا

اس لئے وہ اس نعمت پر مسرور ہیں یہ قید ایسی ہے کہ اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند   شکارش نجوید خلاص از کمند

اس کا قیدی قید سے چھٹکارا نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو اچانک پیچھے سے آ کر بغل میں زور سے دبا لے کہ ہڈی پسلی ٹوٹنے لگے۔ اول بے خبری سے ذرا گھبرایا اس گھبرانے کو دیکھ کر معشوق کہتا ہے کہ اگر تمہارا جی گھبراتا ہو، پریشانی ہو، تکلیف ہو تو چھوڑ دوں۔ تمہاری آزادی میں خلل پڑ گیا ہو تو چھوڑ دوں اگر عاشق صادق ہے تو جواب میں یہی کہے گا۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند   شکارت نجوید خلاص از کمند

تیرا قیدی سے رہائی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں ڈھونڈتا۔

اور یوں کہے گا کہ بھائی خدا نہ کرے کہ مجھ کو اس قید سے رہائی ہو۔ جس کو یہ قید نصیب ہو گئی ہے وہ اس سے نکلنا کب چاہے گا اسی طرح حضرت جب دین کا غم ہو جائے گا تو حقیقت کا ادراک ہو گا اس وقت اپنی کمی اعمال میں محسوس ہونے لگے گی۔ اور اس کمی کے احقاق سے بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کی نوبت بھی آ سکتی ہے ایسوں کی تسلی کے لئے فرما دیا گیا ہے **المرء مع من احب**[1] یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر کمی رہ گئی تو غم مت کرنا، دل کو مت توڑنا پریشان مت ہونا تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے تم کو محبت ہے۔ غرض **المرء مع من احب** ایسے شخص کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے نہ کہ بے عملوں کے لئے۔

جیسے کوئی شخص کام میں کوشش کرے اور آقا کو معلوم ہو کہ اس نے پوری کوشش کی ہے اور اتفاق سے کام میں کچھ نقص رہ جاوے تو اجرت کے وقت اس کو پوری مزدوری دیتے ہیں اور انہی کام کرنے والوں کے ساتھ لاحق کرتے ہیں جن کے کام میں کوتاہی واقع نہیں ہوئی یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور گو مفید خالی محبت بھی ہے یعنی اگر محبت بھی نہ ہوتی تو اس کے اعتبار سے یہ خالی محبت بھی مفید ہے مگر یہ تو نہیں کہ عمل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ نری محبت ہی محبت کافی ہو جاوے گو عمل کچھ بھی نہ ہو۔

اس کا ایک راز ہے وہ یہ کہ بدوں عمل کے جو محبت ہوتی ہے اس محبت میں بھی ثبات اور قوت نہیں ہوتی مثلاً ایک شیخ کے دو مرید ہوں ایک تو ہو متبع دوسرا غیر متبع تو متبع ہی کی محبت قابل اعتبار

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۳۸، ۴۹، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ ۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶

ہوگی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو اتباع کرتا ہے وہ شیخ کو پہچانتا ہے روزمرہ شیخ کے ساتھ اس کی معرفت بڑھتی ہے اور معرفت سے محبت بڑھتی ہے بخلاف اس شخص کے جو متبع نہیں وہ شیخ کو پہچانے ہی گا نہیں تو اسے محبت کیا خاک ہوگی اس کے نزدیک تو پیر اگر اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو پیر ہی نہ رہے گا اور متبع شخص کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر سے لغزش بھی ہو جاوے تو وہ موازنہ کرتا ہے اس لغزش کا اس کے کمالات کے ساتھ پھر کمالات کو غالب دیکھتا ہے تو بد اعتقاد نہیں ہوتا اور اس کی لغزش کو خیال میں بھی نہیں لاتا اور اس پر محمول کرتا ہے۔

فمن ثقلت موازینہ فاؤلئک هم المفلحون پس جن لوگوں کی ترازو کا پلڑا بھاری ہوگا وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس کو ایسا خیال کرتا ہے، جیسے کوئی حسین ہو مگر اس کے چہرے پر ایک کالا تل بھی ہو کہ وہ بھلا ہی نظر آتا ہے اس تل پر اہل عرب کا مذاق یاد آیا عرب کی عجیب تشبیہات تھیں۔ اشعار کہا کرتے تھے کہ اس کے چہرہ پر ایسا تل ہے جیسے میدان میں اونٹ کی مینگنی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ تہذیب تھی اہل عرب کی۔ ان کو تو اسلام ہی نے کام کی باتیں سکھلائیں بعد کے اشعار دیکھئے وہ کیسے اعلیٰ درجہ کے ہیں عرب کو اونٹ بہت محبوب تھے اسی واسطے ہر جگہ ان ہی کا تذکرہ تھا اس لئے محبوب کے تل کو بھی تشبیہ دی تو مینگنی سے اگر اسلامی شعراء کے یہاں یہ مضمون ہوتا تو اور عنوان سے ہوتا۔

غرض یہ ہے کہ جو پیر کے کمالات کو جانتا ہے تو وہ اس کی لغزش کو تل کی مثل سمجھے گا۔ اور جس کی نظر کمالات پر نہیں اس کے نزدیک معمولی لغزش بھی بلکہ غیر لغزش بھی پہاڑ کے برابر ہوگی۔

ایک شخص نے ایک بزرگ کی نسبت یہ کہا تھا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اسی طرح ہمارے یہاں ایک بی بی تھیں انہوں نے ایک بزرگ کو پاخانے جاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں یہ کیسے بزرگ ہیں جو پاخانہ بھی کرتے ہیں۔ اسی بناء پر شریف عبداللہ نے بدوؤں کو اپنی ولایت کا معتقد بنانے کے لئے رکھا ہوا تھا اور یہ انتظام کیا تھا کہ وہ ان کے پاخانہ پیشاب کی اطلاع کسی کو نہ ہونے دیتے۔ جہلاء کا اعتقاد ہی کیا بس جاہل لوگ ان کی ولایت کے قائل تھے ان کا یہ خیال جم گیا تھا کہ شریف صاحب پاخانہ پیشاب نہیں کرتے اس لئے ولی ہیں۔

ایک شخص ایک معمولی بات پر میرے معتقد ہوئے تھے اور ایک معمولی بات پر غیر معتقد ہو گئے معتقد تو اس بات پر ہوئے تھے کہ میں نے ایک شخص سے تین روپے نہ لئے تھے جو مجھ کو ہدیۃً

دینا چاہتے تھے بس اتنی بات پر معتقد ہو گئے اور کئی سال تک معتقد رہے اور غیر معتقد اس پر کہ ان کو دنیا کا ایک کام پیش آیا انہوں نے مجھ سے سفارش چاہی میں نے انکار کر دیا۔ بس غیر معتقد ہو گئے کہنے لگے یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کی سفارش نہیں کرتے۔

نادان کی دوستی

بس نادان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے الف لیلیٰ میں ایک حکایت جاہل کی دوستی کی لکھی ہے کہ ایک شخص قاضی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ بھی اس کو بلاتی تھی مگر موقع نہ ملتا تھا جمعہ کا دن آیا تو اس نے خیال کیا کہ آج اچھا موقع ہے سب لوگ نماز کے لئے چلے جائیں گے میدان خالی ہوگا اس سے کہلا بھیجا مگر اس نے خیال کیا کہ محبوبہ کے پاس اچھی ہیئت سے جانا چاہیے چنانچہ ایک حجام کو بلا کر خط بنوانے کا ارادہ کیا وہ نائی اس قدر بکی تھا کہ ذرا سا خط بنا لیا اور پھر بک مارنے لگا اور یہ شخص ادھورا خط چھوڑ کر اٹھ بھی نہیں سکتا حجام نجومی بھی تھا کبھی خط کو چھوڑ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا کبھی اسطرلاب نکال کر ارتفاع شمس کو دیکھتا غرض اس نائی نے ایسے قصے پھیلا دیئے کہ جمعہ کا وقت بھی گزرنے لگا یہ شخص اس سے پیچھا چھڑا کر معشوقہ کے مکان میں گیا نائی صاحب بھی خیر خواہی سے جا کر مکان کے باہر ایک تخت پڑا تھا اس پر بیٹھ گئے جب قاضی صاحب جمعہ سے واپس ہو کر مکان پر آئے گھر میں جا کر کسی غلام پر خفا ہو کر اس کو مارنے لگے وہ رونے چلانے لگا حجام صاحب سمجھے شاید میرے میاں پکڑے گئے اور پٹ رہے ہیں فوراً مدد کے لئے پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیٹی کو نہیں کہتا اسی نے تو میرے آقا کو بلایا ہے غرض راز فاش ہو گیا وہ آقا ڈرا کہ اب پکڑا جاؤں گا بے چارہ اندر مکان کے اس حال کو معلوم کر کے کہیں کو چھپ کر بھاگا اور چھت پر سے کودا۔ پاؤں ٹوٹ گیا۔ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بچانا۔ دان کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک رئیس کے ہاں ایک ریچھ پلا ہوا تھا جب وہ رئیس سوتا تو یہ ریچھ اس کی مکھیاں جھلا کرتا ایک روز اتفاق سے مکھیوں نے بہت زور باندھا ریچھ اڑاتے اڑاتے دق ہو گیا اس نے دل میں کہا کہ اچھا میں تمہارا علاج بتاؤں گا جب مکھیاں اچھی طرح آقا کے منہ پر بیٹھ گئیں اس نے بڑا سا پتھر لا کر ان مکھیوں کے مارا' مارا تو تھا مکھیوں کے وہاں آقا صاحب ہی کا چکنا چور ہو گیا۔ غرض نادان کی دوستی ہی کیا بلکہ مضر اور ایذا دہ ہے۔

اسی لئے حضرت مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ایک مرید کو ہٹا دے تو فی مرید

ایک آنہ اور مولوی کے ہٹانے پر فی مولوی چار آنہ لے لے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص نادان ہے اس کو شیخ سے بھی برائے نام ہی محبت ہوگی نادان کی دوستی رہ نہیں سکتی وہ معمولی بات کو بھی بزرگی کے خلاف سمجھے گا اور غیر معتقد ہو جائے گا اس کی نظر جہل کے سبب اکثر عیوب ہی کی طرف زیادہ ہوگی اور کمالات کو تو وہ جانتا ہی نہیں ان پر تو اس کی نظر کیا ہوتی سچی محبت اسی کو ہوگی جس کو شیخ کی معرفت ہوگی اور شیخ کی معرفت اس کے اتباع سے ہوگی جیسا اوپر قریب ہی مذکور ہوا پس من احب پورے طور پر وہیں صادق آئے گا جہاں اتباع ہو اور جہاں اتباع نہ ہوگا محبت بھی کامل نہ ہوگی۔ اسی درجہ کے لئے عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں۔

تعصی الالہ و انت تظہر حبہ　　　ھذا لعمری فی الفعال بدیع

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ فعلوں میں انوکھی بات ہے۔

لو کان حبک صادقا لاطعتہ　　　ان المحب لمن یحب یطیع

اگر اس کی محبت میں صدق ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا اس لئے محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے۔

احکام و آثار

مگر اس وقت محبین بہت ہی کم ہو گئے ہیں جو متبع ہوں ہاں محبت کا دم بھرنے والے بہت ہیں ان کی مثال وہی ہے جیسے ایک بدوی کو کسی نے دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے اور ایک کتا اس کے پاس پڑا ہے اس نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا میرا کتا مارے بھوک کے جاں بلب ہے اس کے فراق میں رو رہا ہوں اس شخص کی نظر ایک تھیلے پر پڑی جس میں روٹی کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے اس نے بدوی سے کہا کہ اس تھیلے میں کیا ہے کہا روٹی کے ٹکڑے ہیں کہا پھر اس کو کھلاتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا۔

گفت ناید بے درم در راہ نان　　　لیک ہست آب دو دیدہ رایگاں

روٹی تو بغیر پیسوں کے راستہ میں نہیں ملتی لیکن آنسو تو مفت کے ہیں۔

یعنی اتنی محبت نہیں کہ روٹی خرچ کروں اور آنسو تو مفت کے ہی چار آنسو کی جگہ دس بہا دوں گا اور روٹی کو لگتے ہیں دام بس محبت رونے کی ہے کھلانے پلانے کی نہیں ہے۔

غرض یہ ہے کہ غیر متبع کو محبت نہیں ہوتی یعنی کامل اور یہ قاعدہ ہے کہ قابل اعتبار وہی چیز ہوتی ہے جو معتد بہ درجہ میں ہو جیسے رائی کا دانہ ترازو میں رکھا جائے تو اس کا وزن تو ضرور ہوتا ہے اگر

ایک دانہ میں وزن نہیں تو ویسے ہی دانے بہت سے ڈال کر ترازو کا پلہ کیسے جھک گیا یہ تو سب کو مسلم ہے کہ ایک دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چونکہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا ہے نہ اہل عرف نے گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جب چیونٹی زمین پر چلتی ہے تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے اور دلیل سے یہ بات سچی ہے مگر سننے والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام و آثار مرتب نہیں دیکھے جاتے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں سمجھا اسی طرح احکام شرعیہ وحسیہ میں وہی چیز معتبر ہو گی جس پر احکام و آثار مرتب ہوں پس محبت وہی معتبر ہو گی جس پر آثار مرتب ہوں (یعنی جس میں اتباع ہو وہی محبت قابل اعتبار ہو گی) نرا احب کچھ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے مطلب کی حدیث یاد کر لی ہے اپنے کو عمل سے فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کلمة الحق ارید به الباطل ہے یعنی المرء مع من احب بالکل حق ہے مگر اس سے اپنے مطلب کے لئے باطل مراد لیا گیا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے بھی رد کیا ہے۔

غزوہ احد

چنانچہ غزوہ احد کے متعلق فرماتے ہیں۔

ثم انزل علیکم من بعد الغم امنةً نعاساً یغشیٰ طآئفةً منکم وطآئفةٌ قداھمتھم انفسھم یظنون باللّٰہ غیر الحق ظن الجاھلیة یقولون ھل لنا من الامر من شیءٍ قل ان الامر کلهٗ للّٰہ ‘ یخفون فی انفسھم مالا یبدون لک ‘یقولون لو کان لنا من الامر شیءٌ ما قتلنا ھٰھنا قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الیٰ مضاجعھم ج و لیبتلی اللّٰہ ما فی صدور کم و لیمحص ما فی قلوبکم واللّٰہ علیم بذات الصدور

پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو وہ اونگھ تھی کہ گھیر رہی تھی تم میں سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں کے سے کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں تو کہہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھ میں تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ آپ کہہ دیجئے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جانا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آزمانا تھا جو

کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

یہ حاصل ہے مدلول آیات کا غزوہ احد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور آثار فتح کے نظر آتے تھے اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی اس میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے ان پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رعب و دہشت جاتی رہی سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی جو لوگ اس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا **هل لنا من الامر من شیء** ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر ان کی نیت میں یہ نہ تھا...... بلکہ نیت میں یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے۔ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا فرماتے ہیں۔ **یخفون فی انفسهم مالا یبدون لک** کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے ان کے دلوں میں تو یہ ہے **لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ههنا** کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آ کر مارے جاتے بچ نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں یہ جو کلمہ ہے **هل لنا من الامر من شیء** یہ کلمہ تو حق ہے (جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا) مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ **لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ههنا** (پس یہ قول) **هل لنا من الامر من شیء** (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں) منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے ذو وجہین بات کہہ سکتے تھے چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو وجہین کہی۔

اس کا ایک محمل تو حق ہے وہ محمل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قدر ظاہر کر رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کے کچھ اور تھا سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے یہ اعتقاد اسباب کے موثر ہونے کا ہے اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب موثر بالذات ہیں پس اسی پر۔

یخفون فی انفسهم مالا یبدون لک اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔ مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں آگے اس کو بیان فرماتے ہیں۔

یقولون لو کان لنا من الامر شیء ما قتلنا ههنا کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں۔ کہ ان کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے آگے اس کا رد ہے۔

قل لو کنتم فی بیوتکم الخ کہہ دیجئے اگر تم گھروں میں بھی ہوتے......الخ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے تم کہیں بھی ہوتے جن کے لئے قتل لکھا گیا تھا تو وہ یہیں آ کر قتل ہوتے جا نہیں سکتے تھے۔ غرض اس آیت سے ان کی تائید ہوگئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے یہی حال ہے اس شخص کا جو **المرء مع من احب**[1] سے غرض باطل یعنی عدم ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

داخلہ جنت کی خوش فہمی

اس حدیث کی طرح ہم نے اور چند حدیثیں بھی یاد کر رکھی ہیں۔ جیسے **من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ**[2] جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا' جنت میں داخل ہوگیا۔ اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ نہ کسی عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے پھرو بس لا الٰہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے یہ بھی وہی **کلمۃ الحق ارید بها الباطل** (یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی میں آگے مصرح ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وان زنیٰ و ان سرق یعنی اگر چہ وہ زنا کرے' اور چوری کرے۔ تب بھی جنت میں داخل ہوگا اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الٰہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہا (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے) کے

---

[1] الصحیح للبخاری ٨: ٣٨، ٤٩ الصحیح لمسلم کتاب البر والصلۃ: ١٦٥، سنن ابی داؤد: ٥١٢٧، سنن الترمذی: ٢٣٨٦

[2] المعجم الکبیر للطبرانی ٧: ٥٥، مجمع الزوائد للهیثمی ١: ١٨، المستدرک للحاکم ٣: ٢٥١

بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا و سرقہ سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الٰہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی اسی کی تعلیم فرما دیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کیسے ساقط ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الٰہ الا اللہ پر بس کرتے تھے ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیال کرتے تھے معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق ہے ان دلائل کا یہ مفہوم نہیں صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے حیلے تراش لئے ہیں۔ کیا آیت **لمثل هذا فليعمل العاملون** اس کی مثل عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ عمل کریں۔

اور حدیث **من ترک الصلوة متعمداً فقد کفر**[۱] جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا وہ کافر ہو گیا۔ وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی مجھے تو شرم آتی ہے ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے غرض یہ بات۔

رجال لا تلهیهم تجارة الخ (ایسے بندے ہیں جن کو تجارت نہیں غافل کرتی) جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے ان ہی اعمال کو بتلا رہی ہے جن کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔

دین و دنیا کا تعلق

اب وہ صفات سنئے کیا ہیں بعضے ایک اور جہالت میں گرفتار ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے عمل تو وہ کرے جو جنت کو لینا چاہے ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں ہم تو ذات کے عاشق ہیں خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہئے جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے ذات کی طلب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اور زیادہ عمل کی ضرورت

---

[۱] کنز العمال: ۵۰۰۸، ۱۸۸۷۶ · اتحاف السادة المتقین ۳: ۱۰

ہے اب ان اعمال کو سنئے ارشاد فرماتے ہیں۔

لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله الخ ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

اپنے اچھے بندوں کی ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے۔ اس صفت کا حاصل ایک غلطی کا رفع ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے لوگوں میں عمل کی ہمت نہیں رہی۔ آج کل کے غیر محقق واعظین نے عقل کو کھو رکھا ہے ایسی ایسی حکایات لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی ہمت باقی نہیں رہتی اور وہ غلطی یہ ہوئی کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے اس لئے وہ دین کا کام نہیں کرتے۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے نہیں جاتا بلکہ جس وقت آدمی کو دین کا شوق ہوتا ہے تو ضروری دنیا تو اور زیادہ آسانی سے ملتی ہے۔ البتہ فضول دنیا خود رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے جیسے چراغ کے جلنے سے تاریکی جاتی رہتی ہے جب چراغ آیا تو اندھیرا کہاں باقی ضروری دنیا میں تو اور زیادہ برکت نصیب ہوتی ہے تو ضروری اور مفید دنیا دین کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے پس بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات جب سب ختم ہو جائیں۔ تب دین اختیار کریں یہ خیال محض غلط ہے البتہ دین میں یہ ضروری ہے کہ کمال پر غیر اللہ یعنی جو دنیا مضر ہے وہ خود رخصت ہو جاتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ دین پر چلنے سے بیٹا مر جائے گا بہن مر جائے گی مال و دولت جاتا رہے گا۔ سو دنیا کی دولت رخصت نہیں ہوتی۔ البتہ ان چیزوں کے مضر تعلقات رخصت ہو جاتے ہیں یعنی بیٹے کے ساتھ جو تعلق اب ہے محبت کا جو حاجب عن اللہ ہے وہ نہیں رہتا جو تعلق بیٹے کے ساتھ اب ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہو جائے گا سب چیزیں فنا ہوتی ہیں مگر فنا کے وہ معنی نہیں جو عوام کے نزدیک ہیں کہ آدمی کو کہیں کی بھی خبر نہ رہے نہ کھانے کی نہ پینے کی نہ اپنے تن کی۔ سو یہ معنی نہیں فن کی کتابیں دیکھئے تو معلوم ہو پڑھے لکھے لوگ بھی کتابیں پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے۔ فنا کا حاصل ہے فضول تعلقات کا جاتا رہنا یعنی دنیا کی چیزوں سے جو تعلق اب ہے وہ نہیں رہتا بلکہ وہ تعلق خدا کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں کسی درجہ میں محبوب بھی نہ رہیں ان سے بالکل ہی بے تعلقی ہو جائے ان سے کوئی واسطہ ہی نہ رہے یہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی محبت مغلوب ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی ضرر نہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ بھی محبت کا تعلق ہو مگر غالب

تعلق اللہ کے ساتھ ہو چنانچہ حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

قل ان کان اٰبآء کم و ابناء کم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم واموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللّٰہ و رسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ

کہہ دیجئے کہ اگر باپ تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بیبیاں تمہاری اور قبیلہ اور کنبہ تمہارا اور مال جو کمائے ہیں تم نے اور سوداگری جس کے مندا ہونے سے ڈرتے ہو اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے پس انتظار کرو یہاں تک کہ لاوے اللہ اپنا حکم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ یہ صورت تو بری ہے کہ یہ چیزیں احب ہوں یعنی زیادہ محبوب ہوں اللہ سے معلوم ہوا کہ اگر کم محبوب ہوں تو مضائقہ نہیں آیت میں زیادہ محبوب ہونے کی مذمت کی گئی ہے یعنی یہ چیزیں زیادہ محبوب نہ ہونی چاہییں۔

اہل اللہ کی حالت

باقی اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو مساوات کی نفی نہیں کی گئی کہ یہ چیزیں محبت میں مساوی بھی نہ ہوں تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مساوات میں مضائقہ نہیں حالانکہ یہ بھی خلاف ہے مساوات بھی نہ ہونا چاہیے وہ بھی ایسی ہی بری ہے جیسے زیادہ احب ہونا برا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہی نہیں اس لئے مساوات سے بحث ہی نہیں کی کیونکہ برابری ہو ہی نہیں سکتی یہ مشاہدہ ہے اور جو چیز واقع نہیں ہوتی اس سے بحث نہیں ہوتی وہ تو خود ہی خارج ہے پس بہت لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو گی تو یہ چیزیں چھوٹ جائیں گی۔ سو یہ بات نہیں، یہ چیزیں چھوٹیں گی نہیں البتہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے سے ان چیزوں کی محبت کم ہو جاتی ہے جو خود مفید ہے کیونکہ محبت کم ہونے سے پریشانی کم ہو جائے گی کیونکہ پریشانی کی حقیقت ہے کسی متوقع چیز کا چھٹ جانا اور جب محبت کم ہو گی اس کی طرف التفات بھی نہ ہو گا تو اس کی تمنا اور توقع بھی نہ ہو گی جب توقع ہی نہ ہو گی تو پریشانی کیسی بلکہ وہ چیز ہو تب اور نہ ہو تب دونوں حالتیں برابر ہوں گی۔ جیسے کسی کو اولاد کی تمنا ہو تو اس کو نہ ہونے سے پریشانی ہو گی اور

جو تمنا ہی نہ ہو تو کیا پریشانی ہو گی اہل اللہ کو کسی چیز کے جاتے رہنے سے اسی لئے پریشانی نہیں ہوتی کہ ان کو کسی چیز کی تمنا ہی نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے پاس کسی امیر نے ایک بیش قیمت موتی ہدیۃً بھیجا خادم نے پیش کیا فرمایا الحمد للہ! اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو۔ خادم نے رکھ لیا اتفاق سے وہ موتی چوری ہو گیا خادم نے یہ واقعہ بھی عرض کیا ان بزرگ نے فرمایا: الحمد للہ! خادم کو بڑا تعجب ہوا اس نے دوسرے وقت پوچھا کہ حضرت مجھے بڑی حیرت ہے وہ یہ کہ جب موتی حضور میں آیا تھا تو اس وقت بھی آپ نے الحمد للہ فرمایا تھا اور ضائع ہونے کی خبر معلوم ہو کر بھی یہی الحمد للہ فرمایا اس میں راز کیا ہے؟ آنا اور جانا دونوں پر کیسے خوشی ہو سکتی ہے فرمایا میں نے نہ آنے پر الحمد للہ کہا نہ جانے پر بلکہ جس وقت آیا تھا میں نے قلب کو دیکھا کہ آنے پر کچھ خوشی نہیں ہوئی اس پر میں نے الحمد للہ کہا تھا اسی طرح جاتے رہنے پر میں نے قلب پر کچھ رنج نہیں پایا اس لئے میں نے الحمد للہ کہا۔ یہ حالت ہے اہل اللہ کی۔

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ کسی امیر نے ایک بزرگ کی خدمت میں ایک چینی آئینہ بہت قیمتی ہدیۃً بھیجا تھا وہ بزرگ بھی کبھی اس میں اپنا منہ دیکھا کرتے تھے۔ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اس کو بڑی ہی ڈر ہوا کہ دیکھئے کیا ہو گا کیسا جلال آئے گا۔

جلال پر ایک مضمون یاد آیا۔ وہ یہ کہ خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں یہاں تک تو صحیح ہے واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد لے رکھی ہے وہ غلط ہے لوگوں کے نزدیک جلالی ان اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے وبال پڑے گرمی پیدا ہو۔ جنون پیدا ہو جائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں ان کو جمالی کہتے ہیں سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور نحوست یا جنون پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطف کے پائے جاتے ہیں جیسے رحمٰن، رحیم، کریم، لطیف سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صفتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعضے بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ ان کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں پس ان کا جلال بھی مشتمل بر جمال ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ماترک علیھا من دابۃ اگر میاں لوگوں سے ان کے گناہوں پر مواخذہ فرماتے تو زمین پر جتنے چلنے والے ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

بظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہوں دواب بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ماترک علیھا من الناس اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی نہ بچتا۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر و جلال ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس نلئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غصہ ہے ان کی شرافت و مقصودیت بھی ظاہر کی جا رہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے اگر تدبر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے غصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی اسی طرح اہل اللہ بھی غصے ہوتے ہیں مگر ان کے غصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعایتیں کرتے ہیں۔

چنانچہ جن بزرگ کا واقعہ میں بیان کر رہا تھا کہ خادم کے ہاتھ سے ان کا آئینہ چینی ٹوٹ گیا جو موجب عتاب و عقاب ہوتا مگر اس میں بھی ان کی رحمت کا ظہور ہوا۔ وہ اس طرح کہ خادم کو جب عتاب کا ڈر ہوا تو اس نے سوچا کہ بزرگ زندہ دل ہوتے ہیں لاؤ شاعری بگھارو۔ خوش ہو کر کچھ نہ کہیں گے چنانچہ وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

از قضا آئینہ چینی شکست (چین کے آئینہ کی قضا آئی اور وہ ٹوٹ گیا)

آپ فی البدیہہ فرماتے ہیں

خوب شد اسباب خود بینی شکست (بہت اچھا ہوا کہ خود بینی کے اسباب ختم ہو گئے)

یعنی اس آئینہ کا بھی جھگڑا ہی تھا خود بینی کا سبب تھا اچھا ہوا ٹوٹ گیا۔ پاپ کٹا یہ حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ ان کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت ہو نہ جانے سے غم۔ اسی انقطاع تعلق کو کہتے ہیں۔

تا بدانی ہر کرا یزداں نخواند   از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ زراعت تجارت بی بی بچے سب چھوٹ جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے دل کو کوئی خاص لگاؤ اور تعلق نہیں رہتا بلکہ خاص لگاؤ اللہ تعالیٰ سے ہو جاتا ہے۔

مکہ میں کثرت سے ایسے دکاندار ہیں جن کی یہ حالت ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں' قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں ذکر میں مشغول ہیں۔ کوئی خریدار آیا سودا دے دیا پھر ذکر اللہ میں مشغول ہو گئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دکان بند کی اور گھر کو بلکہ اکثر حرم شریف کو چل دیئے بس اتنا تعلق ہے ان کو دنیا کی چیزوں سے۔

رزق حلال کا اثر

ایک شخص عبداللہ شاہ تھے دیوبند میں جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا تھا اس میں سے ایک حصہ اپنی والدہ کو دیتے اور ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے اور باقی اپنے خرچ میں لاتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا یعقوب صاحب اور دوسرے حضرات کی دعوت کی حضرت مولانا نے فرمایا کہ دعوات کہاں سے کرو گے تمہارے پاس ہے ہی کیا کہنے لگے کہ جو حصہ خیرات کا نکالتا ہوں اسی سے دعوات کروں گا غرض پانچ آنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکا لیجیو۔ میں کہاں جھگڑا کروں گا اگر دنیا دار بھی اس طرز کو اختیار کر لیں تو کیسا اچھا ہو۔ مہمان تھے کئی اور پیسے کل پانچ آنے بزرگوں مہمانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی سستی سی چیز تجویز کی جائے چنانچہ میٹھے چاول گڑ کے تجویز ہوئے۔ بڑی احتیاط سے پکائے گئے کوری ہانڈی منگائی گئی پکانے والے کو وضو کرایا گیا غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی وہ چاول تھے ہی کتنے ایک ایک دو دو لقمے کھا لئے مولانا خود فرماتے تھے کہ ان دو لقموں کی یہ برکت دیکھی کہ ایک ماہ تک قلب میں انوار و برکات محسوس ہوتے تھے۔ ایک ماہ کامل یہ اثر رہا اور میں کہتا تھا کہ جس کی کمائی کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دن رات اسی کو کھاتا ہے اس کی کیا حالت ہوگی۔

صاحبو! اگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت ہوگی تو یہ بات پیدا ہو جائے گی۔ پس اہل اللہ دنیا کو ضروری تو سمجھتے ہیں مگر ضروری یقدر بتقدیر الضرور ان کا مشرب ہوتا ہے یعنی ضروری چیز بقدر ضرورت ہی اختیار کی جاتی ہے وہ حضرات بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرتے ہیں جیسے تم

پاخانہ میں جاتے ہو تو کیا وہاں تفریح کے لئے جاتے ہو بلکہ ضرورت رفع کرنے کو اور جہاں ضرورت رفع ہو گئی بس باہر نکل آئے اسی طرح ان کے نزدیک دنیا ایک حاجت کی چیز ہے تفریح کی چیز نہیں دل لگانے کی جگہ نہیں بس اللہ کی محبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں سے ضروری تعلق رہ جاتا ہے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

تا بدانی ہر کرا یزداں نخواند — از ہمہ کار جہاں بیکار ماند

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو عام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں''

تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر

پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت سے دنیا جاتی رہتی ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اس کو دنیا سے تعلق و محبت نہیں رہتی یہ معنی نہیں کہ وہ سارے حقوق کو معطل کر کے بیٹھ رہے۔ وہ کرتا سب کچھ ہے مگر دل اور ہی طرف رہتا ہے بس یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل بیار دست بکار دنیا داروں کی طرح نہیں کہ ہر وقت دنیا ہی میں ان کا دل رہتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر تھے ان کو نماز میں بھی شعر ہی کی سوجھتی تھی جہاں کوئی مصرعہ موزوں ہوا نماز توڑ دیتے اور شعر لکھ لیتے ایسے ہی دنیا داروں کا مذاق ہے کہ اگر نماز کے وقت گاہک آ گیا تو یوں سمجھتے ہیں کہ اگر نماز جماعت سے پڑھی اور دیر لگ گئی تو گاہک بھاگ جائے گا۔ اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جماعت سے پڑھو یہ بڑی مشکل بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جانے کے بعد دنیا کی چیزوں سے ایسا تعلق نہ رہے گا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے باقی وہ کمانے میں تم سے اچھا رہے گا۔

ہمارے قریب گاؤں میں ایک شخص ہیں ایک گاؤں میں کھیتی کرتے ہیں اور کھیتی بھی عجیب طریقہ سے ایک بیل تو ان کے پاس ہے اور دوسرا بیل ضرورت کے وقت کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے چوتھے سال دس پانچ روپے کسی سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اتنا غلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ سال بھر کو کافی ہو جاتا ہے اور دین کی یہ حالت ہے کہ کام بھی کرتے ہیں اور ذکر میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اطمینان ان کے اندر اس قدر دیکھا کہ ایسا اطمینان ہونا مشکل ہے بیماری (انفلوئنزا) جو پھیلی تھی تو لوگوں کے دلوں کی کیا حالت تھی سب جانتے ہیں کہ کیسی پریشانی سب کو تھی۔ وہ اسی حالت میں میرے پاس آئے تھے خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ بھی ایک شان

ہے اللہ کی کہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے ذرا ہراس ان پر نہ تھا ویسے وہ دیکھنے میں گنوار ہیں۔ کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں مگر فہم کی یہ حالت ہے کہ پڑھے لکھوں سے زیادہ فہیم ہیں۔

دین اور فہم

دین سے فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ اسی درستی فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرت مولانا گنگوہیؒ صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی مجھے مرید کرلو۔ حضرت نے فرمایا' اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلواتے ہیں کہ نماز پڑھو روزہ رکھا کرو سب کچھ کہلوایا جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کرائی نہیں مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے حضرت چونکہ طبیب بھی تھے جانتے تھے کہ دفعۃً افیون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو۔ میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اس میں سے کچھ کم کر کے باقی اس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھالیا کرو پھر مشورہ کر لینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا اجی مولوی جی جب توبہ ہی کرلی پھر اتنی اور اتنی کیا یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اری افیم جا میں نے تجھے چھوڑ دیا بس یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ شغل۔

افیون کے چھوڑنے سے دست آنے لگے۔ اس نے کہلا کر بھیجا کہ مولوی جی دعا کر دیجیے کہ میں اچھا ہو جاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا غرض بری حالت تک نوبت پہنچی مرتے مرتے بچا مگر اچھا ہو گیا تندرست ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں افیم والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دو روپیہ پیش کئے مولانا نے کس قدر عذر کے بعد دلجوئی کی اور روپے قبول فرمالئے تو آپ کہتے ہیں کہ اجی مولوی جی یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب بتلادے کیسے روپے ہیں اس نے کہا کہ یہ روپے افیم کے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ افیم کے کیسے اس نے کہا میں دو روپے مہینہ کی افیم کھاتا تھا جب میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دو روپے ماہوار بچیں گے میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی بس میں نے نفس سے کہا کہ یہ یاد رکھو کہ یہ روپیہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے دے دوں گا بلکہ اسی وقت نیت کرلی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس یہ دو روپیہ ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔

دیکھا آپ نے یہ گنوار کی حکایت ہے جس کو پڑھنا لکھنا کچھ نہ آتا تھا مگر دین کی سمجھ ایسی تھی کہ دین میں دنیا کی آمیزش کو فوراً سمجھ گیا یہ وہ بات ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ کامل بزرگوں سے ایسے واقعات منقول ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس مٹکے شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آئے تھے آپ بھی دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے پہنچے جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے آپ نے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا انیس توڑ دیئے صرف ایک مٹکا باقی رہ گیا تھا کہ اس کو آپ نے چھوڑ دیا اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی خلیفہ کو غصہ آیا اور ان کے پکڑ لانے کا حکم ہوا حاضر کئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرات کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے۔

وامر بالمعروف و انه عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابک حکم کر کرنے کا اور روک برائی سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اس پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا وہ اس طرح کہ جب میں انیس مٹکے توڑ چکا تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی اس بات پر نفس پھولا تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے نہ رہا تھا خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کا معتقد ہو گیا اور محتسب شہر بنا دیا اسی طرح نفس کی کید کی طرف اس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آ گئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہو جاتا ہے ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف ہوتی ہیں جو علماء کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی تھی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اوروں سے زیادہ عطا ہوئی ہیں۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

چنانچہ سب نعمتوں کی روح اطمینان ہے اور اس شخص کو اطمینان کہ اگر خالص دین کے ہو جاؤ گے تو اوروں سے اچھے رہو گے ایسا میسر ہوتا ہے جو مال سے بھی کبھی حاصل نہیں ہو سکتا پھر ایک اور بات کہتا ہوں کہ دنیا کی چیزوں سے اگر تعلق کم ہو گیا تو ضرر کیا ہوا بلکہ تعلق کم ہونے سے تو اور قید سے رہائی ہو جائے گی۔ بہر حال یہ اثر ہے دین میں کہ دنیا کا فکر و غم کم ہو جائے گا یہ خود اس میں خاصیت ہے۔

باقی بعضوں کا یہ خیال ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے سب کام پورے کر لیں اس کے بعد

دین حاصل کرلیں گے کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔

کارے دنیا کسے تمام نہ کرد (دنیا کے کام کسی نے بھی پورے نہ کئے)

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ساری عمر دنیا کے قصوں میں گزر جاتی ہے دین کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ بس اگر کامیابی کی صورت ہے تو یہی ہے کہ دین کا کام شروع کردو۔ یہ انتظار ہی مت کرو کہ پہلے دنیا کا کام تمام کرلیں پھر دین کا کام کریں گے دین کی روشنی پھیلنے سے فضول دنیا کی ظلمت خود ہی جاتی رہے گی اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس کی ہمت نہ ہو تو چلو یہ بھی نہ سہی بلکہ یوں کرو کہ دونوں کو ساتھ ساتھ شروع کردو۔ دنیا سے فارغ ہونے کا انتظار مت کرو۔ دین خود دنیا پر غالب آجاوے گا۔

دنیا کے ساتھ دین شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعت وتجارت میں منافات ہے پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ دکانداری نہ ہو تب طاعت ہوسکتی ہے دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرمارہے ہیں کہ ان کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت نہیں ڈالتی یوں نہیں فرمایا **رجال لا يتجرون** کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی ذکر اللہ بیع وتجارت کو چھوڑاتا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

بہرحال ایک غلطی تو یہ ہے کہ بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ دنیا کو جب تک بالکل نہ چھوڑ دیں دین کیا اختیار کریں اور دنیا چھوڑنا مشکل اس لئے وہ دین کو اختیار ہی نہیں کرتے حالانکہ دین دنیا کو چھوڑاتا نہیں یہ غلطی تو ان لوگوں کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے اس غلطی کا سبب وہی دین ودنیا میں تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں دین کی عظمت ہے اور بزعم خود اس کے طالب بھی ہیں مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جس کو فقیر سن لیا اس کی تعظیم کرنے لگے گو وہ تعظیم شرک ہی کیوں نہ ہو اگرچہ منشاء اس تعظیم کا عظمت ہے دین کی مگر اس عظمت میں غلو ہوگیا ہے اس لئے وہ پیروں ہی کے

ہو لئے اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو گئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تجارت اور دین میں تنافی ہے اس لئے دنیا کو بالکل قطع کرتے ہیں۔ اس غلطی کا سبب بھی وہی دین و دنیا کا تنافی کا اعتقاد ہے۔

ایک غلطی نئی تعلیم یافتوں کو ہوتی ہے کہ وہ خالص دنیا کے قصد کو ضروری نہیں سمجھتے انہوں نے اصل اور مقصود بالذات دنیا ہی کو قرار دے رکھا ہے اس کے تابع دین بھی سہی دین کو دنیا کے ساتھ ایسا سمجھتے ہیں جیسا دوپٹہ میں ہیمک اصل مقصود تو دنیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا لگاؤ دین کا بھی سہی دین کو متبوع نہیں سمجھتے جیسے کپڑا تو اصل ہے اور ہیمک اس کے تابع اسی طرح یہ لوگ دنیا کو اصل قرار دے دیتے ہیں کہ اگر وقت بچے تو خیر دین کا کام بھی کرلو۔ اگر نہ بچے تو مت کرو۔

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لئے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی غرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے کوئی واقعی چیز نہیں مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلا دیا جائے کیسے تخویف ہو سکتی ہے جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز سے ڈرایا جا رہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعوے عقلاً بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی غرض سے دوزخ کا ذکر کیا ہے جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فضول ذکر کیا ہے سو ایسا ایمان و اسلام آپ ہی کو مبارک ہو جو خدا کی طرف لغو اور عبث کو منسوب کرے اور اگر فرض بھی کرلو نعوذ باللہ جنت و دوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے ان کا ذکر کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہم کو ڈرایا ہے تو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی غرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خداوند تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اس کو توڑنا چاہتے ہیں کیا آپ کے ذمہ یہ بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہو گئی۔

علاوہ اس کے اگر جنت و دوزخ کا وجود نہیں تو ان سے ڈرانا ایسا ہوا جیسے ہوی سے بچوں کو ڈرایا کرتے ہیں کہ اسکا وجود کچھ بھی نہیں ہوتا تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا پھر اس کا بھی قائل ہونا پڑے گا کہ نیز اللہ تعالیٰ بے وقوفوں ہی کے ڈرانے کو ہیں۔ ان عاقلوں کے ڈرانے کو نہیں کیونکہ ہوا سے تو بے وقوف ہی ڈرا کرتے ہیں۔ لندن کی ہوا کھانے والے خاک ڈریں گے سبحان اللہ! کیا عظمت کی ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی عنقریب معلوم ہو جائے گا آخرت میں۔

غرض ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا باقی دین و مذہب وہ محض دنیا کی حفاظت کیلئے ہے۔

مذہب کا اثر

اس طرح سے مشاہدہ ہے کہ مذہب کے برابر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا جب مذہب کی پابندی ہوگی تو فتنہ فساد نہ ہوگا کوئی کسی کا حق نہ مارے گا' چوری نہ کرے گا آپس میں اتفاق قائم رہے گا پس دنیا پرامن ہوگی گویا مذہب ان کے نزدیک اس لئے بنایا گیا ہے کہ دنیا کی حفاظت رہے۔

صاحبو! اس سے تو سارا قرآن و حدیث ہی اڑا جاتا ہے پھر چونکہ اصل مقصود ان کے نزدیک دنیا ہے اور اہل دین مقصود دین کو سمجھتے ہیں اس لئے یہ لوگ دین والوں کو بے وقوف بھی سمجھتے ہیں اور اس اعتقاد کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ اپنوں سے بوجہ طالب دین ہونے کے غیر معتقد اور غیر قوموں کی بوجہ طالب دنیا ہونے کے مدح کرتے ہیں ان لوگوں کا یہ مذاق ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو بات بھی ہے وہ تو ان کے نزدیک بری اور غیر قوموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اچھی ہمیشہ اپنے لوگوں کی برائی اور غیر قوموں کی مدح کرتے رہتے ہیں۔

ایک اثر یہ ہے کہ علماء کی بات کو نہیں مانتے کیونکہ ان کو تو بیوقوف شمار کرتے ہیں چنانچہ علماء ہمیشہ سے کہتے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک جماعت خالص مذہبی ہونی چاہیے جو محض مذہب کی خدمت کرے مگر یہ لوگ اس میں قیل وقال کرتے رہے لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی یہ ساری قیل و قال اسی وقت تک رہی جب تک کہ غیر اقوام نے اپنے اندر ایسی مذہبی جماعت پیدا نہیں کی تھی اور اب جو وہ ایسا کرنے لگے تو یہ بھی ان ہی کا دم بھرنے لگے کہ مذہبی جماعت ضرور ہونا چاہئے چنانچہ غیر قوموں کی دیکھا دیکھی اب کسی قدر یہ بھی علماء کے ہم زبان ہو گئے ہیں بس ان کا مشرب وہی ہو جاتا ہے جو غیر قوموں کا مشرب ہو جاوے حالانکہ بفضلہ تعالیٰ ہمیں قوموں سے کسی چیز کے لینے کی کچھ بھی حاجت نہیں ہمارے یہاں تو سب کچھ ہے مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یک سبد پرناں ترا بہ فرق سر
تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

ایک ٹوکرا روٹیوں کا بھرا ہوا تیرے سر پر رکھا ہوا ہے اور تو روٹی کا ٹکڑا اور در بدر مانگتا پھرتا ہے۔

ہمارے یہاں تو جواہرات بھرے ہوئے ہیں اور یہ دوسروں سے کوڑیوں کے طالب ہیں اسی طرح یہ لوگ تقلید کرتے ہیں غیر قوموں کی حالانکہ اپنے یہاں سب کچھ ہے۔

کورانہ تقلید

اور طرفہ یہ ہے کہ اس کورانہ تقلید میں پریشانی بھی اٹھاتے ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی

ایک اوچھے صاحب تھے۔ جنٹلمین، گھر کے غریب تھے اس لئے کوٹ پتلون بھی صرف سوتی کپڑوں کا تھا جس میں ذرا گرمی نہ تھی جاڑے کا موسم ریل میں سفر کر رہے تھے اور جنٹلمینی لباس پہنے ہوئے تھے کان بھی کھلے ہوئے سر بھی کھلا ہوا ایک انگریز نے لیمن پانی اور برف پیا آپ نے بھی تقلید میں برف پیا بس اینٹھ گئے ایک اور صاحب جو مجھ سے اس حکایت کو بیان کرتے تھے اس درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس رضائی تھی ان کو صاحب بہادر کے حال پر رحم آیا انہوں نے کہا کہ رضائی لیتے ہو کچھ انکار نہ کیا چپکے سے لے لی سب اینٹھ مروڑ نکل گئی خدا کے بندے کو اس حالت میں بھی برف پینا رہ گیا تھا مگر صاحب بہادر کیسے بنیں اگر ایسا نہ کریں وہی مثل ہے۔

کلاغے تگ کبک در گوش کرد　　تگ خویشتن را فراموش کرد

ایک کوے نے چکور کی چال اختیار کی اپنی چال کو بھول گیا۔

ایک اور صاحب بہادر ریل میں سفر کر رہے تھے اور ایک مولوی پرانے خیال کے سیدھے سادھے چلن والے بھی اس درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ صراحی تھی اس میں انہوں نے پانی بھر کر رکھ لیا تھا کیونکہ راستہ میں پانی کی کمی تھی آپ صراحی کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے انہوں نے کہا جیسا میں ہوں ویسا ہی میرا برتن ہے چونکہ بیچارے سادے کپڑے پہن رہے تھے اور ایسے لوگوں کی آج کل کچھ قدر نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو یہ لوگ دقیانوسی خیال کا کہتے ہیں اس لئے انہوں نے ایسی بے باکی کی گفتگو کی صاحب بہادر کو اتفاق سے شدت کی پیاس لگی اور پانی ساتھ رکھنا خلاف تہذیب تھا اب لگے کن انکھیوں سے مولوی صاحب کی صراحی کو تکنے مگر شرم کے مارے مانگیں کیسے واقعی کریم النفس اہل اللہ پر ختم ہے۔ مولوی صاحب کو ان کی حالت پر رحم آیا کوئی اور ہوتا تو کبھی رحم نہ کرتا۔ انہوں نے قرائن سے معلوم کر لیا کہ اس کو پیاس لگی ہے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے تو یہ مولوی صاحب بتکلف آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور تھوڑی ہی سی دیر میں مصنوعی خراٹے بھی لینے لگے تا کہ یہ صاحب سمجھیں کہ سو رہے ہیں جب اپنے خیال میں انہوں نے سوتا ہوا سمجھ لیا تو اپنی جگہ سے اٹھے صراحی سے پانی پینے کے ارادے سے یہ بھی چپکے چپکے دیکھتے رہے صاحب بہادر نے صراحی اٹھائی مگر ڈرتے جاتے ہیں کہ کہیں جاگ نہ جائیں مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا اس خیال سے کہ بیچارے غریب کو پانی پی لینے دو پیاسا نہ رہ جائے دیکھئے کیا حوصلہ ہے اہل اللہ کا غرض آپ نے خوب پانی پیا۔ جب پانی پی کر صراحی رکھنے لگے تو مولوی صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ہائیں! آپ نے بھنگیوں کے برتن سے پانی کیسے پی لیا اب تو بڑے خفیف

ہوئے اور کہا معاف کیجئے میں اپنی بات کو واپس لیتا ہوں واقعی مجھ سے حماقت ہوئی پھر جو صاحب بہادر کو معلوم ہوا کہ مولانا کسی اسکول کے پروفیسر بھی ہیں اب تو لگے تعظیم کرنے۔

ایسے لوگوں کا ایک فیشن یہ بھی ہے کہ سفر میں بستر بچھونا نہیں لیتے پانی کا برتن ساتھ نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ جہاں جائیں گے وہاں بستر بچھونا موجود ہے اور پانی اسٹیشنوں پر ملتا ہی ہے پھر کیا ضرورت ہے کچھ نہیں صرف غیر قوموں کی تقلید ہے خواہ اس میں تکلیف ہی ہو۔

ان کے اسی مذاق کی بناء پر میں نے الہ آباد میں ایک وعظ میں جنٹلمینوں سے خطاب کیا تھا کہ صاحبو! لندن سے ڈاڑھی رکھنے کا فتویٰ آنے والا ہے اخبار کی خبر ہے کہ لندن والوں نے اس پر رائے دی ہے کہ ڈاڑھی رکھنی چاہیے اب قبل اس کے کہ وہ لوگ ڈاڑھی رکھیں تم جلدی ڈاڑھی رکھ لو کیونکہ اگر آپ نہ رکھی اور بعد میں تو ضروری ہی رکھو گے تو لوگ مطعون کریں گے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے تو نہ رکھی اور لندن والوں کے کہنے سے رکھی اس لئے ابھی سے رکھ لو تا کہ بدنامی نہ ہو۔

اسی طرح علماء کی اس بات کو کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو محض دین کی خادم ہو اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاوے کسی نے نہیں مانا تھا مگر ابھی تھوڑے دنوں سے ہندوؤں نے یہ کام شروع کر دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ایک جماعت مذہبی ایسی ہونی چاہیے جو صرف مذہب کی خدمت کرنے والی ہو اور کوئی کام اسکے متعلق نہ ہو بس دن رات یہی کام کیا کرے تو مسلمان بھی کچھ کچھ سمجھنے لگے۔

غرض ان کو شب و روز دنیا ہی مقصود ہے۔ مذہب کو یہ لوگ محض اس لئے اختیار کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے مصالح دنیا محفوظ رہیں۔ باقی دین کو دینی حیثیت سے اختیار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینی امور کو از خود اختیار کرتے۔ اسی کو پسند کرتے اور دوسری قوموں کے کیوں منتظر تھے۔ بس ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود اور دین کو تابع قرار دیتے ہیں حالانکہ **لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله** تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔ کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا خود مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے **لاتلهيهم ذكر الله عن التجارة** یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

بعثت انبیاء کا مقصد

یہ مسئلہ تو مسلمانوں کے نزدیک بالکل بدیہی بلکہ حسی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا کمانے کے طریقے نہیں بتلانے

ہیں صرف احکام بتلائے ہیں اور چونکہ عقلی مسئلہ ہے کہ فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ اگر دنیا مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا نمونہ کیوں نہیں بنایا اس طرح سے کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دین میں بے مثل نمونہ ہے تو دنیا میں بھی بنتے مگر احادیث دیکھ لیجئے کہ آپ کس چیز کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں (جیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے) تو تواریخ تو موجود ہیں (تواریخ ان حضرت کا دین ایمان ہے) تواریخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دیکھئے کہ کیا تھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت تھی......!

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تادیباً اپنی بیبیوں کے پاس جانے کی ایک مہینے کے لئے قسم کھائی تھی اور مشہور یہ ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو طلاق دے دی ہے اور اس پر سب لوگ رو رہے تھے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو شبہ ہوا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا ہے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے آئے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو ان کی سفارش ماننی پڑے گی۔ اس لئے اجازت نہیں ملی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے پکار کر عرض کیا کہ میں حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے نہیں آیا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیں تو میں حفصہ کا سر اتار لاؤں میں صرف واقعہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آنے کی اجازت دے دی۔

وہ حاضر ہوئے اس کے بعد ان کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ چمڑے لٹکے ہوئے تھے بس یہ کائنات تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی نہ بکس نہ الماری نہ میز نہ کرسی نہ بنگلہ نہ کوٹھی نہ اور کوئی ساز و سامان۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کے آنسو جاری ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قیصر و کسریٰ خدا تعالیٰ کے دشمن صلیب پرستی کرنے والے ان کے پاس تو یہ ساز و سامان اور آپ کی یہ حالت۔ آپؐ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر دنیا کی وسعت فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب سے یہ نہیں کہا کہ آپؐ پر وسعت فرما دیں جیسے کہتے ہیں کہ آپ کے خادموں کو ایسا کر دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ بات سن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔

افی شک انت یا عمر[1] (اے عمرؓ! تم ابھی تک شک ہی میں ہو)

---

[1] مسند الامام احمد ۱: ۳۳، سنن الکبریٰ للبیہقی ۷: ۳۸، تفسیر ابن کثیر ۸: ۱۱۹، کنز العمال: ۳۲۲۳

ان لوگوں کو تو جو ملنا تھا سب کچھ دنیا میں مل گیا ہے وہاں کچھ نہیں اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور یہ معاشرت۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث مولویوں کی گھڑی ہوئی ہے میں کہتا ہوں کہ تمہارے نزدیک تاریخ تو گھڑی ہوئی نہیں تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے کہ حضورؐ کے یہاں دنیا کم تھی یا زیادہ سو حدیث میں بھی ہے اور تاریخ میں بھی ہے کہ دنیا آپ کے یہاں بہت ہی کم تھی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں مہمان آئے ہیں پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جواب آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں۔ کیا اس واقعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن ہی کو دیکھ لیجئے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلوبیت کے ساتھ نام بھی نہیں لیا گیا جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات امر فرمایا ہے ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔

کسب حلال اور حب دنیا

باقی میں کسب حلال سے منع نہیں کرتا **کسب الحلال فریضۃ** حدیث ہے پس کسب حلال تو فرض ہے ہاں حب دنیا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

حب الدنیا راس کل خطیئۃ[1] (کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے)

صاحبو! ایک دیہ ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حب دنیا حرام ہے اور ان میں باہم تلازم نہیں نہ کسب دنیا کے لئے حب دنیا لازم اور نہ حب دنیا کے لئے کسب دنیا لازم کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حب دنیا اس وقت بھی ہو سکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حب دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حب دنیا بھی ہو مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسب دنیا نہ حب دنیا مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں غرض حب دنیا و کسب دنیا متلازم نہیں بعض محب ہیں کاسب نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محب نہ ہو سو ہم حب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ باقی

---

[1] کنز العمال· ۶۱۱۳، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۱۳، الدر المنثور ۲. ۳۳۱

کسب دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں بھلا فرض کفایہ سے کون منع کر سکتا ہے۔ بس محبِ دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسب دنیا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب کی حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے اس کو چاہیے کہ کسب دنیا کرے۔

علماء اور کسب دنیا

ایک وہ لوگ ہیں کہ ان کے دنیا میں نہ مشغول ہونے سے کسی کا ضرر نہیں نہ ان کا نہ اہل عیال کا سو یہ لوگ اگر کسب دنیا نہ کریں تو کچھ حرج نہیں خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کر سکیں ان کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں بشرطیکہ ترک کسب سے تشویش میں نہ پڑیں اللہ کے ایسے بندے ہر زمانہ میں ہوئے ہیں مگر ایک جماعت ہے دنیا پرستوں کی وہ ایسے حضرات پر طعن و اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں آرام طلب ہیں۔ حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے چنانچہ اس مضمون کو ایک مسلم عند العقلاء (عقلمندوں کے نزدیک) مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اس کو دوسرا کوئی کام تجارت وغیرہ کرنا ممنوع ہے مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اس پر گرفت ہو گی۔ چنانچہ ایک شخص ملازم تھے انہوں نے ملازمت کی حالت میں مطبع کیا کچھ روز بعد کسی نے مخبری کر دی ان پر شبہ ہو گیا بہت قصہ پھیلا گو پورا ثبوت نہ ہونے سے بری تو ہو گئے مگر وہ پریشان اتنے ہوئے کہ انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے مگر اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر بڑی سرکار (یعنی اللہ میاں) کا کوئی ملازم ہو اور اس لئے وہ اسباب معاش کو ترک کر دے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نکمے ہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں تعجب

ہے کہ اللہ میاں کے فتوے کی تصدیق نہ ہو اور حکام کے فتویٰ کی تصدیق ہو۔ **قال اللہ و قال الرسول** (اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) پر قناعت نہ ہو اور **قال الحکام** پر قناعت ہو میں گورنمنٹ کے اس قانون کا راز بتلاتا ہوں گو میرے ذمہ تو ہے نہیں مگر خیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہو سکتا اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری کام میں خلل واقع ہوگا۔ اس لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے اسی طرح جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے مشینیں اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے تو وہ مثال مذکور کو پیش نظر رکھ کر خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا میں مشغول ہوں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا یہی ہوگا کہ دین کا کام نہ کر سکیں گے۔

ایک مولوی صاحب جو ایک دینی ملازم تھے مگر لکڑیوں کی تجارت بھی کرتے تھے، خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو پڑھانے بیٹھے ہیں کہ گاہک آ گیا اس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا بس مولوی صاحب کشمکش میں پڑ گئے اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج اگر نہیں اٹھتے تو خریدار لوٹا جاتا ہے۔ مجبوراً اس سے کہتے ہیں کہ بھائی ابھی اٹھتا ہوں ذرا ٹھہرو۔ اس میں تھوڑا جھوٹ بھی تھا غرض ان کا دل بٹ جاتا سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی بتلا رہے تھے اب دل دوسری طرف ہو گیا۔ طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو ان پر جھنجلاتے ہیں غصے ہوتے ہیں۔ بس علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ دین کا کام پوری طرح نہیں کر سکتے۔

انہی کے متعلق ایک اور قصہ ہے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا ایک بڑھیا اپنے دروازے میں جھانک رہی تھی مجھ کو دیکھ کر بولی کہ بیٹا، یہاں آنا۔ میں گیا تو بولی کہ ایک مسئلہ تو بتا دو وہ یہ کہ زکوٰۃ دینا مدرسہ میں جائز ہے یا نہیں میں نے مسئلہ بتلایا پھر کہنے لگی کہ میں نے ان سے (یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے) بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا مگر مجھ کو ان کا یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر یہ شبہ نہیں خیر میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ جیسا گمان علماء پر جائز نہیں۔

یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ تو معلوم ہو گیا کہ مسائل تک میں ان کا اعتبار نہیں رہتا میں کہتا ہوں جو لوگ علماء کو مشورہ دیتے ہیں دنیا میں مشغول ہونے کا اگر علماء ان کی رائے

پر عمل کریں تو سب سے پہلے یہی لوگ ان کو مردود ٹھہرائیں گے۔ اس لئے علماء کو یہ مشورہ مت دو کہ وہ دنیا میں مشغول ہوں ان کے مشغول ہونے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ خود تم کو ان کے فتاوی کا ان کے وعظوں کا اعتبار نہ رہے گا۔

غرض علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہ اثر ہے اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ علماء سے چندہ کی تحریک بھی مت کراؤ۔ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مت مقرر کرو اس میں بھی ان کا اعتبار جاتا ہے میری رائے یہ ہے کہ چندہ کی تحریک روسا کریں ان کی تحریک کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی دیں گے علماء کی طرف سے تو یہ خیال ہوگا کہ وہ دوسروں ہی سے کہنے کو ہیں خود کبھی کچھ بھی نہیں دیتے علماء سے وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں۔ (یعنی ان سے دین سیکھو) مگر آج کل علماء سے وہ کام لیا جاتا ہے جو ان کا نہیں ہے۔ کانفرنسوں میں لوگ علماء کو صرف اس لئے بلاتے ہیں کہ ان کے قال اللہ اور قال الرسول کے ذریعہ سے خوب چندہ ہوگا۔ سبحان اللہ! مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹٹو ہوئے علماء کو بھی چاہیے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں علماء کا طرز تو وہ ہونا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حکم تھا۔

وامر اهلک بالصلوٰة اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کرو۔

یہی ان کا طرز بھی ہونا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے۔

ام تسئلهم خرجاً فخراج ربک خیر و هو خیر الرازقین یا آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ کے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے۔

سو مانگنا علماء کا کام نہیں ان نصوص کی بناء پر ان کی شان کے بھی خلاف ہے اور وہ بات بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ان پر بدگمانی بھی ہوتی ہے اور روساء پر یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص پچاس روپیہ اپنی جیب سے دے گا تو اوروں سے پچاس لے سکتا ہے اور یہ روساء کر سکتے ہیں اس لئے علماء کو چاہیے کہ وہ اس کام کو نہ کریں۔

علماء وامراء کے اختلاط کا اثر

پھر یہ تحریک علماء کے فرض منصبی میں بھی مخل ہوتی ہے چنانچہ ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی امیر کے پاس جائیں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں تو ہم ان کو منع نہیں کر سکتے کیونکہ ہم اپنی غرض کو ان کے پاس جاتے ہیں

اس لئے دینا پڑتا ہے۔ غرض ان مقاصد کے سبب علماء کا اختلاف امراء سے اچھا نہیں اکثر ان کے اختلاط سے خود مولوی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک کابلی مولوی صاحب مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ میں ایک وزیر ریاست کے پاس بیٹھا تھا وزیر صاحب ڈاڑھی صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حسین چہرہ دیا ہے مگر جو چیز چہرہ کی زینت ہے اس کو آپ مٹا دیتے ہیں۔ اس کہنے سے وہ کچھ شرما گئے ایک دوسرے مولوی صاحب ان کے ہاں اور بیٹھے تھے وہ خوشامد میں کیا کہتے ہیں کہ ڈاڑھی کبھی نہ رکھنی چاہیے اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور باہم زنا کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ چکلہ آپ نے کیوں رکھ چھوڑا ہے اور باہر آ کر میں نے ان مولوی صاحب کو بہت لتاڑا اور کہا کہ تم کو خوف نہ ہوا کہ ایسی باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم جب مکان سے چلتے ہیں ایمان تو فلاں نالہ پر چھوڑ آتے ہیں۔

سو علماء کے لئے امراء کا اختلاط ایسا سم قاتل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز علماء کے پاس ہے (یعنی علم) امراء کو بزعم خود اس کی ضرورت نہیں اور جو چیز امراء کے پاس ہے یعنی مال علماء کو اس کی ضرورت ہے اس واسطے ان کو امراء کے پاس جا کر جھکنا پڑتا ہے اس لئے حق بات نہیں کہہ سکتے بس علماء کو تو آزاد رہنا چاہیے اور ان کی آزادی کی یہ حالت ہونی چاہیے۔

زیر بار اند درختاں کہ ثمرہا دارند
اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ غم کی قید سے آزاد ہے۔

اور اس آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کرتے رہیں۔

علماء اور تنخواہ

باقی یہ کہ پھر ان کی معاش کا کیا انتظام ہوگا سو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو توکل کریں یا پابندی سے جو خدمت کریں تدریس یا تبلیغ اس پر کسی مدرسہ یا انجمن سے تنخواہ مقرر کرا لیں پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو پھر وہی دین فروشی ہوئی جس کی خدمت کی جا رہی ہے سو میں اس کی تحقیق بتلاتا ہوں سنئے اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی کی خدمت میں محبوس ہو اس کا نفقہ اس کے ذمہ ہوتا ہے اور یہ قاعدہ تمام دنیا کے عقلاء کا معمول بہ ہے حتی کہ سلاطین تک کے لئے بھی یہی قانون نافذ ہے بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لئے کہ وہ رعایا کے کام میں محبوس ہے کیونکہ

بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بناتی ہے اور اس کو بیت المال کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کس چیز کا نام ہے اس کی حقیقت بتلاتا ہوں ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی اور ایک پائی عمرو کی اور ایک پائی بکر کی جس کوٹھری میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اس کا نام خزانہ ہے حقیقت اس کی وہی چندہ ہے وہ بھی قومی چندہ ہے اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے صرف خزانہ کے لفظ سے اس کی عزت بڑھ گئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اس کی وہی چندہ قومی ہے پس یہی حقیقت اس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ یا نذر ملتی ہے مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو لوگ ذلت سمجھتے ہیں اور بادشاہ کے لئے ذلت نہیں سمجھی جاتی ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشاہ کو ایک لاکھ ملتے ہیں اس لئے ذلت نہیں خیال کیجاتی اور مولوی بیچاروں کو تھوڑی مقدار ملتی ہے اس لئے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں مگر بغور دیکھئے حقیقت دونوں جگہ ایک ہی ہے اور جب حقیقت ایک ٹھہری تو جس نے چندہ میں سے ایک پیسہ لیا اس کی کم ذلت ہونا چاہیے اور جس نے زیادہ لیا اس کی زیادہ ذلت ہونی چاہیے۔

اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق کی علت کیا ہے سو وہ استحقاق کی علت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے اس لئے اس کا نفقہ رعایا کے ذمہ ہے اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے سب کو چندہ قومی ہی سے تنخواہ ملتی ہے کلکٹر کو بھی ڈپٹی کلکٹر کو بھی جج کو بھی منصف کو بھی۔ بس یہ مسئلہ عقلی ہوا اور اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کر لیا جیسے زوجہ کا نفقہ اس کے شوہر پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے پاس محبوس ہوتی ہے۔

اب بتلایئے یہ علت علماء کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لئے ان کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں دین کا کام کر نہیں سکتے اگر ان کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں ان پر کسی کا احسان بھی نہیں کبھی کوئی احسان کرنے لگے اس لئے کہ اگر وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں پس آپ کے ذمہ تو ان کا قرض ہے اگر یہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلوائیں اور یہ دوسری بات ہے کہ وہ قیامت میں معاف کر دیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ معاف ہی کر دیں گے۔ غرض علماء چونکہ قوم

کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لئے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم کے ذمہ ہے البتہ کسی خاص وعظ پر نذرانہ ٹھہرا کر لینا یہ ناجائز ہے باقی جو محبوس ہونے کے سبب تدریس یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے ایسا نہ ہو تو پڑھنے پڑھانے کا اور تبلیغ کا سلسلہ ہی ختم ہو جاوے گا اور سارا دین درہم برہم ہو جاوے۔ اس تقریر سے دونوں باتوں کا جواب نکل آیا ایک تو یہ کہ مولوی تنخواہ وغیرہ کیوں لیتے ہیں دوسرے یہ کہ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ اگر یہ لوگ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں تو بادشاہ اور وائسرائے اور جج کلکٹر سب ہی خیرات کھاتے ہیں اگر یہی بات ہے تو کسی کو بھی تنخواہ نہ لینی چاہئے کیونکہ سب کو قوم ہی کے چندہ سے تنخواہ ملتی ہے۔

آزمائش علماء

مگر اس تقریر سے کوئی مولوی صاحب دھوکہ میں نہ پڑ جائیں کہ ہم تو دین کی خدمت کر رہے ہیں اور ہماری تنخواہ نفقہ حبس ہے اس لئے ہم کاسب دنیا نہیں خوب سمجھ لیجئے اور اپنے معاملات میں غور کر لیجئے ان معاملات اور واقعات سے کاسب دنیا ہونے نہ ہونے کا اندازہ ہو جائے گا وہ معاملہ محل غور یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ایک جگہ نوکر ہیں دین کی خدمت کر رہے ہیں اور پچاس روپے تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں گزر ہی اوسط درجہ کا ہو رہا ہے تنگی بھی نہیں پچاس روپے کافی ہو جاتے ہیں اس حالت میں ایک اور جگہ سے خط آیا ملازمت کا کہ مبلغ سو روپے تنخواہ ملے گی یہاں چلے آؤ شاید کہیں طلباء نے بیچاروں کی تعریف کر دی ہو گی۔ بعض مدرسین اس لئے بھی طلباء کی خاطر کرتے ہیں کہ کہیں مہتمم سے ان کی برائی نہ کر دیں اور نوکری جاتی رہے اسی طرح بعض مہتممین بھی طلباء کی بہت خاطرداری کرتے ہیں اگرچہ وہ نا قابل ہی ہوں کہ کہیں مدرسہ سے چلے نہ جائیں جس سے مدرسہ کی رونق کم ہو جاوے پھر اس سے چندہ کم ہو جائے حالانکہ مدرسہ علمی کا مہتمم عالم باعمل ہونا چاہیے جو علم کے سبب تو بھلے برے کو سمجھتا ہو کیونکہ ناواقف ہونے کی صورت میں طلباء کی جرات بڑھتی ہے اور جو عالم ہو گا وہ سب باتوں کو سمجھے گا اور طلباء پر اس کا دباؤ ہو گا یا اگر مہتمم عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کی صحبت میں رہا ہو ہر بات کو سمجھتا ہو یہ نہ ہو کہ عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کے سبب حدود طمع و غرض سے پاک ہو خواہ اپنی غرض یا مدرسہ کی غرض سے تکثیر سواد یا تکثیر چندہ پر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں طلباء نے مولوی صاحب کی تعریف کر دی وہاں سے سو روپیہ تنخواہ کی

ملازمت آ گئی اب اس سے دین یا دنیا کی طلب کا حال معلوم ہو جائے گا خلاصہ یہ کہ وہاں نئی جگہ میں نفع مالی بھی زیادہ ہے عزت بھی زیادہ ہے مگر دین کی خدمت کا موقع زیادہ نہیں بلکہ دین کی خدمت اس جگہ زیادہ ہے جہاں تنخواہ پچاس روپیہ ہے مگر کافی ہے اب دیکھا جائے گا کہ مولانا پھسلتے تو نہیں اگر لکھ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا ہوں میرا گزر ہو رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ مقصود ان کا دین کی خدمت ہے اور تنخواہ تبعاً لے رہے ہیں اور ان کی تنخواہ جزائے حبس اور میری تقریر کا مصداق ہے اور جو مولانا چل دیئے تو سمجھا جائے گا کہ مولانا دنیادار ہیں۔ انہوں نے جو تنخواہ کو جزائے حبس بتایا تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ محض دھوکہ تھا اسی طرح جب مولوی صاحب کسی مدرسہ میں نوکر ہونے لگیں اور وہاں ایسی صورت ہے کہ جو تنخواہ ہم کو ملے گی ہمارا گزارہ معمولی طریقہ سے اس میں ہو سکتا ہے اگر اس کو ہم نے بطیب خاطر اختیار کر لیا اور واقع میں ہمارے مناسب حال بھی یہی تھا کہ تین پانچ نہ کریں تو سمجھا جائے گا کہ تنخواہ لینا دراصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود دین ہے اور اگر باوجود کافی ہونے کے پھر بھی تین پانچ کر کے تنخواہ طے ہوئی تو معلوم ہو گا کہ مولوی صاحب دنیادار ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ گاجر مولی کا سا مولویت کا بھاؤ ہونے لگا ہے لوگ بیس روپے تنخواہ کہتے ہیں اور وہ مولانا کے گزر کے لئے کافی ہے مگر مولانا کہتے ہیں کہ چالیس لوں گا جب رہوں گا لوگ کہتے ہیں کہ تیس لے لیجئے مولانا کہتے ہیں کہ اچھا نہ ہمارا کہنا رہے نہ تمہارا بس پینتیس رہے آپس میں جھگڑا تکرار ہو رہا ہے بالکل گاجر اور مولی کا سا سودا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول ہی نظر میں لوگوں کے دل سے اتر جاتے ہیں خیر کہنے سننے سے پینتیس قرار پا گئے پھر تھوڑے دنوں میں مولانا کے بچہ ہو گیا اب درخواست ہے کہ ہمارے ذمہ ایک خرچ آ گیا ہے ذرا خیال رکھئے گا اب اس جستجو میں ہیں کہ تنخواہ میں اضافہ ہو جائے وقتاً فوقتاً لوگوں کے کان میں یہ بات ڈالتے ہیں خیر لوگوں نے طوعاً و کرہاً چالیس کر دیئے پھر اس پر بھی قناعت نہیں سال چھ مہینے میں دوسرا بچہ ہو گیا اب پھر لوگوں کے سر ہیں درخواستیں کرتے کرتے **لاتقف عند حد** تک نوبت پہنچی ہے پس اگر یہ صورت ہے تو دنیاداری ہے اور اگر دوسری صورت ہے کہ تنخواہ میں گزر ہونے کی صورت میں اس کو چھوڑ کر زیادہ تنخواہ پر نہیں گئے یا جو تنخواہ گزر کے قابل مل گئی منظور کر لی کچھ تین پانچ نہ کیا اور خدمت دین میں مشغول ہو گئے تو ایسے شخص کو کاسب دنیا نہ کہا جائے گا۔

یہ تو معیار تنخواہ کی صورت میں تھا لیکن اگر کسی میں قوت توکل اعلیٰ درجہ کی ہو اور وہ تنخواہ وغیرہ

سب چھوڑ دے تو سبحان اللہ! مگر ہر ایک کے لئے یہ صورت درست نہیں کیونکہ سب میں یہ قوت نہیں یا کسی میں قوت توکل خود اپنی ذات کے واسطے تو ہے مگر اہل وعیال میں قوت توکل ایسی نہیں ہے ایسی اگر تنخواہ نہ لیں تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں تو ایسے شخص کو بھی تنخواہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ یہ بھی ایک عبادت ہے کہ انسان اپنے اہل وعیال کی کوئی خدمت کرے ان کے حقوق کو ادا کرے غرض اس بات میں لوگوں کے مختلف حالات ہیں بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے بعض کو نہ ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اور ہونے سے اطمینان رہتا ہے پس جس کو جس طرح اطمینان اور جمعیت قلب حاصل ہو وہ کرنا چاہیے۔

اہل اللہ کا استغناء

میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اس پر تعجب نہ کیا جائے واقعی اللہ کے بعضے بندے ایسے بھی ہیں جن کو مال کی کثرت سے بار ہوتا ہے وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اس کے حقوق کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا اس لئے ایسے لوگ کثرت مال سے گھبراتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ایک صاحب مطبع میں ملازم رکھنا چاہتے تھے آپ نے فرمایا کہ علمی لیاقت تو مجھ میں ہے نہیں اس لئے بڑا کام تو کر نہیں سکتا البتہ قرآن کی تصحیح کر لیا کروں گا اس میں دس روپیہ ماہوار دے دیا کرو۔ (اللہ اللہ کیا تواضع اور زہد ہے)

اسی زمانہ میں ایک ریاست سے تین سو روپیہ ماہانہ کی نوکری آ گئی مولانا جواب میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی یادآوری کا شکر گزار ہوں مگر مجھ کو یہاں دس روپے ملتے ہیں جس میں پانچ روپے تو میرے اہل وعیال کے لئے کافی ہو جاتے ہیں اور پانچ بچ جاتے ہیں آپ کے یہاں سے جو تین سو روپے ملیں گے ان میں پانچ روپے تو خرچ میں آئیں گے آگے دو سو پچانوے جو بچیں گے میں ان کا کیا کروں گا مجھ کو ہر وقت یہی فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں خرچ کروں اس لئے معذور ہوں اس لئے تشریف نہیں لے گئے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی لکھا تھا اور سو روپیہ تنخواہ لکھی تھی مولانا نے دوسرا جواب دیا کہ میں آ سکتا ہوں مگر تین سو روپے سے کم میں نہیں آ سکتا۔ حضرت مولانا محمد

قاسم نے فرمایا کہ مولانا ذرا سنبھل کر جواب لکھئے۔ اگر تین سو کی منظوری پر طلبی آ گئی تو وعدہ پر جانا پڑے گا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کے ساتھ یہ جملہ بھی بڑھا دیا کہ مگر اس میں ایک شرط ہے وہ یہ کہ جب چاہوں گا یہاں رہوں گا جب چاہوں گا وہاں رہوں گا وہ رئیس صاحب سمجھ گئے کہ ان حضرات کو آنا ہی منظور نہیں اور واقعی جانا تھوڑا ہی منظور تھا مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بات ظرافت کے طور پر لکھی دی تھی۔

اللہ اکبر! کس قدر استغناء تھا ان حضرات میں واقعی اہل اللہ کے دل پر مال کی کثرت سے بھی بار ہوتا ہے ان کو خیال ہوتا کہ خدا جانے اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں۔

میرے ذوق میں اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تھی تو اس کے ساتھ ان کی یہ خاص تسلی بھی حقوق ادا ہو سکنے یا نہ ہو سکنے کی کر دی گئی تھی ارشاد ہے۔ **ھٰذا عطاؤنا فامنن او امسک بغیر حساب** کہ یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو۔ یعنی عطا و امساک بالکل تمہارے اختیار میں ہے آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہوگا اس تسلی کے بعد ان کو سلطنت سے گرانی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے۔

اس آیت پر ایک بات یاد آ گئی کہ آج کل تعلیم جدید والے ترقی دنیا پر اس سے دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے معلوم ہوا ترقی دنیوی محمود ہے اول تو ان لوگوں کو تمام انبیاء علیہم السلام میں دلیل پکڑنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ملے ہیں میں کہتا ہوں کیا اور انبیاء علیہم السلام دنیا میں نہیں ہوئے ان کے حالات بھی لینے چاہیں دیکھ لیجئے کہ ان میں سے اکثر کی بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی کیا حالت تھی سب کی حالت قریب قریب فقر کی رہی ہے دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ حکمت الٰہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبار اور متکبر بادشاہ تھے اس وقت کا مقتضا یہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایسی سلطنت دی جاوے جس کا سب لوہا مان لیں اسی واسطے جانوروں اور ہوا تک پر ان کو حکومت دی گئی کہ تمام بادشاہ پست ہو گئے پس سلطنت ان کا معجزہ تھا یہ راز تھا ان کی سلطنت میں ترقی دنیا مطلوب نہ تھی چنانچہ اس حالت میں بھی حسب نقل عارف رومی

زار سلیماں خویش را مسکیں بخواند

یعنی آپ اپنے کو مسکین ہی کہا کرتے تھے اور اپنی ذات کے لئے بادشاہی سامان سے کام نہ

لیتے تھے بلکہ حسب نقل بہشتی زیور اپنی دستکاری زنبیل سازی کے پیسوں سے کھاتے پیتے تھے اور بادشاہ سے گھبراتے تھے کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے اس لئے آپ کے بارے میں ارشاد ہوا۔

فامنن او امسک بغیر حساب پس خواہ کسی پر احسان کرو یا بے اندازہ جمع کرو۔
کہ ہم ان حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہ لیں گے آپ نہ گھبرائیے۔

جمعیت قلب

میں نے اوپر اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اصل چیز جمعیت قلب ہے جس طریقہ سے بھی حاصل ہو بعض کو پریشانی ہوتی ہے مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا نہ ہونا اچھا اور بعض کو جمعیت ہوتی ہے مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا ہونا اچھا ہر ایک کی حالت جدا ہے پس اگر کسی کو مال کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو اسے چاہیے کہ خدا نے جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا ہے بس صرف وہی کام کرے۔

اس بیان پر ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ ادھر تو جوابا یا اباحۃ یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لگو اور اس کے ساتھ ہی یوں کہا جاتا ہے کہ غافل مت رہو دونوں باتوں کا اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ جب دنیا میں لگا جاوے گا تو دوسری طرف سے غفلت ضرور ہوگی یہ تو وہ بات ہوگی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

(گہرے دریا میں تو نے مجھے تختہ سے باندھ دیا ہے پھر کہتا ہے کہ ہوشیار رہ کہ دامن نہ بھیگے)

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض غیر محقق ہی کرے گا محقق کبھی یہ اعتراض نہ کرے گا۔ بات یہ ہے کہ امور غیر مطلوبہ دو قسم کے ہیں اختیاری اور غیر اختیاری امور غیر اختیاری میں تو ملامت نہیں وہ تو اختیار سے باہر ہیں انسان ان کا مکلف نہیں کیا گیا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا** کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ البتہ امور اختیاریہ پر ملامت ہے پس غفلت ایک تو اختیاری ہے اور ایک غیر اختیاری ہے غفلت اختیاری میں تو ملامت ہے اور غیر اختیاری میں بالکل ملامت نہیں۔

مثلاً ایک نیک کام کیا جو توجہ کے ساتھ کرنا چاہئے تھا اور بلا اختیار اس میں غفلت ہوگئی تو یہ موجب ملامت نہیں اس صورت میں درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ کہاں ہے؟ کیونکہ اس میں ملامت ہی نہیں ہاں یہ سوچنا کہ قلب کی ایسی حالت کیوں ہے کہ دنیا میں لگ کر اللہ سے غفلت ہو

جاتی ہے اور یہ سوچ کر غفلت دور کرنے کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری ہے اس اصلاح میں کوشش نہ کرنے پر بے شک ملامت ہے جیسا قرآن کا بلا اختیار غلط پڑھنا قابل ملامت نہیں ہاں صحیح پڑھنے کی کوشش نہ کرنا یہ اختیاری ہے اور قابل ملامت ہے۔

غرض یہ سوچنا کہ غفلت کا سبب کیا ہے پھر اس کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری ہے جب اس کا سبب سوچے گا یہ معلوم ہوگا کہ خدا کی محبت قلب پر غالب نہیں ورنہ غفلت کیوں ہوتی جن حضرات میں خدا کی محبت غالب ہوتی ہے ان کے تمام کام خدا ہی کے واسطے ہوتے ہیں گو ظاہر میں وہ دنیا کے کام معلوم ہوتے ہیں ان کو دنیا میں لگ کر بھی خدا سے غفلت نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو اس کی معشوقہ نے بلایا اور وہ یہ چاہتا ہے کہ معشوقہ کے پاس اس ہیئت سے جاؤں کہ وہ دیکھ کر خوش ہو اس لئے حجام کو بلایا کہ وہ خط بنائے غسل کرے اچھے کپڑے پہنے اور اس کے بعد محبوبہ کے پاس جائے تو جو شخص عشق سے خالی ہے وہ اس کو اس شغل میں دیکھ کر یوں کہے گا کہ یہ تو اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف ہے محبوب سے غافل ہے مگر اس کو کیا خبر ہے کہ اس کی نیت ہر چیز میں محبوب ہی کے لئے ہے۔ کپڑے پہنتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب خوش ہوگا اور غسل کرتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب کو اچھا لگوں گا غرض اس کی ہر چیز میں محبوب ہی مقصود ہے جب یہ حالت ہے تو اس کو محبوب سے غافل کس طرح کہیں گے اگر تم بھی حق تعالیٰ کی محبت کو غالب کر لو تو دنیا کے ہر کام میں تمہارا بھی یہی حال ہو جائے گا اب جو ہم کو دنیا میں لگ کر خدا سے غفلت ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت حق غالب نہیں اور اس محبت سے مراد وہ محبت ہے جس کا انسان مامور ہے سو اس محبت کا غالب کرنا اختیاری ہے اس لئے ہمارے ذمہ ہے کہ محبت الٰہی کو دل میں غالب کریں۔ باقی اس کے اختیاری ہونے کی دلیل وہ مشاہدہ اور واقعات ہیں آزما کر دیکھ لو تدبیر کر کے دیکھ لو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہ امر اختیاری ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب   گر دلیلت باید ازوے رو متاب

سورج کا نکلنا سورج کے وجود پر دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش ہے تو اس سے منہ نہ پھیرو۔

جب اختیاری ہے تو اس کی تدبیر کیجئے اور ہر کام تدبیر ہی کرنے سے ہوتا ہے نری تمنا یا باتوں سے کچھ نہیں ہوتا اگر آپ چاہیں کہ تفریح کر کے اور محض وعظ سن کر کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔

کار کن کار بگذار از گفتار   کاندریں راہ کار باید کار

کام کرو باتوں کو ترک کرو اس راہ سلوک میں کام کرنا چاہیے کام۔۔۔!

طریق تربیت

اب تدبیر کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ کیا دنیا کو چھوڑ دیں یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کسی غیر محقق کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے اس نے اس طرح بتلایا ہوگا اس نے بتلا دیا ہوگا کہ ایک وقت کھانا کھایا کرو۔ چھ مہینے میں بیوی بچوں کو دیکھ لیا کرو نیز طاقت سے زیادہ کام بتلا دیا ہوگا کیونکہ آج کل کے پیروں میں یہ بھی ایک مرض ہے کہ وسعت سے زیادہ کام بتلا دیتے ہیں جس سے وہ پریشان ہو کر ہمت ہار دیتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے اسی واسطے مولانا شیوخ کو تعلیم فرماتے ہیں۔

چار پارا قدر طاقت بار نہ   بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

چار پایوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لادو کمزوروں کو ان کی ہمت کے موافق کام دو۔

طفل را گر ناں دہی بر جائے شیر   طفل مسکین را ازاں ناں مردہ گیر

بچہ کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دی جائے تو بچہ کو اس روٹی سے مردہ سمجھ لو۔

اگر بچہ کو بوٹیاں کھلانے لگو گے تو اس کا پیٹ پھٹے گا یا نہیں اسی کی شکایت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خستگاں را چو طلب باشد وقوت نبود   گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

کمزوروں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تم ان کی ہمت سے زیادہ کام دے کر ظلم کرو تو مروت کے خلاف ہے۔

یہ بھی پیروں کو خطاب ہے جو محقق نہ ہوں شیوخ کو چاہیے کہ ہر ایک کی حالت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کریں جیسے کوئی مریض طبیب سے یوں کہے کہ میں نادار ہوں قیمتی نسخہ کا متحمل نہیں ہو سکتا ارزاں نسخہ لکھ دو تو طبیب کو چاہیے کہ اس کی حیثیت کے موافق نسخہ تجویز کرے اسی طرح شیوخ باطن کو طالب کی طاقت وہمت کا لحاظ لازم ہے۔ اگر کسی کو ایک سال کا دستور العمل ایک دن میں بتلا دیا تو وہ کس طرح کرے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے گا مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور کام ہو جاوے کچھ نہ کچھ تو مشقت اٹھانا ہی پڑے گی۔ جو لوگ گھر بیٹھے کام بنانا چاہیں وہ اپنے گھر پر رہیں مشائخ کو پریشان نہ کریں۔

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گودنے والے سے کہا کہ

میری پیٹھ پر شیر کی تصویر بنا دو تا کہ کمر میں قوت رہے وہ تصویر بنانے بیٹھا اور سوئی چبھوئی اس نے ایک آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو! اس نے کہا کہ دم بناتا ہوں آپ بولے کہ دم نہ بناؤ یہ کوئی مکھیاں تھوڑا اڑائے گا اس نے دم چھوڑ کر دوسری طرف سوئی چبھوئی پھر آہ کی اور پوچھا کہ اب کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ سر بناتا ہوں آپ نے کہا یہ کوئی دیکھے گا تھوڑا ہی ایسے ہی رہنے دو۔ پھر اس نے پیٹ بنانا چاہا تو آپ کہتے ہیں کہ یہ کوئی کھائے گا تھوڑا ہی غرض جو عضو کو بناتا تھا آپ یہی کہتے تھے کہ اس کو کیوں بناتے ہو اس پر بنانے والے نے سوئی پھینک دی اور کہا۔

شیر بے گوش سر و شکم کہ دید　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

شیر بغیر کان اور سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا میں کیا بناؤں گا۔

آگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

یعنی اگر تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ سوئی کو برداشت کر سکو تو شیر کا نام بھی مت لو۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہیں کہ رہیں تو اسی مرکز پر جس پر پہلے سے تھے اور کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ دہلی جانا ہو تو ذرا گھر سے ہٹو بھی تو سہی چلتے تو ہو نہیں اور چاہو کہ دہلی پہنچ جاویں تو کیسے ممکن ہے اور یہاں تو برخلاف مقاصد دنیا کے کوشش کے بعد ناکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کام کرنے کے بعد جو ناکام رہے وہ بھی عنداللہ کامیاب ہے مگر کام تو کرے باقی یہ نہیں ہو سکتا کہ رہو تو اسی چکر میں اور چاہو کہ ہمیں مقصود تک پہنچا دو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

صاحبو! مقصود بہت دور ہے وہ کیا ہے رضائے حق تعالیٰ جس کی مثال جنت کی سی ہے کہ جنت سے پہلے پل صراط ہے اور اس سے پار ہو کر جنت ہے اور جس طرح پل صراط پر رفتار ہر شخص کی مختلف ہو گی بعض بجلی کی طرح عبور کر جائیں گے اور بعض کی رفتار گھوڑے کے سوار کی سی ہو گی اور بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم۔ اسی طرح یہاں سلوک کا مقام اخیر یعنی رضا جنت کے مشابہ ہے اور لوگ اس مقام تک مختلف طرق سے پہنچتے ہیں بعض جلدی اور بعض دیر میں بس جیسے پل صراط پر چلنے کے بعد جنت ملے گی اور بعد تکلیف کے راحت نصیب ہو گی اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تکلیف کے بعد راحت نصیب ہو گی۔

باقی اس سے اطمینان رکھو کہ شیخ محقق تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا بلکہ میں ترقی کر

کے کہتا ہوں کہ وہ حرام نوکری بھی اس وقت تک نہ چھڑائیں گے جب تک حلال میسر نہ ہو جائے کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

کادالفقر ان یکون کفراً[1] (تنگ دستی بعض دفعہ کفر کے قریب ہو جاتی ہے)

اس لئے محقق عوام کو دنیوی تعلقات ملازمت وغیرہ سے الگ نہیں کرتا۔ حرام نوکری سے بھی تدریجاً الگ کرتا ہے کہ پریشانی نہ ہو پھر بھی تعجب ہے کہ ایسا راستہ بے ضرر اور اس پر بھی ہم نہ چلیں صاحبو! محبت کا طریق گو کسی قدر مشکل تو ہے مگر محال نہیں بس کسی محقق سے تعلق پیدا کرلو صرف صالح مت ڈھونڈو مصلح کو ڈھونڈو تندرست کو مت دیکھو بلکہ تندرست کنندہ یعنی معالج کو تلاش کرو۔

شیخ وہ ہونا چاہیے جو خود بھی متقی ہو اور مصلح بھی ہو گو ایسا شیخ تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا مگر یہ بھی نہیں کہ تم تو کچھ نہ کرو اور شیخ تمہاری اصلاح کی غرض سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرے کیونکہ اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے جو تمہارے پیچھے پھرے گا بس ان اصول پر فوراً کام شروع کردو کل پرسوں کا انتظار مت کرو گو یہ دریائے ناپیدا کنار ہے مگر جب خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال ہو گا تو ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن دوسرے کنارہ پر پہنچ ہی جاؤ گے میں مکرر کہتا ہوں اور اطمینان بھی دلاتا ہوں کہ تمہاری معاش میں خلل ہرگز نہ پڑے گا۔

طریق عمل

مگر یہ بھی نہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور پرہیز تو کرنا ہی پڑے گا اگر کسی مریض سے طبیب کہے کہ بھائی دوا پینا اور پرہیز کرنا اور مریض یوں کہے کہ حضور آپ ہی پی لیں آپ ہی پرہیز کرلیں تو ایسے مریض کو کیوں کر شفا ہوگی۔ شفا تو خود مریض کے دوا پینے اور پرہیز کرنے سے ہوگی باقی یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اس طریق میں ذرا بھی تعب اور مشقت نہیں البتہ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔ سو اس میں کیا مشقت ہے مثلاً پرائی عورت کو مت دیکھو چوری مت کرو سو اس میں کون سی مشقت ہے بلکہ یہ تو باتیں وہ ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے علاوہ ایصال الی المقصود کے اور بہت سی دنیوی مضرتوں سے بچ جاؤ گے پھر تمہارا نقصان ہی کیا ہوا دنیا بھی نہیں گئی بلکہ اور سنور گئی اور دین مل گیا بس صرف مقاومت کرنا پڑے گی نفس کی اور یہ کام تو ضرور کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں غرض ہو تو تم اس طرف آؤ گے تم جانو باقی خدا تعالیٰ کو کوئی غرض نہیں کہ گھیر کرلاویں مگر جب آؤ سمجھ کر آؤ کبھی خام ہوس لے کر نہ آؤ کہ اس میں ایسی لذت

---

[1] کنز العمال: ١٦٦٨٢، الدر المنثور ٢: ٣٢٠، مشکوۃ المصابیح: ٥٠٥١

ہوگی ایسے انوار ہوں گے کشف و کرامت ہوگی جب کچھ نہ ہو تو بعد میں کہو کہ دھوکہ ہی ہو گیا۔

جیسا کسی بدوی نے کلام اللہ میں یہ سن کر کہ خدا نے انجیر اور زیتوں کی قسم کھائی ہے انجیر کھالیا تھا بہت اچھا معلوم ہوا پھر آپ نے زیتون بھی کھایا وہ بدمزہ اور بکسا معلوم ہوا تو آپ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ زیتوں کی بے چکھے ہی قسم کھالی بڑا دھوکا ہوا۔

اسی طرح اس طریق کے زیتوں میں بکسا پن تو ہوگا مگر وہ زیتون ایسا ہے کہ **لاشرقية ولا غربية** (نہ مشرق میں نہ مغرب میں) پھر تو وہ زیتوں ایسا اچھا لگے گا کہ کسی چیز کی بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نظر نہ آئے گی جیسے تمبا کو کھانے والوں کو تمبا کو اول اول کیسا برا معلوم ہوتا ہے مگر پھر اس سے زیادہ کوئی چیز مزیدار نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی مرچ کھاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے مگر پھر وہی اچھی لگتی ہے کہ کبھی بھی اس کے سامنے اچھا نہیں لگتا کیا خدا کے راستے کی چیزیں مرچ سے بھی کم ہیں یہ راستہ بھی اول اول قدرے دشوار اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس کی تحصیل میں جان و مال سب کچھ دینا گوارا کر لو گے۔ ذرا اس راستہ پر چل کر تو دیکھو میں کہاں تک تفصیل کروں۔ کیا تصوف کا لقمہ منہ میں بنا کر دے دوں۔ پکاؤ اور کھاؤ ترکیب ہم بتلا دیں گے۔ پہلے کچی روٹی پکاؤ گے پھر پھلکے پکانے لگو گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روٹی پکانے میں دھواں بھی ضرور لگے گا مطلب یہ ہے کہ اس طریق میں مقاومت نفس اور شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ جیسے روٹی پکانے میں دھواں اور آگ کی گرمی ضرور لگتی ہے۔

سختی مشائخ کی حکمت

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادیؒ بعض لوگوں پر تیزی فرماتے تھے اس پر ایک تعلقہ دار نے مجھ سے شکایت کی کہ گنج مرادآبادی میں تو غلامی کرنا پڑتی ہے اس لئے کوئی اور پیر بتلاؤ جہاں کچھ رعایت ہو بس اتنی سی بات پر برگشتہ ہو گئے صاحبو! اتنے چرکے تو لگیں گے ہی۔ مشائخ کی سختی تو برداشت کرنا ہی پڑے گی مگر وہ سختی عین حکمت اور مصلحت ہوتی ہے وہ بے فائدہ سختی نہیں کرتے بلکہ معالجہ کرتے ہیں امراض کا گو سمجھ میں نہ آوے۔

ہمارے ہاں خانقاہ میں ایک شخص تھے انہوں نے ایک دوسرے شخص کو امر بالمعروف کیا امر بالمعروف ہے تو اچھی چیز مگر مجھ کو ان کے طرز سے یہ محسوس ہوا کہ منشاء اس کا کبر ہے انہوں نے اپنے کو اچھا اور دوسرے کو حقیر سمجھ کر ایسا کیا ہے میں نے ان کو بلایا اور کہا کیا آپ محتسب ہیں یا کسی

کی طرف سے مامور ہیں۔ انہوں نے اول اول بہت تاویلیں کیں مگر اخیر میں سمجھے میں نے ان کی یہ سزا مقرر کی کہ خانقاہ کے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کیا کریں چنانچہ وہ کرتے رہے پھر مکان چلے گئے وہاں بھی غالباً کرتے رہے جب میں نے دیکھا کہ مرض نکل گیا لکھ بھیجا کہ اب نہ کرو۔

انہوں نے ایک شخص سے بیان کیا واقعی مجھ میں یہ مرض تھا اور مجھ کو اس تدبیر سے اتنا نفع ہوا کہ دس برس کے مجاہدہ سے بھی نہ ہوتا کبھی برسوں کا علاج ایک آن میں ہو جاتا ہے غرض مشائخ کی سختی اور بدمزاجی میں اصلاح ہی ہوتی ہے اس کو سختی سمجھنا غلطی ہے۔

عادت اللہ

اسی طرح اس کے علاوہ ایک غلطی اور بھی ہے وہ یہ کہ یہ مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلانے کو ایک نظر میں غوث کر دیا ایک نظر میں کیمیا بن گئی ایسی باتوں کو سن کر بعضے لوگ پیر کے بھروسا پر کام سے بیٹھ رہتے ہیں اور خیال کر لیتے ہیں کہ پیر ایک نظر میں ہم کو کامل بنا دیں گے۔ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے کام اپنے ہی کرنے سے ہوتا ہے باقی بعضے واقعات جو مشہور ہیں کہ ایک نظر میں طالب کی کیمیا بن گئی سو یہ بھی ایک درجہ میں صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس اکسیر بننے سے پہلے کتنی دیر لگی تھی اور کیا کچھ ان کو کرنا پڑا تھا کتنے اور کیسے کیسے مجاہدے انہوں نے کیے تھے جب اکسیر بنے ہاں عین اکسیر بننے کے وقت دیر نہیں لگی ایک نظر میں کام ہو گیا یہ ہے حقیقت واقعہ کی البتہ کہیں فرق عادت کے طور پر ایسا بھی ہو گیا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا صرف ایک نظر میں کام ہو گیا مگر یہ شاذ و نادر ہے۔ والشاذ کاالمعلوم (نادر مثل نہ ہونے ہی کے ہے) عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کام کرنے سے ہوتا ہے جو بھی ہوتا ہے۔

شاہ بھیک صاحب حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کے مرید ہیں ان کو ایک نظر میں کامل کر دیا تھا مگر دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا کیا تھا کتنے ریاضات و مجاہدے کئے تھے اس کے بعد یہ نوبت آئی ایک واقعہ ان کے مجاہدہ کا سنیئے۔

شیخ نے ایک روز کسی بات پر ان سے کہا کہ جاؤ نکل جاؤ یہ نکل گئے برسات آ گئی گھر گرنے کو ہو گیا بی بی صاحبہ نے کہا ایسے کاموں کا ایک تو آدمی تھا اسے ہی نکال دیا اب گھر کی مرمت کون کرے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے نکال دیا ہے تم بلا لو بی بی صاحبہ نے بلا لیا شاہ بھیک صاحب

ادب کی وجہ سے پاس نہیں گئے تا کہ حضرت شیخ کو نا گوار نہ ہو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ بھائی بھیک چھت خراب ہو گئی کڑیاں ٹوٹ گئیں اس کو درست کر دو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے چھت پاٹی مٹی ڈالی کوٹنا چاہا جس وقت یہ چھت کوٹ رہے تھے شاہ ابوالمعالی گھر میں تشریف لائے معلوم ہوا کہ بھیک چھت کوٹ رہے ہیں اس وقت آپ روٹی کھانے بیٹھے تھے۔ روٹی ہاتھ میں لئے ہوئے صحن میں آئے اور فرمایا لو میاں بھیک! وہ آپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی چھت پر سے کود پڑے آپ نے ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا اور لقمہ منہ میں دے دیا۔ بس ایک لقمہ میں کام ہو گیا اور کامل ہو گئے۔

سو یہ تو صحیح بات ہوئی کہ ایک نظر میں کامل ہو گئے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ کتنی دقتوں کے بعد اور کتنے مصائب کے بعد سوکھی لکڑی میں آگ کتنی جلد لگتی ہے مگر سوکھتی ہے کتنے دنوں میں شیخ کے پاس رہ کر پہلے اپنا گیلا پن تو دور کرو۔ اس کے بعد پھر آگ کا فوراً ہی اثر ہوگا۔ عارف شیرازی اسی کو تو فرماتے ہیں۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

کل رات صبح کے وقت غصہ و غم سے مجھ کو نجات دی شب کی ظلمت میں مجھ کو آب حیات دی۔

کیمیا ئیست عجب بندگی پیر مغاں　　　خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

پیر کامل کی اطاعت عجیب کیمیا ہے اس کے قدموں پر رہا اتنے درجات پائے۔

اس میں طریقہ بھی بتلا دیا کہ میں نے شیخ کا اتباع کیا تھا اس کی جوتیوں کی خاک بن گیا تھا اس لئے ایسا ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اختیاری ہے پھر کیا عذر ہے پس اس طریقہ سے غلبہ محبت پیدا کر لو پھر دنیا میں لگ کر بھی اللہ سے غفلت نہ ہوگی یہ ہے کامیابی اور فرضاً اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تب بھی اسی جماعت کے ساتھ مشہور ہوگے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ اس طریق کی ناکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہی ہوتی ہے اسی واسطے اہل طریق کہتے ہیں کہ کام کرنے والے اس طریق میں ضرور کامیاب ہی ہوتے ہیں ناکامی محض کسی کو نہیں ہوتی۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں۔ عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل جوارح عبادت بدنی ہے زکوٰۃ عبادت مالی ہے مطلب یہ ہے کہ تجارت و بیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ محض

عبادت ظاہری کافی نہیں بلکہ قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں کیونکہ اس میں تعیین وقت کی قید نہیں وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے کسی کام میں اس سے حرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے جیسے نماز ہی ہے مثلاً اس میں وقت کا اس لئے تعین ہے اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات میں بڑی وقت پیش آئے اسی طرح زکوۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس کا ضرر ظاہر ہے اور تعیین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوۃ تو وقت معین پر ادا کرو مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو اسی کو کہتے ہیں۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو۔

بس اس میں ہر وقت لگے رہو خدا جانے کس وقت کام بن جاوے اور گو مقصود اس تقریر کا ذکر قلبی ہی ہے مگر وہ عادۃً پیدا ہوتا ہے ذکر لسانی سے اس لئے زبان کو بھی ذاکر بنانا چاہیے گو کسی وقت ذکر قلبی سے خالی ہی ہو وہ بھی اگر خلوص سے ہو موثر ہوتا ہے۔

شاید اس پر کوئی ناواقف کلام کرے کہ زبان سے نام لینے سے کیا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قلبی توجہ نہ ہو میں کہتا ہوں کہ کھٹائی کے نام لینے میں تو یہ اثر مشاہد ہے کہ اس کے نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے کیا اللہ کا نام اتنا بھی نہیں ہے کہ دل تک اس کا اثر پڑے۔

صاحبو! اعتراض مت کرو۔ اللہ اللہ کہہ لیا کرو پھر خود دیکھ لوگے کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہی ترتیب ہے سلوک کی اللہ تعالیٰ نے بھی **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اپنے برتر رب کے نام کی پاکی بیان کرو۔ میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتدا بیان فرمائی ہے۔ سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو اسی واسطے **سبح ربک الاعلے** (اپنے برتر رب کی پاکی بیان کرو) نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ بھی لائے گویا یہ تعلیم فرما دیا کہ ابتداء نام ہی سے کرو اس سے آگے ترقی ہو جاتی ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں اور تسلی کرتے ہیں۔

از صفت و زنام چہ زاید خیال　　واں خیالش ہست دلال وصال

وصف اور نام سے کیسا خیال پیدا ہوتا کہ وہ اس کا خیال وصال کے لئے رہنما ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب یہ خیال مت کر کہ صفت اور نام سے کیا ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ اس سے خیال پیدا ہوگا پھر وہی خیال رہنمائے وصال ہو جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرضاً ذکر لسانی سے نفع موہوم بھی نہ ہو تب بھی محبوب کا نام لینے میں کم سے کم مزہ تو آوے ہی گا اسی کو ایک شاعر کہتا ہے۔

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمر   ولا تسقنی سرًا متیٰ امکن الجھر

کہ اے ساقی شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے۔

ایسے ہی مجنوں کی حکایت ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرا نورد   در بیاباں غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم   می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں   می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم   خاطر خود را تسلی میدہم

مجنون کو کسی نے جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کس کو خط لکھ رہے ہو جواب دیا کہ میں اپنی محبوبہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں۔

عشق کا خود مقتضا ہے محبوب کا نام لینا جب یہ سمجھ میں آ گیا تو بس چلتے پھرتے زبان سے اللہ کا نام لیتے رہو اس طور پر۔

لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ الخ ان کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا اور اگر چند دن ایسا کر کے بھی اعتراض کرو کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر ہوگا آگے ارشاد ہے۔

یخافون یوماً تتقلب فیہ القلوب والابصار وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ اس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔

اس میں عجب کا علاج ہے یعنی ان کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے۔

قلوبھم وجلۃ انھم الیٰ ربھم راجعون ان کے دل ڈرتے ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اس دن سے کہ الٹ پلٹ ہو جائیں گے اس میں دل اور آنکھیں مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے پھر خوف ہے عجب نہیں وہ اپنے اعمال کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

عمل اور اجر

ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ جو عمل کو ہیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ جیسے آج کل اکثر کی یہ حالت ہے کہ جہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے۔

حضرت حاجی صاحب ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف متوجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد نہیں مگر لوگ ان ثمرات مانع ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لڈو دے کر یا پیسہ دے کر بہلاتے ہیں اسی طرح مبتدی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے سو مقصود کام ہی ہے اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں تا کہ ذکر اللہ کا چسکہ لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں۔ ان کو مذموم نہ سمجھنا چاہیے۔ اگر خود آئیں آنے دو ان کے دور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ۔ اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں۔ نہیں آتے بلا سے مت آئیں۔

اس آیت میں **یخافون یوماً** (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا **یخافونہ** نہ فرمایا۔ حالانکہ بظاہر **یخافونہ** زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔

سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوائے اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو

بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کا ڈر۔ نہ یوم آخرت سے خوف صرف خدا ہی سے تعلق، محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو عبدیت کے خلاف ہے۔ اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے، نہ کہ ان چیزوں کی ذوات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور فرماتے ہیں **غیر مودع ولا مستغنی عنه ربنا** یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں۔ ہم تو بندے ہیں ہر حال اور ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں۔

اہل طریق کا جو قول ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاؤ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغناء ہونا چاہیے۔ باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق رکھے تو اس سے استغناء نہ ہونا چاہئے بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے یہ عین عبدیت ہے۔

پس آیت میں لفظ **یوماً** لا کر سالک کو علو سے عبدیت کے مقام پر اتارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے۔ وہ تو خدا کی چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں پس **یوماً** لاتے میں یہ نکتہ ہے۔ اور بعض مقام پر **یخافون ربهم** اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ فرمایا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے صوفیا کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہئے۔

آگے فرماتے ہیں **لیجزیهم الله** اس میں لام عاقبت ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے ان کا یہ انجام ہوگا۔ ان کو یہ ملے گا **احسن ما عملوا** میں **احسن** اور **ماعملوا** جو انہوں نے عمل کئے ہیں ایک ہی چیز ہے۔ لفظ احسن سے یہ بتلا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے۔ پس یہ قید واقعی احترازی نہیں۔

جیسے ہم چنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی کھلے ہوؤں کیساتھ کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ

نیک عمل کیسا ہی ہو۔ سب **احسن ماعملوا** میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم ناچیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں قرآن میں تدبر کیا جائے تو جابجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔

واللہ یدعوا الیٰ دار السلام کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتے ہیں۔

واللہ یدعوا الی الصلوٰة والزکوٰة

اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی طرف بلاتے ہیں۔

اگر ابتداءً یوں فرمادیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادت کی طرف بلانے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تاکہ دل کو رغبت پیدا ہوجاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزاء بقدر مجزی بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزاء ہونی چاہئے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جائے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہیے تھی۔ کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کردیے جاتے کیونکہ محدود کی جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیسا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔

ویزیدھم من فضلہ اور زیادہ دیں گے ان کو اپنے فضل سے۔

کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں گے مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہوتا کہ ہمارے اعمال شاید بیج جیسے ہوں یعنی ان میں خاصیت ہو نشوونما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا **من فضلہ** کہ تمہارے اعمال بیج ویج کچھ نہیں جتنے بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ آگے ارشاد ہے۔

واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دیتے ہیں۔

یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں۔ ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

صاحبو! یہ ہے مومن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مال میں کام آوے وہ ہے مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے۔ دونوں جہاں میں اسی کو ارشاد فرماتے ہیں۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ و ھو مومن فلنحیینہ حیٰوۃ طیبۃ و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔

کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون و اطمینان ہوگا۔ اور آخرت میں ان کے نیک اعمال کا مل اجرت دیں گے۔

ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

ومن اعرض عن ذکری فان لہٗ معیشۃً ضنکاً و نحشرہٗ یوم القیامۃ اعمی

یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں۔ اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہد ہے کہ دنیاداروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے۔ یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسر نہیں۔ بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصلی مال اس کو کہنا چاہئے۔ دنیوی مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں **یمیل الیہ القلب** یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔

بس وعظ کا مقصود تو ختم ہوا۔ اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ

یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے دوسیر دلالت النص کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آ گئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں۔ اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو کر ان صفات کو اختیار کرے تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آ جاوے۔ جیسا **لا تلہیہم** اس میں نص ہے۔ یعنی صفت تو اس کی عبدیت ہو اور تعلق الوہیت سے ہو پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبدیت کو اس طرح جمع کیا جاوے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور شان عبدیت کی ہو۔

بس اب بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "خیر المال للرجال" رکھتا ہوں۔ اس نام کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں عورت کو مال کہا گیا ہے اور یہ مال ہے تشبیہا۔ اس لئے میں نے بھی اعمال کو تشبیہا مال کہہ دیا اور چونکہ میں اس وقت تجارت گاہ میں ہوں جہاں تجارت زیادہ ہیں تو شاید کسی کو ان میں سے یہ خیال ہوتا کہ تجارت مانع ہے آخرت سے اس لئے میں نے ان کے لئے مناسب مضمون اختیار کیا اور اس کی اچھی طرح تفصیل کر دی کہ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا کی قید اور اس کے ساتھ تعلق ضرور کم ہو جاوے گا سو اس کا کیا مضائقہ بلکہ یہ تو مفید ہے کہ پیر میں ایک بیڑی تھی وہ کم ہو گئی۔ بس یہ خلاصہ تھا بیان کا۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین!

اشرف علی

خیر الاثاث للاناث

عورتوں کے بہترین سرمایہ کے متعلق یہ وعظ ۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۷ھ کو زنانہ مکان مطبع قیومی کانپور میں فرمایا۔ دو گھنٹے میں ختم ہوا۔ مستورات کا مجمع تھا۔ کچھ مرد بھی شریک تھے۔ حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا۔

اکثر لوگوں میں حب جاہ کا مرض بکثرت پایا جاتا ہے مگر عورتوں میں ان کی کیفیت مردوں سے مختلف ہے۔ عورتوں میں چیزیں جمع کرنے کی حرص اور اس سے ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ حب اللہ و بغض اللہ کا مطلب' اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کا صحیح مفہوم' جب تک مغرب سے آفتاب نہ نکلے' بڑے سے بڑے گناہگار کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے۔ مقام طالب و مطلوب نافرمان باوجود کثرت سامان راحت دنیوی کے ہمیشہ پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں۔ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝

(سورۂ مریم: ۷۳-۷۴)

ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں مکان کس کا زیادہ اچھا ہے اور محفل کس کی زیادہ اچھی ہے اور ہم نے اس سے پہلے بہت سے ایسے گروہ ہلاک کئے ہیں جو سامان اور نمود میں ان سے بھی (کہیں) زیادہ اچھے تھے۔

تمہید: پہلی آیت میں کفار کا تفاخر ساز و سامان اور اہل و اعوان پر مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کا اور دوسری آیت میں ان سے زیادہ سامان و نمود والوں کا مبغوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کے قابل تفاخر نہ ہونے کا۔

سب سے پہلے قابل عرض بات یہ ہے کہ گو اس جلسہ میں مرد بھی شریک ہیں مگر زیادہ مقصود مستورات کو سنانا ہے۔ اس لئے مردوں کے مذاق کی زیادہ رعایت نہ کی جائے گی۔ گو فائدہ دونوں میں مشترک ہے۔ مگر اس وقت اس پر نظر نہیں کہ نفع معتد بہ مردوں کو ہو تا اس کے دلچسپ ہونے پر

نظر ہے بلکہ عورتوں کا افادہ اصل مدنظر ہے تاکہ عورتیں جن کو وعظ سننے کا موقع بہت کم ملتا ہے محروم نہ رہ جائیں۔ اس وقت وعظ میں مضامین متعددہ ہوں گے۔ مگر ہوں گے سہل۔ ارادہ تو یہی ہے آگے اللہ تعالیٰ کو جو بھی منظور ہو عورتوں میں جو امراض پائے جاتے ہیں اس وقت ان کا بیان اور ان کا معالجہ بتلانے کا قصد ہے اور تلاوت کی ہوئی آیات میں ایسے ہی امراض کا ذکر ہے۔

جیسا آیات کے حاصل سے معلوم ہو گیا ہو گا کیونکہ جب تک مرض نہ معلوم ہو اس کا علاج کیسے کیا جائے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اول ان امراض کو ظاہر کیا جائے تاکہ مرض معلوم ہونے پر اس کے علاج کی طرف توجہ ہو۔

زیادہ تر افسوس تو یہی ہے کہ ہم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہمارے اندر کچھ امراض بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علاج کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور جن کو امراض کا کچھ احساس بھی ہے ان کی بھی یہ حالت ہے کہ آثار کو تو دیکھتے ہیں مگر ان کے اسباب کو نہیں دیکھتے کہ اس کا سبب کیا ہے اور فعل کیوں پیدا ہوتا ہے پس خوب سمجھ لیجئے کہ ہر فعل کسی خاص صفت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ صفت سبب ہوتی ہے اس فعل کا۔ تو پہلے اس صفت کا علاج کرنا چاہئے۔ اس کے بعد وہ فعل خود بخود جاتا رہے گا جن کی فہم کوتاہ ہے وہ صرف اثر کو دیکھتے ہیں اور اس کے علاج کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ ان کا یہ فعل کون سی صفت سے پیدا ہوا۔ اسی لئے علاج سے فائدہ معتدبہ نہیں ہوتا۔ بس اس وقت بھی مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر جو صفات مذمومہ ہیں ان کو معلوم کیا جائے پھر ان کا علاج کیا جائے جس سے اصلاح افعال کی ہو اور مراد صفت سے فطرت کا درجہ نہیں۔ وہ تو محل علاج نہیں بلکہ درجہ خلق یعنی عمل باطنی کا ہے۔

دو قسم کے امراض

سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں میں دو مرض بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک حب مال، دوسرے حب جاہ، گو دونوں کا رنگ مردوں اور عورتوں میں مختلف ہے یعنی مردوں میں حب مال اور حب جاہ کا اور رنگ ہے اور عورتوں میں دوسرا رنگ ہے مگر دونوں میں یہی دو مرض زیادہ ہیں۔ مردوں میں حب جاہ اس رنگ سے ہے کہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ عورتیں اپنے کو بڑا تو نہیں سمجھتیں مگر اپنے کو بڑا ظاہر کرنا چاہتی ہیں۔ ایسی باتیں اور ایسے طریقے اختیار کرتی ہیں کہ جن سے ان کا بڑا ہونا دوسرے پر ظاہر ہو۔

اسی طرح حب مال کے رنگ بھی دونوں میں مختلف ہیں۔ مردوں کو زیادہ روپے سے محبت ہوتی

ہے اور کسی چیز سے اتنی نہیں۔ اسی واسطے اس کے جوڑنے اور جمع کرنے کے در پے رہتے ہیں۔ اور عورتوں کو زیور اور کپڑے اور برتن وغیرہ خانگی سامان سے زیادہ محبت ہوتی ہے کہ رنگ برنگ کے کپڑے ہوں، قسم قسم کے برتن ہوں، مختلف قسم کے زیور ہوں علیٰ ہذا مگر اس بارہ میں مردوں کی سمجھ عورتوں سے اچھی ہے۔ کیونکہ روپیہ تو ایسی چیز ہے جس سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے جس کے پاس روپیہ ہے اس کے پاس سب کچھ ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا بدل ہو سکتا ہے اور ہر چیز اس سے حاصل ہو سکتی ہے بخلاف کپڑے اور برتن وغیرہ کے کہ وہ ہر چیز کا بدل نہیں ہو سکتے اور ہر چیز اس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ مرد بکثرت جائیدادیں خریدتے ہیں۔ کہیں مواضعات، کہیں مکانات مول لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی سامان سے محبت ہے روپے سے نہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ وہاں بھی سامان سے محبت نہیں۔ بلکہ روپیہ ہی سے محبت و رغبت ہے۔ جائیداد کے لینے میں بھی روپیہ پھنسانے کی ایک صورت کر لی ہے پس مردوں کو جائیداد سے محبت ہے وہاں بھی اس غیر منقول سے منقول ہی مقصود ہے۔ جائیداد سے آمدنی ہوتی رہے گی اور سرمایہ محفوظ رہے گا وہاں بھی مقصود روپیہ ہی ہے۔

عورتوں کی حرص

عورتوں میں یہ رنگ نہیں۔ وہ تو ساز و سامان پر فریفتہ ہیں ہر وقت چیزوں کے جمع کرنے کی ان کو حرص رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ روپے کو بے طور اڑاتی ہیں اول تو اس وجہ سے کہ ان کو اس بات پر نظر نہیں کہ روپے سے ہر چیز حاصل ہو جاتی ہے دوسرے روپیہ ان کا کمایا ہوا نہیں جس سے دل دکھے۔ اس لئے بے دریغ خرچ کرتی ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ کسی نے ایک شخص کو دیکھا کہ دوشالہ سے اپنی اوہڑی کا جوتا صاف کر رہا ہے۔ یہ اس کو ملامت کرنے لگا تو اس نے کہا، بات یہ ہے کہ جوتا تو میری کمائی کا ہے اور دوشالہ ابا جان کی کمائی کا۔ یہ طبعی تفاوت ہے اپنے مکسوب اور غیر کے مکسوب میں کہ اپنی کمائی دل کو لگتی ہے اور دوسرے کی کمائی دل کو نہیں لگتی۔

خیر جو کچھ بھی وجہ ہو ان کو روپیہ کی قدر نہیں۔ ان کو زیادہ شوق چیزوں کا ہے۔ حتیٰ کہ فضولیات تک ان کی نظر پہنچتی ہے۔ بس ان کو تو یہ خبر ہونا چاہئے کہ فلاں چیز بک رہی ہے۔ فوراً اس کے خریدنے کا اہتمام ہوتا ہے گویا پہلے ہی سے اس چیز کی منتظر تھیں۔ یہاں تک حالت ہے کہ ایک رضائی بنائی کسی کپڑے کی۔ اس کے بعد دوسرا کپڑا سامنے آ گیا بس کوشش کریں گی کہ اس کو بھی

خرید لیں۔ یہ واقعات میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اور اس کا بہانہ کیا ٹھہرایا ہے کہ یہ کپڑا اگلے سال کام آجائے گا اور اگر کہا جاوے کہ اگلے سال اور تیار ہو جاوے گی یا پہلی کو فروخت کر کے دوسری بنالو تو کہتی ہیں کہ ایک تو آنے جانے کے لئے ہے اور ایک گھر کے لئے۔ غرض گھڑ گھڑا کر دوسری کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ کپڑا پسند آگیا اور کچھ نہیں۔ حالانکہ شوہر سمجھاتا اور کہتا ہے کہ میرے پاس گنجائش نہیں مگر وہاں اس کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ ان کو چیزوں سے ایسی محبت ہے کہ ہر شے کے لئے بیس ضرورتیں تراش لیں گی۔ برتن بکتا ہوا آجائے خواہ اس کی کچھ بھی ضرورت نہ ہو بس خرید لیں گی چنانچہ گنجائش والے گھروں میں اتنا سامان موجود ہے کہ کبھی استعمال کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مگر عورتوں کو سامان کے خریدنے سے کسی وقت بھی انکار نہیں۔ آدمی کو تو حقیقت میں تھوڑے ہی سامان کی ضرورت ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

”صائب حرص قناعت کرنے والی نہیں ورنہ اسباب معاش میں ہم وہ کچھ رکھتے ہیں جس کی ہمیں ضرورت نہیں“

یہ حالت ہے کہ بڑے بڑے فرش اور صندوق فضول رکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی خریداری بند نہیں ہوتی۔ خصوصاً نازک اور تکلف کا سامان خریدنے کا آج کل بڑا ہی شوق ہے۔ جو سوائے زینت و آرائش کے کسی کام کا نہیں اور ماشاء اللہ پختہ ایسا ہے کہ اگر ذرا ٹھیس لگ جاوے تو کسی کام کا بھی نہیں۔

جیسے ایک شخص چوڑیوں کی گٹھڑی کمر پر رکھے ہوئے جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک گنوار ملا۔ گنواروں کی عادت ہوتی ہے کہ لکڑی مار کر پوچھا کرتے ہیں۔

اس نے گٹھڑی میں لکڑی مار کر کہا کہ اس میں کیا چیز ہے چوڑی والے نے کہا کہ ایک دفعہ اور مار دو تو کچھ بھی نہیں۔ بیچارے کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

یہی حال تکلف کے سامان کا ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی میں کسی کام کا بھی نہیں۔ مگر مستورات کو دن رات اسی کا اہتمام ہے کہ گھر میں بہت چیزیں ہوں، تکلف کا سامان ہو۔ ہر وقت یہی دھن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کے اندر حب مال اس رنگ میں ہے کہ ان کے پاس کتنی ہی چیزیں ہوں مگر طالب مزید ہی رہتی ہیں۔ ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

ایک عورت نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہماری مثال تو جہنم کی سی ہے کہ اس سے کہا جاوے گا هل امتلئت کہ کیا تو بھر چکی ہے۔ تو وہ کہے گی هل من مزید یعنی کچھ اور بھی ہے اسی طرح ان کو صبر نہیں، طالب مزید ہی رہتی ہیں۔

عورتوں کی ناشکری

جب کبھی ان سے پوچھو تو یہی کہیں گی کہ ہمارے پاس کیا ہے، کچھ بھی نہیں شکر کرنا تو کبھی جانتی ہی نہیں۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ ایک مضمون اپنے وعظ میں فرمایا کرتے تھے۔ گو مضمون تو ہے شاعرانہ مگر ہے واقعی۔

چنانچہ فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کے پاس اگر کپڑوں کے صندوق بھی بھرے ہوں مگر ان سے جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار چیتھڑے سارا گھر برتنوں سے بھرا ہوا ہو مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں چار ٹھیکرے جوتیوں کے کتنے ہی جوڑے ہوں مگر ہمیشہ یوں ہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے یہ مضمون ممکن ہے قافیہ کی ضرورت سے بنا ہو مگر واقعہ سچا ہے۔

حاصل یہ کہ ان کو سامان سے کبھی صبر ہوتا ہی نہیں۔ مرد تو کپڑوں میں پیوند تک لگا لیتے ہیں مگر عورتیں ہیں کہ ان کو نئے کپڑوں کے صندوق بھر کر بھی کفایت نہیں ہوتی۔ چاہتی ہیں کہ کپڑوں سے گھر بھر لیں۔ اگر سخت مجبوری ہو تو پیوند بھی لگا لیں گی۔ مگر وسعت میں تو لگاتی ہی نہیں۔ بعض مرد بیچارے ہیں تو مزدور چار آنے آٹھ آنے کے مگر بیبیوں کو دیکھو تو بیگم بنی ہوئی ہیں مرد اپنے لئے پیوند لگے کپڑوں کو عیب نہیں سمجھتا مگر عورت غریب کی بھی ہوگی اپنے کو ایسا بنائے گی کہ گویا بنت الامیر وزوجۃ الکبیر (امیر کی صاحبزادی بڑے آدمی کی بیوی) ہے اور یہ سب ساز و سامان سجاوت شوہر کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کی غرض سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ محض کم فہمی کی بات ہے۔ دکھانے سے ہوتا کیا ہے کیونکہ آپس میں خاندان والوں کو ایک دوسرے کا حال تو معلوم ہی ہوتا ہے اس کی حیثیت اتنی ہے اور اس کی اتنی پھر دکھانے سے نتیجہ کیا یہ مانا کہ عورتوں کے مناسب زینت ہے مگر اس میں اعتدال تو ہو حد سے بڑھی ہوئی تو نہ ہو۔ ان میں حب مال کا یہ رنگ ہے اور مردوں میں بھی یہ مرض حب مال کا موجود ہے مگر رنگ مختلف ہے۔

عورت اور حب جاہ

دوسرا مرض عورتوں میں حب جاہ ہے اور یہ مرض مردوں میں بھی ہے مگر دوسرے رنگ میں۔ وہ بھی اپنے کو بڑا بناتے ہیں مگر رنگ اور ہوتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ اکثر مردوں میں اور کمالات بھی ہیں جیسے علم وغیرہ۔ اس لئے ان کا حب جاہ اس قدر نازیبا نہیں اور عورتوں میں تو یہ بھی نہیں مگر

پھر بھی ان میں حب جاہ ہے گویا اپنے کو بڑا نہیں سمجھتیں مگر یہ چاہتی ہیں کہ دوسرے ان کو بڑا سمجھیں ان میں اس کے ساتھ تذلل اور تواضع کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض بیبیاں پائنتی بیٹھتی ہیں اور خادمہ سرہانے۔ اور خود پان لگا کر بھنگن وغیرہ کو دے دیتی ہیں۔ ان بیچاریوں میں اس قسم کی تواضع بھی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتی ہیں کہ ہم سب سے بڑھی رہیں۔ بیچاریوں میں کمالات تو ہیں نہیں مگر چاہتی ہیں کہ زیور اور سامان بہت سا ہو دوسروں سے بڑھی چڑھی رہیں۔ جب کہیں جائیں گی' تو خوب زیور لاد پھاند کر جائیں گی۔ خواہ مانگا ہوا ہی زیور ہو اور گو دوسروں کو معلوم بھی ہو کہ مانگ کر پہنا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے رات دن اسی کا اہتمام ہے۔ یہی سبق ہے کہ چمک ہو' گوٹہ ہو' ٹھپہ ہو' لچکہ ہو' کپڑے کی تراش ایسی ہو جھالر بھی لگا ہوا ہو' جہاں تک ان کے امکان میں ہے بناوٹ کا اہتمام کرتی ہیں۔

اس کے متعلق ان میں کمیٹی بھی ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے معاملات اس کے متعلق طے ہوتے ہیں کہ بہن ذرا بتلاؤ تو کہ اس کرتہ کے ساتھ کون سا پاجامہ اچھا لگے گا اور اس جوڑے پر دوپٹہ کون سا ہونا چاہئے۔ پھر ان کا سب سے بدتر یہ مذاق ہے کہ یہ سب زینت محض دوسرے کو خوش کرنے کو کرتی ہیں۔ باقی خاوند کے ساتھ ایسی میلی کچیلی رہیں گی جیسے بھنگن اگر کہیں برادری وغیرہ میں جائیں گی تو غسل صحت بھی ہو گا (یعنی جیسے آدمی تندرست ہو کر مدت کے میل کچیل کو اچھی طرح صابون کھلی وغیرہ لگا کر بدن سے صاف کرتا ہے) جب واپس آئیں گی تو خاوند کی قسمت میں وہی مبارک صورت ہو گی۔ جہاں گھر میں آئیں فوراً زیبائش کے کپڑے اتار پھینکے۔ خدا جانے یہ عورتوں کا کیا مذاق ہے کہتی ہیں وہاں ضرورت تھی اس لئے زیور کپڑے پہن لئے یہاں کیا ضرورت ہے اور وہ ضرورت صرف یہ ہے کہ شان کو ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ہم کو کوئی ہلکا نہ سمجھے اگر اعتدال سے زینت ہو تو مضائقہ نہیں مگر اتنا انہماک کہ ہر وقت اسی میں لگی رہتی ہیں یہ ٹھیک نہیں۔

یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ ان کے پاس اچھا خاصا زیور ہے مگر کسی بی بی کے پاس کسی اور وضع یا نقشہ کا زیور بنا ہوا دیکھا بس فریفتہ ہو گئیں۔ اور اس سے فرمائش کی جاتی ہے کہ بہن ذرا مجھ کو دے دینا میں بھی ایسا ہی بنواؤں گی۔ پھر اس سے زیور لے کر شوہر سے فرمائش کرتی ہیں کہ ایسا بنوا دو۔ اب وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ اس کو کیوں خراب ہوتی۔ اچھا خاصا بنا بنایا زیور خراب ہو جائے گا۔ سنار کھوٹ ملا دے گا تو چار پیسہ کا زیور رہ جائے گا مگر ایک نہیں سنتیں یہی کہتی ہیں کہ مجھے تو اسی نمونہ

کا بنوا دو کچھ ہی ہو۔ اب وہ بے چارہ ان کے اصرار پر دلجوئی بھی کرتا ہے اور یہ اس کی عقل پر غالب ہو جاتی ہیں۔ عاقل دل شکنی کو پسند نہیں کرتا۔ آخر وہ کہتا ہے کہ تم جیتی میں ہارا اور پھر اس پر بھی بس نہیں اگر اگلے مہینہ میں اور کوئی نمونہ سامنے آ گیا تو یہ کہتی ہیں کہ اب یہ نمونہ ہونا چاہئے۔

غرض ہر چیز پر ان کا عشق ہے بس یہی چاہتی ہیں کہ جیسی چیز اور کسی کے پاس ہو ویسی ہی ہمارے پاس ہو جاوے۔ شوہر کی ساری کمائی ان کی زیب و زینت ہی میں صرف ہوتی ہے اور یہ ساری مذکورہ خرابیاں حب جاہ اور حب مال کی ہیں مردوں میں بھی عورتوں میں بھی صرف فرق یہ ہے کہ مردوں میں کسی قدر ضرورتوں پر نظر ہے اور عورتوں میں ضرورتوں پر بھی نظر نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق بیان کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے میں نے یہ آیت اس وقت اختیار کی ہے۔

خوارج اور معتزلہ کا مذہب

اگر چہ آیت میں کفار کی حالت بیان کی گئی ہے کہ ان میں فلاں فلاں صفات ذمیمہ پائی جاتی ہیں مسلمانوں کی حالت بیان نہیں کی گئی مگر اس عنوان سے بیان کرنے میں ایک بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اس پر دلالت ہے کہ یہ صفات فی نفسہ ایسی بری خصل ہیں کہ کفار میں بھی باوجود کافر ہونے کے بری ہیں تو مسلمانوں میں تو اسلام کے ہوتے ہوئے بدرجہ اولیٰ نہ ہونی چاہئیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت مسلمانوں کے لئے ان صفات ذمیمہ سے زیادہ مانع ہونی چاہیے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو سیاہ کپڑے پر دھبہ ہو وہ ایسا برا نہیں معلوم ہوتا جیسا سفید کپڑے پر معلوم ہوتا ہے۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ بعض لوگ شاید یوں کہیں کہ یہ آیتیں تو کفار کے بارہ میں ہیں اور مسلمانوں میں ان کو کیوں جاری کیا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان آیات کے جاری کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ صفات اگر مسلمانوں میں پائی جاویں تو ان کو ان صفات کی وجہ سے کافر بنایا جاوے۔ اس درجہ میں تو منطبق کرنا حرام ہے اور اس میں ترک ہے نصوص کا یہ تو مذہب ہے خوارج کا۔ وہ کہتے ہیں کہ کبائر کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لاتکفره بذنب ولا تخرجه من الایمان[1]

یعنی کسی مسلمان کو کافر مت بناؤ کسی گناہ کی وجہ سے اور اس کو ایمان سے خارج مت کرو۔

---

[1] مجمع الزوائد للهیثمی ۱:۱۰۶ بلفظ لا تکفروهم بذنب

حضور نے دو جملے ارشاد فرمائے ایک **لاتکفرہ بذنب** اور دوسرا **لاتخرجہ من الایمان** بظاہر دوسرے جملہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ **لاتخرجہ من الایمان** تو **لا تکفرو بذنب** میں خود ہی آ گیا۔ کیونکہ جب مسلمان کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ ہوا۔ تو خروج من الایمان بھی نہ پایا گیا۔ پھر دوسرا جملہ ارشاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

سو اس کا راز یہ ہے کہ آپ کے بعد دو متنوع فرقے بڑے بڑے پیدا ہونے والے تھے جن کا فتنہ عظیم تھا۔ ایک خوارج دوسرے معتزلہ خوارج کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر تو نہیں ہوتا مگر مومن بھی نہیں رہتا۔ بین بین حالت ہو جاتی ہے نہ اس کو کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن۔ آپ نے ان دونوں فرقوں پر نکیر فرمائی۔ پہلے جملہ میں تو خوارج کا رد ہے اور دوسرے میں معتزلہ کا۔ اس لئے آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔

میں ہر چند قصد کرتا ہوں کہ ایسے غیر اہل علم کے مجمع میں ایسی باتیں نہ بیان کروں جو اہل علم کے لائق ہیں عوام کے مناسب نہیں مگر ایک آدھ بات بیان ہو ہی جاتی ہے۔ بہر حال ان آیات کا مسلمانوں کے حق میں اس طرح جاری کرنا کہ ان کو ان صفات کے ارتکاب سے کافر بنایا جاوے یہ تو مذموم ہے لیکن ایک دوسری صورت ہے کہ تعییر (من العار) یعنی شرم دلانے کے طور پر ان آیات کو مسلمانوں پر جاری کیا جاوے یہ عین حکمت ہے اور شرعاً مطلوب ہے۔

چنانچہ حضور نے فرمایا ہے:

من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر[1] (یعنی جس نے عمداً نماز چھوڑ دی وہ عملاً کافر ہے)

گو عقیدہ کے اعتبار سے کافر نہیں یعنی نماز کا ترک کرنا کفار کا سا عمل ہے کہ وہ بھی نماز نہیں پڑھتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک صلوۃ کو کفر فرمایا گو اس میں تاویل ہے مگر اصل مقصود عار دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کی سی خصلتیں مسلمانوں میں کیوں ہوں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جو صفات ان آیات میں مذکور ہیں ان کے مذموم ہونے کے لئے کفر شرط ہے یعنی جس شخص میں یہ صفات کفر کے ساتھ ہوں وہی ان کا مخاطب اور مورد عتاب ہوگا اور اگر ان کے ساتھ کفر نہ ہو تو مورد عتاب نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دعوی ہے جس کے لئے دلیل کی ضرورت ہے اب رہی یہ بات

---

[1] کنز العمال: ۵۰۰۸، ۱۸۸۷۲، اتحاف السادۃ المتقین ۳: ۱۰

کہ کافروں میں تو کفر تھا ہی اور وہ ان کے لئے کافی تھا اور صفات پر عتاب کیوں کیا گیا۔

حب اللہ و بغض اللہ

سو کفار کے لئے ان صفات کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے نہ محبت ہے نہ بغض۔ بلکہ ان کے بغض و محبت کا مدار صفات پر ہے۔ جس میں اچھی صفات ہوں اس سے محبت ہے اور جس میں بری صفات ہوں اس سے بغض ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر ہے خود حضرت انبیاء علیہم السلام کے حق میں ارشاد ہے۔ **لو اشر کوا لحبط عنهم ما کانوا یعملون** یعنی اگر انبیاء علیہم السلام میں بھی ایسی صفت پائی جاوے تو ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جاوے گا جو اوروں کے ساتھ کیا جائے گا اور مقدم اور تالی میں صرف ملازمت کافی ہے گو مقدم کا وقوع محال ہی ہو۔ پس ہر چند کہ ان حضرات سے ایسا ہو نہیں سکتا مگر نعوذ باللہ نعوذ باللہ! بالفرض محال اگر ایسا ہو تو وہی اثر ہوگا جو اوروں میں ہوتا ہے۔

حضور کی ازواج کے بارہ میں ارشاد ہے۔ **یضاعف لها العذاب ضعفین** کہ نافرمانی کرنے پر ان کو دوسروں سے دگنا عذاب ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ناز و نعمت سے پالتے ہیں اور جس کی زیادہ خاطر داری کرتے ہیں وہ اگر نافرمانی کرے تو اس پر غصہ بھی آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی اہل بیت سے زیادہ کون مورد انعام و فضل ہوگا۔

بہر حال ان نصوص سے معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی ذات سے نہ ایسی محبت ہے کہ چاہے جو بھی کرتا رہے پھر بھی کچھ نہ کہیں اور نہ کسی کی ذات سے ایسا بغض ہے کہ وہ کیسی ہی اطاعت و فرمانبرداری کرے پھر بھی قدر نہ ہو۔

میں نے اپنے بیان میں ایسی کی قید اس لئے لگائی ہے کہ حق تعالیٰ کو بعض سے اتنی محبت ضرور ہے کہ ان کو معاصی نہیں کرنے دیتے۔ ان کے افعال کے ساتھ خدا تعالیٰ کو محبت ہو گئی ہے جس سے ان کی حفاظت کرتے ہیں ان کو گناہوں سے بچاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ حضور کے بارہ میں۔

ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیهم شیئاً قلیلاً (یعنی اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ ان کی طرف کسی قدر تھوڑا سا مائل ہونے کے قریب ہو جاتے)

اللہ اکبر! کیا شان حفاظت ہے کہ قلیل در قلیل کے میلان سے بھی حفاظت کی جاتی ہے اگر کبھی ایسوں سے لغزش ہونے والی ہوتی ہے تو ان کو سنبھال لیتے ہیں۔ آگے نہیں بڑھنے دیتے

ایسے بندوں کو خدا تعالیٰ نے پہلے سے محفوظ رکھا ہے۔ معصیت ان سے ہوتی ہی نہیں۔ انبیاء علیہم السلام سب ہی ایسے ہوتے ہیں۔ اولیاء میں بھی بعض ایسے ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو مراد کہتے ہیں اور ایک ہوتے ہیں مرید جو کہ مجاہدہ کر کے معاصی سے محفوظ رہتے ہیں۔ بعض اولیاء کو یہ مرتبہ دیا ہے۔ (یعنی مرادیت کا) ان کے ارادوں کے اسباب بعد منہدم کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان سے معصیت سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ایسے اولیاء کو محفوظ کہتے ہیں اور انبیاء کو معصوم۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ انبیاء سے تو معاصی صادر ہوئے ہیں پھر معصوم ہونے کا حکم کیسے کیا گیا۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بارہ میں ہے **عصی آدم ربہ** کہ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ عصی کے معنی مجازی مراد ہیں یعنی خطائے اجتہادی جیسا اپنے موقع میں ثابت ہو چکا ہے۔ اور خطائے اجتہادی میں تو ایک گنا ثواب ملتا ہے پس وہ صورۃ خطا ہے ورنہ واقع میں طاعت ہے کیونکہ ثواب مخصوص ہے طاعت کے ساتھ پس انبیاء علیہم السلام کی لغزشیں حقیقت میں طاعت ہی ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ عقوبت کا کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس وقت اس تحقیق کا زیادہ موقع نہیں۔

اس وقت مجھے فقط اتنا بتلانا ہے کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی بندہ کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ہو کہ اس کو گناہ کرنے ہی نہ دیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ باوجود گناہ کرنے کے محبت باقی رہے اسی واسطے میں نے اپنی تقریر میں ایسی کی قید لگائی بہت لوگوں کو یہ ناز ہے کہ ہم کچھ ہی گناہ کر لیں کچھ نہ ہوگا کیونکہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں مگر یہ خیال محض باطل ہے یہ عقیدہ یہود اور نصاریٰ کا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے ایسی محبت نہیں کہ معاصی کرنے پر بھی وہ باقی رہے نہ ایسا بغض ہے کہ طاعت سے بھی قدر نہ ہو۔

جیسے انسان کا حال ہے کہ کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ جو کچھ بھی کرے سب معاف اور ریا بغض ہو جاتا ہے تو وہ گو کیسی ہی طاعت کرے مگر قبول ہی نہیں۔ جیسے کسی حاکم کو کسی کی ذات سے بغض ہو جاتا ہے تو وہ اس کو قید ہی کرنا چاہتا ہے۔ وکلاء و بیرسٹر وغیرہ سب کے سب رہ جاتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا اسی طرح اگر کسی سے ذاتی نفرت ہوتی ہے اس کے ہزار کمالات بھی بے اثر ہو جاتے ہیں بلکہ عیوب نظر آنے لگتے ہیں۔

ایک بزرگ تھے اچھے اچھے لوگ ان کے معتقد تھے مگر بی بی ان کی نہایت نالائق تھی۔ وہ ان

کی معتقد نہ تھی بلکہ ایذائیں دیتی تھی۔ ہمیشہ ان سے لڑتی رہتی تھی ان کے خوارق اور کرامات کو بھی دیکھتی تھی مگر اس کا اعتقاد ہی ان پر نہ ہوتا تھا۔ ایک روز وہ بزرگ قصداً ہوا میں اڑے اور اپنے گھر کے اوپر سے گزرے تاکہ بی بی دیکھے اور ایذا دینا چھوڑ دے۔ مستورات نے جوان کے گھر میں جمع تھیں دیکھ کر کہا کہ یہ کوئی ابدال معلوم ہوتے ہیں ان کی بی بی نے بھی کہا کہ واقعی ابدال ہی ہیں جب وہ گھر میں آئے تو بی بی نے کہا اللہ اکبر! آج ہم نے عجیب بات دیکھی جو کبھی نہ دیکھی نہ سنی۔ ایک بزرگ ہوا میں اڑ رہے تھے بڑے صاحب کمال تھے ان بزرگ نے کہا کہ بی بی تم نے پہچانا بھی کہا نہیں فرمایا وہ میں ہی تھا تو وہ کہتی ہے کہ ہاں جب ہی ٹیڑھے اڑ رہے تھے اس بی بی کو ان کی ذات سے بغض تھا۔ اس لئے باوجود کمال دیکھنے کے بھی ان کی معتقد نہ ہوئی۔

بات یہ ہے کہ انسان جس کے متعلق کوئی رائے اچھی بری قائم کر لیتا ہے تو گو اس کو کیسی ہی دلیل اس کے خلاف کی ملے مگر یہی چاہتا ہے اپنی رائے نہ بدلے سو خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت ارفع ہے کہ کوئی ہزار برس بھی اطاعت اور بغض ذاتی کی وجہ سے ان کے نزدیک اس کی قدر نہ ہو یا کوئی گناہ کیا کرے اور حب ذاتی کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کسی کی طاعت سے نہ ان کا ذرہ برابر نفع نہ کسی کی معصیت سے ان کا کچھ ضرر وہاں تو یہ کیفیت ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو   دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

"جو آنا چاہے آجائے جو جانا چاہے چلا جائے اس دربان میں چوبدار چوکیدار اور دار و گیر نہیں ہے"

حق سبحانہ تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہی معنی ہیں نہ وہ معنی جس کو عوام سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ نہ کسی بات کا انتظام ہے نہ کسی کے آرام و تکلیف کی پرواہ ہے جس کو چاہا بدوں کسی حکمت کے یتیم کر دیا، جس کو چاہا مصیبت میں ڈال دیا جسے چاہا بیمار کر دیا جب کوئی یتیم ہو جائے یا غریب ہو جائے یا مصیبت میں پڑ جائے تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ خدا کی ذات بے پرواہ ہے یعنی کسی کے نفع و ضرر کی کوئی رعایت نہیں۔ ایسے موقع پر یہ کلمہ بہت ہی سخت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں آتا نہ کسی کی مصلحت کی رعایت کرتے ہیں۔ لوگ بدلالت حال یہ چاہتے ہیں کہ جو مصلحت کسی واقعہ میں ہم سمجھتے ہیں خدا تعالیٰ بھی نعوذ باللہ اسی کے موافق معاملہ فرما دیں۔ اگرچہ یہ عقیدہ نہ ہو مگر اقوال سے تو یہی مفہوم ہوتا ہے بڑے بڑے اس میں مبتلا ہیں۔

یہ جو بیماری آج کل ہوئی تھی۔ اس میں کیسے کیسے کلمات لوگوں نے کہے ہیں کفر تک بکا ہے۔

(بیماری ہوئی تھی اس میں بہت جگہ ایسا ہوا کہ بچے یتیم رہ گئے گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ بی بی بیوہ ہوگئی تو لوگ کہتے تھے کہ بس اللہ میاں کے یہاں نعوذ باللہ کوئی قاعدہ نہیں۔ اندھا دھند معاملہ ہے کسی کی پرواہی نہیں بڑی بڑی شکایتیں کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی؛ اس سے توبہ کرنا چاہئے خدا تعالیٰ کے غنی ہونے کے یہ معنی نہیں جو مذکور ہوئے بلکہ یہ معنی ہیں کہ کسی کی طاعت سے ان کو نفع نہیں اور کسی کے کفر و معصیت سے ان کا ضرر نہیں۔ چنانچہ اسی معنی کو صریحاً فرماتے ہیں۔

ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم (یعنی اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے غنی ہے)

یعنی اس کا کچھ بھی ضرر نہیں۔ جیسے سلاطین دنیا کو رعایا کے بگڑنے سے ضرر ہوتا ہے ایسا نہیں ہے۔ اگر کسی بادشاہ کی رعایا اس سے باغی ہو جائے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اس کا تخت و تاج باقی نہیں رہتا۔ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ اس کا احتمال حق تعالیٰ میں نہیں ہے۔ اگر تمام آسمان و زمین والے باغی ہو جائیں تو وہاں ذرہ برابر بھی ضرر نہیں اور یہ بھی نہیں کہ کوئی ہزار برس تک معاصی کرتا رہے پھر رجوع کرے اور توبہ کرے تو قبول نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد بالا کے بعد ہی یہ بھی ارشاد ہے **وان تشکروا یرضہ لکم** (اور اگر تم شکر کرو وہ تم سے راضی ہوں گے)

شیطان سے رعایت

چنانچہ میں ایک روایت سیر کی نقل کرتا ہوں۔ سیر کی روایت بطور تائید کے بیان کر دی جاوے تو مضائقہ نہیں جب کہ وہ نصوص سے متاید ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوگا کہ شیطان کو بھی جو سب سے اعلیٰ درجہ کا نافرمان ہے۔ حق تعالیٰ نے توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا۔

وہ روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حق تعالیٰ سے مناجات کے لئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کہ شیطان ملا اور آپ سے کہا کہ میری بھی ایک درخواست ہے میں بہت گنہگار ہوں میرے لئے بھی حق تعالیٰ سے دو کلمہ کہہ دیجئے گا۔ انبیاء علیہم السلام بڑے شفیق ہوتے ہیں اس کے اس کہنے پر آپ کو رحمت کا جوش ہوا اور آپ نے وعدہ فرما لیا۔ غرض خدا تعالیٰ سے مناجات ہوئی آپ شیطان کا پیام بھول گئے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کسی بندہ سے وعدہ کر کے بھول گئے آپ کو یاد آ گیا اور آپ نے شیطان کے بارے میں عرض کیا اس پر ارشاد ہوا کہ اس سے کہہ دینا کہ ہمارا تمہارا جس بات پر بگاڑ ہوا ہے وہی اب بھی ہے گو آدم اس وقت موجود نہیں مگر ان کی قبر موجود ہے۔ ان کی قبر کو سجدہ کر لے بس سب معاف ہے۔ آپ بہت خوش ہوئے کہ یہ تو بڑا سستا نسخہ ہے اس میں اس کا کیا حرج ہے اچھا ہو کہ وہ ایسا کر لے تو دنیا سے سارا فساد ہی مٹ جاوے۔ غرض

آپ واپس تشریف لائے اور شیطان ملا تو آپ نے فرمایا تو بڑا خوش قسمت ہے وہاں سے عجیب وغریب جواب ملا ہے۔ اس نے کہا بتلایئے تو سہی آپ کو جو جواب ارشاد ہوا تھا اس سے کہہ دیا اس نے کہا سبحان اللہ! اچھا پیام لائے جب میں نے آدم کو ان کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا تو اب مرنے کے بعد تو ضرور کروں گا کم بخت خبیث ملعون نے یہ جواب دیا۔

شیطان کی خود ہی حالت ایسی ہے کہ آسان سے آسان نسخہ بھی کم بخت کو بتلایا تو اس سے نہ ہو سکا جب خناس دماغ میں گھسا ہو تو عمل کون کرے لیکن اگر وہ بھی توبہ کر لے تو اس کو بھی روک ٹوک نہیں مگر وہ کم بخت کیوں کرنے لگا اس کی قسمت ہی میں نہیں۔

آگے راز قدر کا ہے اس میں خوض نہ کرنا چاہئے۔ غرض جب شیطان کے لئے بھی توبہ کی گنجائش ہے تو پھر اور کون رہ گیا حق تعالیٰ بعد فہرست کبائر کے ارشاد فرماتے ہیں۔ **ومن یفعل ذلک یلق اثاماً یضاعف له العذاب یوم القیمة و یخلد فیه مهاناً الامن تاب الخ**

اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب سے آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گو اس کا زمانہ محدود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حب ذاتی اور بغض ذاتی نہیں کفار سے بھی ان کی ذات کی وجہ سے بغض نہیں بلکہ ان کے افعال سے بغض ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے۔ اور دوسرے افعال بھی موجب بغض ہیں۔

احتیاط کی ضرورت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ افعال مبغوض ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ ان افعال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو کفار سے بغض ہے تو ان سے ہمیں بھی بچنا چاہئے ایک تو اس وجہ سے کہ وہ افعال مبغوض ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ ہم مکلف ہیں فروع کے اس لئے ہمارے حق میں ان کا قبح زیادہ شدید ہو گا اس لئے ہم کو اور بھی زیادہ بچنا چاہئے یہ تو تمہید تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بغض اور حب کا مدار افعال وصفات پر ہے نہ ذات پر۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ مقولہ یہ ہے۔ **ای الفریقین خیر مقاماً و احسن ندیاً** یعنی جب ہماری آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان

والوں سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کون سا فریق بہتر ہے۔ مکان میں اور اچھا ہے محفل میں واذا تتلیٰ علیهم میں ھم کی ضمیر ظاہراً ان کفار کی طرف عائد ہے مگر نہ تخصیص کی بناء پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔

تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ کر کے اس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا اور حضور کی خدمت میں آ کر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو سنیں گے مگر ہماری مجالس غرباء سے علیحدہ کر دیجئے ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم روسا ہیں ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بٹہ لگتا ہے ہماری اہانت ہوتی ہے حضور نے اتمام حجت کی غرض سے اس کا کچھ خفیف سا خیال بھی کیا تھا تا کہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ولاتطرد الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه' ما علیک من حسابهم من شیء وما من حسابک علیهم من شیء فتطردهم فتکون من الظلمین.

اور مت دور کر ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں رضا مندی اس کی تم پر نہیں ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تمہارے حساب سے ان پر کچھ تم اگر ان کو دور کر دو پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

ایک جگہ اسی کے قریب المعنی یہ آیت ہے۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه' ولاتعد عینک عنهم تریدزینة الحیوٰة الدنیا ولا تطع من اغفلنا قلبه' عن ذکرنا واتبع هواه و کان امره' فرطاً.

اور روک رکھو اپنی ذات کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طالب ہیں اس کی رضا مندی کے اور نہ ہٹیں تمہاری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ کہا مانو اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور پیروی کی اس نے اپنی خواہش کی اور ہے اس کا کام حد سے نکلا ہوا۔

یہ ترید مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا (یعنی ارادہ زینت دنیا کا) صدور بھی ہوا ہو بلکہ نہی کے تحت میں ہے۔ اور ترکیب میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی

آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشاء اور سبب ارادہ حیات دنیا کا ہوتا۔ آگے صاف صاف فرما دیا۔

فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر

کہ جس کے جی میں آئے ایمان لائے جس کے جی میں آئے کفر کرے۔

آپ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ غرض آپ کو منع فرمایا کہ کوئی خاص جلسہ ان خبیثوں کے لئے نہ کیا جاوے۔ ان کو سو دفعہ غرض پڑے آئیں' ورنہ جائیں جہنم میں۔

مقام طالب و مطلوب

امام مالکؒ سے خلیفہ نے درخواست کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا ان کے لئے عار ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا خلیفہ نے پہلے ان سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آ کر درس دیا کریں آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب ہے طالب نہیں خلیفہ سمجھدار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا اس لئے فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو **تتلی علیھم** کے متعلق تحقیق تھی اس کے بعد آیات میں بینات کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل مستنبط بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارۃ النص بالکل کھلا ہوا ہے۔ اس میں کچھ اغلاق نہیں باقی دلالت النص اور اشارۃ النص اور اقتضاء النص وہ کھلے ہوئے نہیں کہ ہر کوئی اس کو سمجھ لے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے۔

واذا جاء ھم امر من الامن او الخوف اذا عوابه ولو ردوه الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمه الذین یستنبطونه' منھم

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی آتی ہے اس کو پھیلا دیتے ہیں جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں تو استنباط شرط ہے تو اور امور علمیہ تو جدار ہے ہاں ظاہری مدلول کھلا ہوا ہے ہی۔

غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اگر ہم برے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے' نہ مال دیتے' نہ اولاد دیتے۔

غالباً انہوں نے کسی پھانسی کے مجرم کو نہیں دیکھا ہوگا کہ اس کی کیسی خاطر کی جاتی ہے مگر آج کل تو سب جانتے ہیں کہ پھانسی والے کی بڑی خاطر کی جاتی ہے اس سے کہتے ہیں کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتلا دو۔ اگر وہ کہے فلاں چیز کو دل چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ چیز موجود کی جاتی ہے اس سے پوچھتے ہیں کہ کسی سے ملو گے اگر کہے تو ملاتے بھی ہیں تو اس وقت سب جانتے ہیں کہ اس کی کیسی خاطر کی جاتی ہے مگر نتیجہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ اب اگر وہ پھانسی والا اس منظر کو دیکھ کر یوں سمجھے کہ میں حاکم کا بڑا محبوب ہوں اور یہ خیال کرے کہ رؤسا کو ابھی چائے تک بھی نہیں دی گئی اور میری یہ خاطر ہو رہی ہے تو یہ اس کی کتنی بڑی حماقت ہے۔

کفار کی غلط فہمی

قاعدہ یہی ہے کہ جتنا سنگین مقدمہ ہوتا ہے اسی قدر مجرم کو مہلت دی جاتی ہے۔ تو شرک و کفر سے بڑھ کر کون سا جرم ہوگا۔ اس لئے اس میں مہلت بھی اچھی دی گئی۔ پس کفار کا یہ استدلال کتنا باطل تھا۔ کہ ہم خوشحال ہیں ہمارے گھر اچھے ہیں ہماری نشست گاہ عمدہ ہے اس لئے ہم خدا کے محبوب ہیں اور تمہارے پاس کیا ہے۔ روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں ملتی۔ ہمارا خوشحال ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ ہم حق پر ہیں۔

اس دلیل کی ایسی مثال ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی ہندوستان آیا تھا۔ ایک دکان پر اس نے حلوہ رکھا دیکھا۔ کھانے کو جی چاہا۔ پاس کچھ تھا نہیں۔ تو آپ نے کیا کیا کہ حلوا مٹھی میں بھر کر وہاں سے بھاگے۔ حلوائی پیچھے پیچھے دوڑا جب دیکھا کہ یہ تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتا تو آپ سارا حلوہ منہ میں رکھ گئے اور کہا جاؤ۔ یہ حلوا نہ تمہارا رہا نہ ہمارا۔ کیونکہ خان نے اپنی منشاء کے موافق لطف کے ساتھ تو کھایا ہی نہ تھا۔ حلوائی آپ کو حاکم کے پاس لے گیا حاکم نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کو ایک گدھے پر سوار کرو اور لڑکوں کی فوج پیچھے تالیاں جاتی جائے۔ اس طرح شہر سے باہر کر دو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کوئی لڑکا دف بجا رہا تھا کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا غرض اس ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالے گئے اور اپنے ملک میں پہنچے وہاں لوگوں نے پوچھا ’’آغاز ہندوستان رفتہ بودی‘ چہ طور یافتی؟‘‘ (آغا ہدوستان گئے تو وہاں کے لوگوں کو کیسے پایا)

تو آپ کہتے ہیں ’’بابا! ہندوستان خوب ملک است‘ حلوہ خوردن مفت است۔ فوج طفلاں مفت ست‘ سواری خر مفت است ہندوستان خوب ملک است‘‘۔

یعنی ہندوستان میں مجھ کو دولہا بنایا گیا پیچھے پیچھے باجا بجتا چلا آتا تھا اور تنک گدھے کی سواری ملی۔ سبحان اللہ! کیا آپ کا مذاق تھا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ دنیا کا سامان نافرمان کے لے ایسی ہی سزا ہے جیسی خان کی سزا تھی مگر وہ اس سزا کو نہیں سمجھتے اور اس کو سزا ہونا کچھ آخرت ہی پر موقوف نہیں وہاں تو سزا ہو گی ہی۔ اس سازوسامان کا سزا ہونا فہم سلیم کو دنیا ہی میں محسوس ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا

کہ اللہ تعالیٰ یہی ارادہ کرتا ہے کہ ان کو مال و دولت سے دنیا میں (بھی) عذاب دے۔

اس ارشاد میں اس کی تحقیق زیادہ نہیں فرمائی کہ وہ عذاب کیا ہے کیونکہ ذرا سے غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کا سازوسامان بظاہر سامان راحت تو ہے مگر ان کو اس سے راحت نہیں۔

دولت اور کفار کی خصلت

کیونکہ نافرمان لوگ ہمیشہ روحانی پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر مال میں نقصان ہو گیا تو کیا ہو گا۔ اگر چور لے گئے تو کیا ہو گا اور یہ ہو گا کہ تو کیا ہو گا اور وہ ہو گا تو کیا ہو گا دن رات اسی ادھیڑ بن میں مبتلا ہیں۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اولاد نہیں ہوتی تو اس کی فکر میں ہیں اور اگر ہو گئی تو بھی فکر سوار ہے کہ جانے زندہ رہے گی یا نہیں غرض ہر وقت تردد میں ہیں دن رات مال و اولاد کی فکر میں پریشان ہیں۔

ایک رئیس تھے ان کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا مدت کے بعد اولاد ہوئی تو یہ غم سوار ہوا کہ دیکھئے زیادہ دیر زندہ بھی رہے گی یا نہیں یہاں تک کہ ان کی شادیاں بھی کر دیں۔ پھر یہ غم سوار ہوا کہ اولاد کے بھی اولاد ہوتی ہے یا نہیں بے چارے ہر وقت غم و پریشانی میں رہتے ہیں۔

یہی وہ عذاب ہے جو اہل دنیا پر دنیا میں مسلط کیا جاتا ہے۔ غرض وہاں بھی عذاب اور یہاں بھی عذاب اگر صرف وہاں ہی ہوتا وہ بھی بہت کافی تھا چہ جائیکہ دونوں جگہ ہو۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ وہ عذاب سے آخرت میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ بری ہیں اور دنیا میں بھی ان کو یہ فکر ہی نہیں ہوتی کہ مال ہو گا تو کیا ہو گا اور نہ ہو گا تو کیا ہو گا اولاد نہ ہو گی تو کیا ہو گا اور ہو گی تو کیا ہو گا مر جائے گی تو کیا ہو گا جو حالت پیش آئے ان کے نزدیک سب یکساں ہے۔

یہ مسلم ہے کہ سامان کلفت سے فی نفسہ کلفت ہوا کرتی ہے مگر وہاں ایک عارض ہے جس کے

سبب ان کو کلفت نہیں پہنچتی۔ وہ عارض کیا ہے محبت حق چونکہ ان کو محبت ہے خدا تعالیٰ سے اس لئے جو سبب بھی کلفت کا پیش آتا ہے وہ ان کے حق میں عین راحت ہوتا ہے محبت کا خاصہ ہی یہ ہے کہ محبوب کی طرف سے جو تکلیف بھی پہنچے وہ راحت ہی ہوتی ہے عشق مجازی میں اس کا تجربہ کر لیجئے کہ عشاق کو محبوب کی طرف سے کتنی کلفتیں پہنچتی ہیں مگر وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

غرض کفار استدلال کرتے تھے کہ ہماری حالت اچھی ہے اگر ہم برے ہوتے تو ہمیں یہ چیزیں کیوں دی جاتیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہاں کے اچھے ہونے سے کیا استدلال ہو سکتا ہے۔ جیسا ابھی بیان ہوا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اموال دنیا پر فخر کرنا کفار کی خصلت ہے چنانچہ پہلے تو خدا تعالیٰ نے کفار کا قول نقل کیا۔ آگے اس کا رد ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثاً ورئیاً

کہ ہم نے تم سے پہلے کتنے قرن ہلاک کر دیئے جو سامان اور منظر میں تم سے بڑھے ہوئے تھے۔ یعنی ان کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی۔ مال واسباب بھی بہت تھا اچھے اچھے مکانات تھے' نشست گاہیں نہایت آراستہ وپیراستہ تھیں خلاصہ یہ کہ زیب وزینت کی چیزیں ان کے پاس بہت تھیں مگر پھر بھی معذب ہوئے۔ تو ان میں بھی یہی دو مرض تھے حب مال وحب جاہ۔

حب مال کے اثرات

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور جاہ کی بھی میرا مقصود اس کی مذمت سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ کفار کی خصلت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہیے۔ اور یہاں گو چند علمی مضامین بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں۔ کیونکہ مجمع مستورات کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں۔ اس لئے سہل سہل بیان کر رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابل فخر ہیں نہ زینت کی چیزیں قابل فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اس سے جاہ پیدا کر لیں اور چونکہ یہ دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ حب مال کی وجہ سے اگر حب مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا غیبت اسی وجہ سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جاہ ہے۔ غصہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر خیال کرتا ہے جو کہ

جاہ اور تکبر ہے اور یہ تکبر ایسی بری خصلت ہے کہ اس سے اور بہت سی بری باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان میں یہی تو تھا۔ اسی لئے تو یہ کہا تھا۔

خلقتنی من نار و خلقته من طین. (کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے)

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص اکڑتا ہوا گزرا۔ انہوں نے اس کو نصیحت کی۔ اس نے کہا تم مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ بولے ہاں جانتا ہوں۔

اولک نطفة مذرة آخرک جیفة قذرة و انت بین ذلک تحمل العذرة

یعنی اول تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سڑا ہوا مردار ہو جاوے گا اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے اندر پاخانہ بھرا ہے۔

ہماری عجب حالت ہے۔ اگر ہمارے پیٹ میں سوراخ ہوتا۔ جس سے ہر وقت پاخانہ بہتا یا اس میں سے ہر وقت بدبو آیا کرتی تو کوئی ہمیں اپنے پاس بھی نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسا چھپا دیا ہے کہ دوسرے کا ذہن بھی نجاست تک نہیں جاتا۔ ورنہ ہماری کیا گت ہوتی۔ اگر ہم بیٹھ کر اپنی اس حالت کو سوچ لیا کریں کہ ہمارے اندر پاخانہ بھرا ہوا ہے تو یہ بھی پورا علاج ہے تکبر کا میں کہتا ہوں کہ جو شخص تکبر میں مبتلا ہو وہ پاخانہ میں بیٹھ کر ذرا اپنی حالت پر غور کر لیا کرے کہ میرے اندر سے کیسی چیز اور کس طرح نکل رہی ہے اگر اسی کا مراقبہ کر لیا کرے تو کافی ہے بعض لوگ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں کہ تم ہمیں نہیں جانتے۔ ایسے لوگوں کا جواب وہی ہے جو ان بزرگ نے دیا تھا۔

اس بیماری میں دیکھئے کہ کیا کیا حالتیں ہوئیں ایک دن کی بیماری میں آدمی ڈھیلا ہو جاتا ہے اگر کسی کو اپنے حسن و جمال پر ناز ہو اور چیچک نکل آئے تو اس سے پوچھئے کہ اب کہاں گیا وہ حسن و جمال اور کمال بعض عالموں کو دیکھا گیا کہ علوم کے ماہر تھے۔ ان کو ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ الحمد بھی یاد نہ رہی انسان کس کمال پر فکر کرے۔

مال اور فخر

مال پر فخر کرنا تو بڑی ہی بیوقوفی ہے کیونکہ کمالات کو تو انسان سے من وجہ تلبس بھی ہے جیسے علم، شجاعت اور سخاوت، مال میں یہ بھی نہیں۔ مال کو انسان کے سامنے صرف اضافت کا تعلق ہے کہ یہ فلاں کا مال ہے۔ اضافت پر کیا فخر اگر کہیں چور آ گیا اور سب جمع پونجی لے گیا تو بس مضاف الیہ

ہی مضاف الیہ رہ گئے مضاف جو تھا وہ نکل گیا۔

تھانہ بھون میں ایک بی بی تھیں کچھ اثاثہ پاس تھا۔ ایک ہی بیٹا تھا اس کی شادی کے واسطے خوب سامان کیا ان کو خرافات میں خرچ کرنے سے منع بھی کیا گیا تو بولیں واہ ایک ہی تو بیٹا ہے ارمان تو نکال لوں۔ ہر چند منع کیا مگر کچھ اثر نہ ہوا' غرض خوب شیخ چلی کا سا گھر بنایا کہ اگر خرچ ہو جاوے گا تو کیا ہوا جہیز میں اتنا آوے گا نیوتہ میں اتنا۔ اتنا فلاں کا دوں گی اور اتنا فلانے کا پھر اتنا بچ جاوے گا غرض خوب جمع کر کے رکھا چور بھی تاک لگا رہے تھے بس سب کا سب ایک ہی رات میں اٹھا کر لے گئے جب یہ حالت ہے مال کی اس پر فخر کرنا حماقت ہے جو چیزیں فخر کی ہیں بھی مثلاً علم وغیرہ اس پر بھی فخر نہ کرنا چاہئے۔

اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے کو نہیں نکلتا۔ اپنے آپ کو خدا جانے کیا سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کوئی اونچا نہیں بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں اسی طرح لوگوں نے دنیا میں اپنے سے بڑوں کو دیکھا نہیں۔ اس لئے تکبر کرتے ہیں اپنے سے بڑوں کو دیکھیں تو حقیقت معلوم ہو جائے جب اپنے سے بڑے بڑے بھی دنیا میں موجود ہیں تو پھر فخر کی کہاں گنجائش ہے ہاں اپنے سے بڑا کوئی نہ ہوتا تو کچھ گنجائش بھی تھی فخر کی۔

بوستاں میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک گاؤں کا چودھری تھا جس کی عزت و توقیر گاؤں میں بہت زیادہ تھی۔ وہ اتفاق سے ایک جگہ پہنچا جہاں شاہی لشکر پڑا تھا۔ ہاتھی' گھوڑے حشم' خدم' نقیب' چوبدار ہزاروں کی تعداد میں سب ہی کچھ تھا۔ چودھری یہ حال دیکھ کر کانپنے لگا اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا' ابا جان! آپ بھی تو چودھری ہیں اور ایسے بڑے ہیں اور ایسے ہیں آپ کی یہ حالت کیوں ہے آپ کے پاس بھی تو حشم خدم ہیں۔ اس نے کہا' بیٹا میں چودھری اسی وقت تک ہوں جب تک یہاں قدم نہیں رکھا میں تو گاؤں تک چودھری ہوں یہاں میری کچھ بھی ہستی نہیں۔

اسی طرح گولر کا کیڑا جب تک گولر کے اندر ہے یوں سمجھتا ہے کہ میں بڑی سلطنت کا مالک ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون ہو گا مگر جب گولر کا پیٹ پھوٹا تو اپنی حقیقت کھلی۔ اس کو کہتے ہیں۔

چوں کرمے کہ در سنگ نہاں ست   زمین و آسمان وے ہماں ست

پتھر کے اندر جو کیڑا ہے وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔

شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید   خجل شد چو دریائے پہنا بدید

اس نے جب دریا کو دیکھا تو اپنی بڑائی نکل گئی۔

یعنی پانی کا ایک قطرہ اوپر سے ابر میں سے چلا اور اپنے کو سمجھ رہا تھا انا کذا و انا کذا کہ میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ مدور ہوں یعنی حسین و جمیل ہوں۔ منور ہوں یعنی چمک دمک رکھتا ہوں مطہر ہوں غرض اپنی صفات کمال پر ناز کر رہا تھا۔

جب نیچے آیا اور دریا کو دیکھا تو سب بڑائی نکل گئی فرماتے ہیں۔

خجل شد چو دریاہ پہنا بدید

آگے خجلت میں وہی قطرہ کہتا ہے

کہ جائیکہ دریا ست من کیستم   گراو ہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا موجود ہے میں کون ہوں اگر اس کا وجود برحق ہے تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کی طرف نظر کی جائے تو ہستی اور نیستی کا تفاوت معلوم ہو جاوے۔ اسی کو آگے کہتے ہیں۔

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتراند   کہ با ہستیش نام ہستی برند

"سب لوگ جو کچھ بھی ہیں ان سے کمتر ہیں کہ اسکی ہستی کے ساتھ کسی ہستی کا نام لیتے ہیں"

عارف نظامی فرماتے ہیں۔

پناہ بلندی و ہستی توئی   ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

"بلندی اور ہستی والا تو ہی ہے سب نیستی یعنی نہ موجود ہونے والے ہیں ہستی صرف تو ہی ہے"

بوستان میں ایک اور حکایت لکھی ہے جگنو سے کسی نے پوچھا کہ یار تم رات میں تو نظر آتے ہو دن میں کہاں رہتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا۔

کہ من روز شب جز بصحرا نیم   ولے پیش خورشید پیدا نیم

کہ میں دن رات صحرا ہی میں رہتا ہوں میں کہیں چلا نہیں جاتا مگر آفتاب کے سامنے مٹ جاتا ہوں۔

خدا جانتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی عظمت منکشف ہو جائے یعنی اپنی استعداد کے موافق' ورنہ ہم کیا سمجھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت کو' تو نہ اپنے علم پر نظر رہے نہ اور کسی چیز پر' نہ کوئی اپنے کو میر صاحب کہیں' نہ ڈپٹی صاحب کہیں۔ یہ حالت ہو جاوے کہ سب کچھ بھول جاویں۔

بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو حقیقی بنا رکھا ہے اور خدا کا ہوائی۔ اسی لئے ہمیں بڑائی سوجھتی ہے۔ پس اصل مرض اپنے کو بڑا سمجھنا ہے اور اس کی اصل خدا کو بڑا نہ سمجھنا۔ ساری خرابی اسی کی ہے پس اس کا علاج کرو۔

عورتوں کا مذاق

نیز اس سے ایک اور مرض بھی پیدا ہوتا ہے یعنی زیب و زینت کا خیال۔ چنانچہ زینت میں عورتوں کا مذاق یہ ہے کہ خوب زینت کرنا چاہئے۔ کوئی مہمان آ جائے تو بڑے بڑے سامان ہوتے ہیں۔ خاصدان جو مہمان کے سامنے ایک دو دفعہ گیا تھا' دوسری دفعہ پان اس میں نہیں جانا چاہئے۔ بلکہ دوسرا خاصدان ہونا چاہیے صرف یہ بات ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمارے یہاں خاصدان اور بھی ہے پھر ایک دفعہ تانبے کا ہو تو دوسری بار کوٹ کا ہو۔ اسی طرح اور چیزوں میں اندازہ کر لیجئے۔ روزانہ تو گھر کوڑے سے بھرا پڑا رہتا ہے مہمان آیا تو صاف کیا غرض ہر بات میں دکھلاوا ہے ان کا تو مذہب یہ ہے کہ کوئی یوں نہ کہے کہ ایسے ہیں اور ویسے ہیں اور کوئی سے ان کی مراد مخلوق ہی ہوتی ہے۔ کاش! اللہ تعالیٰ کو بھی اس عموم میں داخل کیا جاتا (کہ ان کے ناخوش ہونے کا بھی خیال ہوتا)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین سے دنیا بھاری ہے اس لئے اس کی زیادہ رعایت کی جاتی ہے سو بالکل غلط۔ دنیا کیا بھاری ہوتی۔ دنیا ہے کیا چیز **لاحول ولا قوۃ الا باللہ!** کھانا' پینا' ہگنا' موتنا' بس اتنی ہی تو حقیقت ہے دنیا کی۔ یہ امیر کو بھی حاصل ہے اور غریب کو بھی۔ ہاں اگر پانچ روپیہ والے کی خوراک پانچ چھٹانک ہے اور پانچ ہزار والے کی پانچ ہزار چھٹانک ہوتی تو کہہ سکتے تھے کہ امیر ہونے میں بڑا فائدہ ہے مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہاں اتنا فرق بے شک ہے کہ یہ پانچ چھٹانک سوکھی کھاتا ہے اور وہ تر بلکہ امیر صاحب تو پانچ چھٹانک کھا بھی نہیں سکتے وہ تو پانچ تولہ ہی کھائیں گے۔ گھی کی کثرت سے ان کی خوراک ہی نہیں رہتی۔

جب میں نواب صاحب ڈھاکہ کے یہاں گیا تو تھا وہ میری وجہ سے گھی کم ڈلواتے تھے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے مذاق میں زیادہ گھی ڈالنے سے کھانے کا مزہ ہی باقی نہیں رہتا۔ مگر وہاں نواب صاحب کے چچا سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی پڑا کرتا ہے میں نے کہا اتنا گھی تو ہمارے یہاں بیلوں کو دیا جاتا ہے میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گھی کوئی زیادہ مرغوب چیز نہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا قرآن مجید سے کیسے معلوم ہوا۔ میں نے جواب دیا

کہ قرآن مجید نے جنت میں چار نہریں بتلائی ہیں۔ ایک پانی کی ایک دودھ کی ایک شراب طہور کی ایک شہد کی۔ اگر گھی بھی مرغوب ہوتا تو ایک نہر اس کی بھی مذکور ہوتی پھر یہ کہ امیر صاحب کو ایک بجے کھانا نصیب ہوتا ہے اور غریب تو جب صبح ہوئی اور بی بی سے پوچھتے ہیں کچھ ہے بس باسی واسی جو کچھ ہوا کھا پی کر کھیت یا کچہری یا دوسرے کام کو چلے گئے اور امیر صاحب کو ایک بجے کھانا نصیب ہوگا کیونکہ مکلّف کھانے تو جلدی تیار نہیں ہو سکتے۔ تو صاحب ہم باز آئے ایسی امیری سے۔

عورت اور زیور

اسی طرح جو عورتیں دن رات زیور وغیرہ لادنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ وہ پوری قید میں ہیں اور اگر اس زیور وغیرہ کی زکوٰۃ نہ دی تو یہاں بھی قید اور وہاں آخرت میں بھی قید۔ مگر عورتیں اس بوجھ کی ایسی عادی ہیں کہ لادے ہی رہتی ہیں۔

ایک بنئے کی حکایت ہے کہ اس نے اپنی بی بی سے کہا کہ ذرا سل کا بٹہ اٹھا دیجیو وہ بولی کہ میں اتنا بوجھ کس طرح اٹھاؤں۔ وہ بے چارہ خاموش ہو گیا پھر اس نے یہ کیا کہ بی بی سے چھپا کر سل کو سنار کے پاس لے گیا اور کہا کہ اس پر سونا چڑھا دے اور ایک زنجیر ڈال دے اس نے سونا چڑھا دیا اور زنجیر ڈال دی اب اس کو گھر لائے بی بی سے کہا کہ میں نے تمہارے واسطے یہ ایک قسم کا زیور بنوایا ہے یہ سنتے ہی اس نے وہ سل اپنے گلے میں ڈال لی اور لگی ادھر ادھر چلنے پھرنے۔ ذرا بھی بوجھ نہ معلوم ہوا اگرچہ گردن جھک گئی لالہ جی نے کہا کہ تجھ سے تو سل کا بٹہ بھی نہیں اٹھتا تھا اب سل کیسے اٹھالی۔

بعض دفعہ یہ حالت ہوتی ہے کہ کان زیور کو لادے لادے سوج جاتے ہیں مگر ان کی شوق میں کچھ نظر سوجھتا ان کو تو اس کے لادنے پھندنے سے یہ مقصود ہے کہ ذرا بڑی نظر آویں اور کچھ بھی نہیں غرض اس امیری کا یہ انجام ہے کہ یہاں بھی اس سے راحت نہیں ملتی اور بڑی عورتوں کا کیا گلہ کیا جاوے اس بات میں بچیوں کی بھی عجیب حالت ہے۔

ہمارے یہاں قصبہ گنگوہ میں عورت کی ناک اکثر نہیں بندھواتے کیونکہ علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ باقی ہمارے یہاں سب بندھواتے ہیں ہمارے یہاں ایک شخص کی لڑکی تھی جس سے ان کو بہت محبت تھی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر اس کی ناک نہ بندھائی جائے تو کچھ حرج تو نہیں میں نے کہا کچھ حرج نہیں بلکہ بہتر ہے انہوں نے اس بچی سے جا کر میری طرف منسوب کر

کے کہا کہ اب تیری ناک نہیں بندھے گی انہوں تو کہا تھا اس غرض سے کہ وہ خوش ہوگی کہ میں تکلیف سے بچی اچھا ہوا۔ لڑکی نے یہ بات سن کر بڑی لتاڑ کی اور کہا کہ میرے ہی واسطے یہ فتویٰ رہ گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے گھر والوں کے لئے یہ فتویٰ نہ بتایا غرض بچیوں کو بھی اس قدر شوق ہے زیور کا کہ روتی جاتی ہیں اور کان ناک بندھاتی جاتی ہیں کس قدر محبت ہے زیور سے۔

عورت اور حب زینت

اسی واسطے حق تعالیٰ نے کفار کے رد میں عورتوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔ **او من ینشؤا فی الحلیة وهو فی الخصام غیر مبین** یعنی کفار جو ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں بتلاتے تھے اور کہتے تھے کہ **الملا ئکة بنات اللّٰه** کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کا رد فرماتے ہیں کہ ان کی عقل کہاں جاتی رہی۔ خدا کی اولاد بھی کس کو بنایا جن میں یہ دو بری صفتیں ہیں ایک تو ان میں قوت بیانیہ نہیں ہوتی ان میں قوت استدلال نہیں مرد کے ساتھ جب ان کی گفتگو ہوتی ہے وہ بے چارہ اس سے رنج ہی اٹھاتا ہے وہ تو مناظرہ رشیدیہ کے قانون سے گفتگو کرتا ہے اور یہ الٹی سیدھی ہانکے چلی جاتی ہیں۔ بس زبان چلائے جائیں گے۔ خواہ ایک بات بھی موقع کی نہ ہو مرد بے چارہ ان کی زبان زوری دیکھ کر چپکا ہو جاتا ہے مگر یہ کبھی چپکی نہیں ہوتی آخر یہ مناظرہ میں اس پر غالب آ جاتی ہیں اگر محض بولنے اور بک بک کرنے کا نام مناظرہ ہے تو گدھا بڑا مناظر ہے سو ایک تو ان میں یہ نقص ہے۔

دوسری بات ان میں یہ ہے کہ **او من ینشؤا فی الحلیة** ان کی پرورش زیور اور زینت میں ہوتی ہے ان کے اندر ایک خاص شان حب زینت کی ہے جس میں کہ ان کی ساری عقل صرف ہو جاتی ہے آگے علوم و کمالات تک رسائی نہیں ہوتی تو جس میں یہ دو بری صفتیں ہوں ان کو خدا کی اولاد بنانا کتنی بڑی حماقت ہے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ امور تو عورتوں میں فطری ہیں پھر فطری امر پر کیوں ملامت کی گئی وہ تو اختیار سے باہر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود فطری پر ملامت نہیں بلکہ اعتدال کی تعلیم مقصود ہے کہ عورتوں کو زینت میں انہماک نہ ہونا چاہیے باقی اعتدال کے ساتھ تو زینت ضروری ہے علماء نے لکھا ہے کہ مرد بی بی کو ترک زینت پر مار سکتا ہے مگر یہ نہ ہونا چاہئے کہ رات دن اسی فکر میں رہیں لیکن اس کا مذاق یہ ہو گیا ہے کہ رات دن اسی فکر میں پڑی رہتی ہیں اور غنیمت ہے کہ غریب آدمی اس قسم کے

بہت سے بکھیڑوں سے بچے ہوئے ہیں اور ان کی مستورات کھانا بھی پکاتی ہیں اور دیگر مشاغل خانہ داری میں بھی لگی رہتی ہیں اس لئے ان کو زیب و زینت کے لئے فرصت کہاں بخلاف امراء کے ان کی مستورات کو کام تو کچھ ہوتا نہیں۔ اس لئے دن رات ان کو یہی مشغلہ ہوتا ہے۔

غریب اور راحت

نیز غریبوں میں ایک اور امتیاز بھی ہے وہ یہ کہ دنیا جس کا نام ہے وہ بھی ان غریبوں ہی کو حاصل ہے یعنی راحت کیونکہ وہ دن کو کام کرتے ہیں اور کام بھی وہ جس کی ضرورت ہے اور رات کو بے فکر پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں وقت پر کھاتے ہیں محنت و مشقت سے ہضم بھی خوب ہوتا ہے غذا بدن کو لگتی ہے اکثر غریبوں کو وہ دولت میسر ہے جس کی نسبت رسول اللہ ارشاد فرماتے ہیں۔

من اصبح آمنا فی سربہ معافی فی جسدہ و عندہ قوت یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذ افیرھا[1]

یعنی جو شخص صبح کو اس حال میں اٹھا کہ اسے کسی شخص کا خوف نہ ہو مثلاً مقدمہ وغیرہ کا، کسی دشمنی کا، **معافی فی جسدہ** بدن میں مرض اور دکھن نہ ہو، اور اس کے پاس ایک دن کا کھانا ہو تو گویا ساری دنیا اس کے لئے اکٹھی ہوگئی اسی کا گویہ ترجمہ ہے۔

چوں ترا نانے و خرقانے بود — ہر بن موئے تو سلطانے بود

"جب تک تیرے پاس کھانے کی اشیاء ہیں اس وقت تک تیرا بال بال بادشاہ ہے"

اور ذرا سوچا جاوے کہ اگر کسی کو ساری دنیا مل بھی جاوے تو کیا ایک روز میں سب کھا پی کر خرچ کر لے گا ہرگز نہیں! خرچ تو مقدار ہی کے موافق ہوگا سو اتنی دنیا غریب کے پاس بھی ہے اور اگر کسی غریب کے پاس دنیا اس سے بھی کم ہو مگر آخرت کا سامان پورا ہو تو سب کچھ ہے اور اگر کسی امیر کے پاس دنیا میں سب کچھ ہو اور آخرت کے لئے کچھ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔

ایک مثال سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاوے گی مثلاً ایک شخص ریل میں دہلی جانے کے قصد سے سوار ہوا۔ راستہ میں کسی اسٹیشن پر اترا وہاں دیکھا کہ قسم قسم کی چیزیں بک رہی ہیں۔ وہ بندہ خدا خوب دل کھول کر چیزیں خریدنے لگا۔ اور ان کے کھانے میں ایسا مشغول ہوا کہ ریل چل دی اور وہ وہیں رہ گیا۔ مقصود سے جاتا رہا تو ایسے مزہ اڑانے کو مزہ نہیں کہہ سکتے عاقل شخص یہی کہے گا کہ جب مقصود سے رہ گیا تو ایسے مزہ پر خاک اور ایک وہ شخص ہے جس نے یہ مزے نہیں اڑائے اور دہلی پہنچ گیا۔ حقیقت میں پہلے

---

[1] اتحاف السادة المتقین ۸:۱۵۰، الترغیب والترہیب ۵۹:۱۰۰۱، الادب المفرد للبخاری ۳۰۰

شخص نے سراسر اپنا نقصان کیا اور دوسرے شخص کا سوائے اس کے کچھ بھی نہیں ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے حظوظ سے محروم رہا مگر منزل مقصود تک تو پہنچ گیا جہاں اطمینان سے ہر قسم کے حظوظ حاصل کر سکتا ہے۔

یہی حال دنیا اور آخرت کا ہے۔ ایک دن کو جو پچاس برس سے نسبت ہے دنیا کو آخرت سے وہ نسبت بھی نہیں۔ وہاں تو ابداً آباد ہے اور وہاں ہر قسم کی راحت کا وعدہ بھی ہے بشرطِ ایمان البتہ تقدیر کا مقابلہ تو کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ مگر جو مومن ہے اسے ضرور توقع ہے پھر خدا تعالیٰ کسی کا ایمان تھوڑا ہی چھینتے ہیں اور قدر کی وجہ سے بھی جو شخص ایمان سے محروم رہے گا تو وہ بھی اپنے ارادہ سے محروم ہے یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ زبردستی ایمان اس کے قلب سے نکال لیں اور جب مومن کو راحت آخرت کی توقع ہے پھر دنیا سے دل لگانے کی کوئی وجہ نہیں اور آخرت سے غفلت کسی طرح جائز نہیں۔ کیونکہ دنیا میں جب کسی چیز کی توقع ہوتی ہے تو اس کی تحصیل کے لئے آرام کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مثلاً کسی کو سو روپیہ کی ملازمت کی توقع ہوتی ہے تو اس کے لئے کیسی کیسی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ اسکولوں میں پڑھتے ہیں سفر کرتے ہیں ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں تو جس چیز کا یقین دلایا گیا ہے تو یقین کے بعد اس کے لئے آرام کو کیوں نہ چھوڑنا چاہیے۔ خصوص جب دونوں میں ایک خاص تفاوت بھی ہے وہ یہ کہ سامان دنیا تو ایسی چیز ہے کہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے اسی قدر غموم کا ہجوم ہوتا جاتا ہے اور اس کی کسی حد پر بس نہیں ہوتی۔ کسی دنیا دار سے نہیں سنا نہ اس نے کسی حد پر پہنچ کر یوں کہا ہو کہ اب مجھے ضرورت نہیں۔ شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

آں شنید ستی کہ در صحرائے غور　　بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیا دار را　　یا قناعت پر کند یا خاک گور

تم نے سنا ہوگا کہ ایک دفعہ غور کے صحرا میں ایک مال دار خچر پر سے گر پڑا۔ اس نے بے کسی کے عالم میں کہا کہ دنیا دار کی حریص آنکھ کو قناعت بھر سکتی ہے قبر کی مٹی۔

ہوس کی کوئی حد ہی نہیں البتہ ان غموں کے دور کرنے والے اگر کوئی چیز ہے تو وہ تعلق مع اللہ ہے۔

ایک آسان مراقبہ

میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر خدا سے تعلق ہو جاوے تو کبھی غم پاس نہ آوے یہ ہے زندگی اور یہ ہے حیات طیبہ بخلاف دنیا کے کہ اس کی لذت خیالی لذت ہے اس لئے یہ سب کو عموماً اور عورتوں کو خصوصاً خطاب کرتا ہوں کہ دنیا کی فناء اور آخرت کی بقاء کا مراقبہ کیا کریں۔ زیادہ نہیں تو دس ہی منٹ کے لئے روزانہ کر لیا کریں۔ اور وقت بھی وہ لیں جو محض بے کار ہو یعنی جس وقت سونے کو لیٹیں اس وقت دس منٹ کے لئے

سوچ لیا کریں کہ دنیا ایک نہ ایک دن ہم سے چھوٹ جائے گی۔ سارا سامان پڑا رہ جائے گا پھر آخرت کو پیش نظر کریں کہ خدا تعالیٰ کے سامنے جانا ہوگا۔ اعمال پیش ہوں گے۔ اعمال ٹھیک نہ ہوئے تو دوزخ میں جانے کا گمان غالب ہے اس واسطے ہمیں اچھے اعمال کرنا چاہئیں تاکہ دوزخ کے عذاب سے بچیں۔ اور جنت ملے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سب نعمتیں ہوں گی اور وہ دنیا کی نعمتوں کی طرح فنا نہ ہوں گی۔ خدا تعالیٰ کا دیدار بھی وہاں ہوگا جو سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہوگی۔ جس میں یہ حالت ہوگی۔

ہر چند پیر وخستہ وبس ناتواں شدم　　ہر گہ نظر بروئے تو کردم جوان شدم

اور ظاہر ہے کہ ایسی دائمی نعمت کو چھوڑ کر دنیا کی فانی چیزوں میں منہمک رہنا سراسر بے عقلی ہے حرص دنیا کے متعلق مجھے ایک قطعہ یاد آیا اسی کا مراقبہ کرلیا کریں اور بھی کچھ نہیں تو یہی سہی کیونکہ عورتوں کو گیت کا بہت شوق ہوتا ہے تو وہ مراقبہ کے لئے اسی کو پڑھ لیا کریں یہ تو آسان مراقبہ ہے۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی　　اس طرف آواز بلبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہے گلگلوں کا دور　　شب ہوئی تو ماہرؤوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے　　چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یک بارگی گور غریباں کی طرف　　جس جگہ جان تمنا سو طرح محبوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے　　یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمت دنیا سے آج　　کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت وافسوس ہے

حقیقت یہ ہے کہ انسان مال وجاہ پر کیا ناز کرے جب کہ اس سے زیادہ مال وعزت والے آج دنیا کے اندر ایسے بے کس وبے بس پڑے ہیں کہ نہ مال ان کے ساتھ گیا نہ عزت کچھ کام آئی۔ یہی حال ہر شخص کو پیش آنے والا ہے البتہ اگر آخرت کا سامان ساتھ ہے تو یہ وہاں ضرور آرام دے گا۔ پس یہ مراقبہ ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے اس مراقبہ سے ان شاء اللہ پورا علاج ہو جائے گا۔ حب مال اور حب جاہ کا یہی دو مرض بڑے مہلک مرض ہیں جو اصول امراض ہیں ان ہی سے تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ تو ایک وقت معین کرکے یہ سوچا کرو کہ دنیا ہیچ در ہیچ ہے۔ اس لئے دنیا یہاں سے چلی گئی تو کیا اور ہم دنیا سے چلے گئے تو کیا۔

شادی میں بربادی

عورتوں کی ایک حالت یہ ہے کہ شادیوں کے موقع پر اتنا خرچ کرتی ہیں کہ سارا گھر خالی کرنے کو

تیار ہو جاتی ہیں۔ اور مقصود وہی نام ہوتا ہے مگر اکثر تو نام بھی نہیں ہوتا کیونکہ بدنام کرنے کو بہت لوگ موجود ہیں اور اگر ہو بھی گیا تو کیا ملا۔ ایک صاحب نے دیوبند میں بیٹے کی شادی کی اور بہت ہی ضرورت سے زیادہ خرچ کیا ایک بزرگ بھی وہاں تھے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ آپ نے خوب ہی خرچ کیا اور بڑے حوصلے سے کام کیا۔ اس بات سے تو وہ بہت خوش ہوئے اس کے بعد ان بزرگ نے فرمایا کہ مگر افسوس یہ ہے کہ آپ نے خرچ کر کے کیا چیز خریدی نام؟ کہ اگر اس کو بازار میں لے جاؤ تو اس کا کیا اٹھے گا ایک پیسہ بھی نہیں شیخ صاحب یہ تو آپ سے حماقت ہوگئی۔ باقی اور سب آپ نے اچھا کیا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ اگر آپ برباد ہوئے تو کیا کوئی عزیز و قریب آپ کا ساتھ دے گا ہرگز نہیں' مصیبت میں کوئی پاس بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ اپنے پرائے سب آسودگی کے ساتھ ہیں۔

صاحبو! یہ ساری خرابیاں حب مال اور حب جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

قال الذین کفروا للذین امنوا ای الفریقین خیر مقاماً و احسن ندیاً

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ بتلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کا گھر اچھا ہے اور کس کی مجلس اچھی ہے۔ آگے ان کا جواب ہے۔

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم احسن اثاثاً ورئیاً

یعنی ہم نے تم سے پہلے لوگ ہلاک کر دیئے جو تم سے اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔ جیسے فرعون' ہامان' شداد' قارون وغیرہ

اہل اللہ کی کشش

پھر ہلاک بھی ایسے جن کا نام و نشان تک بھی مٹ گیا بلکہ مرنے کے بعد اکثر فقراء کا تو نام بھی باقی رہتا ہے کہ ان کی جوتیاں تک آج سر پر رکھی جاتی ہیں بخلاف بادشاہوں کے کہ ان کی تو کھوپڑیاں بھی ماری ماری پھرتی ہیں۔

ایک ہندو کلکٹر ہمارے ضلع میں تھا بیمار ہو کر نینی تال گیا وہاں مر گیا اس کی میم لاش کو نینی تال سے لائی تھی۔ اس کی لاش کو کہار بہنگی میں لئے ہوئے میم کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس کا سر کہیں لٹک گیا اور پتھر پر لگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ غرض اس کی تو کھوپڑی تک کا بھی احترام نہیں ہوتا۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کی جوتیاں تک محترم ہیں۔

ہمارے قصبہ کے قریب لوہاری ایک قصبہ ہے۔ وہاں ہمارے دادا پیر حضرت میاں جی نور محمد صاحب قدس اللہ سرہٗ تشریف رکھتے تھے۔ ان کی جوتیاں اب تک محفوظ رکھی ہیں جن کو لوگ آنکھوں سے لگاتے ہیں میں نے بھی حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ کی جوتیاں آنکھوں سے لگائی تھیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ ہے وہ یہ کہ وہاں ایک صاحب گئے اور لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کوئی شخص میاں جی صاحب کے شاگردوں میں زندہ ہے معلوم ہوا کہ ایک ہندو حلوائی زندہ ہے۔ آپ اس کے پاس پہنچے اور اس کو بلوایا اور پوچھا کہ تو نے میاں جی سے پڑھا ہے اس نے کہا ہاں! پھر پوچھا کبھی تجھے مارا بھی ہے؟ کہا ہاں! کہا کس جگہ مارا تھا؟ کہا گدی پر تھپڑ مارا تھا۔ کہا بھائی میں مسلمان ہوں اور تو ہندو ہے شاید تو مجھ سے پرہیز کرے لیکن اگر تو اجازت دے تو میں اس جگہ کو چوم لوں' جہاں مارا ہے اس نے اجازت دے دی۔ تو آپ نے اس جگہ کو بوسہ دیا یہ کشش کیوں تھی صرف اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے۔ اسی لئے لوگ ان کی جوتیاں بھی چومتے ہیں۔ اسی لئے تو عاشقانہ رنگ میں کہتے ہیں۔

عشق را نازم کہ یوسف را بباز ار آورد
ہمچو صنعا زاہدے را او بہ زنار آورد

"تیرے عشق کو ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بازار لے آیا اور صنعا جیسے زاہد کو زنار پہنا دیا"

ان سے اتنی محبت کیوں تھی اس لئے کہ وہ اللہ والے تھے اگر انسان عزت بھی چاہے تو اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرے مگر اس میں یہ غرض نہ ہو کہ ہماری عزت ہوگی بلکہ پستی اختیار کرو اس طریق میں پستی ہی سے علو ہوتا ہے اور جو علو چاہتے ہیں تو اول غلو ہو جاتا ہے پھر خلو ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے سارے امراض اسی سے پیدا ہوتے ہیں اور سارے امراض کا علاج دنیا کی فناء اور آخرت کی بقاء کا پیش نظر رکھنا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ہر وقت یہ خیال رکھے کہ گناہ پر سزا ہوگی۔ اور نیک کام پر جزا ملے گی۔ اجمالاً اتنا کافی ہے باقی تمام اعمال کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں' نہ ضرورت ہے۔ کیوں کہ کتابوں میں سب تفصیل موجود ہے اور اب تو اردو میں بھی اچھی اچھی کتابیں طبع ہوگئی ہیں جن کو کسی محقق سے معلوم کر لیں پھر وہ کتابیں دیکھا کریں یا سنا کریں اور ان کے موافق عمل کریں۔

بس اب ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام "خیر الاثاث للاناث" رکھتا ہوں۔ یعنی اچھی پونجی عورتوں کے لئے۔ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرماویں۔ آمین۔

اشرف علی

علاج الحرص

حرص کی مذمت کے متعلق مستورات کی درخواست پر یہ وعظ ۹ شوال سنہ ۱۳۴۳ھ بروز یکشنبہ بوقت صبح مکان موقوفہ خود واقعہ تھانہ بھون میں کرسی پر بیٹھ کر فرمایا جو ۲ گھنٹہ ۴۵ منٹ میں ختم ہوا۔ مرد تقریباً ۴۰ تھے۔ مجمع مستورات پردہ میں تھا۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

حرص کی مذمت اور یہ کہ گناہ کو جی بھر کر کرنے سے اس کو قوت ہوتی ہے ضعف نہیں ہوتا گو اس وقت سکون ہو جائے بعض سالکین کو اس میں غلطی ہوتی ہے؟

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّم.

اما بعد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان لابن ادم و ادیان من المال لابتغٰی ثالثاً ولا یملأ جوفہ الا التراب. و یتوب اللہ علٰی من تاب[1]

”ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی آدم کے پاس اگر دو جنگل بھرے ہوئے مال سے ہوں تب بھی اس کی حرص ختم نہ ہوگی اور وہ تیسرے جنگل کی آرزو کرے گا۔ مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی اس پر نظر عنایت ہو جائے“

تمہید: یہ ایک حدیث ہے جس میں آدمی کی ایک خاصیت بیان کی گئی ہے جو تمام بنی آدم میں قریب قریب مشترک ہے کوئی اس سے بچا ہوا نہیں۔ الا ماشاء اللہ اور بعض کے استثناء ہی کی وجہ سے قریب قریب کا لفظ کہا گیا ہے چونکہ یہ مرض ایسا عام ہے اس لئے اس کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ معمول یہ ہے کہ جب تک کوئی مضمون ضروری ذہن میں نہ آ جائے اس وقت تک بیان نہیں کیا جاتا اور اسی لئے اس بیان میں تاخیر ہوئی حالانکہ بیان کا وعدہ بہت دنوں سے ہو چکا تھا چنانچہ وعدہ کے بعد بھی میں گھر میں پوچھتا رہا کہ مستورات کو کس قسم کے مضمون کی زیادہ ضرورت ہے اور ان میں کیا کیا عیوب زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ ضرورتیں ظاہر کیں مگر کوئی اہم ضرورت خیال میں نہ آئی اور بات یہ بھی ہوگئی ہے کہ اب کوئی ضروری مضمون ذہن میں بہت کم آتا ہے کیونکہ پہلے تو

---

[1] الصحیح للبخاری ۸:۱۱۵، الصحیح لمسلم کتاب الزکوٰۃ ۱۱۶، مسند احمد ۳:۱۲۲

اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کو اپنے اوپر قیاس کر لیا جاتا تھا کہ ان میں بھی یہ عیوب ہوں گے۔ اس لئے ضرورت جلدی سمجھ میں آ جاتی تھی۔ اور اب قیاس سے بھی کسی میں کوئی عیب ہی نظر نہیں آتا۔ اس لئے کوئی ضروری مضمون بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یہ حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کیونکہ مخلوق کے عیوب پر نظر نہ ہونا فی نفسہ بڑی نعمت ہے اس لئے اب مجھے بعض دفعہ بیان کے لئے کئی کئی روز تک تردد رہتا ہے کہ کیا بیان کروں چنانچہ اس مرتبہ بھی کئی روز تک سوچتا رہا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو پھر میں نے ایک کتاب ویسے ہی اپنے سامنے سے اٹھائی مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کون سی کتاب تھی۔ اتفاقاً وہ سامنے رکھی تھی میں نے اٹھائی اور کھولنے سے پہلے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ بیان کے لئے کوئی ضروری مضمون اس میں نظر پڑ جائے۔

عورت اور حرص

اس کے بعد جو اسے کھولا تو نظر کے سامنے سب سے پہلے یہ حدیث آئی میں بہت خوش ہوا کیونکہ واقع میں اس کا مضمون بہت ضرورت کا ہے۔ خصوصاً عورتوں کی ضرورت کا کیونکہ عورتوں میں دنیا کے متعلق حرص بہت ہے ان کے یہاں اس کی کوئی حد ہی نہیں یہ بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کر لیتی ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا ہے چنانچہ بعض چیزیں رکھی رکھی خراب ہو جاتی ہیں۔ اور یہ رکھ کر ایسی بھولتی ہیں کہ نام بھی نہیں لیتیں اور یہ بھول جانا جیسا کہ عورتوں کی حرص کی دلیل ہے کہ اتنا سامان جمع کیا تھا کہ یاد بھی نہیں رہا۔ ایسے ہی حق تعالیٰ کے منعم ہونے کی بھی دلیل ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اتنی نعمتیں دیں کہ ہم کو یاد بھی نہیں رہتا کہ ہمارے پاس کیا کیا چیزیں ہیں۔

و ان تعدوا نعمة اللّٰه لا تحصوها (اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے) کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ تم یاد سے نعمتوں کا احصاء نہیں کر سکتے اور ایک محمل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی۔ واقعی بعض دفعہ اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ کا منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

ان کے متعلق مولوی عبدالرب صاحب کا ایک لطیفہ ہے کہ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر ان کے پاس کپڑوں کا صندوق بھی بھرا ہوا ہو مگر پھر بھی جب پوچھو یہی کہیں گی میرے پاس کیا ہیں چار چیتھڑے اور برتن چاہے کتنے ہی ہوں مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہے چار ٹھیکرے اور جوتوں کے دو تین جوڑے رکھے ہوئے ہوں گے مگر جب پوچھو یہی کہیں گی کیا ہیں دو لیترے۔

وہ واعظ آدمی تھے قافیہ خوب ملایا۔ واعظوں کے بیان میں ایسی صنعتیں بہت ہوتی ہیں۔ اور اسی کو لوگ پسند کرتے ہیں مولویوں کے وعظ کو پسند نہیں کرتے کیونکہ ان کو یہ قافیے نہیں آتے۔ مگر واقعی عورتوں کی حالت تو وہی ہے جو مولوی عبدالرب صاحب نے کہی ہے چنانچہ بعض عورتیں ضرورت کے موافق کپڑے بنا لیتی ہیں۔ اس کے بعد پھر کوئی بزاز عمدہ سی چھینٹ لے آیا تو ایک دو پاجامہ کی اگلے سال کے لئے ضرور خرید لیں گی۔ بس اس بارہ میں یہ بالکل اس شعر کا مصداق ہیں۔

لختے بر دار دل گزرد ہر کہ ز پیشم   من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

”میرے سامنے سے جو حسین بھی گزرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے میں اپنے دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں“

باقی شاعر نے جس معنی کے اعتبار سے لختے بزدار دل کہا ہے اس کا مصداق عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میرے سامنے جو حسین بھی آ جاتا ہے میں اس پر فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ سو یہ بات ماشاء اللہ تعالیٰ عورتوں میں نہیں ہے بلکہ اس بارہ میں تو وہ حوروں کے مشابہ ہیں۔ جیسے ان کے بارہ میں **قاصرات الطرف ای علی ازواجھا** آیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گی۔ یہی حالت ہندوستان کے اکثر حصہ کی عورتوں کی ہے کہ وہ اپنے شوہر کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتیں۔ گو بعض کم بخت ایسی بھی ہیں کہ آبرو میں بٹہ لگا دیتی ہیں۔ مگر ایسی بہت کم ہیں زیادہ تر عورتیں عفیف ہی ہوتی ہیں ان کے دل پر غیر مرد کا خیال ہی نہیں گزرتا۔ نہ حلال کا نہ حرام کا مگر جیسے باغ میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی بعض دوسری قسم کی بھی ہیں۔ خیر ان سے قطع نظر کر کے اکثر کو دیکھا جائے تو وہ **قاصرات الطرف** ہی کا مصداق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں نکاح ثانی کا رواج کم ہے۔ حقیقت میں یہاں کی عورتیں یہی چاہتی ہیں کہ شوہر کے مرنے کے بعد خود ہی مر جائیں۔

موت اور اختیار

مگر موت تو قبضہ میں نہیں ہے رہے اسباب موت وہ گو قبضہ میں ہیں مگر حرام ہیں اور واقع

میں اسباب موت اختیار کرنے کے بعد بھی موت قبضہ میں نہیں ہے کیونکہ اسباب موت اختیار کرنے سے موت کا آجانا لازم نہیں۔ ایسے بہت واقعات ہوئے ہیں کہ بعض لوگوں نے سنکھیا کھا لیا اور نہیں مرے۔ اسی طرح بعضوں نے گلا کاٹ لیا اور نہیں مرے۔

ایک شخص ایک انگریز کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس کو کسی نے کچھ تہمت لگائی تو بدنامی کے رنج سے اس نے استرہ لے کر اپنا گلا کاٹ لیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا تھوڑی دیر کے بعد نالی سے خون نکلا تو ملازم گھبرایا کہ یہ خون کیسا۔ اس نے کمرہ کے کواڑوں میں جو اوپر آئینے لگے ہوئے تھے ان میں سے جھانکا تو دیکھا کہ صاحب بہادر کا گلا کٹا ہوا پیچھے کو گرا ہوا ہے مگر کھال اٹکی ہوئی ہے اور خون بہہ رہا ہے اس نے فوراً پولیس اور ڈاکٹر کو خبر دی سب نے آکر کواڑ کھولے اور ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا اس وقت ڈاکٹر کو یہ معلوم ہوا کہ بدن میں کچھ حرارت باقی ہے اور رگیں سب نہیں کٹیں تو اس نے سر اٹھا کر سیدھا کر کے جما دیا اور گلے میں فوراً ٹانکے لگا کر کوئی دوا لگا دی۔ شام تک اس مردہ نے آنکھیں کھول دیں اور چند روز میں مقوی دوائیں کھا کھا کر چلنے پھرنے لگا راوی کہتے تھے کہ وہ بالکل اچھا خاصا ہو گیا صرف ایک عیب ہو گیا تھا کہ گنگنا بولتا تھا نہ معلوم خیشوم کی کون سی رگ خراب ہو گئی تھی۔

تو موت تو کسی کے قبضہ میں نہیں مگر عورتیں خاوند کے مرنے سے کالمیت ضرور ہو جاتی ہیں اور پہلے زمانہ میں تو بعض عورتیں سچ مچ میت ہو جاتی تھیں چنانچہ یہ ستی کی رسم بھی اسی محبت کی وجہ سے نکلی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو خاوند سے ہوتی ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا یہ اثر ہے کہ یہاں عورت کو مرد سے تعلق ہوتا ہے چنانچہ ہندی شاعری اس کی دلیل ہے اس میں عورت کی طرف مرد کو خطاب ہوتا ہے میرے پیا وغیرہ۔ اور عرب میں مرد کو عورت کی طرف سے میلان ہوتا ہے جیسا کہ عربی شاعری اس کی شاہد ہے اور فارس میں بڑا گندہ اثر یہ ہے کہ وہاں مرد کو مرد سے میلان ہوتا ہے چنانچہ اس میں مذکر کی طرف سے مذکر کو خطاب ہوتا ہے اور اب یہ اثر ہندوستان کی اردو شاعری پر بھی ہو گیا ہے اور حیرت یہ ہے کہ بعض ثقہ اور دیندار لوگ بھی اس اثر سے نہ بچ سکے۔ حضرت امیر خسرو کتنے بڑے درویش ہیں مگر شاعری میں وہ بھی لڑکوں اور امردوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اے دہلی والے بتان سادہ　　پگ بستہ و ریشہ کج نہادہ
کردند مرا خراب آخر　　ہندو بچگاں سار زادہ

خیر ہندوستان میں یہ اثر خارجی آگیا ہے ورنہ یہاں کی آب و ہوا کا اصلی اثر یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرف میلان ہوتا ہے اس لئے وہ شوہر کے مرنے سے کالمیت ہو جاتی ہیں۔ نہ نکاح

کریں نہ زینت و آرائش عمر بھر کریں۔

نکاح بیوگاں

اسی لئے یہاں نکاح ثانی معیوب ہو گیا ہے مگر اب رواج ہونے لگا ہے اور اچھا ہی ہوا کیونکہ گو منشاء اس کا امر طبعی تھا مگر بعد میں عقلی کراہت پیدا ہو گئی ورنہ لوگ حکم شرعی کو عیب سمجھنے لگے تھے۔

حتیٰ کہ کانپور میں ایک بیوہ عورت سے کسی نے کہا کہ دوسرا نکاح کرنا سنت ہے حضور کی صاحبزادیوں نے دو دو نکاح کئے ہیں تو بھی دوسرا نکاح کر لے تو وہ کمبخت کیا کہتی ہے کہ دیکھو حضور کی بیٹی حضرت فاطمہ نے تو دوسرا نہیں کیا وہ خاندانی بی بی سے تھیں اور دوسری بیٹیوں نے جو کیا ہے تو ظالم نے ایسا سخت لفظ کہا کہ اس کو نقل کرتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ نقل کفر کفر نباشد کم بخت کہنے لگی کہ وہ کسی کم ذات بی بی سے ہوں گی۔ نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

حالانکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو نکاح ثانی کی ضرورت ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ تو حضرت علی ﷺ کے سامنے وفات پا گئی تھیں۔ پھر حضور کی سب صاحبزادیاں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے تھیں اور کسی اور بیوی سے بھی ہوتیں تو آپ کی ازواج میں کم ذات کوئی بھی نہ تھی۔ سب شریف زادیاں اعلیٰ خاندان سے تھیں۔ مگر اس کم بخت نے حضور کی صاحبزادیوں کو ایسا سخت لفظ کہا۔

جب اس طبعی اثر کا نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا تو علماء نے اس بدعت کے مٹانے میں قولاً و عملاً ہر طرح سے کوشش کی پہلے مجھے علماء پر شبہ ہوتا تھا کہ نکاح ثانی کے باب میں تصحیح اعتقاد کافی ہے عملی سعی کی کیا ضرورت ہے محض تصحیح عقائد پر کیوں اکتفا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ سر ہو کر بیوہ کا نکاح کیوں کراتے ہیں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ظاہر کو بھی باطن میں بڑا اثر ہوتا ہے اور جب کسی عمل کو دائماً متروک رکھا جاتا ہے تو باطن پر اس کا اثر ضرور رہتا ہے بدوں عمل کے اعتقاد کی جڑ نہیں نکلتی۔ اس لئے علماء کی رائے صحیح ہے کہ اس بدعت کا استیصال بدوں عملی سعی کے نہیں ہو سکتا چنانچہ جب سے اس پر عمل ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے اعتقاد بھی درست ہونے لگے ہیں غرض عورتوں کے متعلق یہ شعر اس معنی کو تو صحیح نہیں جو شاعر کی مراد ہے۔ شوہر کے باب میں ان کی یہ حالت نہیں۔ مگر اور چیزوں کے متعلق ان کی یہی حالت ہے۔ زیور اور کپڑوں کے باب میں وہ بالکل اس شعر کا مصداق ہیں۔

لختے بر داز دل گزرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

"میرے سامنے سے جو حسین بھی گزرتا ہے وہ ایک ٹکڑا دل کا لے جاتا ہے میں دل صد پارہ کی ایک پھانک بیچتا ہوں"

کہ جو چیز بھی دیکھتی ہیں ان پر اس کی حرص غالب ہو جاتی ہے ان کو تو چیز کا دکھانا ہی غضب ہے پھر بدوں خریدے یا بنوائے ان کو صبر نہیں آتا بس ان کو تو کوئی نئی چیز دکھاؤ ہی نہیں غرض چونکہ ان میں حرص کا مادہ زیادہ ہے اس لئے یہ حدیث ان کے حال کے بہت مناسب ہے اور بعد میں یہ بھی اتفاقی مناسبت ہوگئی کہ میں نے اس مکان کو جس میں یہ بیان ہو رہا ہے وقف کر دیا ہے احباب کو معلوم ہوا ہوگا اور فعل اس خاصیت کا مقابل ہے۔ جو حدیث میں مذکور ہے کیونکہ حرص میں اپنی ملک کے اندر چیزوں کو لایا جاتا ہے اور وقف میں ملک سے نکالا جاتا ہے۔ تو وقف حرص کا مقابل ہوا اور اس میں گویا مراد حدیث پر عمل ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود حرص سے روکنا ہے جس کا تحقق اس فعل میں ہوگیا اور یہ تفاخر نہیں بلکہ شکر ہے بہرحال اس حدیث میں ایک ضروری مضمون ہے عورتیں غور سے سنیں کیونکہ یہ مضمون خصوصیت سے ان کے مناسب ہے۔

قناعت کی ضرورت

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر ابن آدم کے پاس دو وادی سونے چاندی کے ہوں تو وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو۔ جیسے ندی اور نالہ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر انسان کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کہ پانی کی طرح بہتا ہو جب بھی وہ زیادہ کا طالب ہوگا۔ چنانچہ اس کے پاس دو وادی بھی ہوں تو تیسری کا طالب ہوگا اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تین ہوں گے تو لابتغیٰ رابعاً کہ چوتھے کی تلاش میں ہوگا سعدیؒ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ہمچناں در بند اقلیمے دگر

ہفت اقلیم کا بادشاہ اگر ساتوں اقلیم بھی فتح کرے تب بھی اسی طرح دوسرے اقلیم کی فکر میں رہے گا”

سلاطین کو تو اقلیم و سلطنت کی ہوس ہوتی ہی ہے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ رعایا بھی سلطنت کے خواب دیکھتی ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ بس ان کی وہ حالت ہے جیسے چیونٹی کے مرنے کے دن قریب آتے ہیں تو اس کے پر لگتے ہیں۔ اس وقت تو وہ خوش ہوتی ہے کہ آہا میں بھی ہوا میں اڑنے لگی اور اس کی یہ حالت ہوتی ہے۔

چیونٹی کے لگے پر تو وہ کہنے لگی اڑ کر ‏ ‏ ‏ ‏ میں مثل سلیماں ہوں ہوا میں کئی دن سے

مگر اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کی ہلاکت کے دن قریب آ گئے ہیں اسی طرح جب رعایا سلطنت

کے خواب دیکھے گی تو اس کا نتیجہ بجز ہلاکت کے کچھ نہیں اور باوجودیکہ اس خواب پریشان کا منشاء محض حرص ہے اور کچھ نہیں مگر یہ لوگ اس کو دین سمجھتے ہیں اور اس کا نام ترقی اسلام رکھا ہے۔

صاحبو! نام کے بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا نتائج اور آثار کو دیکھنا چاہئے کہ اس ہوس خام کے آثار و نتائج کیا ہیں۔ کیا اس سے اسلام کو کچھ ترقی ہوئی ہے یا کفر کو۔ صوفیاء بڑے محقق ہیں اور ان سے زیادہ دیندار کون ہوگا۔ ان کی تعلیم یہ ہے۔

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ　　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

یعنی آرزو اور تمنا کا مضائقہ نہیں مگر اپنے اندازہ کے موافق ہونی چاہیے (حد سے زیادہ آرزو نہ کرنا چاہئے) کیونکہ پہاڑ کو گھاس کا تنکا ہٹا نہیں سکتا۔

تو دیکھئے محققین حد سے زیادہ ہوس کو منع کرتے ہیں کیونکہ تجاوز عن الحد میں پریشانی ہی پریشانی ہے اور شریعت نے مسمانوں کو پریشانی سے بچانا چاہا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ** (اپنے آپ کو ہلاکت کے ہاتھوں میں مت ڈالو) اور رسول فرماتے ہیں۔

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قالوا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) **و کیف یذل نفسہ قال یتحمل من البلاء لما لایطیقہ**[1] (الحدیث)

نص قرآنی سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے وہ دین نہیں ہے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں گو ہلاکت بھی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسلمان اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا ایسی بلا کو سر دھر لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں۔ اس سے بھی تجاوز عن الحد کی مذمت معلوم ہوئی۔

یہ تو مصائب اختیاریہ کے متعلق شریعت کی تعیم تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اختیاری مصائب سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ کبھی پاس نہ آسکے۔

تفویض کی اہمیت

مصائب غیر اختیاریہ کا شریعت نے ایسا علاج بتلایا ہے کہ تمام حکماء عالم بھی جمع ہو جائیں تو اس کی نظیر نہیں لاسکتے۔ سنئے وہ علاج کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ و انا الیہ راجعون۔

---

[1] سنن الترمذی: ۲۲۵۴، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۶، مجمع الزوائد ۷: ۲۷۴

کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں (یعنی اس کی ملک ہیں وہ ہمارا مالک ہے اور مالک کو ہر قسم کے تصرف کا مملوک میں حق ہے' اور ہم اس کے پاس لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اس میں تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت اس مضمون کا استحضار کرنا چاہیے مگر ہم لوگوں نے اس کو محض وظیفہ بنالیا ہے جیسے اور وظیفے ہوتے ہیں تسخیر جن اور حب وغیرہ کے لئے یعنی محض زبان اور ہونٹوں تک اس کا اثر رہتا ہے دل سے بالکل اس مضمون کو نہیں سوچتے۔

تو اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے سنا تھا کہ گل بنفشہ زکام کے لئے مفید ہے اس نے گل بنفشہ پکا کر ہونٹوں کو لگالیا تو بتلایئے اس سے زکام کیونکر جاتا رہے گا۔ اسی طرح ہماری پریشانی کیونکہ دور ہو جب کہ ہم نے انا للہ کو محض ہونٹوں سے لگا رکھا ہے ارے بھائی اس کو دل کے اندر اتارو پھر دیکھو پریشانی کہاں جاتی ہے شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں تو قالوا آیا ہے تفکروا نہیں آیا اور قول کا صدور ہم سے بھی ہو جاتا ہے پھر نفع کیوں نہیں ہوتا تو آپ کو خبر بھی ہے کہ قول کسے کہتے ہیں۔

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

'' کلام تو انسان کے دل میں ہوتا ہیاور زبان تو محض دل کی بات کا پتہ دینے والی ہے (دل کی ترجمان ہے)''

اصل قول تو قلب ہی سے ہوتا ہے اور قرآن میں یہی مراد ہے کہ زبان واصل دونوں سے یہ کلمہ کہا جائے شاید تم یہ کہو کہ جب ہم زبان سے کہیں گے تو دل میں بھی پہنچ جائے گا کیونکہ اس وقت تصور تو لازم ہے میں کہتا ہوں کہ دل میں کیا پہنچے گا محض الفاظ ہی الفاظ پہنچیں گے۔ اور مقصود معنی کا پہنچنا ہے وہ بدوں تامل وتفکر کے نہیں پہنچ سکتے۔ اگر ہم اس کلمہ کو تصور معنی کے ساتھ کہا کریں تو پریشانی پاس نہیں آسکتی۔

چنانچہ اس میں اول تعلیم یہ کی گئی ہے کہ انا للہ کا استحضار رکھو کہ۔ ہم اور ہماری تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ملک ہیں اور مالک کو مملوک میں ہر قسم کے تصرف کا اختیار ہے دوسروں کو کسی کی ملک میں کسی تجویز کا حق نہیں اس میں ہماری تجویز کو قطع کیا گیا ہے کہ تم اپنی طرف سے کوئی خاص حالت اور خاص صورت اپنے لئے یا اپنے متعلقین وغیرہ کے لئے تجویز نہ کرو کیونکہ تم سب خدا کی ملک ہو اور تجویز کا حق مالک کو ہے تم کو نہیں ہے اور یاد رکھئے کہ پریشانی کا مدار یہی تجویز ہے کہ انسان اپنے لئے یا اپنے متعلقین کے لئے ایک خیالی پلاؤ پکالیتا ہے کہ یہ لڑکا زندہ رہے اور تعلیم یافتہ ہو اور اس کی

اتنی تنخواہ ہو پھر وہ ہماری خدمت کرے اور یہ مال ہمارے پاس رہے اس میں یوں ترقی ہو اور اتنا نفع ہو۔ اسی طرح شیخ چلی کی مانند ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ منصوبے قائم کر لئے جاتے ہیں۔

جیسے شیخ چلی کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے دو پیسہ کی مزدوری پر تیل کا گھڑا اس سے اٹھوایا کہ فلاں جگہ تک پہنچا دو۔ آپ گھڑا سر پر رکھے ہوئے چلے اور راستہ میں تجویز پکانے لگے کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے لاؤں گا ان کے بچے نکلواؤں گا اس طرح میرے پاس بہت سی مرغیاں ہو جائیں گی پھر ان کو بیچ کر بکریاں خریدوں گا ان میں بھی اسی طرح سلسلہ توالد چلے گا پھر ان کو بیچ کر گائے خریدوں گا پھر بھینس لوں گا پھر ان کو بیچ کر بہت سارو پیہ حاصل ہوگا تو میں ایک دکان کھولوں گا جس سے بہت نفع ہوگا تو ایک عالیشان محل بناؤں گا۔ اور بادشاہ زادی کو پیغام نکاح دوں گا۔ بادشاہ میری ریاست کو دیکھ کر بس فوراً ہی نکاح کر دے گا۔ پھر اس سے ایک لڑکا ہوگا وہ میرے ساتھ ساتھ رہا کرے گا اور کبھی مجھ سے پیسہ مانگے گا تو میں کہوں گا ہشت! بس ہشت جو کیا تو سر کے ہلنے سے گھڑا گر پڑا اور سارا تیل بہہ گیا مالک نے کہا ارے یہ کیا کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ میاں جاؤ بھی تمہارا تو چند پیسوں کا تیل ہی ضائع ہوا اور میرا تو سارا کنبہ ہی ہلاک ہو گیا اور سب کارخانہ تباہ ہو گیا۔ کیونکہ سارے منصوبوں کا منشاء تو وہ دو پیسے تھے جو میاں کو مزدوری میں ملتے جب مزدوری پوری نہ ہوئی تو پیسے بھی نہ ملے اور جب پیسے نہ ملے تو سب انڈے بچے رکھے رہ گئے۔ (لوگ اس حکایت پر ہنسنے لگے تو فرمایا کہ)

ہم اس پر ہنستے ہیں مگر در حقیقت ہم سب اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ کہ بادل دیکھ کر گھڑے پھوڑ دیتے ہیں اور دور دراز کی امیدیں پکانے لگتے ہیں پھر جب تجویز اور امید کے خلاف وقوع ہوتا ہے تو پریشانی اور رنج میں گرفتار ہوتے ہیں اگر پہلے سے کوئی تجویز نہ ہو تو پریشانی کبھی پاس نہ بھٹکے۔ اسی لئے اہل اللہ سب سے زیادہ آرام و راحت و مسرت میں ہیں۔ ان کو کسی واقعہ سے پریشانی اور غم نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تجویز کا نشان ہی نہیں ہے بلکہ تفویض کلی ہے بس ان کا ایک غم آخرت کا تو ہے اور کسی بات کا غم نہیں مگر غم آخرت ایسا نورانی اور لذیذ ہے کہ اس کے بدلے میں وہ سلطنت بھی لینا نہیں چاہتے۔ اسی لئے کہتے ہیں۔

غم دین خور کہ غم غم دین ست   ہمہ غم ہا فرو تر ازین ست
غم دنیا مخور کہ بیہودہ ست   ہیچ کس در جہاں نیاں سودہ ست

دین کا غم کھا کے دراصل غم تو دین ہی کا ہے باقی غم اس سے کم ہی ہیں دنیا کا غم مت کھا کہ یہ بیہودہ ہے کسی نے اس سے دنیا میں آرام نہیں پایا۔

موت کے مشتاق

اس مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غم دین بیہودہ نہیں ہے بلکہ یہ غم موجب راحت ہے۔ اسی لئے اہل اللہ ہر وقت شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں کہ کوئی مرے جب خوش' جئے جب خوش' بیمار ہو جب خوش' قحط ہو تب خوش' کیونکہ وہ ہر حال میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے' محبوب کی طرف سے ہو رہا ہے۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکو ست
دوست سے جو بھی پہنچے اسی میں خیر اور حکمت ہے

غرض انا للہ میں تجویز کو قطع کیا گیا ہے مگر چونکہ بعض کو ابتداءً اس پر قدرت تام نہیں ہوتی تو ان کے لئے انا الیہ راجعون کی بھی تعلیم ہے کہ کسی کی مفارقت سے غم نہ کرو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں پہنچو گے۔ جہاں وہ گیا ہے۔ اس میں تسلی عام اور تام ہو جاتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدر آباد کسی کے عزیز کو بلا لے اور اس کو مفارقت کا صدمہ ہو۔ پھر نظام اس کو خط لکھ دے کہ تم بھی عنقریب یہیں بلائے جاؤ گے۔ تو اب غم مفارقت نہیں ہوتا۔

اسی طرح اہل اللہ کو کسی کی مفارقت سے زیادہ غم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو کسی کو مرتا ہوا دیکھ کر خود بھی موت کے مشتاق ہوتے ہیں پھر کسی کے مرنے سے کیا غم کرتے۔ وہ تو موت سے ایسے مسرور ہیں کہ اس کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے   تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

وہ دن مبارک ہوگا کہ جس دن اس ویران گھر (دنیا) سے چلا جاؤں۔ جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے دیدار کیلئے جاؤں میں نے یہ نذر مان لی ہے کہ جس دن یہ کام ہوگا میکدہ (شراب خانہ) کے دروازہ تک خوش خوش اور گاتا ہوا جاؤں گا۔

اور یہ محض باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ عارفین نے اس کو کر کے دکھلایا ہے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مر رہے تھے تو سب لوگ رو رہے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم   جسم بگذارم سراسر جاں شوم

"وقت قریب آ گیا ہے کہ میں بدن کے لباس سے ننگا ہو جاؤں گا جسم کو چھوڑ کر سراپا جان ہو جاؤں گا"

غرض شریعت مسلمانوں کے لئے پریشانی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی لئے مصائب اختیاریہ و غیر اختیاریہ سب کے لئے ایسی تعلیم دی گئی ہے جس سے پریشانی کا استیصال ہو جاتا ہے۔

راحت کی صورت

رعایا کو ہوس سلطنت ہونا پریشانی کا سبب ہے اس لئے یہ ہوس دین نہیں ہے بلکہ حد سے تجاوز ہے جس کی ممانعت آئی ہے اور منشاء اس ہوس کا محض حرص ہے اور ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی تو حرص سے پریشانی ہی پریشانی ہوگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں ام للانسان ماتمنّٰی اس لئے حریص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی شاعر کہتا ہے۔

ماکل ما یتمنی المرأ یدرکہ   تجری الریاح بمالاتشتھی السفن

انسان بہت دفعہ ایک آرزو قائم کرتا ہے اور وہ خاک میں مل جاتی ہے

ای بسا آرزو خاکشدہ (بہت سی آرزوئیں خاک میں مل گئیں)

اس لئے اگر راحت چاہتے ہو تو احکام پر عمل کرو اور حرص کو قطع کرو تم اپنے لئے نہ سلطنت تجویز کرو نہ گداگری صرف خدا تعالیٰ کی غلامی اختیار کرو اس کے بعد وہ جو چاہیں گے خود دے دیں گے۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ آج کل جو لوگ ترقی متعارف کے معلم ہیں وہ درحقیقت پریشانی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کا نام انہوں نے ترقی رکھا ہے اس کی حقیقت محض حرص ہے اور جو لوگ ترقی متعارف سے مانع ہیں وہ راحت کے معلم ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں شریعت کے موافق چلو اور اس میں راحت ہی راحت ہے۔ شریعت میں چل کر پریشانی پاس نہیں آ سکتی۔ بہرحال حرص تمام پریشانیوں کی جڑ ہے اور یہ مرض عورتوں میں زیدہ ہے اور یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں اسی کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں اگر لوگوں میں حرص مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے پھر ان قساوات کی بھی نوبت نہ آئے بدکاری اور چوری وغیرہ کا منشاء بھی حرص ہے کہیں حرص مال ہے کہیں حرص لذت نیز اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشاء بھی ایک گونہ حرص ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ بھی حرص کی ایک فرد ہے کیونکہ تکبر طلب جاہ کا نام ہے۔

جاہ کی ہوس

تو اس میں جاہ کی ہوس ہے بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی حرص ہے کیونکہ طلب جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ صاحب جاہ کو ضروریات معاش سہولت سے مل جاتی ہیں اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں جو کام دوسرے شخص کا سینکڑوں روپے خرچ ہونے سے نکلتا ہے، وہ صاحب جاہ کی زبان ہلنے سے ہو جاتا ہے چنانچہ سفر وحضر میں مشاہدہ ہے کہ کلکٹر اور حاکم کے منہ سے جہاں یہ نکلا کہ ہم کو دودھ کی ضرورت ہے تو ہر شخص دودھ لانے کو تیار ہو جاتا ہے اور جہاں یہ نکلا کہ ہم کو گائے کی ضرورت ہے تو ہر طرف سے لوگ گائے ہی گائے لئے چلے آتے ہیں۔ چاہے دل سے یا بددلی سے مگر حاکم کا منشاء پورا ضرور ہو جاتا ہے تو صاحب جاہ کو انجام حوائج سہل ہو جاتا ہے مال بھی آسانی سے ملتا ہے ورنہ کم از کم روپے کی بچت تو ضرور ہو جاتی ہے کیونکہ ہر شخص خوشامد میں جو کچھ لاتا ہے مفت ہی پیش کرتا ہے۔

اسی لئے صوفیاء نے صاحب جاہ کے آداب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنی حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جائیں گے اور ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہے گا۔ اس لئے صاحب جاہ کو اظہار حاجت مناسب نہیں۔

شاید کوئی کہے کہ ہم تو اظہار حاجت کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم پر بار نہ ہو، گرانی نہ ہو تو یہ کام کر دو تو خوب سن لو کہ یہ مقدمات شرطیہ سب فضول ہیں کیونکہ معتقدین ان مقدمات کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ تو تالی کو دیکھ کر حوائج کا تالا کھولنے میں لگ جاتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جاہ کی حقیقت ملک القلوب لکھی ہے اور ملک القلوب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں پس تکبر کا منشاء بھی حرص ہوا اور کبر تمام رذائل کی جڑ ہے تو حرص منشاء ہوا تمام معاصی کا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نااتفاقی کا منشاء بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشاء بھی یہی ہے کیونکہ مال و دولت کو دکھانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے تو حرص کا ام الامراض اور اصل معاصی ہونا ثابت ہو گیا۔

یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا۔ **حب الدنيا راس كل خطيئة** (دنیا کی محبت سب برائیوں کی جڑ ہے) حب دنیا ہی کا نام تو حرص ہے اور عورتوں میں یہ مرض مردوں سے زیادہ ہے۔ ان کو زیور کپڑے اور برتنوں کی بہت حرص ہے پھر اس سے ریاء وتفاخر بھی پیدا ہوتا

ہے جب محفل میں بیٹھیں گی تو کسی بہانہ سے اپنے کرن پھول اور کنگن دکھانا چاہیں گی۔ کنگن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں وہ تو سب بے تکلف دیکھ لیتے ہیں البتہ کرن پھول اور طوق گلو بند وغیرہ پٹہ سے مستور ہوتے ہیں تو جوان میں ثقہ نہیں ہیں وہ تو بدلالت قال دکھلاتی ہیں کہ اے فلانی! یکھئے میرے کرن پھول کیسے ہیں؟ اچھے بھی بنے ہیں گلو بند عمدہ بھی ہے جس سے سب سمجھ جاتی ہیں کہ مقصود یہ جتلانا ہے کہ ہمارے پاس یہ چیزیں بھی ہیں اور جو ثقہ بھی ہیں وہ بدلالت قال تو نہیں دکھلاتیں مگر بدلالت حال دکھلاتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے ان کے کان میں یا گلے میں کھجلی اٹھتی ہے بار بار کان اور گلا کھجلاتی ہیں مگر یہ کھجلی اول دل میں ہوئی تھی پھر کان میں ہونے لگی۔

بہر حال حرص سے اول قلب کو پریشانی ہوتی ہے پھر ظاہر کو بھی پریشانی ہونے لگتی ہے۔ تو اس کا علاج ضروری ہوا۔ جو اس حدیث میں مذکور ہے جس کی تقریر یتوب اللہ علیٰ من تاب کی شرح میں ذکر کی جاوے گی۔

آدم اور انسان

رسول اللہ فرماتے ہیں لو کان لابن آدم و ادیان من المال[1] اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لفظ ابن آدم اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ ابن آدم کے عنوان میں ایک مقبول کی طرف نسبت ہے جس سے شرم دلانا منظور ہے کہ ایسے مقبول کا بیٹا اور نبی زادہ ہو کر اس کی خصلت ایسی جو بہائم جیسی ہے دوسری توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حرص کو مذموم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے بلکہ عام مان لیا جائے جو محمود و مذموم سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں لفظ ابن آدم میں اضافت سے بناء حرص کی طرف اشارہ ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام میں ایک حرص محمود پیدا ہوئی تھی مگر حضرت انسان اس کی وجہ سے حرص مذموم میں مبتلا ہو گئے۔ مگر یہ توجیہ عوام کے منہ سب نہیں بلکہ خاص کے سمجھنے کی ہے عوام کو ابن آدم کہنے کی وہی وجہ سمجھنی چاہئے جو پہلے مذکور ہوئی (نیز ابن آدم کہنے سے اس خاصہ کے عموم پر اور فطری ہونے پر بھی اشارہ ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ حرص کا مادہ اس میں طبعی ہے۔ آگے اس کا علاج بتلاتے ہیں مگر علاج صحیح بتلانے سے پہلے ایک غلط علاج کا غلط ہونا بتلاتے ہیں کیونکہ انسان میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امراض کا علاج خود کیا کرتا ہے جیسے عورتوں کی بھی عادت ہے کہ وہ اکثر امراض کا علاج خود کیا

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۱۱۵، الصحیح لمسلم کتاب الزکوۃ: ۱۱٦، مسند احمد ۳: ۱۲۲

کرتی ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ الٹا علاج ہوتا ہے جس سے بجائے اصلاح کے فساد ہی بڑھتا ہے کسی کے پیٹ میں درد ہو تو اس کا علاج عورتوں میں یہ ہے کہ کھانا کھالو۔ چنانچہ کہا کرتی ہیں کہ یہ بھوک کا درد ہے کھانے سے جاتا رہے گا بھوک کا درد! یہ درد کی نئی قسم ہے جو اطباء کو بھی معلوم نہیں۔

اسی طرح مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے پاس ایک مریض آہ آہ کرتا ہوا آیا۔ اس کو درد شکم کی شکایت تھی مولوی صاحب طبیب بھی تھے آپ نے ایک نسخہ تجویز کر کے اس کو دیا کہ یہ دوا پی لو۔ تو آپ کہتے ہیں کہ حضرت اگر پیٹ میں دوا پینے کی گنجائش ہوتی تو میں کھانا ہی اور نہ کھاتا۔ اس کے نزدیک بھی درد کا علاج کھانا ہی تھا۔

ایسے ہی آج کل لوگوں نے مرض حرص کا علاج الٹا کیا ہے اور یہ بھی وہ لوگ کرتے ہیں جو حرص کو مرض سمجھتے ہیں ورنہ عام طور پر تو اس کو مرض بھی نہیں سمجھتے۔

آج کل کی ترقی

چنانچہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں نے حرص کا نام ترقی رکھا ہے اور اس کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں مگر صاحبو! عنوان بدلنے سے کیا ہوتا ہے یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی ڈاکو کا نام کاسب رکھے اور اس کو **الکاسب حبیب الله** (روزی کمانے والا اللہ کا دوست ہے) کا مصداق بنانے لگے یا جیسے ایک بدو نے کہا تھا کہ ہم جو حاجیوں کو لوٹتے ہیں یہ جائز ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء بعضھم اولیاء بعض

اور سلطان روم نصاریٰ سے موالات رکھتا ہے تو (نعوذ باللہ) وہ بھی منہم ہے۔ اس سے ہر طرح لینا جائز ہے اور ہم حجاج کو اسی واسطے لوٹتے ہیں تاکہ دباؤ میں سلطان ہم کو دے۔

یا جیسے معتزلہ اپنے کو اہل توحید و اہل عدل کہتے ہیں کیونکہ وہ زیادت صفات کے منکر ہیں اور عاصی کی مغفرت کو بدوں عذاب کے ناجائز کہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کو موحد اور اہل عدل کہتے ہیں اور تماشا یہ ہے کہ آج کل بعض نیچری اپنے کو معتزلی لکھتے ہیں۔ حالانکہ جس جماعت کی طرف وہ اپنے کو منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ جماعت اس لقب سے نفرت کرتی ہے اور اس کی اپنے سے نفی کرتی ہے کیونکہ معتزلہ کا لقب تو ان کو ہم نے دیا تھا **لاعتزالھم عن جماعة الحق** ورنہ وہ اس لقب سے خوش نہ تھے اس کی ایسی مثال ہے جیسے شیعہ کو ہم لوگ رافضی کہتے ہیں مگر وہ اس لقب سے جلتے اور ناخوش ہوتے ہیں۔

اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک سنی محرم کے زمانہ میں شیعوں کی مجلس میں جانے لگا۔ وہ خاص مجلس تھی جس میں سنیوں کے آنے کی ممانعت تھی۔ دروازہ پر پہرہ تھا جو کوئی اندر جاتا اس سے پہلے پوچھ لیتے تھے کہ تم کون ہو۔ جو کوئی شیعی بتلاتا اس کو اندر جانے دیتے ورنہ روک دیتے۔ جب وہ سنی صاحب دروازہ پر پہنچے تو ان سے بھی پوچھا گیا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ ہم رافضی ہیں سب سمجھ گئے کہ یہ سنی ہے کیونکہ شیعی اپنی زبان سے کبھی خود کو رافضی نہ کہے گا چنانچہ میاں نکال دیئے گئے۔ اسی طرح کوئی معتزلی اپنی زبان سے خود کو معتزلی نہیں کہہ سکتا یہ آج کل کے نیچریوں کی کم علمی ہے جو لقب مذلت کو خود اختیار کر رہے ہیں۔

بہر حال عنوان کے اچھا ہونے سے معنون اچھا نہیں ہو سکتا۔ ورنہ بھڑوا کو بھی اپنے کو کاسب کہہ سکتا ہے اور بدوؤں کا فعل بھی مستحسن ہو جائے گا پس ترقی کا عنوان تو عمدہ ہے کیونکہ قرآن میں بھی اس کا امر آیا ہے۔ **فاستبقوا الخیرات** (پس نیکیوں میں آگے بڑھو) استباق کے معنی ہیں ایک دوسرے پر سبقت کرنا یہی ترقی کا حاصل ہے۔

یہاں سے ایک مترجم قرآن کی غلطی واضح ہو گئی جس نے **یاابانا انا ذھبنا نستبق** (اے ہمارے ابا جان ہم سب تو دوڑنے میں لگ گئے) میں استباق کا ترجمہ کبڈی سے کیا ہے کیونکہ کبڈی میں ایک دوسرے پر دوڑنے میں سبقت مقصود نہیں ہوتی۔

دوسرے کبڈی کا میدان اتنا وسیع نہیں ہوتا جس میں سب کھیلنے والے اتنے دور چلے جائیں کہ ایک بچہ کو بھیڑیا اٹھا لے جائے اور کسی کو خبر نہ ہو بلکہ یہ بات دوڑنے میں بے شک ہوتی ہے کہ دو جماعتیں آپس میں دوڑیں کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے تو اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کے سب دوڑتے ہوئے اتنی دور نکل جائیں کہ جس لڑکے کو سامان پر بٹھایا جائے وہ نظروں سے غائب ہو جائے۔

تیسرے کبڈی کا لفظ نہایت مبتذل ہے جو فصحاء کے کلام میں مستعمل نہیں ہوتا اس لئے بھی ترجمہ قرآن میں اس کا لکھنا معیوب ہے کیونکہ قرآن کا ترجمہ ایسا فصیح و بلیغ و پرشوکت ہونا چاہیے مگر باوجود ان غلطیوں کے وہ ترجمہ آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا مقبول ہے حالانکہ معنوی غلطیوں کے ساتھ اس میں لفظی غلطیاں بھی بہت ہیں۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بہت عمدہ ہے اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔

ترقی خیر

مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم خیرات میں ترقی کرو۔ اب

فیصلہ اس پر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے۔

وانہ' لحب الخیر لشدید (اور وہ مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے) اور **کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرٌ انِ الوصیۃ للوالدین** (تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب ہر کسی کو موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو والدین اور اقارب کے لئے معقول طور پر کچھ بتلایا جائے)

یہاں خیر سے مراد مال ہے لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ **فاستبقوا الخیرات** میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ خیر مقید ہے جس کی خیریت کے لئے بہت سی شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے لہذا تم اپنی ترقی مال کو ترقی خیر نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے **کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ**[1] (حلال روزی کمانا فرضوں کے بعد ایک فرض ہے)

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی کیا وہ خیر تھی؟ کیا اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو پنڈت کا لقب دیا گیا ہندوؤں کو مولانا کہا گیا' قشقے لگائے گئے۔ گائے کے گوشت کو ممنوع کہا گیا۔ مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں۔ اور ایک ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو وہ نبی ہوتا (پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں ان سے قطع تعلق نہیں۔ کیا گیا بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا) وغیرہ وغیرہ۔ اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر (نیکیوں میں آگے بڑھنے) کا مصداق تھی تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم تو محض ملانے ہو تم کو سیاسیات کی کچھ خبر نہیں۔ یہ وقت جائز و ناجائز کے سوال کا نہیں۔ اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہئے۔

افسوس! ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملانا پن ہی مطلوب

---

[1] حلیۃ الاولیاء ۷: ۱۶۲

ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملا پن ہی کا پھیلانا ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتواالزکوٰة و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں نیک کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کریں)

مگر لوگ اسی کو مٹا رہے تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے پس حرص کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مگر اُن لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کے عیب کو چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے۔

ہوس اور موت

مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کو مرض سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اس کا علاج خود کرنا چاہتے ہیں اور الٹا علاج کرتے ہیں ان کے علاج کا حاصل یہ ہے کہ ایک دفعہ خوب جی بھر کر ہوس کو پورا کر لو۔ پیٹ بھر کے گناہ کر لو۔ لڑکوں اور عورتوں کو خوب گھور لو۔ پھر توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ ایک جنٹلمین مجھ سے ملے جو انگریزی پڑھ رہے تھے اور دین کا بھی کچھ خیال تھا۔ وہ کہنے لگے کہ میری نیت مستقبل کے متعلق یہ ہے کہ انگریزی پڑھ کر بی اے پاس کر کے بڑی سی نوکری کروں گا اور خوب پیٹ بھر کر رشوت لوں گا اور مال جمع کر کے ایک دو گاؤں خرید کر ملازمت کو ترک کر دوں گا۔ پھر زندگی بھر اللہ اللہ کروں گا۔

اس غلطی میں جاہل صوفی بھی مبتلا ہیں وہ بھی تقاضائے معصیت کا علاج اسی طرح کرتے ہیں کہ ہوس کو اچھی طرح پورا کر کے پھر توبہ کر لینا چاہیے۔ رسول اللہ نے اس غلط خیال کا اس حدیث میں جواب دیا ہے اور جواب بھی حکیمانہ دیا ہے حاکمانہ نہیں دیا۔ ضابطہ کا جواب تو یہ بھی کافی تھا کہ یوں فرما دیتے کہ ازالہ حرص کی نیت سے بھی ہوس پورا کرنا اور ازالہ تقاضائے گناہ کی نیت سے گناہ کرنا بھی جائز نہیں مگر اس جواب سے فلسفی دماغ والوں کو تسلی نہ ہوتی۔ وہ اس کے ناجائز ہونے کی وجہ نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے آپ حکیمانہ جواب دیتے ہیں کہ حرص کے مقتضاء پر عمل کرنے سے جی بھر نہیں سکتا۔ کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ یہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جن میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا پس یہ خیال ہی غلط

ہے کہ ہوس کے پورا کرنے سے ہوس بجھ جائے گی بلکہ جتنا اس کو پورا کرو گے۔ یہ اتنا ہی بڑھے گی انسان کی ہوس کے پیٹ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ تراب سے مراد تراب قبر ہے یعنی موت کے سوا کوئی چیز ہوس کو نہیں بھر سکتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا خوب ترجمہ کیا ہے۔

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاک گور

''دنیادار کے ہوس کے پیٹ کو (موت) قبر کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی''

موت کو ہوس کا پر کرنے والا اس لئے کہا گیا ہے کہ اس سے ہوس منقطع ہو جاتی ہے گو پوری اس وقت بھی نہیں ہوتی مگر موت سے قطع حرص اضطراری ہے اور ایسے وقت میں قطع ہے کہ تم کو اس قطع سے نفع نہیں پہنچ سکتا۔ مرنے کے بعد تو کفار بھی مومن ہو جائیں گے مگر وہ ایمان کالعدم اور غیر قابل اعتبار ہے چنانچہ حق تعالیٰ مرتے ہوئے ایمان لانے کے نافع نہ ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔

فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راؤا باسنا

کہ عذاب کا معائنہ ہو جانے کے بعد ایمان نافع نہیں۔

اور یہی ایمان مبنی ہے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب کہ امام صاحب رحمۃ اللہ سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ اس شخص کے بارہ میں آپ کیا فرماتے ہیں جو کہتا ہے کہ جہنم میں کوئی کافر نہ جائے گا۔ امام صاحب نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ فتوے دو۔ سب نے یہ کہا یہ شخص کافر ہے جو نص صریح کا منکر ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ کیا اس کے قول میں کچھ تاویل نہیں ہو سکتی۔ لوگوں نے کہا اس میں کیا تاویل ہو گی۔ فرمایا ممکن ہے کہ اس نے کفر لغوی کا ارادہ کیا ہو کفر شرعی مراد نہ لیا ہو اور کافر جب مرتا ہے تو خدا پر ایمان لے آتا ہے۔ لہذا لغۃً وہ مومن ہے گو شرعاً چونکہ یہ ایمان معتبر نہیں اس لئے کافر ہے لہذا اس کا مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جو بھی جائے گا وہ لغۃً مومن ہوگا کافر نہ ہوگا۔

تو ایسے ہی مرتے ہوئے گو سب کی حرص منقطع ہو جائے گی مگر یہ انقطاع معتبر نہیں۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے علاج سے حرص قطع تو ہوگئی گو موت ہی کے وقت ہوئی۔

جواب یہ ہے کہ انقطاع آپ کے علاج سے نہیں ہوا بلکہ موت سے اضطراراً ہوا۔ اس لئے یہ انقطاع مفید نہیں۔ پس یہ علاج ہی غلط ٹھہرا کہ خوب گناہ کرنے سے حرص بھر جائیگی۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کو دونی ترقی ہوگی۔ کیونکہ فلسفی مسئلہ ہے کہ جس وقت قوت سے جتنا کام لیا جاتا ہے اتنا ہی وہ قوت زور پکڑتی ہے اور راسخ ہو جاتی ہے۔ پس نگاہ بد کرنے سے مرض نگاہ بد کو سکون نہ ہوگا بلکہ اس کی جڑ اور مضبوط ہوگئی

اور ایک بار گھور لینے سے جو سکون ہو جاتا ہے اس سے دھوکہ نہ کھایا جائے کیونکہ یہ عارضی سکون ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے تمبا کو کھانے والے کو جب تمبا کو کی طلب ہوتی ہے تو اس وقت ایک بار کھا لینے سے کچھ دیر کو سکون معلوم ہوتا ہے مگر در حقیقت اس کا اس وقت تمبا کو کھا لینا زیادت طلب کا سبب ہے۔ اس سے طلب میں کمی نہیں ہوتی بلکہ ہر دفعہ کے کھانے میں عادت اور پختہ ہو جاتی ہے۔

گناہ اور طاعت کا کمال

اسی طرح ایک بار گھورنے سے تھوڑی دیر کو عارضی سکون ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں عادت پختہ ہو رہی ہے کیونکہ سکون کی وجہ دو ہیں ایک تو خروج علت سبب ہے کہ جو چیز پریشانی کی علت تھی وہ اندر سے باہر نکل جائے اور ایک سبب یہ ہے کہ وہ تہہ اور جڑ میں بیٹھ جائے۔ اس سے بھی قدرے سکون ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے حوض میں ایک ڈھیلا گر پڑے جس سے حوض گدلا ہو جاتا ہے پھر وہ تہہ کے اندر بیٹھ جائے تو تھوڑی دیر میں پانی صاف نظر آنے لگتا ہے مگر وہ ایسا صاف ہے کہ جہاں کوئی ذرا محرک ہوگا تو حوض پہلے سے زیادہ گدلا ہو جائے گا۔

اسی طرح یاد رکھو کہ نگاہ بد کرنے سے مرض کو سکون نہیں ہوتا بلکہ قوت ہوتی ہے اور اس عارضی سکون کی ایسی حالت ہے کہ جیسے درخت کی جڑ میں جب پانی دیا جاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر میں نظروں سے غائب ہو جاتا ہے مگر واقع میں غائب نہیں ہوا بلکہ اب وہ شاخوں اور پتوں میں رطوبت بڑھا کر ظاہر ہوگا اور جڑ کو پہلے سے زیادہ مضبوط کرے گا پس جو لوگ مقتضائے تقاضا پر عمل کرتے ہیں وہ حقیقت میں تقاضے کو کم نہیں کرتے بلکہ اس کی آبیاری کرتے ہیں۔

یہ میں جہلاء صوفیاء کی غلطی بیان کر رہا ہوں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو وسوسہ نہ آئے۔ گناہ کا خطرہ نہ آوے اور جب یہ بات حاصل نہیں ہوتی تو وہ اس کی یہ تدبیر کرتے ہیں کہ لاؤ ایک دفعہ اس خطرہ پر عمل کر لیں پھر سکون ہو جائے گا۔ یہ ان کی سخت غلطی ہے۔

اول تو یہ مطلوب ہی صحیح نہیں کہ گناہ کا خطرہ نہ آئے۔ اگر تم کو گناہ کا وسوسہ اور خطرہ ہی نہ آئے تو پر طاعات میں تمہارا کمال ہی کیا ہوگا۔ پھر تو تم دیوار کی طرح ہو جاؤ گے کیونکہ اس کو بھی گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لیکن دیوار اگر زنا نہ کرے تو کیا کمال ہے اندھا نامحرم کو نہ دیکھے تو کیا کمال ہے۔ بہرا غیبت نہ سنے تو کیا کمال ہے صاحبو! تو اسی میں ہے کہ تم کو گناہ کا تقاضہ ہو اور تقاضے کا مقابلہ

کرو۔ گھورنے کی جو چاہ ہے اور نگاہ بد کو روکو۔ پھر دیکھو قلب میں کیسا نور اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔ حدیث میں اس کے متعلق وارد ہوا ہے۔

وجد حلاوۃ الایمان کہ نگاہ کو روکنے سے حلاوت ایمان نصیب ہوتی ہے۔

بھلا یہ بات اس شخص کو کہاں نصیب جسے تقاضا ہی نہیں ہوتا۔ اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گلخن است　　　　که ازو حمام تقویٰ روشن است

''دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی ہے کیونکہ اس سے تقویٰ حمام روشن ہے''

اس تقاضے ہی سے تو تقوے کا حمام روشن اور تقوے کا کمال ظاہر ہوتا ہے پس اول تو اس کے نہ ہونے کی طلب ہی جہل ہے پھر اس کا جو علاج کیا گیا ہے وہ بالکل الٹا علاج ہے بلکہ علاج صرف یہ ہے کہ تقاضے کا مقابلہ کرو اور گو مقابلہ تقاضا سے یہ تقاضا زائل نہ ہوگا مگر ضعیف ضرور ہو جائے گا جس کے بعد پھر مقاومت سہل ہو جائے گی اور یہ بھی بڑا نفع ہے کہ دشمن ضعیف ہو جائے۔

ماہ رمضان اور شیطان

یہاں سے ایک حدیث سے اشکال رفع ہو گیا وہ یہ کہ حدیث میں آیا ہے۔

اذا دخل رمضان صفدت الشیاطین[۱]

(کہ جب رمضان آتا ہے تو شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں)

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں **مردۃ الشیاطین** (بڑے بڑے شیاطین) آیا ہے تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہی کی وجہ سے ہوتا ہے مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں ان کا منشاء تقاضائے نفس ہے۔

مگر اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جب چھوٹے شیاطین قول اول پر اور تقاضائے نفس قول ثانی پر گناہ کرانے کے لئے موجود ہیں تو پھر شیاطین کے قید ہونے سے کیا فائدہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی نفع ہے چوروں کی جماعت کم ہو جائے رمضان سے پہلے اگر ہزار چور

---

[۱] شرح السنة للبغوی ۶:۲۱۳، تفسیر البغوی ۱:۱۵۷

تھے تو اب سو رہ گئے اور دوسرے قول پر تو صرف ایک ہی رہ گیا اور ظاہر ہے کہ ایک چور کا ہونا ایک جماعت کے ہونے سے سہل ہے۔ اس کا مقابلہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں اور دنوں سے کم گناہ ہوتے ہیں تو جو شخص تقاضے کے ضعیف کرنے کے لئے اس کے مقتضاء پر عمل کر رہا ہے وہ درخت کو پانی دے کر گرانا چاہتا ہے حالانکہ پانی سے تو جڑ اور مضبوط ہوگی۔ اس کی صورت تو یہی ہے کہ اس کو بالکل سکھا دو۔ تاکہ جڑ کمزور ہو جائے پھر وہ خود ہی گر پڑے گا بس ان لوگوں کے علاج کی وہی حالت ہے جس کو طبیب روحانی کی حکایت میں مولانا فرماتے ہیں کہ اس نے دوسرے طبیبوں کے علاج کو سن کر کہا تھا۔

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند   آں عصمت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال دروں   استعیذ اللہ مما مفترون

”کسی نے کہا انہوں نے جو دوا بھی کی ہے وہ آباد کرنا نہیں ہے انہوں نے تو ویران کیا ہے اندر کے حال سے وہ بالکل بے خبر تھے۔ میں ان کے افترا اور بہتان سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں“

خودرائی کا علاج

خودرائی کے علاج کی یہی گت ہوتی ہے کہ اس سے الٹا مرض ہی بڑھتا ہے۔ اس لئے اس طریق میں دستگیری کی ضرورت ہے۔ اپنے آپ یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ مگر دستگیری سے مراد ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت کرنا نہیں ہے بلکہ دست گیری سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص راہ بتانے والا ہو اور تم اس کا اتباع لازم سمجھو۔ بیعت کی ضرورت نہیں۔ دست گیری بدوں بیعت کے بھی ہو سکتی ہے۔

دیکھو اگر کوئی اندھا حافظ کسی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلے تو کیا وہ اس کا مرید ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ مگر لڑکا حافظ جی کا دست گیر ضرور ہے۔ کیونکہ راستہ دیکھنے کے فن میں وہ حافظ جی سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ وہ بصیر ہے اور حافظ جی ضریر ہیں یعنی اندھے وہ ان کی دست گیری کر کے منزل پر ضرور پہنچا دے گا۔

بشرطیکہ وہ ایسا دست گیر نہ ہو جیسے ایک حافظ جی دعوت کھا کر ایک لڑکے کے ساتھ واپس ہو رہے تھے راستہ میں کھائی یعنی خندق آئی تو لڑکے نے کہا‘ حافظ جی کھائی‘ تو وہ فرماتے ہیں ہاں بیٹا خوب کھائی۔ اس نے پھر کہا‘ حافظ جی کھائی۔ وہ یہی کہتے رہے ہاں بیٹا خوب کھائی۔ آخر کو گڑھے میں گر پڑے تو اس پر بڑے خفا ہوئے کہ تو نے بتلایا کیوں نہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے تو بار بار کہا تھا۔ حافظ جی کھائی۔ حافظ جی کھائی۔ تو آپ فرماتے ہیں کہ تجھے یوں کہنا چاہئے تھا‘ حافظ جی خندق۔

تو ایسا دست گیر تو واقعی دھکے دے گا جو مخاطب کی حالت کو سمجھ کر اس کے موافق علاج نہ کرے اور اگر دست گیر کامل ہے تو وہ ضرور منزل پر پہنچا دے گا۔ اگر تم اس کا اتباع اور انقیاد کرتے رہے۔ باقی بیعت تو جھگڑا ہے۔ اصل بیعت تو انقیاد ہی ہے چنانچہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے اس کو خوب سمجھا۔

معاہدہ بیعت

حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں یہ معاہدہ قرار پایا تھا کہ جہاں ایک صاحب بیعت ہوں اور دوسرے کو خبر کر دیں۔ وہ بھی انہی بزرگ سے بیعت ہوں گے پھر حضرت حاجی صاحب لوہاری جا کر میاں جی صاحب سے بیعت ہو گئے اور حافظ صاحب سے تذکرہ کرنا بھول گئے جب حافظ صاحب نے دیکھا کہ یہ بار بار لوہاری جاتے ہیں تو دریافت کیا کہ آپ بار بار لوہاری کیوں جایا کرتے ہیں تب فرمایا کہ میں ایک بزرگ سے بیعت ہو گیا ہوں۔ فرمایا اور ہمارا تم سے تو معاہدہ ٹھہرا تھا کہ دونوں ایک ہی جگہ بیعت ہوں گے۔ آپ نے ہم سے کیوں نہ تذکرہ کیا فرمایا میں بھول گیا تھا۔ اب چلے چلو۔ چنانچہ حافظ صاحب بھی ہمراہ ہو لئے۔ جب آپ لوہاری پہنچے تو میاں جی صاحب نے دریافت فرمایا کہ حافظ صاحب کیسے آئے عرض کیا حضرت بیعت کے ارادہ سے آیا ہوں۔ فرمایا بھائی میں تو بزرگ نہیں ہوں۔ ایک میاں جی ہوں بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ کسی بزرگ سے بیعت ہونا چاہئے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے تو اپنا ارادہ عرض کر دیا آگے آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد حافظ صاحب ہمیشہ لوہاری آتے جاتے رہے۔ اور بیعت کے لئے پھر عرض نہیں کیا آخر میاں جی صاحب نے خود ہی ایک بار فرمایا کہ حافظ صاحب کیا اب بھی وہی خیال ہے۔ حافظ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں تو دل سے بیعت ہو چکا ہوں کیونکہ بیعت اعتقاد ہی ہے باقی بزرگوں پر اصرار کرنا بے ادبی ہے اس لئے صورت بیعت پر میں نے اصرار نہیں کیا فرمایا اچھا وضو کر کے آجاؤ اور بیعت ہو جاؤ۔

تو دیکھئے حافظ صاحب نے صورت بیعت پر اصرار نہیں فرمایا بس اپنے اعتقاد و انقیاد کو کافی سمجھا پھر خود ہی شیخ نے بیعت کے لئے فرمایا۔ تو صورت بیعت بھی نصیب ہو گئی مگر جیسے حافظ صاحب کو شیخ نے دیر سے بیعت کیا تھا ایسے ہی وہ بھی بہت دیر میں بیعت کرتے تھے انہوں نے اپنے مریدوں سے اس کی کسر نکالی چنانچہ عمر بھر آٹھ سے زیادہ آپ کے مرید نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ آپ نے حاملان عرش کی شمار پوری کر دی۔ وہ بھی آٹھ ہی ہیں اور حضرت حاجی صاحب بہت جلد بیعت کر لیتے تھے کیونکہ آپ کو میاں جی صاحب نے فوراً بیعت کر لیا تھا۔

حضرت حاجی صاحب پہلے شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔ پھر تکمیل سے

پہلے ہی ان کا وصال ہو گیا تھا تو حضرت کو دوسرے شیخ کی تلاش تھی اور اس تلاش میں بے چین تھے اور شاہ سلیمان صاحب سے بیعت ہونے کا کبھی کبھی ارادہ ہوتا تھا کیونکہ اس وقت وہ مشہور تھے اسی عرصہ میں حضور کو یا اپنے مشائخ میں سے کسی کو آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور کے ساتھ ایک بزرگ ہیں اور حضور نے حاجی صاحب کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ یہ تمہارے شیخ ہیں حاجی صاحب خواب سے بیدار ہوئے تو بڑے پریشان تھے کہ یا اللہ یہ کون بزرگ ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کیونکہ خواب میں پتہ کچھ نہیں بتلایا گیا۔

آخر ایک دن کسی شخص سے میاں جی صاحب کا تذکرہ سنا تو قلب کے اندر میاں جی صاحب کی طرف ایک خاص کشش پائی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ تو یہاں سے قریب لوہاری ہی میں رہتے ہیں تو حضرت نے زیارت کا ارادہ کیا اب حالت یہ تھی کہ جوں جوں لوہاری کی طرف بڑھتے جاتے اسی قدر دل میں کشش بڑھتی جاتی جیسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ جب لوہاری پہنچے اور میاں جی صاحب کی صورت دیکھی تو بعینہ وہی صورت تھی جو خواب میں دکھائی گئی تھی۔ اب تو حاجی صاحب کی اور ہی حالت ہوئی۔ قریب جا کر سلام عرض کیا تو میاں جی صاحبؒ نے دریافت فرمایا کہ صاحبزادے کیسے آنا ہو گیا بس حاجی صاحب پر گریہ طاری ہو گیا اور جوش میں عرض کیا کہ کیا حضرت کو معلوم نہیں ہے (نہ معلوم اس وقت حاجی صاحب پر کیا حالت تھی) اس کے جواب میں میاں جی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ صاحبزادے خواب و خیال کا کیا اعتبار۔ اس میں خواب کی طرف اشارہ تھا۔ اب تو حاجی صاحب کو اور بھی یقین ہو گیا اور زیادہ گریہ طاری ہو گیا اب میاں جی صاحب نے تسلی فرمائی کہ آپ گھبرائیں نہیں جو تم چاہتے ہو وہی ہو جائے گا۔ چنانچہ فوراً بیعت فرما لیا۔

حضرت حاجی صاحب پر یہی اثر غالب تھا کہ طالب کو پریشان نہیں کرتے تھے مگر دونوں صاحبوں کی نیت بخیر تھی حاجی صاحب کی نظر وسعت رحمتی پر تھی اس لئے فیض کو عام کر رکھا تھا۔ اور حافظ صاحب کی نظر اس پر تھی کہ سلسلہ کی بے قدری نہ کرنا چاہئے بلکہ اچھی طرح طلب کا امتحان کرنے کے بعد بیعت کرنا چاہئے۔

الغرض صورت بیعت کی تو ضرورت نہیں مگر کسی کو رہبر بنا لینے اور اس کے اتباع کرنے کی اس طریق میں بہت ضرورت ہے اپنی رائے پر عمل کرنا اس طریق میں سخت مضر ہے کیونکہ رای العلیل علیل۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاؤز اندریں صحرا مرو
ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید — ہم بعون ہمت مرداں رسید

ضرورت رہبر و دست گیر

یہ اپنی رائے ہی سے علاج کرنے کا نتیجہ ہے کہ بعض جاہل تقاضائے معصیت کے مقتضا پر عمل کر کے اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔

ایک سالک میرے ساتھ سفر میں بزوت کے راستہ میں تھے۔ وہ اسی مرض میں مبتلا تھے کہ نظر بد کو مفید سمجھتے تھے تا کہ تقاضا فرو ہو جائے۔ پھر میں نے ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا کہ اس طرح تو مرض دن بدن بڑھتا جائے گا ہرگز سکون نہ ہوگا۔

صاحبو! یہ الٹا علاج معصیت تو ہے ہی مگر اس میں کفر کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ یہ شخص معصیت کو مضر نہیں سمجھتا بلکہ مفید سمجھتا ہے اور اس کو طاعت کا مقدمہ بناتا ہے اور مقدمہ طاعت طاعت ہے تو اس نے گویا گناہ کو طاعت سمجھا اور یہ قریب کفر ہے اسی لئے ایک بزرگ نے عوام کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ اگر تم غلطی کرتے ہو تو طاعات سے معاصی میں آتے ہو۔ اور ہم غلطی کرتے ہیں تو ایمان سے نکل کر کفر میں جاتے ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ طریق نہایت لطیف ہے اور غذا جتنی لطیف ہوتی ہے اتنی ہی جلدی سڑتی ہے اور سڑنے کے بعد اس میں کثیف غذا سے زیادہ تعفن ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس طریق میں کسی کو رہبر اور دست گیر بنایا جائے۔ ورنہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے اور جس کو رہبر بنایا جائے اس کے اتباع کی ضرورت ہے۔ صرف بیعت کافی نہیں۔

مگر اب تو اس لئے بیعت ہوتے ہیں کہ آئے دن مقدمات و امراض وغیرہ میں تعویذوں کی ضرورت ہوتی ہے اور تعویذ گنڈے والے ہر دفعہ فیس طلب کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ایک کو پیر بنا لیا تا کہ عمر بھر کے لئے مفت تعویذ لکھوانے کا ٹھکانہ ہو جائے یا یہ نیت کرتے ہیں کہ مقدمات میں دعا کرنے کو اور اللہ میاں سے لڑنے بھڑنے کو ایک شخص کو پیر بنا لو۔ واقعی آج کل بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ مشائخ اللہ میاں کے رشتہ دار ہیں کہ بس جس بات کے لئے دعا کر دیں گے وہ ضرور ہو جائے گی اللہ تعالیٰ ان کے خلاف کر ہی نہیں سکتے۔ نعوذ باللہ!

شفاعت انبیاء اور پیر

بعض کا یہ خیال ہے کہ پیر آخرت میں ہمارے گناہ اپنے سر لا دے لے گا۔ اور ہمیں بخشوا لے گا پھر جو چاہو کرو۔ تو پھر پیر کیا ہوا بھنگی ہوا کہ تمہارا پاخانہ اٹھا لے گا استغفر اللہ! ارے میاں! قیامت کے دن انبیاء کا تو پتا پانی ہو جائے گا پیر بے چارہ کی تو کیا ہستی ہے کیا تم کو شفاعت کی حدیث یاد نہیں کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس اول جائیں گے کہ حق تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لئے

سفارش کر دیجئے۔ وہ کہیں گے نفسی نفسی مجھے اپنی ہی فکر ہے مجھ سے ایک قصور ہو گیا تھا اگر آج سوال ہو گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اس کے بعد پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ تو سب نفسی نفسی کہیں گے اور کچھ نہ کچھ عذر کر دیں گے اور حضور کا شفاعت کے لئے آمادہ ہو جانا اور کوئی عذر نہ کرنا اس وجہ سے نہ ہوگا کہ آپ خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں ہیں۔ (استغفر اللہ) آپ تو سب سے زیادہ خائف ہیں۔ انا اعلمکم باللہ و اخشاکم للہ[1] (میں تم سب سے بڑھ کر اللہ رب العزت کو جاننے والا اور تم سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا ہوں) مگر آپ کو اشارہ اور اذن ہو جائے گا اس لئے آپ عذر نہ کریں گے کیونکہ حق تعالیٰ کے یہاں بدوں اذن کے کوئی شفاعت نہیں کر سکتا۔ نص موجود ہے۔ من ذاالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ (کون ہے جو ان کے سامنے انکی اجازت کے بغیر شفاعت کرے) اس لئے ماننا پڑے گا۔ کہ آپ اذن کے بعد شفاعت فرمائیں گے اور اذن کے بعد جو شفاعت ہوگی اس کی تو یہ حالت ہوگی۔

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو　　ایمنی از تو مہابت ہم زتو

”دعا کی توفیق بھی آپ خدا ہی کی جانب ہے اور اسکی قبولیت بھی بے خوفی بھی اپ ہی کی طرف سے ہے اور خوف بھی“　اور

ماچو چنگیم و تو زخمہ ے زنی　　زاری ما از نے تو زاری میکنی

”یا اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور گویا آپ اس پر مضراب مار ہیں ہماری گریہ وزاری بظاہر ہماری طرف سے ہے مگر اس کی توفیق دینے والے آپ ہیں“

جب وہ خود کہہ دیں گے کہ تم شفاعت کرو ہم قبول کریں گے تو پھر یوں کہنا چاہئے کہ وہ خود ہی بخشا چاہتے ہیں بخشوانے کا نام ہی نام ہوگا۔ باقی اگر وہ بخشانہ چاہیں تو انبیاء بھی کسی کو نہیں بخشوا سکتے۔ پھر بے چارہ پیر تو کس شمار میں ہے۔

پس یہ خیالات تو محض لغو ہیں اور اس نیت سے بیعت ہونا کچھ مفید نہیں بلکہ اس طریق میں شیخ کے وجود کی مصلحت یہ ہے کہ وہ غلطیوں پر متنبہ کرتا ہے مقدمات میں دعا کرنے اور تعویذوں کے واسطے نہیں ہے نہ وہ قیامت میں بخشوانے کا ذمہ دار ہے۔ ان خیالات کو قلب سے نکال دینا چاہئے اور شیخ کو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ نہ معلوم آخرت میں پیر مرید کو بچائے یا مرید پیر کو بچائے شیخ اپنے کو مریدوں سے

---

[1] فتح الباری لابن حجر ۲: ۱۵۱ بلفظ: انا اعلمکم بحدود اللہ واتقاکم

بڑا نہ سمجھے کیا معلوم خدا تعالیٰ کے ہاں کون بڑا ہے اس لئے شیخ کو بھی چاہئے کہ اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرتا رہا کرے اور معاملات میں ان سے رائے لیا کرے اور عام مسلمانوں سے دعا بھی کرائے۔

حرص کا صحیح علاج

غرض حضور حرص کا صحیح علاج بتاتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ تمہارے علاج کی غلطی بھی معلوم ہوگئی کہ زیادہ مال جمع کرنا حرص کو کم نہ کرے گا۔ اس سے تو مال کی حرص اور زیادہ ہوگی کم نہ ہوگی۔ دوسرے زیادہ مال ہونے سے پھر اس کی حفاظت کی حرص ہوگی اور اس سے مال کے ساتھ تعلق بڑھے گا ہر وقت اسی دھن میں رہو گے کہ اس روپیہ کو کہاں رکھوں کس طرح بڑھاؤں پس زیادتی مال سے تو پریشانی دن بدن بڑھے گی کم نہ ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں۔

جان ہمہ روز از لگد کوب خیال می شود مجروح و خستہ و پامال
نے صفا میماندش نے لطف و فر نے بسوئے آسمان راہ سفر

”انسان کا دل ہر وقت خیالات کی کش مکش سے زخمی اور بدحال و برباد رہا کرتا ہے نہ اس میں صفائی باقی رہتی ہے اور نہ زندگی کا لطف اور شان باقی رہتی ہے اور نہ اس کو نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی رہتا ہے“

اور یہ تعلقات مبتدی کو تو بہت ہی مضر ہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ نے نواب محمود صاحب رئیس چھتاری کو لکھا تھا کہ آپ مکہ میں بہ نیت ہجرت آنا چاہتے ہیں تو یہاں رہ کر اپنے لئے صرف اتنی رقم منگانے کا انتظام کیجئے جو آپ کے خرچ کے لئے کافی ہو تقسیم کے واسطے نہ کوئی رقم ساتھ لانا وہاں سے منگانے کا انتظام کرنا۔ حالانکہ یہ صدقہ تھا جو موجب ثواب ہے مگر مبتدی کو یہ بھی مضر ہے کہ اس جھگڑے میں پڑے کہ صدقہ کس کو پہنچا اور کون رہا اور رقم اب تک کیوں نہیں آئی کہاں دیر ہوئی اور اپنے آپ کو دینے والا اور دوسروں کو اپنا محتاج سمجھے۔

ہاں حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اقویا کو یہ تعلقات مضر نہیں ان کی نسبتیں راسخہ تھیں اس لئے ان تعلقات سے ان کو توجہ الی اللہ کم نہیں ہوتی تھی۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بڑا ساز وسامان تھا۔ سلطنت جیسے ٹھاٹ تھے مگر مال سے بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ ایک فقیر نے آپ کا امتحان لینا چاہا کہ دیکھوں ان کو مال سے کتنا تعلق ہے اس نے ایک دن خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ اس سال آپ کے ساتھ حج کروں اس نے دل میں سوچا ہوگا کہ خواجہ صاحب انتظام ریاست کا عذر کر کے کچھ طویل

میعاد مقرر کریں گے مگر وہاں کیا دیر تھی خواجہ صاحب فوراً رومال جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا بہت اچھا چلو۔ فقیر نے کہا، حضرت ریاست کا تو کچھ انتظام فرما دیجئے۔ فرمایا یہ تو خدا کا مال ہے، وہ خود اس کی حفاظت کر لیں گے میں تو ایک برائے نام محافظ ہوں اگر میں نہ ہوں گا تو وہ کسی دوسرے کو میری جگہ مقرر کر دیں گے مجھے انتظام کی ضرورت نہیں اس نے کہا اچھا میں ذرا کمبل اور کپڑے گھر سے لے آؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بس اسی پر اپنے کو دنیا سے بے تعلق سمجھتے ہو مجھے تو اتنی بڑی ریاست کی بھی فکر نہ ہوئی اور تمہارا دل ابھی تک کمل اور کپڑوں ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ درویش اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ باوجودیکہ سلطنت کرتے تھے مگر اس سے ایسے بے تعلق تھے کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو خلیفہ بھی نامزد نہیں کیا۔ نہ اس کا مرتے ہوئے کچھ تذکرہ کیا نہ یہ فکر ہوئی کہ میرے بعد سلطنت کا کیا حال ہو گا۔ صرف دو وصیتیں فرمائی تھیں۔

ایک یہ کہ خلافت چھ آدمیوں کے مشورہ پر ہے یہ جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔

دوسرے یہ کہ عبداللہ بن عمر کا خلافت میں تو کوئی حق نہیں مگر خلیفہ کو ان سے مشورہ کرتے رہنا چاہئے۔ لانه رجل صالح کیونکہ وہ نیک آدمی ہیں۔

تو جو شخص ان تعلقات میں مبتلا ہو کر ان سے ایسا بے تعلق ہو اس کو تو ضرر نہیں ہوتا۔ ورنہ عام طور پر تعلقات مضر ہیں ان سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے اس وقت تو یہ بات تقلیداً مان لی جائے پھر جب آپ کو تعلق مع اللہ کے نور کا احساس ہو گا اس وقت ان تعلقات کی ظلمت کا بھی احساس ہو جائے گا غرض حرص کا یہ علاج تو غلط ہے اور اس سے ہرگز ہوس نہیں بھرتی۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ہم نے ایک دفعہ وسوسہ گناہ کے بعد جی بھر کے گناہ کر لیا تھا۔ پھر توبہ کر لی تھی تو پھر اس کے بعد واقعی ہم کو اس گناہ کی ہوس نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جی بھر کے گناہ کر لینے سے ہوس بھر جاتی ہے تو وہ علاج غلط نہ ہوا۔

سالکین اس کا جواب کان کھول کر سن لیں کہ یہ نفع جی بھر کے گناہ کرنے کا نہیں بلکہ وہاں دو چیزیں تھیں ایک جی بھر کے گناہ کرنا دوسرے یہ ارادہ کرنا کہ پھر نہ کروں گا تو یہ برکت اس عزم ترک کی ہے جس کو تم جی بھر کے گناہ کرنے کا اثر سمجھتے ہو اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دوا گلے سے نیچے نہ اترتی تھی۔ مریض نے پانی کے ساتھ اس کو نگل لیا تو گلے سے اتر گئی اور اس سے نفع ہوا۔ اب وہ بے وقوف یہ سمجھنے لگا کہ یہ نفع پانی سے ہوا ہے اور اسے مفید سمجھ کر خوب پینے لگا تو ظاہر ہے ایک دن مرے گا اور اس بیوقوف سے ہر عاقل یہی کہے گا کہ میاں نفع تو دوا سے ہوا تھا۔ پانی کو اس میں کچھ دخل نہ تھا اس نے محض گلے سے اتارا تھا اور اگر تم ہمت کر کے ویسے ہی نگل جاتے

جب بھی نفع ہو جاتا۔ تمہارا پانی کو مفید سمجھنا حماقت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ نفع محض عزم ترک کا ہے۔ گناہ کرنے کو اس میں کچھ دخل نہیں۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ کچھ ہی سہی مگر نفع تو ہوا اور جی بھر کے گناہ کرنے سے تقاضا تو رفع ہوا۔ چاہے عزم ترک کے ہی اقتران سے سہی۔

میں تو بقسم کہتا ہوں کہ اقتران کو نفع میں کچھ دخل نہیں بلکہ محض عزم ترک ہی کو دخل ہے بلکہ اس عزم کے ساتھ گناہ کے منضم ہو جانے سے نفع دیر میں ہوا۔ اگر گناہ منضم نہ ہوتا تو نفع جلدی ہوتا (بلکہ انضمام گناہ کے ساتھ عزم ترک سے کچھ نفع ہو جانا شاذ و نادر ہے ورنہ زیادہ تر یہ ہے کہ ارتکاب گناہ سے پہلے تو عزم ترک بعض میں ہوتا ہے مگر گناہ کر لینے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ گناہ سے اکثر یہ عزم ضعیف و معدوم ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ شاذ پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اگر کسی کو اتفاقاً زہر نقصان نہ دے تو اس سے زہر کو نافع نہیں کہہ سکتے۔ خوب سمجھ لو۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازالہ حرص کا صحیح علاج بتاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **ویتوب اللہ علیٰ من تاب** اس میں توبہ کو علاج حرص بتلایا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں توجہ الی اللہ۔ اور اس کا حرص کے لئے علاج ہونا ایک قاعدہ فلسفہ سے سمجھ میں آ جائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے۔

النفس لاتتوجه الى شيئين فى آن واحد

کہ نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ حرص کی حقیقت توجہ اور میلان الی الدنیا ہے اب اس توجہ کو کسی دوسری شے کی طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا باقی نہ رہے گی پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی اور اس سے توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی قوی ہوگا اور اگر ایسی شے کی طرف توجہ کی جائے جو طبعاً محبوب نہ ہو تو اس صورت میں توجہ کمزور ہوگی۔

تعلق باللہ

اب سمجھو کہ حق تعالیٰ سے ہر شخص کو فطری تعلق ہے اور ذات حق کی طرف ہر ایک کو میلان طبعی ہے۔ فقط مسلمان ہی کو نہیں بلکہ کافر کو بھی کیونکہ انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے تو کسی سبب سے ہوتی ہے اور وہ اسباب یہ ہیں حسن و جمال یا جود و نوال یا فضل و کمال۔ اور جس میں یہ اسباب قوی ہوں گے اس سے محبت بھی قوی ہوگی اور یہ معلوم ہے کہ یہ اوصاف بالذات حق تعالیٰ ہی میں ہیں دوسری اشیاء میں بالعرض ہیں پس یوں کہنا چاہئے کہ محبت اور میلان حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی

کی طرف ہوتا ہے اور دوسری اشیاء کی طرف میلان محض اس وجہ سے ہے کہ ان میں صفات حق کا ظل ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں پر نظر کا منحصر ہو جانا اس لئے ہے کہ لوگوں کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ اوصاف حقیقت میں حق تعالیٰ کے اندر ہیں جس وقت یہ معلوم ہوگا کہ حضرت حق ہی محسن و منعم ہیں اور وہی حسین و جمیل اور صاحب فضل و کمال ہیں اور مخلوقات میں محض ان کا ظل ہے اس وقت ہر شخص حق تعالیٰ ہی کی طرف مائل و متوجہ ہوگا۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاج کا حاصل یہ ہوا کہ اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دو اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ الی اللہ کی طرف ہوگی اتنی ہی دنیا سے توجہ ہٹے گی کیونکہ دو چیزوں کی طرف نفس متوجہ نہیں ہو سکتا۔

مگر اس علاج میں ایک غلطی ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جب بندہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو عجب و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے کہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کامل ہو گیا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح حدیث کے عنوان ہی سے کر دی ہے وہ یہ کہ آپ نے یہاں پر توجہ الی اللہ نہیں فرمایا۔ **یتوب اللہ علیٰ من تاب** فرمایا ہے جس میں **من تاب** میں تو حرص کا علاج مذکور ہے کہ توجہ الی اللہ اس کا علاج ہے اور **یتوب اللہ** بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ محض تمہاری توجہ سے یہ مرض زائل نہ ہوگا بلکہ علت تامہ کا جزو اخیر ایک اور چیز ہے وہ یہ کہ تمہاری توجہ کے بعد حق تعالیٰ بھی تم پر توجہ فرمائیں گے تب یہ مرض زائل ہوگا اور جب خدا تعالیٰ کی توجہ علت تامہ کا جزو اخیر ہے تو اصل علاج خدا کی توجہ ہے محض تمہاری توجہ کافی نہیں اس میں عجب و ناز کا علاج ہو گیا کہ اپنی توجہ اور طاعات پر ناز نہ کرنا کیونکہ اس سے کچھ نہیں ہوا بلکہ کام تو خدا کی عنایت سے بنا ہے اب اس مختصر حدیث میں چار مضمون بیان ہو گئے۔

ایک یہ کہ حرص مرض ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کے مقتضا پر عمل کرنے اور اس میں زیادتی کرنے سے تقاضا فرو نہ ہوگا بلکہ دونا بڑھے گا۔

تیسرے یہ کہ اس کا علاج توجہ الی اللہ ہے۔

چوتھے یہ کہ اصل علاج خدا کی توجہ ہے جو عادۃً بندہ کی توجہ پر مرتب ہے و متفرع ہو جاتی ہے۔

توجہ الی اللہ

جب حرص کا صحیح علاج معلوم ہو گیا تو اب سمجھئے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے بس اسی پر میں بیان ختم

کروں گا بعض نے تو یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے‘ روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجالائے ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجودیکہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی تقاضائے معصیت مضمحل کیوں نہیں ہوتا چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے۔

بعض نے یہ کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر اُن کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے اور دل میں گناہوں کا تقاضائے شدید پاتے ہیں۔

تو سنو! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے پس دونوں کو جمع کرنا چاہئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو۔ نگاہ کو روکو اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنو۔ اس کے بعد بھی اگر نورانیت حاصل نہ ہو تو ہم پر ہنسنا۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے۔

چشم بند لب بہ بندو گوش بند　　گر نہ بینی نور حق برما بخند

”اگر آنکھوں‘ لبوں اور کانوں کو گناہوں سے بند کرلو اسکے بعد بھی اگر دل میں نور حق محسوس نہ کرو تو ہم پر ہنسنا“

اس وقت غلطی یہ ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہرہ کے تارک ہیں اور بعض اعمال باطنہ کے تارک ہیں اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی دونوں کو جمع کرنا چاہئے۔ پھر ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔ اب میں دونوں کی قدرے تفصیل بتلاتا ہوں۔

اعمال ظاہرہ

اعمال ظاہرہ میں سب سے اہم نماز ہے اس میں خصوصاً عورتیں بہت کوتاہی کرتی ہیں بعض تو پڑھتی ہی نہیں ہیں اور ایسی ہی زیادہ ہیں اور بعض پڑھتی ہیں مگر ان کا قرآن صحیح نہیں ہے اور نہ تصحیح کا اہتمام ہے۔ اور بعض کا قرآن بھی صحیح ہے لیکن وہ وقت کو بہت تنگ کر دیتی ہیں۔ ظہر کی نماز عصر کے وقت اور عصر کی مغرب کے وقت پڑھتی ہیں (حالانکہ مردوں کے لئے تو بعض اوقات میں تاخیر مسنون بھی ہے مگر عورتوں کے لئے تو سب نمازیں اول وقت پڑھنا افضل ہے مگر یہ اول تو اول اخیر میں بھی نہیں پڑھتیں بلکہ اکثر قضا

پڑھتی ہیں (بعض ان نمازوں کو قضا نہیں کرتیں جو ہر مہینے میں ان سے غسل کی تاخیر کے سبب فوت ہو جاتی ہیں اگر احتیاط کریں اور مسئلہ کو اچھی طرح معلوم کرلیں تو اول تو ایسی نوبت ہی نہ آئے اور جو غلطی سے ایسا ہو جائے تو جلدی قضا کرنا چاہئے۔ غرض اعمال ظاہرہ میں نماز سب سے زیادہ اہم ہے اس کی اچھی طرح پابندی کرنا چاہیے اور دل لگا کر نماز پڑھا کریں۔ جلدی جلدی سر سے بیگار نہ اتاریں۔

باقی روزہ میں تو عورتیں بڑی بہادر ہیں چاہے بیماری ہو یا تکلیف ہو اور حکیم بھی افطار کی اجازت دے دے مگر یہ روزہ قضا نہیں کرتیں لیکن اس کے ساتھ روزہ میں غیبت بھی بہت کرتی ہیں کیونکہ صبح سے شام تک کچھ کام تو ہوتا نہیں بس بیٹھی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں بناتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان میں وہ عورتیں بہت اچھی ہیں جن کو تمباکو کی عادت کی وجہ سے روزہ بہت لگتا ہے اگرچہ تمباکو برا ہے کیونکہ وہ روزہ کو الگ کر کے ایک طرف کونا میں سر ڈالے پڑی رہتی ہیں ان سے بغیر پان کھائے بات تک نہیں ہوسکتی تو وہ ان قصوں سے یعنی غیبت شکایت سے محفوظ رہتی ہیں مگر اب جاڑوں کے روزے آرہے ہیں۔ اس لئے جن کو روزہ بہت لگتا ہے اب ان کو بھی کم لگے گا بہر حال روزہ رکھنے کی ترغیب دینے کی ان کو ضرورت نہیں۔ اس کو تو عورتیں خود بہت شوق سے کر لیتی ہیں البتہ روزہ کے حقوق ادا کرنے کی میں ان کو تاکید کرتا ہوں کہ فضول اور گناہ کی باتوں میں روزہ کو برباد نہ کیا کریں بلکہ قرآن پڑھا کریں بزرگوں کی حکایات دیکھا سنا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو ایک طرف پڑ کر سو رہا کریں۔

ایک بات عورتوں کے متعلق یہ کہنے کی ہے کہ یہ پردہ میں احتیاط کم کرتی ہیں جن عزیزوں سے شرعاً پردہ ہے ان کے سامنے آتی ہیں نیز کافر عورتوں سے جیسے بھنگن اور چماری وغیرہ سے بدن چھپانے کا اہتمام نہیں کرتیں حالانکہ شرعاً ان سے بھی پردہ ہے گو ایسا گہرا پردہ نہیں جتنا مردوں سے ہوتا ہے بلکہ کافر عورتوں کے سامنے صرف منہ اور ہاتھ گٹوں تک اور پیر کھولنے کی اجازت ہے باقی سر اور سر کے بال اور بازو اور کلائی اور پنڈلی وغیرہ کھولنا جائز نہیں اس کا بہت خیال کرنا چاہئے۔

ایک کوتاہی عورتیں رسوم کے بارہ میں کرتی ہیں شادی وغیرہ کی رسوم میں بہت بے احتیاطی کی جاتی ہے بے پردگی کی بھی اور فضول مال ضائع کرنے کی بھی اور تفاخر و نام و نمود چاہنے کی بھی۔ یہ وہ گناہ ہیں جن میں آج کل عورتیں بہت مبتلا ہیں ان سے اچھی طرح احتیاط لازم ہے باقی جن گناہوں میں آج کل مرد مبتلا ہیں ان سے عورتیں اکثر محفوظ ہیں ان کی نگاہ بہت کم بہکی ہوتی ہے بلکہ اس بارہ میں ان کی وہی شان ہے۔ **قاصرات الطرف** (کہ نگاہ کو اپنے شوہر تک منحصر رکھتی ہیں) جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔

مفید مستحبات

اب بعض مستحبات کا بیان کرتا ہوں جن کی برکات بہت ہیں اور جن سے توجہ الی اللہ کو قوت ہوتی ہے وہ یہ کہ نماز روزہ کے ساتھ کچھ ذکر اللہ بھی کرنا چاہیے۔ اس سے دل کو خدا تعالیٰ کے ساتھ لگاؤ ہوتا ہے اور نماز میں دل لگتا ہے مگر عورتوں میں ذکر اللہ کا رواج ہے بہت ہی کم ہے۔ اسی لئے ان میں کوئی شیخ نہیں ہے ہاں شیخ زادیاں بہت ہیں مگر شیخ بمعنی پیر کوئی نہیں ہے۔ گو عورتوں نے کسی کسی عورت کو پیرنی کا لقب تو دے دیا ہے اگر چہ وہ شیطان کی بنائی کیوں نہ ہو۔ سو ایسی پیرنیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا تو وجود ہی مضر ہے۔ غرض یہ ہے کہ ضرورت شیخ کی ہے جو خدا کا راستہ بتلائیں۔ عورتیں اپنے مردوں کے ذریعہ سے کسی شیخ کامل سے ذکر کا طریقہ پوچھ کر آپس میں اس کا رواج دیں کیونکہ ان کی طبیعتوں کو ذکر اللہ سے بہت مناسبت ہے اس لئے کہ ذکر اللہ کا اثر ان پر زیادہ ہوتا ہے جن کے قلوب میں سکون اور یکسوئی کی حالت ہو اور عورتوں کو یہ بات خاص درجہ میں حاصل ہے ان کے قلوب میں تشتت و تفرق نہیں ہے اور یہ پردہ کی برکت ہے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں مقید رہتی ہیں اس لئے ان کے قلوب میں یکسوئی بہت ہے مگر آج کل کے جنٹلمین اس کے دشمن ہو رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح آزاد پھرا کریں اور وہی علوم پڑھیں جو مرد پڑھتے ہیں اگر ایسا ہو گیا تو پھر عورتوں میں یہ جمعیت و سکون نہ رہیگا۔ جو پردہ میں بیٹھ کر علوم دنیا سے بے خبر ہو کر اس وقت حاصل ہے۔

ایک دفعہ کانپور میں میرا بیان ہوا تو میں نے کہا کہ بعض لوگ آج کل عورتوں کو جغرافیہ پڑھاتے ہیں میری سمجھ میں اس کی حکمت نہیں آئی۔ مردوں کو تو اس کی اس لئے ضرورت ہو سکتی ہے کہ وہ ضروریات معاش کے لئے ادھر ادھر سفر کرتے ہیں تو مختصر شہروں کے حالات جاننے سے ان کو آسانی ہو گی مگر عورتوں کو جغرافیہ پڑھانے میں سوا اس کے کہ ان کے گھر سے بھاگنے کا راستہ بتانا ہے اور کیا فائدہ ہے کیونکہ اب تک عورتیں گھر میں مقید ہیں۔ ان کو کچھ خبر نہیں کہ اپنے شہر میں کتنی گلیاں اور کتنی سڑکیں ہیں اور اسٹیشن کس طرف ہے اور یہاں سے اگر دہلی جانا چاہیں تو کس طرف کو جائیں مگر جغرافیہ پڑھ کر یہ سب باتیں ان کو معلوم ہو جائیں گی تو اب وہ نہایت سہولت سے بھاگ سکتی ہیں۔

یہ مضمون میں نے ویسے ہی بطور عموم کے بیان کیا تھا۔ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہ تھا مگر اتفاق سے اس مجلس میں ایک صاحب ایسے موجود تھے جو اس مرض میں مبتلا تھے بعد بیان کے وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ جغرافیہ کے اس مفسدہ پر میری نظر نہیں کی گئی تھی میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ بھی ایک علم ہے اس کے پڑھانے میں بھی کچھ حرج نہیں اس لئے میں نے اپنی بیوی کو جغرافیہ شروع کرادیا

تھا لیکن اب مجھے آپ کے کہنے سے اس کے مفسدہ کا علم ہو گیا۔ ان شاء اللہ اب نہ پڑھاؤں گا۔

واقعی عورتوں کو علوم جدیدہ کی تعلیم دینا ان کو تباہ و برباد کرنا ہے بس ان کو تو قرآن شریف اور بقدر ضرورت مسائل دینیہ کی تعلیم دینا چاہئے لکھنا بھی نہ سکھائیں تو اچھا ہے کیونکہ عورتوں کے لکھنے سے بعض جگہ قصے ہو گئے ہیں اور اگر لکھنا سکھایا جائے تو اس کی بہت نگہداشت رکھی جائے کہ وہ از خود کسی کو خط نہ بھیج سکیں بلکہ جہاں خط لکھیں پہلے گھر کے مردوں کو دکھلا لیا کریں اور پتہ وہ خود نہ لکھیں بلکہ مرد اپنے قلم سے لکھے۔

مجھ سے ایک جنٹلمین جنٹ ملے وہ اس نکتہ کو سمجھ گئے تھے چنانچہ کہتے تھے کہ میں لڑکوں کو تو سب علوم پڑھاتا ہوں قدیم بھی اور جدید بھی مگر لڑکیوں کو قرآن و حدیث و فقہ کے سوا کچھ نہیں پڑھاتا۔ کیونکہ ان کے اندر جو صفات حمیدہ ہیں وہ انہی علوم سے محفوظ رہتی ہیں علوم جدیدہ سے ان کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ عورتوں کے اندر یہ صفت یکسوئی اور سکون و جمعیت کی بہت ہی اچھی ہے جو محض پردہ کی برکت سے ہے۔ اس حالت میں اگر یہ ذکر اللہ کرنے لگیں تو بہت نفع ہو اس لئے ان کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور دل لگا کر ذکر اللہ کرنا چاہئے اور کچھ وقت تلاوت قرآن کے لئے بھی نکالیں عورتیں قرآن کم پڑھتی ہیں حالانکہ اس سے دل بہت صاف ہوتا ہے اور نیک کاموں کی طرف رغبت و شوق بڑھتا ہے۔ اس کا بھی اہتمام چاہیے اور اس کے بعد تھوڑا سا وقت موت کی یاد کے لئے مقرر کریں جس میں اپنا ایک دن مرنا اور قبر میں دفن ہونا اور دنیا سے رخصت ہونا ذہن میں مستحضر کریں اور دنیا کے کاموں میں بھی موت کا دھیان کر لیا کریں۔ بس پھر یہ حالت ہو گی کہ آدمی چلتا ہوا کام رکھے گا زیادہ بکھیڑا نہ رہے گا یہ ہے کامل علاج حرص کا۔ اس کو کر کے دیکھیں ان شاء اللہ چند ہی روز میں حرص کم ہو جائے گی۔

حج اور تجارت

اب ایک یہاں طالب علمی شبہ ہے اس کا جواب دے کر میں ختم کئے دیتا ہوں شبہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تو زیادت مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم** یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے تھے جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کو شبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کا ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو۔ جس میں تجارت کی بحالت حج اجازت دی گئی حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے خاص اپنے دربار کی زیارت کو

آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دیدی۔ بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا اس کے دل میں تمہاری اس ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی بلکہ کان پکڑ کے دربار سے نکال دیئے جاؤ گے تم ہم سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ سوداگری کو آئے تھے۔ مگر حق تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں یہاں تو اباحت ہی ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت ہو کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی فقراء کی امداد کریں گے۔

رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ ہوتا جب بھی ضرور حج کو جاتا تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج بھی کم نہ ہوگا۔ اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے تو اس حالت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حج کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل حرام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص ریاکار ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکہ دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت کے لئے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں۔

رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صوت میں مال تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے تو اگر زادراہ بقدر کفایت موجود ہے تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے کیونکہ اس میں خلوص زیادہ ہے اور اگر زادراہ بقدر ضرورت ہی ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہوگی مال تجارت لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا ہے جو مدلول ہے آیت کا بلکہ انہماک اور زیادت حرص سے منع کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ اس قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش ابتغاء فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھایا ہے۔ سورۂ جمعہ میں فرماتے ہیں۔

وابتغوا من فضل اللّٰہ و اذکروا اللّٰہ کثیراً۔

(اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو)

تو **واذکروا اللہ** کو بڑھانا بتلا رہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل جبھی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے۔ اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی ممانعت ہے جو حد سے متجاوز ہو۔ خوب سمجھ لو۔

بس اب میں ختم کر رہا ہوں خلاصہ یہ ہوا کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص مال کی مذمت بیان فرمائی ہے اور حرص کے کم کرنے کی جو تدبیر غلط فہموں نے سمجھی تھی اس کی غلطی ظاہر فرمائی ہے پس لوگوں کو چاہئے کہ اس تدبیر کو استعمال نہ کریں جیسے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ذرا بیٹے کی شادی یا بیٹی کے نکاح سے فراغت کر لیں تو پھر دنیا کے دھندوں کو الگ کر کے اللہ اللہ کریں گے حضور فرماتے ہیں کہ اس طرح کبھی یہ حرص کم نہیں ہو سکتی بلکہ اور بڑھے گی وہی حالت ہوگی جیسے خارش والا کہا کرتا ہے کہ ذرا سا کھجلا لوں پھر نہ کھجلاؤں گا۔ مگر وہ جتنا کھجلاتا ہے اتنی ہی خارش بڑھتی ہے۔ ایسے ہی آج تو آپ ایک بیٹی کی شادی کا بہانہ کرتے ہیں کل کو نہ معلوم کتنی بیٹیاں ہو جائیں گی اور تمہاری نہ ہوں تمہاری اولاد کی ہو جائیں گی تو یہ سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا اور وہی حال ہو جائے گا۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم — باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

”ہر رات کو ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ جنون چھوڑ دوں مگر جب کل آتی ہے تو اس کو کل پر ٹال دیتا ہوں“

صاحبو! اس کا علاج وہی ہے جو اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ بس اسی وقت ان دھندوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اگر توجہ الی الدنیا کم کرنے پر اس وقت قدرت نہیں اور ان تعلقات کو نہیں چھوڑ سکتے تو پھر صورت یہ ہے کہ اس سلسلہ کو بھی چلنے دو اور اس کے ساتھ دوسرا سلسلہ توجہ الی اللہ کا بھی شروع کر دو ان شاء اللہ تعالیٰ ناکامی نہ ہوگی۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور عمل کی توفیق عطا فرمائیں **و صلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین.**

نوٹ:۔ درمیان وعظ میں بارش آنے لگی تھی اس لئے حضرت مولانا اور اکثر سامعین باہر سے مکان کے اندرونی حصہ میں آ گئے پھر ذرا بارش کم ہوئی تو حضرت مولانا کی وجہ سے پھر باہر تشریف لے آئے۔ اس آمد و رفت کی وجہ سے ذہن مشوش ہو گیا۔ اس لئے بیان جلدی ختم فرما دیا۔ ۱۲ جامع۔

اشرف علی!
۱۴ رجب ۱۳۵۱ھ

وعظ میرٹھ

ہدیٰ ہویٰ کے متعلق یہ وعظ ۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۲ھ بعد مغرب محلہ کوٹلہ میرٹھ میں فرمایا۔ ڈھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ۙ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ؕ

ترجمہ: اور جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔

طلب اور ذریعہ

یہ آیت سورہ والنازعات کی ہے۔ اس میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے جس کو ذرا بھی اطلاع اس کو ہو جائے وہ مفتون ہو جائے۔

مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر جب ہی ہوتی ہے کہ جب اس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے۔ جو شخص کسی شے کا طالب ہو مگر اس کے اسباب حاصل نہ کرے اس کو اس شے کا طالب نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً کوئی مالدار ہونا چاہے مگر جب اس سے کہیں ان علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کر ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ کہ خرچ آمدنی سے کم رہے

تا کہ کچھ پس انداز ہو اور تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جاوے اور تمول حاصل ہو تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی کسی کے نخرے کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر پابندی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور خرچ کو محدود کر کے دل کو کیوں ماروں جتنا جی چاہے گا خرچ کروں گا اس شخص کو تمول کا طالب نہیں کہتے اس کو بوالہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں بڑھاتا تو یہ شخص جامع مسجد میں کیسے پہنچے گا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثواب کا طالب ہے؟

یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اس کے پاس آ جائے اور جب کہتے ہیں کھیتی کر زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے، کون کھیتی کرے اور سچائی کس سے ہو سکتی ہے۔ کون گھر چھوڑ کر حفاظت کے لئے جنگل میں جا کر پڑے۔ مجھے تو غلہ چاہیے یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی نہیں ہے۔

یا جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جائے گی تو کہتا ہے کہ کون بکھیڑے میں پڑے نکاح میں ایک رقم صرف کروں پھر نان ونفقہ کا مطالبہ ہو مکان چاہیے، مہر کی فکر ہو اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مول لے۔ نکاح تو کرنے کا نہیں بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں۔ یہ احمق ہی ہے اللہ میاں نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے۔ اس کو اختیار کرو اولاد بھی مل جائے گی۔

یا جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ، لقمہ کو چباؤ اور نگلو پیٹ بھر جائے گا۔ تو کہتا ہے کہ صاحب میں تو یہ کرنے کا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محض احمق ہے۔ توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تا کہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے میں آگے ان شاء اللہ ان سے کام لوں گا غرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے تو طالب ہے ورنہ بوالہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے دیکھنے اور سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر خبط ہو گیا ہے دیکھئے پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوا ہے نکاح تو کرتے نہیں اور اولاد کی دھن ہے۔ کیسا افسوس ہے وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سعی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے پس اب تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس وناکس، عالم وجاہل، بڑے اور چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے۔

اسباب اور آخرت

جب دین کا معاملہ آ پڑتا ہے تو بڑے بڑے عقلاء احمق بن جاتے ہیں وہاں مقصود کی زبانی

طلب کو ہی طلب کہنے لگتے ہیں اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب علم ہیں اور اس طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہیے کہ اس کے اولاد ہوگی (معلوم نہیں کس طرح ہوگی۔ شاید مرد کے بچہ ہوگا)

معلوم نہیں کیا بات ہے فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل ہو اور آخرت میں نہ ہو بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصد آخرت میں ہے۔ یہ بات ظاہراً مشکل معلوم ہوتی ہوگی کیونکہ ذہن نشین یہی ہو رہا ہے کہ دنیوی کام تو اختیاری ہیں اور اخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیئے ہیں۔ مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا۔ چاہے فاسق ہوں یا فاجر ہوں۔ اگر تقدیر میں جنت ہے تو جائیں ہی گے دنیا میں بھی یوں ہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کھائیں۔ اگر قسمت میں تمول اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔ بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ہی گی غلطی یہی ہے کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں یا تو دونوں کو اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھے رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھ میں آ جائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقلاء کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ باذنہ تعالیٰ ہے۔ جلانا آگ کا لگانا اثر دائمی اور متفق علیہ ہے مگر جب تک اذن نہ ہو احتراق مرتب نہیں ہو سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا۔ مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہہ دیا ٹھنڈی ہو جا کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور احتراق مرتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزو ماہیت یا لازم ماہیت ہوتا تو کیوں منفک ہوتا۔ کیا آگ آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمال صالحہ میں بھی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کوئی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا مطلب یہ ہے کہ عمل تاثیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے۔ مشیت ایزدی شرط ہے۔ (جس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخول جنت میں کچھ بھی دخل نہیں رکھتا) عمل کو وہی دخل ہے دخول جنت میں جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے لئے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخول جنت کے لئے بھی بہر حال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہو گیا

کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سبب مرتب ہوتا ہے تو اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے تو نصوص و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتب اثر یقینی ہونے کا وعدہ ہے۔ باری تعالیٰ کا اور تجربہ سے بھی کون یقینی ہے۔ سو کہیں نہیں فرمایا گیا نصوص میں کہ اسباب دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہوگا اور تجربہ واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے بسا اوقات کھیتی کرتے ہیں اور ایک دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اسباب اور اثر

یہی حال جاہ و ثروت کا ہے بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گزر جاتی ہے اور غربت ہی رہتی ہے اور کبھی بے تدبیر مالدار ہو جاتا ہے اگر آپ غور کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعات دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت میں دو آنے کی تھی آج وہ لاکھ پتی ہو گئے۔ اگر آپ کہیں کہ انہوں نے تدبیر سے اس قدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ ان کے پاس جایئے اوز اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھئے اور ان کی کل تدبیریں بھی لکھئے کہ پہلے ان کے پاس دو آنے تھے اس کا انہوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کر کے بیچا اس میں ایک آنا نفع ہوا ایک آنا میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کر دیا اگلے دن اڑھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہو گئے۔ اسی طرح راس المال بڑھتا گیا یہاں تک کہ جب تعداد آنوں سے نکل کر روپوں میں آ گئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے۔ جب ایک کافی رقم جمع ہو گئی تو جائیداد خرید لی پھر اس کی آمدنی کو بقدر ضرورت خرچ کیا اور کچھ داخل خزانہ کرتے گئے۔ یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا۔ لاکھ پتی ہو گئے۔ اس کو مفصل لکھئے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجئے اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ جیسا انہوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجئے اور پھیری کیجئے اور نفع کو شامل راس المال کرتے جایئے بعد چندے کچھ پس انداز کیجئے اور جائیداد خرید لیجئے پھر خزانہ بڑھایئے یہاں تک کہ لکھ پتی بن جایئے۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی بھی تو ان

تدبیروں سے آپ ان کے برابر نہیں ہو سکتے کیا وجہ ہے کہ تدبیر سے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کر سکتے وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم پر ہوتا ہے پس ثابت ہو گیا ہے کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ اثر مترتب نہیں فرماتے۔

میرے دعوے کا ایک جزو ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کا مترتب ہونا ضروری اور دائمی نہیں۔ رہا دوسرا جزو یعنی آخرت سو دیکھئے فرماتے ہیں۔

ومن اراد الأخرة و سعیٰ لها سعیها و هو مؤمن فاولٰئک کان سعیهم مشکوراً

یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں **نزدله فی حرثه** یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں زیادہ دیا جائے گا۔ دیکھ لیجئے وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔

میرا مدعا ثابت ہو گیا کہ اسباب دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ نہیں اور اسباب اخروی کے لئے وعدہ ہے پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی مگر پھر اکتساب ذرائع سے کوئی غفلت نہیں کرتا اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے اور آخرت میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے غفلت ہو اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ **فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین** (پس کسی شخص کو خبر نہیں وجو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے)

طلب جنت کا ذریعہ

حدیث قدسی میں فرماتے ہیں **اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر قلب بشر**[1] میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ حالانکہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث وہ چیزیں اسباب آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہاں تک سوچیں گے جمال باغ نہریں خادم ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے پھر ایک مرتبہ ایسا نکالئے کہ خیال سے بھی باہر ہو اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ

---

[1] مسند الامام ۲: ۴۳۸، الترغیب والترهیب ۴: ۵۲۱، ۵۵۷، الدر المنثور ۵: ۱۷۶

ہے کہ سبب سے اور اس سے کچھ نسبت بھی نہیں جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں اور بعض نتیجے وہاں کے وہ ہیں کہ ان کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی۔ وہ رویت الٰہی ہے غرض ترتب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو۔

لوگوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا کچھ نہیں کرتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں حالانکہ بارہا اسباب کے تخلف کو بھی مقاصد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ تو جمع کئے جائیں اور جن کو دخل ہے ان کو نہ اختیار کیا جائے کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنت کا طالب ہے اسی کو فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اس کا طالب کیسے سوتا ہے۔

اس سے اور ماسبق سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اس کے دماغ میں خلل ہے طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے اور اس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ اب تک بیان کیا گیا سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

حال وکمال

یہاں ایک بات اور قابل تحقیق ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے اولیاء اللہ میں بعض ایسے گزرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو گویا تو جنت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن ہیں۔

جیسے ایک صاحب حال کی نقل ہے (یہ قصہ حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کا ہے) کہ ایک روز غلبہ حال میں ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا۔ کہا تمام عالم کو جنت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا میرے مالک کا نام کوئی نہیں لیتا آج میں فیصلہ کئے دیتی ہوں پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کروں گی اور آگ بہشت میں لگاؤں گی۔

سو بات یہ ہے کہ یہ اقوال وحکایات اہل حال کے ہیں اور غلبہ حال سے ان کو معذور سمجھا جاوے گا۔ ہم سوالوں کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات

جذب میں کوئی کہہ جائے باقی قصداً کہنا یا اس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں اور نہ وہ اختیاری چیز ہے جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں۔ حاشا وکلا جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیاری کے ہیں پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی۔ آج کل لوگوں نے اسی کو کمال سمجھ رکھا ہے۔ جو کوئی واہی تباہی کلمات بیباکانہ بکتا ہو اس کو بڑا پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مست ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے ایسے کلمات منقول ہیں ان کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں غلبہ حال کی وجہ سے معذور تھے کوئی الزام ان پر عائد نہیں ہوتا اور رہے نقال سو وہ تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ ان کے اقوال کے دعوے کے ساتھ نقل سخت بے ہودگی ہے۔ غرض ان لوگوں کی ایک حالت معذوری کی تھی ورنہ جس چیز کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طلب فرماویں۔ **اللّٰھم انی اسالک الجنة و ماقرب الیھا من فعل او عمل**[1] (اے اللہ میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور وہ چیز جو اس جنت کے قریب کر دے قول ہو یا عمل) اس کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔

آیات واحادیث میں صاف طور پر طلب جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہل حال معذور تھے حال کی وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا۔ نقل ہی نقل رہ گئی اسی کو فرماتے ہیں مولانا۔

حرف درویشاں بدزود مرد و زن تا بہ پیش جاہلاں خواہد فزوں

"درویشوں کو الفاظ چرا کر کمینہ آدمی جاہلوں کے سامنے ان کو اپنے حرام میں پھنسانے کیلئے منتر پڑھتا ہے"

جن میں کچھ ہے نہیں وہ ان کے دعووں کی نقل کر کے جاہلوں میں بزرگ بنتے ہیں۔

مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے ادھر ادھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی لمبی باتیں کرنے لگے کیا پرواہ ہے جنت کی اور کیا خیال ہے دوزخ کا میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو۔ چار روپیہ کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کرو گے۔ ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصلی میں نقلی کی سی آب وتاب نہیں ہوتی۔ رنگ وروغن کو دیکھ کر شیفتہ ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص

---

[1] مسند الامام احمد ۱، ۱۴۷، ۱۸۳ المصنف لابن ابی شیبة ۱۰، ۲۶۳ کنز العمال ۳۷۶۴۳، ۵۰۶۲۳

نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض ناواقف ہے غرض اہل حال تو بحث سے مستثنیٰ ہی نہیں اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہ باقی رہا۔

حصول جنت کے طریقے

البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے کی دو صورتیں ہیں اور میرے نزدیک ایک تیسری صورت اور بھی ہے ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھ کر کھانے کو پینے کو، باغوں کو مکانات کو، نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں کسی کو مکانات کا شوق ہے کسی کو دل کش فضاؤں کا، کسی کو بچوں کا، کسی کو حسن و جمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا اور جنت میں سب کچھ ہے۔ تو جو چیز جس کو مرغوب ہو ملے گی۔

حدیث شریف میں ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ ایک شخص تمنا کرے گا کہ وہ کھیتی کرتا اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جائے گی بات کہنے میں ہرا بھرا کھیت، پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہیے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی ضدیں کرتا ہے اور سب پوری کی جاتی ہیں والدین جانتے ہیں کہ باولی ضدیں ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی لقاء کے لئے طلب کرتے ہیں یہ لوگ طالب در حقیقت اللہ میاں کے ہیں مگر ان کو معلوم ہوا ہے کہ رویت اور رضا خاص جنت میں ہوگی اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تا کہ مقصود اصلی حاصل ہو غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ منعم کے ہیں۔

مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بلایا جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گزرا ہو۔ وہاں تیار۔ نہریں، حوض، دلکش فضائیں، خادم، غلام غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔

بعض جانے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے جائیں گے اور بعض تازہ بتازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے وعلی ہذا۔ اور ایک جانے والے وہ ہیں کہ اس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہے یہ سن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈتے، باغ والے کے شیدائی ہیں اس وقت چونکہ محبوب

باغ میں ہے۔ اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آ جائے تو باغ کا خیال بھی ان کے ذہن میں کبھی نہ گزرے۔ باغ کی طرف جانے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوئے۔ ایک وہ کہ نفس باغ کے طالب ہیں دوسرے وہ کہ نہ انہیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔

مشہور قسمیں طالبانِ جنت کی تو یہی دو ہیں اور میرے نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے۔ وہ یہ کہ طالب تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے تذلل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلا واسطہ طالب منعم کے ہوں۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوئی طالب نعمت کا مبتدی ہے اور طالب منعم کا متوسط ہے اور طالب نعمت للعبدیت کا کہ واقع میں طالب کامل منعم کا ہے منتہی ہے اور صاحب حال بحث سے خارج ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلب جنت سے عدم طلب کا درجہ بڑھ کر ہے حالانکہ غور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے کہیں آیات و نصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدم طلب کوئی شے حسن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدم طلب والا معذور ہے سو معذوری میں فضیلت کہاں!

خلاصہ یہ کہ طالب جنت کی تین قسمیں ہو گئیں کہ یا مبتدی ہے یا متوسط یا منتہی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر ممتاز ہوتا ہے لیکن مبتدی اور منتہی کا حال بہت مشابہ ہوتا ہے مگر واقع میں زمین و آسمان کا فرق ہے مبتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے گو حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آ جانا' دھاڑیں مارنا' مغلوبوں کا کام ہے جو صاحب کمال ہے وہ حال پر نہ آنسو ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن میں حرکت پیدا کر سکتا ہے نہ حال اس کی زبان سے بے ساختہ کلمات نکلوا سکتا ہے شاہ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد　　ایں جا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نزنند

"منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے فریاد میں آ گیا اس جگہ مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے"

منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ مگر چونکہ منتہی راستہ طے کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

اسی طرح جنت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گزرا ہوا ہے۔ پھر جنت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے

حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدیت ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں اور مبتدی کی فناء میں ابھی کمی ہے اس کا التفات مزہ کی طرف ہنوز باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز کی طلب کا حکم ہوتا ہے مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اس صورت میں مبتدی کے پیر اکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے اس کی لغزش کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ مزہ کا طالب ہی نہیں جس کے رہنے نہ رہنے پر اس کی طلب کا دارومدار ہو چونکہ طلب کا حکم پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔ فلیتنا فس المتنافسون (اور حرص کرنیوالوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے) امر کا صیغہ ہے۔ یہ شخص زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

جب ادھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔ مطیع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے جیسے کسی کو شراب پلا دیں (شراب دو ہیں حلال اور حرام) شراب محبت حلال ہے۔ شراب پی کر آدمی سب طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جو بندہ ہے وہ امتثال امر میں مخمور ہو جاتا ہے۔

محویت اور بے خودی

یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بے خودی نہیں ہے بعض ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت ہو جائے تو رکوع وسجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی یکسوئی کے ہیں۔ صرف باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریق احسن ہوگی رکوع وسجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تباہی کلمات زبان سے نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعویٰ کے ساتھ حکم لگا دیا کریں۔ اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو منہ سے نکل گیا۔ پورا ہو کر رہتا ہے۔ یہ مسلم سہی کہ دعا قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور دعویٰ سے حکم لگا دینا۔ انہیں سے ہو سکتا ہے جو بے خود ہیں۔ یہ محویت محمود نہیں محویت محمود میں حق سبحانہ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے اور جتنا جس کو قرب ہوتا ہے اتنا ہی عظمت کا حق اس پر ظہور ہوتا ہے اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل جاتا ہے پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو اس کی نسبت کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جہاں چاہے بے دھڑک قدم اٹھا بیٹھے گا۔

بادشاہ کے دو بچے ہیں ایک ناسمجھ اور ایک سمجھدار۔ ناسمجھ تو جب آتا ہے سیدھا گود میں جگہ لیتا ہے۔ نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ اراکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا ادب نہ شاہی پوشاک کا خیال۔ پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر چڑھ بیٹھے۔ اور ہوشیار بچہ جب آتا ہے تو نیچی نگاہ کئے ہوئے۔ چہرہ پر

ارا کین کا لحاظ ظاہر۔ مجلس کا رعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ کر حاضری کی اجازت مانگ کر مودب کھڑا ہوتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سمجھدار کی عظمت شاہی کی خبر ہے اور ناسمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناسمجھ بچہ بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے۔ کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور الٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں! قرب زوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھدار کو۔ اگرچہ سمجھدار گود میں نہیں ہے اور کسی قدر فصل سے کھڑا ہے میلے پیروں سے کپڑوں پر جا چڑھنا اور الٹی سیدھی ضدیں کرنا گستاخی ہے باعث فضیلت نہیں۔ زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ، نہ بہشت نہ اس کا خوف ہے نہ اس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کامل نہیں ہیں ان پر ابھی عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرات ہے کہ قرب کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔

دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عالی شان محبوب کی طرف جانا چاہتا ہے تو اول تو برسیں چاہئے۔ اس کوشش کے لئے کہ کسی راستہ کے موانع رفع ہوں۔ دربان و چوبدار وغیرہ سے ساز: د جائے تب توقع کی جائے کہ ان کی درخواست محبوب تک پہنچ سکے گی اور پھر قسمت کی یادری سے محبوب نے بہت ہی لطف فرمایا کہ حاضری کی اجازت دے دی۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت ان کی بڑی سی بڑی آرزو کیا ہو گی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جائے گا کہ مجھے محبوب بنا لیں۔ بڑا حوصلہ یہ ہو گا کہ چوکھٹ کو بوسہ دینے کی اجازت مل جائے۔ اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں کرتا حتیٰ کہ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو پیروں میں رعشہ پڑ جائے گا۔ سو منتہی اسالک الجنۃ کہے گا نہ اس واسطہ کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا ہے مگر اس سے بڑھ کر حوصلہ اپنی ذلت اور ان کی عظمت کو دیکھ کر نہیں کر سکتا۔

مبتدی اور منتہی کا فرق

معلوم ہو گیا ہو گا کہ طالب تین قسم کے ہیں مبتدی یعنی طالب جنت کے حظ کے لئے اور منتہی یعنی طالب جنت عظمت محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال۔ مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ حال سے مغلوب ہوتا ہے گو ایسا مغلوب نہ ہو کہ حد

شرع کی حفاظت نہ کر سکے کیونکہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا بحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا بات پر رونے لگتا ہے۔ ذرا بات پر وجد آ جاتا ہے۔ زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آ جائے اور حال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کر سکے۔ ایسے شخص کو پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہیے۔ اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیاء کو تو لوگوں نے پہچان لیا اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے۔ **قالوا ان انتم الابشر مثلنا** (انہوں نے کہا تم تو ہماری مثل بشر ہو) متوسط اولیاء میں تو جوش وخروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسے از سرحق آگاہ شد
گفت اینک مابشر ایشاں بشر — ما وایشاں بستہ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایشاں از عمے — درمیاں فرقے بود بے منتہا
ایں خود گردد پلیدی زوجدا — واں خورد گردد و ہمہ نور خدا
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

”تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انہوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں۔ اور کہنے لگے کہ ہم بھی انسان وہ بھی انسان وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں۔ ان بے وقوفوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے۔ یعنی ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی وبخل وحسد پیدا ہوتا ہے دوسرا کھاتا ہے تو اس سے تمام تر نور خدا یعنی عشق الٰہی پیدا ہوتا ہے۔ بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر خیال مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہے“

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچانے جائیں۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغناء ہوتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو گیا گر بھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ ٹھگ البتہ کمالات دکھاتے پھرتے ہیں۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعبدے ہی ہوتے ہیں۔ جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا

نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے۔ قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم   گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی ان کی باتیں نہ سننے دوں۔

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے۔ میرا کان آپ کی بات سنے یہ لوگ امتثال امر میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی ان کو پہچانے یا نہ پہچانے کچھ پرواہ نہیں۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور رضا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہئے جب کہیں خاموش رہو خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا تو بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا بھی طاعت ہے اس وقت اخفاء اتباع نفس ہے۔ اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہوگی جو پہلے اخفاء میں تھی۔

غرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا نہ اخفاء میں نہ اظہار میں بس فنا ہوتا ہے تعمیل حکم میں۔ اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ اب تک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا امتثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا مگر حکم ہے اس لئے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے۔ مبتدی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی طلب میں دونوں شریک ہیں اور کسی بات سے حالت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر فرق کیا جائے تو کس طرح۔ مولانا فرماتے ہیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

"ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہئے"

مبتدی اور منتہی میں فرق بڑا مشکل ہے۔

طلب جنت کا گر

بالجملہ طالبوں کی تین قسمیں ہوئیں اور جنت مطلوب بہر حال ٹھہری اور اس کی طلب ماموربہ اور فرض ہے۔ اب وہ مقدمہ بھی یاد ہوگا کہ ذریعہ کا اکتساب ضروری ہوا۔ جنت جب ہر شخص کی مطلوب ہے تو اس کے ذرائع کی طلب بھی ہر ایک کے ذمہ ہے ورنہ وہی بوالہوسی ہوگی۔

اس ذریعہ اور طریق کو فرماتے ہیں۔

واما من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماوی

(اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا پس جنت اس کا ٹھکانا ہے)

سبحان اللہ! **کلام الملوک ملوک الکلام** (بادشاہوں کا کلام کلام کا بادشاہ ہوتا ہے) جنت اتنی بڑی چیز اس کا طلب خلاصہ فرما دیا تا کہ طالبوں کو آسانی ہو۔ اتنے بڑے مطلوب کے لئے جس قدر ذرائع اور طرق ہوتے کم تھے مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات بتا دی جیسے گر ہوتا ہے۔ گر اس لئے ہوا کرتا ہے کہ کثیر التعداد افراد کو جن کو بالاستقلال ایک ایک کو یاد رکھنا دشوار ہو اس کے ذریعہ سے یاد رکھیں۔ جیسے کوئی خادم کو محفل کے دروازہ پر بٹھا دے اس غرض سے کہ غیر آدمیوں کو اندر نہ آنے دے تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ زید عمرو بکر خالد وغیرہ ایک سو نام اس کو بتا دیئے جائیں کہ ان میں سے جو کوئی آئے منع کرنا۔ اس میں کس قدر دقت تو خادم کو پیش آئے گی کہ ایک فہرست بنائے گا۔ جس میں یہ سب نام درج ہوں اور ہر آنے والے سے نام پوچھ کر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کرے گا کہ یہ نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست دیکھنی پڑے گی۔ نیز کس قدر دقت آنے والوں کو ہوگی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اسی میں ہے کہ مختصری بات بتا دی جاوے کہ جس کو تو پہچانتا ہو اس کو آنے دینا۔ اس سے نہ فہرست کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور دقت پیش آئے گی اسی کو گر کہتے ہیں۔

جنت کے حصول کیلئے بہت سے طریق ہیں جن کا فرداً فرداً یاد رکھنا نہایت دشوار تھا۔ اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتا دیا کہ جب اس کی رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جاوے گا وہ وہی ہوگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کی آتی ہے جو طالب ہے جب کسی کے جنت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہوگا اور جب بتایا جاوے کہ اس کی طلب کے فلاں فلاں طریق ہیں اور چونکہ جنت بڑی چیز ہے اس کے طرق بھی کثیر ہی ہوں گے۔ ان کی کثرت کو دیکھ کر یہ شخص گھبرا اٹھے گا مگر چونکہ شوق انتہا درجہ کا پیدا ہو چکا ہے اس لئے یہ تو ہوگا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک حالت سخت اضطراب کی پیدا ہوگی۔ اس شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو تو ہر کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ اس کی کیا حالت ہوگی۔ وجد

کی سی کیفیت ہوجائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ کیا چیز ہے۔ اس گر کو فرماتے ہیں۔

واما من خاف مقام ربه و نهى النفس عن الهوىٰ

(اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا)

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا **ونهى النفس عن الهوىٰ** (اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا)

الف لام عوض مضاف الیہ ہے ای **عن هواها** نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں۔ اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ گر میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہوگئی جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کیساتھ کریگا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر برے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے بچ جائیگا۔

افراط خوف اور کفر

آپ نے جان لیا کہ طرق طلب جنت کا حاصل دو امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل ہے اور دوسرا معین یا دونوں اصل ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نہی النفس ہے اور خوف اس کے لئے معین ہے میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اس حدیث سے کہ **نسالک من خشیتک ماتحول به بيننا و بين معاصيک**[1] دعا مانگتے ہیں رسول اللہ کہ اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اس سے ہم میں اور معصیت میں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے۔ بالذات مقصود نہیں ورنہ **نسالک خشیتک** (ہم تیرا خوف مانگتے ہیں) مطلقاً فرماتے کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرما دی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں۔ خوف مع

---

[1] لم اجد الحديث في "موسوعة اطراف الحديث"

الرجاء یہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجا نہ رہے اور ناامیدی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے اس سے معصیت چھوٹتی نہیں بلکہ آدمی یہ سمجھ کر طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑ جاتا ہے میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اس میں یہ مصلحت ہے۔

ایک وکیل صاحب تھے نماز روزہ کے خوب پابند تھے خوف غالب ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہو گئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی۔ قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں اور یہ سب کچھ ہوا تھا ایک کتاب کو دیکھ کر۔

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ خرابی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے نخرے کون اٹھائے۔ عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا دقت ہے۔ کیونکہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگر یہی بات ہے تو ہر شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے۔

جائے استاد خالی است "استاد کی جگہ خالی ہے"

وجہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں لکھی جا سکتیں۔ ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب و فصول اسی لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھ دی جائیں تو کتاب کی ترتیب میں فرق آ جائے اور ڈھونڈنے والوں کو بڑی دقت پیش آئے کوئی خاص مضمون کہاں تلاش کریں مثلاً نماز و روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب کیف ما اتفق جمع کر دیئے جائیں تو کس قدر دقت ہو جائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ کی ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم و فنون میں یہی حالت ہے کہ کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جا سکتے۔ تو بطور خود کتاب دیکھنے والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ اس کو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال جم جاتا ہے اور بسا اوقات یہ خیال ہو جاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے مصنف خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا قصور ہے۔ جو شبہ ذہن میں آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب میں اس باب میں اس کا حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہے۔ متعلم کے شبہ کرنے سے یا از خود سمجھا ہر موقع پر اس کی ضروریات کو بتایا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاص کر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں تو یہ ہے۔ بہت سے بہت بطور خود دیکھنے سے وہ فن

نہ آئے گا اور تصوف میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان جاتا رہے۔

گر روی صد سال در راه طلب　راهبر نبود چه حاصل زاں تعب
گر ہوائے ایں سفر داری دلا　دامن رہبر بگیر و پس برآ
در ارادت باش صادق اے فرید　تابیابی گنج عرفاں را کلید
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　عمر بگذشت او نہ شد آگاہ عشق

اگر راہ طلب میں سو سال تک بلا رہبر کامل کے چلے گا تو تعب ومشقت کے سوا تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اے دل اگر اس محبت کے سفر طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو کسی رہبر کامل کا دامن مضبوط پکڑے چلا آ اے فرید حسن عقیدت اور ارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑ تا کہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے بلا مرشد کے طریق عشق میں جس نے قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔

ان وکیل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھ تھا اور ایک مقام کو نا تمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بیٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے اور نیند اڑ گئی مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ آج کل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھ کر کسی واقف کار سے ان کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں حکم لگا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان بزرگوں سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور واہی تباہی کلمات بکنے لگتے ہیں یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھ کر خراب ہوتے ہیں میرے پاس آئے کہ کچھ امید نہیں کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی تمام عمر کوشش کرے اور دنیا کو تج کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر سچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے زبان لڑکھڑاتی تھی۔ کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی۔ جیسے کسی کو پھانسی کا حکم سنا دیا جائے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زائد غلبہ خوف اچھی چیز نہیں ہے۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے۔ بحمد اللہ! ان کے سب شبہے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا لیا۔ جانے کیا ہوتا میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔ لکھا کتاب ہی میں سب کچھ ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ لکھنے والوں نے حتی الامکان سہولت اس قدر کر دی ہے کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کرا دیئے ہیں لیکن پھر بھی استاد کی ضرورت باقی ہے۔

خوف محمود

اس سے بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ انکشاف بھی مضر ہو جاتا ہے جیسا

ان وکیل صاحب پر استغناء حق زیادہ متجلی ہوا اور یہ حالت ہوگئی۔ اسی واسطے بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ جیسے تجلی رحمت ہے استتار بھی رحمت ہے واللہ! اگر تجلی تام ہو جائے تو فنائے عالم ہو جائے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وجہ کیا تھی صرف غلبہ خوف اس واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **من خشیتک ماتحول به بیننا و بین معاصیک** صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہوا تنا نہیں چاہتے کہ ہم متحمل نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت سے روکے اور جو خوف خود باعث معصیت ہو جائے وہ معصیت کی طرح برا ہے۔

اسی واسطے لکھا ہے کہ بڑھاپے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف بوڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر اور خوف غالب ہو جائے گا تو رہے سہے بھی ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور امید میں کچھ نہ کچھ کر ہی جائے گا اور جوانی میں قوت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہو سکتا ہے جتنا خوف زیادہ ہوگا نفس کو تنبیہ ہوگی۔ معصیت سے اجتناب ہوگا اور اعمال حسنہ کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جداگانہ ہے۔ باطن طب بھی ظاہری طب کی طرح ہے۔ کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم۔ کبھی تنقید کرنا پڑتا ہے کبھی تقویت۔ اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہو گیا ہوگا کہ خوف معین ہے اور ترک خواہشات اصل اب صاف ہے کہ **خاف مقام ربه** ذریعہ ہے اور مقصود نہی النفس ہے ذریعہ اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچائے اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ مقصود تک پہنچائے اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ مقصود فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ رہا خوف اسی قدر چاہئے کہ نفس کو تنبیہ ہو پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس گر کا۔

ضرورت غور و فکر

اب دیکھو کہ نوکر کو یہ بتا دینا کہ ناشناسا کو اندر نہ آنے دینا کہنے میں ذرا سا ہے کرنے میں بہت ہے جو کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے۔ بلکہ فہرست میں تو افراد محدود ہو جاتے۔ اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع نہ کر سکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور کسی تعداد تک ناشناساؤں کی حد نہ رہی اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گر بتا دیا کہ اگر سوچے تو وہی ہو جائے ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں۔ دیکھئے نافرمانی ہوتی کیوں ہے۔

مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کر کے پڑھی یا بے توجہی ہوئی۔ حضور قلب کے ساتھ ادا نہ ہوئی۔ اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہش نفسانی کے ہوگا فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آ رہی تھی عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا۔ سو کر صبح کر دی۔ آرام اور تن پروری خواہش نفسانی ہی ہے تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کسی کام میں لگا ہوا ہو اس کام کے آدھ بیچ میں رہ جانے سے نقصان مال کا اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کر دی۔ یہ حب مال ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جبھی ہوگی کہ جب توجہ دوسری طرف ہو۔ توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نفس ہی کا کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔

غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا ارتکاب معصیت تو صرف نفسانی خواہش سے۔ اس کے اندر بھی کچھ آ گیا۔ ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں۔ جب اس پر کوئی محافظت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ تھوڑے دنوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجئے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ضرور ایک فرد معصیت کا ہے پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جائے اور اس کی مضرت کو پیش نظر رکھئے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مضرتیں ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔

مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو خبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہوگی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے نفع تو کوئی مرتب نہ ہوگا مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے جیسے کسی سے بدلہ لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس کے سامنے مضرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سننے میں مزہ آتا ہے بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی رفع الزام کے لئے کہہ دیا 'میاں جانے دو اور پھر رغبت کے ساتھ سن رہے ہیں' دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں۔ بہت احتیاط کرتا ہوں۔ دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں (قانونی برتاؤ اللہ میاں سے) جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے۔

کار ہا او راست باید داشتن　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

''اس خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھنا چاہئے اور اخلاص وصدق کا علم بلند رکھنا چاہئے''

فریب نفس اور اتباع نفس

فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے تو کیسے لڑنے

لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں اس وقت یہ نہ ہوگا کہ ایک دفعہ اسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں حضرت اس منع سے براءت نہیں ہوتی۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو ان کے دل میں اشتیاق وانتظار رہتا ہے ظاہراً غیبت نہ کی سہی' ظاہر بینوں کی نگاہ میں پرہیزگار بن جائیں مگر باطن میں تو یہ مرض موجود ہے۔ نفس نے جو خواہش کی تھی اس کا ظاہر تک اثر نہ آیا سہی قلب میں تو اس سے التذاذ اور اس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے۔ یہی اتباع نفس ہے غرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہوگی۔ جہاں تک خواہش نفسانی پائی جائے۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے۔ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ جب کوئی معصیت ہوگی خواہش نفسانی سے۔ برائی باوجودیکہ ظاہر مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوش مند آ جاتے ہیں۔ کوئی چیز رشوت میں مثلاً ملنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام تجھے کرنے ہیں ان کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے اور تجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہئے۔ پھر اللہ میاں کریم ہیں یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں گی اور پھر توبہ سے گناہ بھی نہ رہے گا۔ کیسی اچھی بات ہے۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس جال میں پھانستا ہے۔ اور اس تاویل کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے کہ جب دل میں خوف ہوتا ہے ورنہ تاویل کی بھی کون سی ضرورت ہے اور اتنی دیر کب گوارا ہے گردن پکڑ کر حکم دے دیا کہ رقم ہرگز نہ جانے پائے بس اس کی تعمیل ہوگئی۔ ہاں جن کو محتاط پاتا ہے ان کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں پیدا کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کو پورا کرنا ہے۔ حالانکہ یہ اسراف ہے مگر ضرورتیں ایسی تراش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے آج کل کے عقلمند اس مرض میں مبتلا ہیں۔

مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سنائی کہ لڑکا نائب تحصیلدار ہو گیا میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے اب ذرا صاحبزادہ کو یہ تنبیہ کیجئے کہ اسراف نہ کریں کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آ کر بیٹھیں اور میز کرسی لیمپ وغیرہ گھٹیا رکھے ہوں یا مکان شاندار نہ ہو۔

اسراف اور فیشن

یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت دو قسم کی ہوتی ہے ایک واقعی اور ایک فرضی واقعی ضرورت کی تو انتہاء ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہاء نہیں۔ ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہاء گنجائش ہے فرض میں محالات تک بھی آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہاء نہیں تو

اس کے رفع کے لئے کون سی رقم کافی ہوسکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی متناہی ہوگی۔ پھر متناہی لامتناہی کے برابر کیسے ہوسکتی ہے۔ اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال اخروی تو آخرت میں ہوگا مگر دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہوگئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائیداد اور مال ومتاع سب اس کی نذر کردیا اور پھر بھی پورا نہ ہوا قرض لے کر بمشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض کے بعد چندے۔ آبرو بھی گئی۔ ذرا ساختنہ ہے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہئے خواہ رشوت لے کر ہو یہ سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر۔ ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جائے یہ سب فرضی ضرورتیں ہیں۔ بیوی کے کان میں پانچ سو کا زیور ہو خواہ میاں کی اوقات دو ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو۔ کہیں سے پانچ سو لاؤ تب منہ دکھاؤ۔ میز کرسی پوشاک سب قاعدے ہوں ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی انہیں چھوٹا کہہ دے حضرت بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہوگا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپیہ کی ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا یہ ضرورت نہیں صرف فیشن ہے۔

لطف یہ ہے کہ علماء رسموں کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ ان کے شریک ہوجاتے ہیں اور بڑے شکر گزار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کرتے ہیں کہ فضولیات کو چھڑاتے ہیں کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لادلیا جائے جس سے کان کٹ پڑیں۔ یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جائے جس سے راس المال محفوظ رہے اور چار پیسے اور ملنے لگیں تجارت کی جائے یا جائیداد خرید لی جائے شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں اس روپیہ سے لڑکی کے لئے کوئی صورت بسر اوقات کی کیوں نہ کردی جائے۔ آتش بازی وغیرہ سے ذرا سی دیر کا حظ نفس نہ ہوا نہ سہی غرض علماء کی تائید کرتے ہیں البتہ پرانی وضع کے لوگوں کو ضرور شاق ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو جب ترک دین آسان ہوا تو رسم دنیا کیا۔ یہ لوگ ساتھ دیتے ہیں اور بھولے سیدھے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ یہ بھی علماء کے ہم خیال ہیں۔ بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔ چوری ان کی پکڑی گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاح میز وکرسی کے لئے نہ اس کے لئے کہ اسراف نہ ہو یا روپیہ کسی منفعت کے کام لگے۔ بلکہ اس لئے کہ ادھر سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں میز وکرسی سے کمرہ سجائیں۔ ہارمونیم باجا منگائیں کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا۔ بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو۔ سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں اپنے گھر میں سب طرح بسر ہوسکتی ہے بہت کرو کہیں جانے کے لئے ایک اجلا جوڑا بنالو زیور جو کچھ میکہ سے لائی ہو وہی کیا تھوڑا ہے۔ بہت ہوس اچھی نہیں ہوتی۔ سادگی کے بھی خلاف ہے۔

ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کماتے کماتے مرے جاتے ہیں اور تمہیں ذرا خیال نہیں۔ جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں بچتا خرچ میں کمی نہیں کرتی بیوی نے کہا' میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ نہیں آتی۔ کوئی چیز ضرورت سے زائد نہیں منگاتی۔ کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی۔ جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں۔ اور کون سے خرچ میں کمی ہو سکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا ہی رکھا ہے۔ اگر ماہانہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک بچے یا نہیں۔ ہم ایک چکی خرید دیں خود پیس لیا کرو اور روز کی پسنہاریوں کی دقت نہ رہے اور پسائی کے دام بچیں اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے گھر کی لیپ پوت بھی خود کر لیا کرو۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ ان سب ترکیبوں سے ایک کافی رقم بچ سکتی ہے۔ تھوڑا ہی تھوڑا کر کے بہت ہو جاتا ہے مگر جب تمہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مدوں میں تخفیف کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ وہی بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے۔ ہر طرح بسر کر سکتی ہے مگر تمہاری کسی مد میں ذرہ بھر کمی نہ ہو۔ کمرہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے رہیں۔ نازک چیز ہے شاید کوئی ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود رہے اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہو جائے تو پہلے خریدے ہوئے سب ردی ہیں اب نئے طرز کے خریدنے چاہئیں وعلیٰ ہذا۔

بیوی کے لئے تو زیور بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو **ترکت اللات و العزیٰ جمیعا** (میں نے لذت اور عزیٰ سب کو چھوڑ دیا) یہ سب فضولیات ہیں جن کو نفس ضروری بتا کر طلب کرتا ہے ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روا رکھتی ہے کہ اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ دے دیا جاوے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر ہو چکی۔ اسراف کے نتائج آپ نے دیکھ ہی لئے۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں شیطان اور نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اس نے کہہ دیا بے دھڑک کر ڈالا خواہ اللہ کے خلاف یا رسول کے۔

احسانات اور کفرانِ نعمت

مسلمانو! کیا جواب ہوگا اگر پوچھا جائے گا **الم اعھد الیکم یا بنی آدم ان لا تعبدوا**

الشیطان انہ لکم عدو مبین و ان اعبدونی ھذا صراط مستقیم ولقد اضل منکم جبلاً کثیراً افلم تکونوا تعقلون ھذہ جھنم التی کنتم توعدون پوچھیں گے اے بنی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے گمراہ کر دیا تھا کیا تمہیں عقل نہ تھی اب یہ جہنم موجود ہے۔

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا تھوڑا ہے کہ کہا جائے کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے۔ ہم سے تعلق قطع کر کے باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان تھے اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو قاعدہ مسلمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس کیا جاتا ہے۔ جس قدر اس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر اس طرف سے کفران نعمت ہوتا ہے۔ جس قدر ادھر سے ساتھ دیا جاتا ہے اسی قدر ادھر سے قطع کیا جاتا ہے اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی ہوتی ہے۔ دشمن نے جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے اور اللہ میاں نے جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حضرت یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالیٰ سے بعد بڑھتا ہے اور غفلت پیدا ہوتی ہے۔

عاقبت سازد ترا از دیں بری   ایں تن آرائی و ایں تن پروری
باہوا و آرزو کم باش و دست   چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست
تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست   چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

تیری تن آرائی اور تن پروری تجھ کو دین سے دور کر دے گی آرزو اور ہوائے نفسانی کا پیرو مت بن چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ تجھ کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہکا دیتی ہے جب تک تو خواہش کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے مانند ہوا کے سوائے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے۔

دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں۔ ارایت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ اس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہش نفسانی کو بنایا۔ ہم کو چھوڑ کر اپنے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سنا۔ اور نفس نے اندر سے ایک شرہ چھوڑ دیا کہ افعل ھکذا۔ بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی۔ جو حکم ہوا فوراً تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں بھی ہر ہر بات کی علت ڈھونڈی جاتی ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح

ضرور ہیں مگر ہر شخص کی عقل نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں پھر ہم کو علت نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب دلیل صحیح ثابت ہو گیا عمل کرلیا۔ کبھی اس میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا۔ بس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پر ہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے (خلاف شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے یعنی وہ عمل جس میں خروج عن الاسلام ہی لازم آجائے) اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں ان کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں۔ ان کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوائے نفس ہی ہے اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر حجتیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ اتنی حجت تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے اور پھر مصلحت میں غور کرلیا کریں۔ کہ واقعی ہے یا فرضی تب بھی تو بہت سی برائیوں سے حفاظت ہو جائے۔ مگر کہاں اس کے تو ہاتھ میں ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھہر ٹھہرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گرائے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی اس کو نہ کیا اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اس کو کر ڈالا۔

ایک تاجر سے کوئی سو کا مال پچیس اوپر سو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہاں جہاں پچیس اور کم ملے نہ معلوم اول خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے اس کا اتنا خیال کہ پچیس زیادہ دیتا ہے گویا اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے پلے پڑ رہے اور ان کو ایسی ضد کہ اپنا مال پھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمہاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ افسوس!

معصیت کی دنیاوی مضرتیں

خواہش نفسانی وہ بری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صدہا مصیبتیں ہیں۔ کہ ان میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ میاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب مودی الی المسبب بہت کم ہوتے ہیں ہر کام میں پریشان رہتا ہے بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے اس کے برعکس اس

کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔

ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے آپ کہیں گے کہ ہم پر تو تنگی نہیں میں کہتا ہوں کہ رزق سے مقصود کیا ہے۔ اطمینان! یہ معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ اطمینان فراغ قلب کا نام ہے ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو تھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے وجدانی سی بات ہے۔

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　گفتم کہ چو ما شوی بدانی

"ایک شخص نے پوچھا عاشق کس کو کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ جب ہماری طرح ہو جاؤ گے تو تجھ کو معلوم ہو گا کہ عاشقی کیا ہے"

عنین محض کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز نہ سمجھے گا اور الٹا تمہیں کو بے وقوف بنائے گا۔ اگر اس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اس کا علاج کرو۔ جب قوت رجولیت پیدا ہو جائے گی آپ بے وقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا۔ معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو۔ دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے اور اس تک پہنچ جانا اور اس کو پالینا ضروری نہیں اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں ادھر سے ذرا سی کوشش چاہیے ادھر سے خود کرم فرماتے ہیں غیر اللہ کی طلب پر چونکہ نتیجہ کا ترتب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مترتب ہو جاتا ہے اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اس کی لذت وہی جانتا ہے جو پاتا ہے۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش　　آزمودن را یک زمانے خاک باش
ارے غافل پتھر تو برسوں رہا ہے　　امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھ

پھر تو پتھر ہونے کا نام بھی نہ لے گا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتیرے خاک ہو گئے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں جبھی تک وہ علیحدہ ہے جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ دوڑ دوڑ کر لپٹتی ہے کر کے دیکھو۔ امتحاناً ہی سہی۔

طاعت کا اثر

میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر دھبے تو ضرور ہی پڑ جائیں گے تجربہ ہوا ہے کہ لوگوں کو دھوکے سے طاعت ہو گئی اور اثر ہو گیا۔

قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر عاشق تھا ایک روز کہیں چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی شادی کی نسبت گفتگو تھی بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد اور متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا۔ وہاں آ کر ایک مسجد میں جا بیٹھے اور دن رات عبادت کرنا شروع کی۔ تہجد بھی' اشراق بھی' چاشت بھی' غرض عبادت ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے ہیں۔ رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہو گئی۔ ادھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیزگار کون ہے ان مخبروں نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں ان سے زیادہ متقی و پرہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص وزیر کو ان کے پاس پیغام دے کر بھیجا۔ اور یہاں کام ہو چکا تھا۔ انہوں نے التفات بھی نہ کیا۔ خیر وزیر نے نہایت ادب سے پیغام شاہی سنایا کہ دراصل نیت تو میری فاسد تھی اس غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا۔ اب مجھے نہ آپ کی بیٹی کی ضرورت ہے نہ آپ کے جاہ و حشم کی بس تشریف لے جایئے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گو اس میں غرض صالح نہ ہو۔ مگر انجام کار اسی سے درستی ہو جاتی ہے دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اغراض فاسد سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہو جاتا ہے ایسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ بعض لوگ غافل نادان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہیے ان لوگوں نے پیشہ کر لیا ہے ان کے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے پھریں۔ کوئی کہتا ہے کہ میرے ذمہ اتنا قرضہ تھا۔ مسلمان لوگ مل کر ادا کر دیں کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے مسلمان لے دیں اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔

مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام کریں تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو خواہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ہی ہو یا موروثی شیطان بھی ہو تو پرواہ نہیں ہے۔

ریا اور عبادت

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طمع سے ہوتا ہے۔ مال کی طمع ہو یا اور کسی چیز کی۔ مگر اسلام وہ چیز ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے۔

تعلمت العلم بغیر اللہ فابی العلم الاان یکون للہ میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ کے لئے مگر علم نے خود نہ مانا اللہ ہی کا ہو کر رہا۔

آگ جلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائے گی آگ میں یہ اثر کہ لکڑی خود گھس جاتی ہے آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا' دیکھئے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے کہا تو دکھلاوے کا بھی نہیں کرتا۔ وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے کبھی نہ کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے تھے عبادت اول ریا ہوتی ہے چند روز میں عبادت ہو جاتی ہے پھر عبادت اور اخلاص اور واقعی یہ بات بالکل صحیح ہے دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے پھر سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی ہے بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی وقت ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا بے وضو ہی اڑا دیتے ہیں۔ یہ ریاکاری ہے پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچ کر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے اور جیسا کہ اور امور ضروری کا تقاضا ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے۔ تاوقتیکہ ادا نہ کر لی جائے طبیعت پر بار رہتا ہے اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زائد سے زائد تاخیر کی نوبت آتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ قضا کریں یہ مرتبہ عادت کا ہے اس کے بعد تو بحمد اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز چین ہی نہیں پڑتا۔ یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

غرض عبادت ابتداء کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلباء کو دیکھا کہ اول ان کی نیت اچھی نہیں ہوتی مگر

فورغ ہوتے ہی مخلص بن جاتے ہیں بالکل حالت پلٹ جاتی ہے وجہ یہی ہے کہ اول اگرچہ نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کر لیتی ہے۔

یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتدائی حالت دیکھ کر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل مہمل ہوتے ہیں۔ دنیا سے تو ناآشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔

معصیت اور مضرت

میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو۔ پڑھتے رہو۔ انہیں میں مقتدا لوگ ہوں گے اور انہیں میں غزالی وقت بھی ہوں گے طالب علموں سے اگر ذرا سا قصور ہو جائے تو تمام شہر میں سن لیجئے اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا۔ کس قدر مغائرت اس لفظ سے ٹپکتی ہے آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا یہ تمہارے دین کے حامل ہیں۔ ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔

اگر آپ کا بچہ بازار میں کسی سے لڑ آئے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو جائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ اگر لڑائی کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف تو خیال بھی نہ ہوگا۔ اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا۔ اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے پھر اس غصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی میں بچہ کو فہمائش کریں گے کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا (یہ بھی جب ہے کہ آپ بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ ملامت وغیرہ نہ ہوگی) اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کو بے قصور کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہہ دیں گے کچھ نہیں بازار میں ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ لڑکا تیز مزاج ہے دبتا کسی سے ہے نہیں بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے اس کی بدنامی اپنی بدنامی ہے بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے تعلق رکھا ہوتا۔ اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبایا ہوتا۔ بچہ کی بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی۔ طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیوں کر ہو میں کہتا ہوں اپنی طبیعت سے ہی انصاف کر لو جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں۔

فرض کرلو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ باوجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور بد سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان پر دھبہ آجائے ننگ و ناموس کو بٹہ لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں کیا اس سے بالکل قطع تعلق کر دیتے ہیں قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کر دے تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ موت سے بدتر ہے باوجود قطع کے تمام عمر یہی چاہتے ہیں کہ کاش یہ احمق اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے ان سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے جرم پر تو کیا ایک چھوٹے سے قصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمدللہ وھوالمقصود اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے۔ ایک کے قصور پر آپ سب کو بدنام کرتے ہیں کیا آپ کے سب بچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں یا بچپن ہی سے آپ کے بچے تمیزدار ہوتے ہیں ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھدار بھی تو ہیں آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالی وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر ان پر اعتراض نہ کرو ہر طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہیے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کر لیتی ہے۔ اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دینی اور دنیاوی دونوں نفع ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراغ قلب ہوتا ہے۔ اور برعکس اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا اس کے علاوہ اور بھی مضرتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں۔

ایمانداری کی مثال

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی ہے اور معصیت سے مضرت اور یہ تو لازمی مضرتیں ہیں۔ اکثر مضرتیں متعدی ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا تو دوسرے کو خبر پہنچے ہی گی پھر وہ کیوں نہ کرے گا بلکہ اس سے زیادہ کرے گا اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہوگی پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دو میں پڑ جاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہو جاتی ہے۔ اٹھنے میں بیٹھنے میں سونے میں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جا

رہی ہیں یہ کیا نماز ہوئی شغل قلب ہوا اور کا ہے سے حرام چیز ہے۔ منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت سے آلودہ ہے دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہ حلال تھیں یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوئی اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کر لیتی ہے اور صرف ایک کام رہ جاتا ہے مضرت رسانی آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اظہر من الشمس ہے یہ اتحاد کا ضد ہے جتنی چیز دینوی و دینی اتحاد میں ہے اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے یہ سب کا ہے سے ہوا صرف ذرا سی غیبت سے یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی یہ بھی خواہش نفسانی کا ایک فرد ہے۔

خواہش نفسانی کی ایک اور خرابی سنئے میرا اور آپ کا جائیداد پر مقدمہ ہے ہر شخص کی خواہش ہوئی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے۔ بس لڑائی ہو گئی اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے تو طول کا ہے کو کھنچتا مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے (امم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوئے ہیں' ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا' مشتری نے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا۔ وہ گھڑا لے کر بائع کے پاس آیا کہ لو اپنا گھڑا لے لو۔ تمہارے مکان میں سے نکلا ہے اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا میرا اس میں کیا ہے اس نے کہا کہ میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے اس پر عقد ٹھہرا ہے یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لے لوں۔ ایمانداری اسے کہتے ہیں اگر آج کل گھڑا نکل آئے تو مزہ آ جائے۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں سن لیا تھا کہ شب براءت میں جو کچھ دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے شب براءت کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلا لے کر بیٹھے اور اس پر ایک رومال ڈھانک دیا اور دعا مانگنی شروع کی کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہو جائے تمام رات جاگے اور اسی دعا میں رہے جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہو جائے گا۔ بمشکل صبح پکڑی اور جلدی سے اس کو کھولا دیکھا تو وہی مٹی ساری آرزوئیں خاک ہو گئیں اور دل مر گیا کہ شب قدر بھی خالی گئی جس پر بڑا اعتقاد تھا طرح طرح کے شیطانی خیال دل میں آئے کہ دعا کو ویسے بھی سنا کرتے تھے۔ کہ قبول ہوتی ہے اور آج تو شب قدر تھی۔ اسی تردد میں بیٹھے تھے خیریت ہوئی کہ بندہ خدا ایک درزی آ گیا یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا۔ اس نے پوچھا' کیسے ست ہو۔

انہوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ کہا بھائی شکر کرو اسی میں کچھ حکمت ہوگی ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمہارے بدخواہ نہیں ہیں۔ تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی سونا بننے میں تمہارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح تم نے ڈھیلے کو کھولا اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا۔ ممکن ہے کہ ڈھیلا کسی تیسرے کا ہو جاتا اور تم دونوں میں لڑائی مفت میں بندھ جاتی۔ آدمی سمجھدار تھے دونوں کی تسکین ہوگئی موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑ جائے تو جانے کیا ہو۔ اس کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے سے انکار کر دیا وہ لوگ ایسے تھے۔

ایثار کی نادر مثال

صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے چند آدمی نزاع کی حالت میں تھے موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذرا سا پانی ڈال دے تو بڑا کام کرے ایک بندہ خدا کاسہ میں پانی لے کر پہنچے اور چاہتے تھے کہ ان کے منہ میں ڈالیں کہ اتنے میں ایک طرف سے اور آواز آئی کہ ذرا سا پانی کوئی پلاتا۔ انہوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے ان کو پلاؤ، پھر مجھے پلانا یہ شخص پیالہ لے کر ان کے پاس پہنچے پلانا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی غرض مقتل میں چھ سات جگہ اسی طرح پانی لئے پھرے اور سب یہی کہتے رہے کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جن کے پاس پہنچے ان کو پلانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ دم آخر ہو گیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لائے جس کو دیکھا دم آخر ہو چکا ہے۔ ایک نے بھی پانی نہ پیا اور پیالہ بھرا ہوا لے کر چلے آئے۔ ایثار اس کو کہتے ہیں۔

پانی وہ چیز ہے کہ سفر حج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس میں چھوڑ دیتے ہیں۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔

اتباع ہوا

غرض ہم میں جو بجائے ایثار کے کشاکشی اور نزاع و جدال ہے اس کی وجہ ہی اتباع ہوا ہے یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دیتا آج کل سب نے یاد کر لیا ہے ’اتفاق اتفاق‘ یہ خبر نہیں کہ اتفاق کاہے سے ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہش نفسانی کو روکنے سے۔ دو شخصوں میں جب جھگڑا ہوگا کسی ایسی چیز پر ہوگا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہوگا اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو

روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑ دیں تو پھر جھگڑا کیسا اور نااتفاقی کہاں۔ اتفاق اتفاق کہتے رہیے اور نفس کو روکیے نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

غرض جملہ شروں کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے خواہش نفسانی روکنے کی چیز ہے دیکھیے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں۔ حاکم کیا کرتا ہے بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعث مضرت ہیں معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھیے کیا ہو۔ ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے، چوروں کو چوری کرنے دے، زیردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے غرض ہر شخص کو مخلی بالطبع کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہو گی۔

قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے یا کوئی اور جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزا و سزا ہوتی ہے جب اس گزرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزا اور سزا ہے سب کو مخلی بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا گیا۔ فرض کیجیے کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مارتے ہو۔ خواہش پوری کرنے دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے کہ اس کے مقابلے میں ضرورت کا بھی خیال نہیں کیا جا سکتا۔

محبت الٰہی اور مصلحت دنیوی

دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفسانی روکنے ہی کی چیز ہے اگر خواہش نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھر میں بی بی کو کیوں روکتے ہو اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو زیادہ زیور فضول ہے پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے اگر آزادی ہی پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے اور اگر آزادی میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے نفس کو بھی پابند کرو مگر

دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس سے چارہ نہیں فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل جبراً اور قہراً پابند بنائے جاتے ہیں۔ آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اگر قانون خداوندی سے آزاد کر دیا تو اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا' تو قانون دنیاوی پابند بنانے کیلئے موجود ہے اور دست بدست سزا تیار ہے بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں کیونکہ ان پر عمل کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانو! قانون کی وجہ سے تم نے خواہش نفسانی کو چھوڑ دیا اور اللہ رسول کے حکم سے نہیں چھوڑتے کیا غضب کی بات ہے اگر قانوناً ممانعت ہو جائے تو ایک بھی حیلہ باقی نہ رہے۔ اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں حیلے نکالے جائیں اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے مرتبہ سے نکل کر تحریف تک پہنچ جائیں اور اگر بالکل ہی صریح حکم ہو تو اس کا مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت ہے قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبت الٰہی مصلحت دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہرا و اولیٰ بود

"مولیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہو اس کیلئے کوچہ گردی زیادہ بہتر ہے"

ایک مردار اور عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کر گزریں اور اللہ میاں کے حکم سے عشاء کی نماز بھی بھاری ہے۔

اتباع حق کی ضرورت

ایک شخص کا قصہ ہے (یہ ایک بزرگ ہیں پہلے حالت ایسی ہی تھی بعدہ بڑے شخص ہوئے ہیں) ایک عورت سے تعشق تھا بڑی تمناؤں کے بعد ایک دن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گزر گئی عشاء کی نماز بھی فوت ہوئی۔ جب موذن نے صبح کی اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں بھلے مانس تجھے بھی آج ہی عشاء کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی کسی نے کہا' جناب خبر بھی ہے صبح ہو گئی صبح کی اذان ہے منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے۔ ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہ تعالیٰ کا فرض قضاء ہوا۔ ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا پھر

صاحب کمال ہوئے اور بھی کچھ ہوا۔

ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے غور کریں تو آج کل احکام الٰہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسی کے احکام کی۔ احکام الٰہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں مگر شاق ہوتے ہیں اگر کسی انہی احکام کو کہے جن کو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کبھی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شاق نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہ شاق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے **کالقلم فی ید الکاتب** (جیسے لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم) ہوتا اور غیر کے سامنے لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔ انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و افضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے خاک بھی نہیں ملتا۔ پر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہئے یا اپنے جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہئے۔

چونکہ بر میخت بہ بندد بستہ باش چوں کشاید چابک و برجستہ باش

”جب باندھ دیں تو بندھ جاؤ اور جب کھول دیں تو مست ہو کر مالا ہو جاؤ“

ہمچو کلکم درمیان اصبعین نیستم در صفت طاعت بین بین

”میں قلموں کی طرح دو انگلیوں میں ہوں صف طاعت میں بین بین نہیں ہوں“

مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم کہ اس کو کچھ عذر نہیں کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ہاتھ میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ہاتھ میں نفس کے بت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بت ہے۔ ظاہری بت پرستی پر تو طرح طرح کے طعن کئے جاتے ہیں اور ان کو احمق بنایا جاتا ہے اور اپنے آپ کو باطنی بت پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعویٰ ہے کسی نے ایک بت کو پوجا کسی نے دوسرے کو۔ کیا فرق ہے لات کو پوجنے والے میں اور عزیٰ کو پوجنے والے میں۔ جہاں ظاہری بت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑ دو۔ اپنی باگ نفس کے ہاتھ میں مت دو۔ حق تعالیٰ اپنے منعم حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن اپنے آپ کو دے دو۔ احکام الٰہی کے سامنے سر جھکاؤ۔ اتباع تو یہی ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے تابع ہو جائے دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش چھوڑنی پڑتی ہے اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ اب لوگوں

نے حق سبحانہ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا اوروں ہی کا اتباع اختیار کر لیا۔

اتباع کی چیزیں

اتباع کرنے کی دو چیزیں تھیں۔ عقائد اور اعمال۔ اعمال میں تو یہ گنجائش نکالی گئی ہے کہ ہم مجبور ہیں اور یہ احکام مصلحت وقت کے موافق نہیں مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر ان کے ادا میں قصور کرتے تھے اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اڑ گئی۔ ادائے اعمال کو تو چھوڑا تکلیف کی وجہ سے مگر ان کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگر چہ میں نے ادائے اعمال سے روک دیا مگر تا وقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا و پر مستعد ہو جائے اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کرنی پڑے گی اور احتمال ہے کہ روکنے سے نہ رکے اس لئے اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی سرے سے ان کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑا دینا چاہیے عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر ہری ہوں گی عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ حارج ہے وہ نماز ہے غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہوگی پانچ وقت کی پابندی سر پڑے گی مولوی لوگ نماز کی قید اٹھا دیں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کر دیں۔

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آ گیا اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں غرض جو جس کی سمجھ میں آتا ہے احکام الٰہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم سے رائے لے کر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے۔ کثرت رائے پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے عقائد میں یہ حال اعمال میں یہ حال صورت میں آزادی آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں۔ زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع و شرائع میں عقد کے صحت و بطلان کی پروا نہیں آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا یہ بیع باطل ہے بیع باطل میں مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا اس کا رد واجب ہے یکے بعد دیگرے جہاں تک سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا گناہ ہوتا چلا جاتا ہے غرض معاملات کی صفائی کی طرف اصلا خیال نہیں۔

صحیح طریق تعلیم

زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا قلب حرص میں اور طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی حالت ہے ظاہر کی طرف دیکھئے وہ ٹھیک نہیں باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست نہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نازل نہیں کئے بلکہ ایک اتنا بڑا نبی بھیج کر یہ بھی بتادیا کہ اس نمونے کے ہو کر آ ؤ۔

تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شے کی پیائش زبانی بتادی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لانبی اتنی چوڑی اتنی موٹی بنا کر لاؤ اور ایک طریقہ ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ بھی دکھا دیا جائے کہ آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہئے۔ یہ نہایت ابلغ ہے۔

خوش نویس لکھنے والوں کو بتایا ہے کہ الف تین قط کا لکھو اور اوپر کی نوک ایسی ہو اور نیچے کی ایسی مگر یہ بتانا کافی نہیں لکھنے والوں کو ہرگز الف بنانا نہیں آسکتا تاوقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچ کر نہ دکھائے اگر ہاتھ سے لکھ کر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے نخرے اٹھانے کی کیا ضرورت رہتی۔ کتابوں میں سب حرفوں کی پیائش لکھی ہے اسی کو پڑھ کر خوش نویس بن جاتے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے سو احکام تو ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے جس طرح کہ تین قط سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قط یا کم و بیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرمادیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ تول ہیں اور یہ فرمادیتے کہ یہ ناپ تول ہیں ان کو پورا پورا درست کرو یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہو جائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو۔ اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑ جاتے اور کیسی کیسی دقتیں پیش آتیں تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہوگئی۔ جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے مگر نہیں حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھا دیا کہ اصلاح تردد نہ رہے احکام کی پوری پوری تعمیل ہوگئی یا نہیں اپنی صورت کو نمونے سے ملا کر دیکھ لو ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہو جائے گا کس حکم کی تعمیل میں کسر رہ گئی مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوئی ہم کس قدر نمونہ کے موافق بن کر آئے۔

اگر درزی کو اچکن سینے کو دو اور وہ ساری اچکن بہت ٹھیک اور خوبصورت بدن کے موافق سیئے

کہیں جھول تک نہ رہے سلائی کہیں ٹیڑھی نہ ہو غرض سب طرح ٹھیک ہو صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کرلائے تو کیا آپ اس کو لے لیں گے اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے آستین بھی دو ہیں۔ صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی تو کیا ڈر ہے ہرگز نہیں بلکہ اس اچکن کو آپ اس کے سر دے ماریں گے اور اگر اس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا کچھ جرمانہ بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے مطابق ہو۔

ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله

(اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے)

ماانا علیه و اصحابی[1] (فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین)

نئی تراش خراش

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کیا۔ جو وضع بتائی اس کے خلاف وضع تراشی نکاح نیا تراشا اخلاق نئے اختیار کئے اب عقائد میں بھی تراش خراش ہونے لگی اور پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا۔ معلوم نہیں کہ اتباع کس چیز کا نام ہے۔ اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ سے ہے گروہ میں ہونے کے لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں بلکہ جان بوجھ کر مخالفت کی جاتی ہے۔ اس گروہ میں ہونا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہتے کیونکہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے لکھنؤ میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں بہت سے اسباب بیان کئے گئے آخر میں یہ طے ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے اس کو چھوڑ دینا چاہئے یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔

اس لامتناہی ترقی ہی نے خرابی ڈالی ہے جو کچھ ڈالی ہے کہیں اس ہوس کی انتہا بھی ہوگی حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی اور یہ ترقی مطلق العنانی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی وہی حاصل کرسکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق سے آیا نہ یہ

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ۱:۱۵۱، ۲:۵۱، ۸:۱۳۹، ۱۲۱، ۱، تفسیر ابن کثیر ۲۱۳۰-۳

دیکھے کہ ناحق سے آیا۔ چوری سے وہ نڈر ہے ظلم سے اسے خوف نہ ہو روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو حالانکہ قطع نظر خلاف دین ہونے سے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا ہے اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر ہیں۔ جو غرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا تو اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کر لیں جن کے لئے کوئی تعداد روپیہ کی کافی نہیں ہوتی اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جا سکتا یہ چیزیں لازم کس نے کیں اسی ہوائے نفس نے حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے اب میں اسی پر بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خواہش نفسانی کا علاج

غرض سارا فساد خواہش نفسانی سے ہوا ہے سو علاج کیا ہے نفس کو خواہش سے روکو مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادہ اور سبب کو قطع کیا جائے جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی جاتا رہے گا۔ مسلمانو نفسانی خواہشوں کو چھوڑو اور حق سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت کرو کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں پر دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح سمجھ نہ سکتے اور وہ اندر ہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طب اکبر کی قدر ہو مگر احکام الٰہی کی قدر نہ ہو جانتے ہیں کہ طب اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا صاحبو! طب اکبر پر عمل نہ کرنے سے صحت جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پر اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہئے اس سے سمجھ لیجئے کہ احکام الٰہی کی کیا عظمت ہونی چاہئے۔

اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابل قدر چیز ہے وہ علاج یہی ہوائے نفس کو چھوڑنا ہے اس کا آسان طریق میں بتلائے دیتا ہوں چند روز کرنا پڑے گا بہت ہی تھوڑے دنوں میں ان شاء اللہ نفع معلوم ہوگا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداءً تکلیف سے ہوتا ہے پھر کرتے کرتے اس میں ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی فعل معا دل میں آتے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہش نفس کے موافق ہوگا بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہئے۔ اس کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جو کام کیا جائے پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں۔ یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر بے دھڑک ہو کر کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اول اول یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو۔ یہ حالت ہو

جائے کہ بات منہ سے نکالنی ہے مگر رک گئے کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی خواہش کیا ہے جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالا نہ اس پر عمل کیا۔

رہی یہ بات کہ تمیز کیوں کر ہو حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش میں اس کے لئے علم دین کی ضرورت ہے۔ تھوڑا علم ضرور چاہئے کتاب نہیں پڑھ سکتے ہو تو پوچھ لو چند روز یہی عادت ڈالو۔ اس سے کسی قدر آپ کے بولنے میں کمی ہوگی اور کسی قدر آپ کے کھانے میں کمی ہوگی۔ مگر جس وقت لذت اس کی حاصل ہوگی تو آپ پھر تھوڑے کو بہت پر ترجیح دیں گے تھوڑی چیز ہو اور اچھی ہو وہ اس سے بہتر ہے اس سے کہ بری ہو اور بہت ہی غلیظ کتنا ہی ہو ایک چھچہ فیرنی پر اس کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ جب طاعت میں کسی کو لذت آنے لگتی ہے تو معصیت کی حقارت اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے طاعت کرتا تھا۔ (مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلفت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہے جیسا کہ دیگر امور عادیہ میں تغیر ہونے سے معلوم ہونے لگا کرتے ہیں۔ ورنہ طاعت کو کر کے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور فرحت ہی ہوتی ہے) عادی ہو جانے کے بعد تو معصیت سے نفرت ہو جاتی ہے اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی گئی تو طبیعت سست رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تاوقتیکہ استغفار نہ کر لے۔

طاعت کی لذت

طاعت میں عجب لذت ہے کہ آدمی لاکھ روپیہ پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے کوئی بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپے لے لے اور آج ظہر کی نماز نہ پڑھ تو روپیہ نہ لے گا اور ظہر پڑھے گا ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ روپے سے زیادہ ہے حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں اول سے اخیر تک کوئی رکن بھی قابل اعتبار نہیں۔ نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل ادھر ادھر ہے زبان سے قراءت کر رہے ہیں مگر مطلق خبر نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ رہے ہیں خیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر حاوی ہو گئی آپ ہی آپ قراءت کر لیتی ہے۔ ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا اور اعادہ واجب ہوتا۔ سر سجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے اس حالت پر بھی آدمی لاکھ روپیہ سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح دیتا ہے اور اگر نماز نماز ہو جائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کند

"جب شراب کا ایک گھونٹ مٹی میں مل کر مجنوں بنا دیتا ہے تو خالص شراب کیا کچھ نہ کرے گی"

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لحظہ کا لطف بھی میسر ہو جائے تو آدمی دنیا و مافیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے۔ خواہش نفسانی کا تو دشمن ہو جائے نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آتا ہے جب تک کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا عادت ڈالیے پھر لذت آنے لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتداء میں کسی قدر کلفت ضرور ہوتی ہے۔

غرض یہ عادت ڈالنی چاہئے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے۔ اگر وہ کام خواہش نفس سے ہو تو نہ کیا۔ اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہ جائے گی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترک ہوائے نفس کے لئے معین ہے خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہے جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے، جسمانی سزا کا خوف ہو یا مال کے نقصان کا یا ہم چشموں میں سبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہو گا خوف ہی ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا' سزا کے خوف سے۔ بچہ شرارت سے کیسے رکتا ہے پٹنے کے خوف سے۔ بہت سے جرائم سے لوگ باز رہتے ہیں جرمانہ کے خوف سے محفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بیٹھتا ہے اور خلاف متانت حرکات سے کیوں باز رہتا ہے سبکی کے خوف سے وعلیٰ ہذا۔ خوف ہی تو اٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور غدر ہو جاتا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہے۔

البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خوف تو ہر مومن کو ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہوائے نفسانی نہیں چھوٹتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف کا استحضار نہیں اور استحضار نہ ہونے کی وجہ صرف ایک ہے عذاب کا نہ سوچنا۔ پس منتہائے معالجہ یہ سوچنا ہوا اس سے خوف کا غلبہ و استحضار ہو گا جو ترک ہوا کے لئے کافی ہو جاوے گا۔

طاعت کی تدبیر

اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں کو سوچنا شروع کیجئے اور اس کے لئے ایک وقت مقرر کیجئے مثلاً سونے کا وقت اس وقت آپ کے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہ ہو گا دنیا کے لئے تو سارا وقت دیا ہے اللہ میاں کے لئے نکما ہی وقت دو۔ اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمہارا کام بنا دیں گے۔ وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بندہ ذرا ادھر کو منہ کرے اور رحمت کے انبار اس پر بکھیر دیں۔ پندرہ بیس منٹ دیر میں سوئے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کئے۔

فہرست گناہ تیار کیجئے پھر دل میں خیال جمائیے۔ گویا میدان قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے اپنا مددگار کوئی بھی نہیں دشمن بھیڑے ہیں حیلہ کوئی چل نہیں سکتا۔ زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے آفتاب سر پر دوزخ سامنے ہے اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ یہ سب حالات پیش نظر ہوں گے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کرے گا کہ بے شک خطاوار ہوں کہیں ٹھکانا نہیں اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں رات کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھئے کہ کل فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا ہے۔ سو آج وہ گناہ نہ ہونے پائے۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائے گی۔ اور چند روز میں تو کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ گناہ رہ سکیں یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے اور دل میں گناہ کے وقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

پھر اس کے لئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے اور یہ طاعت۔ سو علم دین حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں اردو میں منتخب کر دی گئی ہیں۔ ان کو کسی سمجھدار سے سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے رفع ضرورت کے لئے کافی ہے۔ کتابوں کو خود نہ پڑھئے کہ اس سے طبیعت میں پہلے سے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے اشکال پیدا ہو جاتے ہیں اور باعث مضرت ہوتے ہیں۔

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے ترک ہوا اور اس کا معین ہے خوف اور اس کا طریق ہے مراقبہ جب مراقبہ کیا خوف پیدا ہوا۔ اس سے خواہش نفسانی چھوٹ گئی۔ اس پر نتیجہ مرتب ہوا فان الجنۃ ھی الماوی (پس جنت اس کا ٹھکانا ہوگا) اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرما دیں۔

آمین

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

وعظ الحیوۃ

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کے متعلق یہ وعظ ۱۲ رجب سنہ ۱۳۳۷ھ کو مولوی محمد انوار الحسن صاحب رئیس کاکوری ضلع لکھنؤ کے مکان پر تخت پر بیٹھ کر فرمایا۔ سامعین تخمیناً ایک ہزار۔ مستورات کا مجمع بھی تھا۔ ۴ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ حکیم محمد یوسف بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ﴿۱۷﴾ (الاعلیٰ:۱۶-۱۷)

ترجمہ: (مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر ہے اور پائیدار ہے۔

فلاح کا طریقہ

اس آیت کے اختیار کرنے کی وجہ جیسے یہ ہے کہ اس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہے ایسے ہی اختیار کرنے کا معین یہ امر بھی ہے کہ قریب ہی زمانہ ہوا کہ اس کے قبل اس سے پہلے کی آیات کے متعلق بیان ہو چکا ہے چونکہ یہ اسی سلسلہ میں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو پورا کر دیا جائے۔ اس لئے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے اور اس کے قبل بھی ایک ضروری مضمون بیان ہو رہا ہے جو مرتبط اس جملہ سے ہے۔

وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کے قبل نکاح کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاح کامل کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو تزکیہ ہو کہ اس کو برے عقائد اور اخلاق ذمیمہ سے پاک کرے۔

دوسرے ذکر ہو کہ خدا تعالیٰ کا نام لیا کرے اور ذکر زبان کی عبادت ہے جیسے کہ تزکیہ عقائد

فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ سے قلب کی عبادت ہے۔

تیسرے صلوٰۃ ہے اس کو مع اس کے حقوق کے ادا کرے کیونکہ نماز کامل وہی ہے جو مع حقوق کے ادا کی جائے۔

غرض تین چیزیں ہیں۔ فلاح کا طریقہ، قلب و نفس کا پاک کرنا اور زبان سے ذکر کرنا اور جوارح سے اعمال کرنا اور اگر زبان کو جوارح سے مانا جائے تو دو چیزیں نکلیں گی۔ ایک قلب و نفس کا پاک کرنا جو باطن کے متعلق ہے دوسرے جوارح کو اعمال ظاہری سے آراستہ کرنا یہ ظاہر کے متعلق ہے خلاصہ یہ کہ ظاہر و باطن دونوں کو درست کرنا۔ یہ ہے فلاح کا طریقہ۔

اس مضمون کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ اس لئے اب بقیہ مضمون جو اس آیت کے اندر مذکور ہے بیان کیا جاتا ہے۔ تا کہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ **بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا** بل اس میں اضراب کے واسطے ہے۔ جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے یہ نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ **بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا** بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے نہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے یوں فلاح تو سب کو مطلوب ہے اس میں کسی کو کلام نہیں مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں اور بتلا رہے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرو گے تو فلاح ہوگی نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ تعین میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

ذکر اللہ اور دنیا

اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو

آخرت پر دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شب و روز دنیا ہی میں منہمک اور اسی کی دھن میں لگے ہوئے ہیں یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے۔ حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی ہے چنانچہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ **لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله و اقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة** یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔۔۔۔!

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔

مثلاً کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور مدت کے بعد اس کی تمنا پوری ہو کہ محبوب اسے ملنے کے لئے بلائے تو وہ چاہے گا کہ ایسا بن کر جاؤں کہ اس کے نزدیک بے قدر نہ ہوں۔ آدمیوں کی شکل سے جاؤں کیونکہ اس میں محبوب کی بے قدری ہے کہ چماروں کی طرح اس کے سامنے چلا جائے ظاہر ہے کہ جب محبوب کے سامنے انسانیت کی شکل اور آدمیت کے جامہ میں ہو کر جانا چاہے گا تو اول خط بنوائے گا۔ غسل کرے گا خط بنوا کر پاک صاف ہو کر اور اچھے کپڑے پہن کر تب اس کے سامنے جاوے گا پس وہ صورۃً تو غیر محبوب میں مشغول ہے مگر حقیقتاً محبوب ہی کی یاد میں مشغول ہے اس واسطے کہ وہ سارے کام محبوب ہی کے واسطے کر رہا ہے جو شخص ناواقف ہے وہ یوں خیال کرے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے اور کہے گا کہ یہ کیسا عاشق ہے اگر واقعی عاشق ہوتا تو جب محبوب نے بلایا تھا فوراً دوڑ پڑتا ذرا بھی تامل نہ کرتا۔ اس کی کیا حالت ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر سنگار میں مصروف ہے اور یوں کہے گا کہ شاید یہ محبوب کو بھول گیا اسے محبوب کا دھیان نہیں رہا۔ اس پر محبت کا غلبہ نہیں لیکن اس بات کو عاشق جانتا ہے کہ وہ ہر حالت میں محبوب ہی کی یاد میں لگا ہوا ہے خط بنوا رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے واسطے اور غسل کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے لئے اور سنگار کر رہا ہے تو وہ محبوب ہی کی خوشی کے واسطے۔ غرض ہر فعل اس کا محبوب کے لئے ہی ہے ہر کام میں اس کی یاد

ہے کوئی کام اس کا اپنے نفس کے لئے نہیں اس کا تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ کہہ سکیں کہ یہ شخص محبوب سے غافل ہے۔ گو ظاہر میں وہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبوب سے غافل ہے مگر واقع میں ذرہ برابر بھی اس کو محبوب سے غفلت نہیں ہے۔

جب یہ بات ادنیٰ سے عشق میں ممکن ہے کہ نہ خط بنوانا محبوب کی یاد سے غافل کرتا ہے نہ غسل اور سنگار کرنا غافل بناتا ہے پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ حق تعالیٰ کے عاشق کو تجارت اور بیع اس کی یاد سے غافل کرے۔ خدا تعالیٰ کا عاشق تجارت کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے اور بیع کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے جیسے عاشق مجازی ہر کام محبوب کے تعلق سے کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ہر کام محبوب حقیقی کے تعلق سے کرتا ہے یہ کوئی کام اپنے نفس کے لئے کرتا ہی نہیں پس اس کی تو نظیر دنیا میں موجود ہے بہر حال مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کا کام کرے تو اس میں بھی دین ہی ملحوظ ہو.... !

نیت کی اہمیت

ایک حکایت ہے کہ کسی بزرگ کے ایک مرید نے مکان بنوایا تھا۔ جب بن کر تیار ہو گیا تو شیخ کو مکان دکھانے لے گئے۔ اس مکان میں روشندان کھلے ہوئے تھے شیخ نے پوچھا کہ یہ روشندان کس غرض سے رکھے گئے ہیں مرید نے کہا کہ یہ اس واسطے رکھے ہیں کہ مکان میں روشنی آیا کرے یہ سن کر شیخ نے ایک آہ کھینچی اور کہا کم بخت اگر بنانے کے وقت یہی نیت کر لیتا کہ ان سے اذان کی آواز آیا کرے تو تیرا مقصود تو جب بھی حاصل ہو جاتا کیونکہ روشنی کا آنا تو اس کی نیت کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کے ساتھ جب تک روشندان باقی رہتے اجر بھی ملتا۔

آخر یہ کیا بات تھی جو یہ بزرگ روشنی کی نیت سے روشن دان بنانے پر خفا ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی دین ہی مطلوب ہونا چاہئے واقعی اگر دنیا میں دین مطلوب ہو تو اس سے منافع دنیوی منقطع تھوڑا ہی ہو جاویں گے کہ دنیا کے وہ منافع تو حاصل ہوتے ہی ہیں مگر نیت درست ہونے سے دین کا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔

مثلاً نکاح دنیا کا قصہ ہے اور کوئی اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے دین محض تو وہ ہے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہو اور نکاح کافر مسلم دونوں میں مشترک ہے۔ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف دنیا کا قصہ ہے مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیت یہ ہونا چاہئے کہ اس سے عفت محفوظ رہے اور طبیعت منتشر نہ ہو اور جمعیت خاطر کے ساتھ عبادت ہو سکے۔ اگر اس

نیت سے کرے گا تو نکاح عبادت ہو جاوے گا۔

اس سے بڑھ کر اور لیجئے کھانا پینا اور پہننا ہے دنیا ہی کا کام کافر بھی کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں اس میں دنیا ہی کا تو نفع ہے مگر اس میں بھی مسلمان کی شان وہ ہونی چاہئے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو یہ نیت رکھنا چاہئے کہ میں اس لئے کھاتا پیتا ہوں کہ طاعت پر قوت ہو حق تعالیٰ کی نعمت کا تذکرہ ہو پس اس نیت سے کھانا پینا بھی عبادت ہو جاوے گا اسی طرح سے جتنے دنیوی امور ہیں ان سب میں دین کی نیت ہو سکتی ہے۔

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **کسب الحلال فریضة بعد الفریضة**[1] یعنی جو فرائض شرعیہ ہیں نماز روزہ وغیرہ ان کے بعد کسب حلال بھی فرض ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو فرض فرماتے ہیں تو پھر یہ دین کیسے نہ ہوگا۔

فرض کا تو دین کے اندر سب سے اعلیٰ درجہ ہے دین کے اندر بہت سے درجے ہیں واجب اور سنت اور فرض ان سب میں فرض اعلیٰ درجہ ہے لہذا کسب حلال اعلیٰ درجہ کی فرد ہوئی دین کی جب کہ اس میں نیت ہو کہ اہل وعیال کی خدمت کریں گے۔ حقوق کو ادا کریں گے۔

حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ انسان جو بی بی کے پاس جاتا ہے اس سے بھی ثواب ملتا ہے کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو اپنی خواہش کا پورا کرنا ہے اس پر کیوں ثواب ملتا ہے آپ نے جواب دیا کہ اگر اپنی خواہش کو بے محل صرف کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا تو جب حلال موقع میں صرف کرتا ہے تو ثواب بھی ملنا چاہئے۔

غرض مسلمان اس بناء پر دنیادار ہو نہیں سکتا۔ اس لئے یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیادار ہیں مسلمان تو دیندار ہی ہے مسلمان کی دنیا بھی دین ہی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ نیت کر کے اس کو دین بنانا چاہئے۔

لیجئے اس سے زیادہ کیمیاگر کون ہوگا۔ جس کو تانبے کا سونا بنانے کی ترکیب بتا دی گئی ہے۔

متعارف کیمیا میں اول تو حکماء کا بھی اختلاف ہے کہ تانبے کا سونا بننا ممکن بھی ہے یا نہیں پھر اگر ممکن بھی ہو تو اس کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ مگر یہ کیمیا کیسی سستی اور آسان ہے کہ دنیا کا تانبا تھوڑی سی آس سے جس کا نام نیت ہے سونا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی کیمیا عطا فرمائی ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے مستفع نہیں ہوتے ذرا سی بات میں ہم دنیا کو دین بنا سکتے ہیں۔

---

[1] حلیة الاولیاء ۷:۱۶۳

دنیا کی دُھن

ہماری شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ ہر امر میں دین ہی مقصود ہوتا۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہم دین کو بھی دنیا بنا رہے ہیں حتیٰ کہ بڑی چیز ہے علم اور عبادت ہم عالم اور عابد ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ ہماری آبرو اور عزت ہو۔ ہماری طرف لوگوں کا اعتقاد ہو اور لیجئے اللہ اللہ کرنے والے سب سے بڑے طبقہ میں شمار ہیں جن کو صوفیا کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی کثرت سے وہ لوگ ہیں جن کو کیفیات مقصود ہوتی ہیں۔ کیفیات کیا ہیں اغراض دنیویہ ہی تو ہیں بس عام طور پر یہی حالت ہے کہ دین کو دنیا بنا رکھا ہے۔

بہر حال میں نے یہ تفریع اس پر کی ہے کہ مسلمانوں کو یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیا دار ہیں مسلمان تو دنیادار ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیادار تو اور ہی لوگ ہیں اور یہیں سے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے کہ

اہل دنیا کافران مطلق اند   روز و شب در زق زق و در بق بق اند

ظاہراً تو یہ بہت سخت حکم معلوم ہوتا ہے کہ سارے دنیا دار کافر ہیں کیونکہ اکثر مسلمان بھی تو دنیا دار ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ وہ بھی کافر ہوں مگر ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ اہل دنیا کو مبتداء اور کافران مطلق کو خبر قرار دیا ہے بلکہ اس کی ترکیب برعکس ہے یعنی کافران مطلق مبتداء موخر اور اہل دنیا خبر مقدم ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اہل دنیا کون لوگ ہیں کافر مطلق ہیں اہل دنیا کا مصداق بس کفار ہی ہیں مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ حقیقۃً اہل دنیا نہیں۔ اس معنی کا قرینہ خود آگے موجود ہے کہ فرماتے ہیں۔

روز و شب در زق زق و در بق بق اند

کیونکہ یہ شان تو کفار ہی کی ہے کہ دن رات دنیا کی زق زق اور بق بق میں مبتلا ہیں اور شب و روز دنیا ہی کی ان کو دھن ہے۔ کسی وقت بھی خدا کی یاد ان کی زبان اور دل میں نہیں آتی۔ چنانچہ تجربہ سے دیکھ لیجئے کہ جب ذکر کریں گے تو تجارت اور دنیا ہی کے جھگڑوں کا ذکر کریں گے۔ ریلوں میں دیکھئے تو یہی دنیا کے قصے لے کر بیٹھیں گے کہ تمہارے یہاں گیہوں کیا بھاؤ ہیں فلاں چیز کا نرخ کیا ہے۔ یہی باتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ذکر ہی نہیں اور

مسلمان چاہے کیسا ہی ہو اس کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نہ کوئی ساعت ایسی ضرور ہو گی کہ جس میں وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوگا۔ مسلمان کسی نہ کسی وقت ضرور گھبرائے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ اگر زبان سے نہیں تو قلب میں ضرور خدا کو یاد کرے گا۔

طاعون میں دیکھئے کیا حالت تھی حق تعالیٰ اور آخرت کی طرف کیسی توجہ تھی۔ اگر مسلمانوں کے دل میں آخرت بسی ہوئی نہیں ہے تو اس کی یاد کیسے ہوتی ہے۔ بہرحال دنیادار کسی مسلمان کو نہیں کہہ سکتے۔ مسلمان تو اہل دنیا ہی ہوگا۔

راحت قلب

ہاں اہل دین کے مراتب مختلف ہیں کوئی کم کوئی زیادہ جیسے عربی مدرسہ میں طلبہ ہوتے ہیں کوئی میزان پڑھنے والا ہے۔ کوئی مشکوٰۃ پڑھتا ہے کوئی شمس بازغہ مگر ہیں سب عربی پڑھنے والے۔ پس جتنے اہل اسلام ہیں سب اہل دین ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کو بھی دین ہی بنائے مگر ایسا کرتے نہیں چنانچہ اپنی حالت کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی آمیزش دنیاوی ہوتی ہے اور اس میں زیادہ مقصود دنیا ہی ہوتی ہے ہم نے اپنی یہ حالت کر رکھی ہے اور اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہی طریقہ ہے فلاح کا جب ہی تو رات دن دنیا میں کھپ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کسی کو سلطنت حاصل ہو جائے۔ اعلیٰ درجہ کی ترقی ہو کہ بادشاہ ہو جائے مگر حقیقت میں جس کا نام کامیابی ہے وہ اس کو بھی میسر نہیں۔ ہاں اللہ والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کامیابی میسر ہے۔

میں مختصراً کامیابی کا ذکر کئے دیتا ہوں کہ وہ ہے کیا چیز۔ اول مقصود کا تعین ہونا چاہئے کہ مقصود کیا چیز ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ وہ کس کو حاصل ہے تو وہ کامیاب ہے اور کس کو نہیں۔ سو وہ مقصود بس ایک چیز ہے وہ کیا ہے راحت جو بھی کوشش کرتے ہیں کامیابی کی اس سے مقصود سب کا راحت قلب ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو اب مشاہدہ کر لیجئے۔ بادشاہ کی حالت دیکھ لیجئے۔ ان کو راحت بھی نصیب ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو راحت میسر نہیں ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد متعین کر رکھے ہیں جن کے کچھ تو اسباب ہی اختیار میں نہیں اور بعض گو اختیاری تو ہیں مگر ان پر مقاصد کا ترتب یقینی نہیں (کہ جب وہ پائے

جائیں تو مقصود بھی ضرور پایا جائے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اسباب کو جمع کرتے ہیں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ سو وہ لوگ چونکہ اپنے خیال میں اول ایک ثمرہ متعین کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ ثمرہ حاصل ہوگا اور اس کی توقع پر ان اسباب کو مہیا کرتے ہیں اور پھر اکثر اس توقع کے خلاف پیش آتا ہے اور ان کی امید پورا نہیں ہوتی' اس لئے پریشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ پریشانی کا حاصل کیا ہے۔ امید کا پورا نہ ہونا۔ پس جب وہ امید پوری نہیں ہوتی تو قلق ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے ان لوگوں کی پریشانی کی بخلاف اہل دین کے کہ ان کا اصلی مقصود صرف آخرت ہے سو وہ اس کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور اس کے جتنے اسباب ہیں وہ سب یقینی ہیں کہ ثمرہ کا ان پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نماز پڑھے اور خدا تعالیٰ خوش نہ ہوں۔ یا کوئی اسلام لائے اور جنت نہ ملے رہی یہ بات کہ شاید اسلام پر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے جنت نہ ملے۔ سو یہ اس کے یقینی ہونے کے منافی نہیں کیونکہ منافات اس وقت ہوتی' جب کہ اسلام تو پایا جاتا اور پھر جنت نہ ملتی اور اس صورت میں تو اسلام ہی نہ رہتا اور وہ بھی اپنے اختیار سے کیونکہ اسلام اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ خود ہی اس کو نہ چھوڑے چونکہ اس باب آخر پر ثمرہ کا ترتب یقینی ہے اس لئے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی امید پوری نہ ہو۔ پس ان کو پریشانی کیوں ہوگی کیونکہ پریشانی کی حقیقت تھی امید کا پورا نہ ہونا اور اس کا یہاں احتمال ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں ان کو دنیا بھی مقصود ہوتی ہے تب بھی ان کو پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ گو اس کے ثمرہ کا تخلف اسباب سے ممکن ہے مگر ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ اس پر مصر نہیں ہوتے کہ اسباب پر ثمرہ ضروری ہی مرتب ہو جائے اگر ثمرہ مرتب نہ ہو تو وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت کسی مریض کا علاج کرتے ہیں تو وہ گو یہ چاہتے ہیں کہ اچھا ہو جائے مگر قلب کو اس کے ساتھ ایسا متعلق نہیں کرتے کہ اگر صحت نہ ہو تو پریشان ہو جائیں۔ اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی وہ راضی ہی رہتے ہیں۔

اہل حال و اہل مقام

اب رہی یہ بات کہ یہ رضا عقلی ہے طبعی تو سمجھ لینا چاہئے کہ رضا طبعی تو ضروری نہیں البتہ رضا عقلی ضروری ہے ان حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مریض کی صحت پر بھی راضی ہوتے ہیں اور عدم صحت پر بھی۔ اگر مریض مر بھی جائے تو طبعاً تو ایک قسم کا حزن ہوتا ہے مگر عقلاً اس پر بھی راضی

ہوتے ہیں اور بعضوں کو طبعًا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی حکایت سنی ہے اور کتابوں میں موجود ہے کہ وہ اولاد کے مرنے پر ہنس دیئے۔ ان کو اس میں لذت ہوئی۔

میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے تو اس کو سن کر ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں کہا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے ہنستے تھے حالانکہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔

بعض اہل حال کی یہ حالت بھی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ ترقی ہوگئی ہے بلکہ ان سے آگے اور مرتبہ کے لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کو پہنچ کر اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ گو ان کی ظاہری حالت بڑھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور عوام ان کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ ایک دریائے عظیم الشان ہے اور اس کے اس کنارے پر ایک شخص ہے اور ایک شخص اس کنارے پر اتر گیا ہے اور ایک تیسرا شخص دریا کے درمیان میں ہے اب میں اس سے پوچھتا ہوں کہ زیادہ کامل کون ہے عبور اور عدم عبور کے اعتبار سے مقام کس کا بڑھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دریا کو عبور کر گیا ہے وہ بڑھا ہوا ہے اور کامل السیر وہی ہے جو دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ مبتدی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس کنارہ پر کھڑا ہے اور اہل حال کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو دریا کے بیچ میں ہے۔ یہ شخص متوسط الحال اور اہل مقام کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا سے پار ہو گیا ہے یہ شخص منتہی ہے۔ بظاہر تو مبتدی کی حالت میں اور اس کی حالت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کی حالت یکساں معلوم ہوتی ہے جو شخص ناواقف ہو گا وہ اس شخص کو جو پار اتر گیا ہے اس کنارے والے کی مثال سمجھے گا۔ کیونکہ جیسے یہ کنارہ پر ہے۔ ایسے ہی وہ بھی کنارہ پر ہے اس لئے ممکن ہے کہ اسے یہ گمان ہو کہ وہ اس کنارہ پر آنا چاہتا ہے اور جو شخص واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ دریا سے گزر کر اس جگہ آیا ہے تو وہ اس کو افضل سمجھے گا۔

بس تین قسم کے لوگ ہوئے۔ مبتدی، متوسط، منتہی۔ منتہی کی حالت ظاہر میں مبتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لئے عوام کو دونوں میں امتیاز نہیں ہوتا اور اہل حال کی حالت ہے ممتاز اس لئے عوام ان کو بہت بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ابھی درمیان میں ہیں چونکہ منتہی کی حالت مشابہ ہوتی ہے مبتدی کے اس لئے جیسے مبتدی کو بیٹے کے مرنے سے رونا آتا ہے منتہی کو بھی آتا ہے گو کہ اس کے رونے اور اس کے رونے میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔

دیکھئے رسول اللہ اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے اور جب بعض صحابہ

نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا کہ یہ رونا تو رحمت ہے۔ ترحم اور شفقت سے رونا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا اور آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ کو صاحبزادہ کے انتقال پر رونا آیا۔ پس معلوم ہوا کہ رونا کمال کے منافی نہیں۔ جو کامل ہوتا ہے اس کو ایسے واقعات میں ضرور رونا آتا ہے اور یہ شخص صاحب مقام ہوتا ہے۔

البتہ صاحب حال نہیں روتا۔ عوام اہل حال کو کامل سمجھتے ہیں مگر واقع میں کامل وہی شخص ہے جو بیٹے کے مرنے پر روتا ہے۔ بظاہر تو اس کا رونا مبتدی کے مشابہ ہے مگر واقع میں مشابہ نہیں۔ مبتدی کا رونا تو محض داعیہ نفس کی وجہ سے ہوتا ہے منتہی کا رونا ترحم کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے اور اس کے رونے میں بہت فرق ہے اور صرف رونے ہی میں نہیں بلکہ اس کے اور اس کے کھانے پینے اور ہر بات میں بہت فرق ہے۔ گو ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عوام نے انبیاء کو نہیں پہچانا اور ان کو ظاہری نظر سے اپنے ہی مثل سمجھے۔ کیونکہ ان کی ظاہری حالت کوئی ممتاز نہ تھی اسی واسطے تو حضرت ہود کے بارہ میں ان کی قوم نے کہا تھا۔

ماھذا الابشر مثلکم یاکل مماتاکلون منه و یشرب مما تشربون

نہیں ہیں یہ مگر ایک بشر تمہاری مثل۔ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو۔

غرض کہ اہل حال کو اہل مقام سے افضل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس اہل حال کے رضا طبعی ہوتی ہے اور اہل مقام کی رضا عقلی۔ رضا ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ طبعی رضا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس یہ درجہ میں اہل حال سے زیادہ ہیں۔

تفویض اور راحت

یہاں ایک شبہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ جب اہل حال کو رونا نہیں آتا اور اہل مقام کو رونا آتا ہے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حال طبیعت کی پاکیزگی میں اہل مقام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ قضا حق سے ان کی طبیعت پر بھی ناگواری نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اہل حال کی طبیعت چونکہ حال کے غلبہ کی وجہ سے بالکل مغلوب ہو جاتی ہے اس لئے ان کی طبیعت نہ واقعات کا پورا ادراک کرتی ہے اور نہ ان سے متاثر ہوتی ہے اور اہل مقام پر چونکہ حال کا غلبہ نہیں رہتا اس لئے ان میں امور طبعیہ پھر عود کر آتے ہیں۔ مگر عقلی قوت ان

کی طبعی قوت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے مقتضائے طبع ان کو رونا آتا ہے مگر از جا رفتہ نہیں ہوتے۔ حد کے اندر رہتے ہیں اور جب ان کی طبیعت مغلوب نہیں ہے۔ تو پھر رونا کیوں نہ آوے طبیعت تو اسی واسطے ہے کہ اس کو ادراک ہو اور ادراک نہ ہونا یہ تو اس کا نقص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام واقعات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ادراک کامل ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ لطافت طبع میں بھی اہل مقام ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ ان پر واقعات کا اثر ہوتا ہے۔ اور اہل حال کی طبع میں چونکہ اس درجہ لطافت نہیں اس لئے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اہل مقام نے تو دو حق ادا کیے۔ طبیعت کا حق بھی ادا کیا اور وہ یہ کہ ان کو رونا آیا اور عقل کا بھی حق ادا کیا (کہ حد سے تجاوز نہیں کیا) اس لئے یہ اہل حال سے زیادہ ہیں۔

بہر حال یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کو اصرار نہیں ہوتا کسی ثمرہ پر کہ فلاں عمل کا ثمرہ مرتب ہو ہی۔ اگر ثمرہ مرتب نہ بھی ہو تو بھی راضی ہیں۔ البتہ الحاح سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ایسا کر دیجئے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ ہی کا ان کو ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب الملحین فی الدعا[1] (کہ اللہ میاں دعا میں ہٹ کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں)

اس وجہ سے وہ الحاح کے ساتھ دعا کرتے ہیں مگر نہ اس طرح کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا ہاں اصرار بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کی حاجت ہے اس کو پیش کرتے ہیں اظہار عبدیت کے لئے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں کہ ہم ضرور لیں گے۔ جس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی رضا اس میں سمجھتے ہیں دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے اس سے وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سو ان کا اصرار اس معنی کر ہے۔

باقی اصرار کی نفی جو کی ہے کہ ان کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا تو وہ اس معنی کر ہے کہ ان کو ثمرہ نہ ملنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر ثمرہ نہ ملے تو وہ ناراض ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکایتیں پیدا ہونے لگیں کہ سمجھا کچھ تھا اور ہو گیا کچھ۔ ان کی دعا تو یہ ہوتی ہے کہ ادھر ان کو دعا کے قبول نہ ہونے کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ معاً ہی ان کے قلب میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خیر وہی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا۔ گو کہ ہم اس کے خلاف کو خیر سمجھے ہوئے تھے بس یہ

---

[1] فتح الباری لابن الحجر ۱۱: ۹۵، الدر المنثور للسیوطی ۵: ۳۵۶

سمجھ کر وہ اسی پر خوش ہو جاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایسی حالت نہیں ہوتی جیسی کہ اہل دنیا کی ہوتی ہے کہ کوئی مر جائے تو یہ ارمان کرتے ہیں کہ اگر چار برس اور زندہ رہتا تو لڑکے کی تعلیم پوری ہو جاتی اور یہ کام ہو جاتا اور وہ ہو جاتا یہ ارمان اللہ والوں کو پیدا نہیں ہوتے۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ایسے ارمان سننے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی سے کفر کا کلمہ سنیں۔ انہیں یہ بات اتنی گراں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے ان کے کان میں کفر کا کلمہ ڈال دیا۔ گو مروت کی وجہ سے وہ اس کو ظاہر نہ کریں مگر ان کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے میں اس امر کا یقین کیسے دلاؤں۔ اگر کہنے والے کہ آپ سچا سمجھیں تو اس کا یقین کر لیجئے۔ ان کی حالت تو تفویض کی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ تجویز ہی نہیں کرتے کہ بس یہ کام اسی طرح ہو۔

اور اس سے بڑھ کر لیجئے ان حضرات کی تفویض اس قدر کامل ہوتی ہے کہ اگر اس میں راحت معلوم ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کہیں اس میں نفس کا شائبہ نہ ہو۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ تفویض راحت کی وجہ سے کی جائے یہ چاہتے ہیں کہ خالص تفویض ہو اور کسی نفسانی غرض کا شائبہ بھی نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ میں تفویض ہوتی ہے اور تفویض کے اندر ایک راحت ہوتی ہے۔

کیونکہ جب کوئی شے بھی مقصود نہ رہے گی تو اب جو بھی واقع ہوگا' اس پر یہ راضی ہوں گے تو پھر پریشانی کہاں۔ پس تفویض کے اندر بڑی راحت ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات ہو جاتی ہے مگر تفویض سے ان کو راحت بھی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں وہ یہ کہ اسی نیت سے خدا تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ اس میں چین ہے (گویا مقصود ان کا تفویض سے چین ہے) ایسے لازم کو ملتزم کر لیتے ہیں راحت تو تفویض کے لئے لازم ہے یہ نیت کر کے اس کو ملتزم اور مقصود بنا لیتے ہیں) یہ بڑی غلطی ہے محققین اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ تو یوں کہتے ہیں کہ تفویض خدا تعالیٰ کا حق ہے پس اس کو محض رضا حق کے لئے کرنا چاہئے اور یہ شخص اس کو اپنی غرض کے لئے کرتا ہے سو اس نے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی غرض کو شامل کر لیا۔ یہی شرک ہے اس لئے محققین اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی تفویض سے پناہ مانگتے ہیں وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور حق تعالیٰ مالک ہیں ان کے حقوق عظمت میں سے ایک حق تفویض بھی ہے۔ وہ حق عظمت سمجھ کر تفویض کرتے ہیں نہ اس غرض سے کہ راحت ہو وہ تو اگر اس کا شائبہ بھی ہو تو پناہ مانگتے ہیں۔

یہ لوگ کس درجہ کے ہوتے ہیں کہ عبادت کے اندر راحت کی نیت سے بھی بچتے ہیں۔ غرض

کہ اصلی نیت تو ان کی خدا تعالیٰ کی عظمت کا حق ادا کرنا ہے ہاں راحت اس کو لازم ہوتی ہے مگر وہ اس طرف التفات نہیں کرتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دھوپ میں جا رہا ہو اور اس نے کسی جانور کے سایہ کو زمین پر دیکھا اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ کسی عاقل نے رائے بتلائی کہ کم بخت یہ کیوں نہیں کرتا کہ جانور کو پکڑ لے سایہ خود تیرے پاس آ جاوے گا نادان ہے وہ شخص جو سایہ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ پرند کو پکڑ لے سایہ تو خود اس کے ساتھ ساتھ ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص پرند کو پکڑے گا وہ سایہ کی طرف التفات نہ کرے گا لیکن سایہ خود اس کے ساتھ ہوگا۔

تو جیسے اس شخص کے ہاتھ میں پرند ہے اور باوجود سایہ کی طرف التفات ہونے کے سایہ اس کو لازم ہے اسی طرح تفویض کے لئے راحت لازم ہے تفویض کو اختیار کرو۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا حق عظمت ادا ہو۔ پھر راحت تو خود ہی حاصل ہو جاوے گی۔ نادان ہے وہ شخص جو راحت کی غرض سے تفویض کو اختیار کرے غرض یہ کہ جس شخص میں تفویض ہو اس کو کسی طرح پریشانی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے جو اصلی وقت ہے پریشانی کا جس کا نام فزع اکبر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو پریشانی نہ ہوگی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **لایحزنهم الفزع الاکبر** اس دن میں ان لوگوں کو ذرہ برابر رنج نہ ہوگا۔ پھر دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے وہ تو ان کے نزدیک کھیل اور دل لگی ہے پس ایسا شخص دنیا میں کیا رنجیدہ ہوگا۔

نعمت دنیا و آخرت

اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ اہل سلطنت کو بھی راحت نصیب نہیں ہوسکتی۔ کسی جگہ پناہ ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اگر پناہ ہے تو اس میں ہے جس کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

الابذکر اللہ تطمئن القلوب کہ دلوں کو راحت اللہ کے ذکر ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

میرے بیان سے معلوم ہو گیا کہ فلاح اور کامیابی کا کون سا طریقہ ہے۔ کامیابی کا وہی طریقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ وہ جو ہم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے اسی واسطے لفظ بل لا کر فرمایا **بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا** کہ جو حقیقۃً طریقہ فلاح ہے اس کو چھوڑ کر تم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ سو یہ طریقہ نہیں فلاح کا بلکہ دوسرا طریقہ

ہے۔ پس ہم لوگوں میں جو یہ مرض ہے کہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہیں اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے یہ مرض ہمارے اندر عام ہو رہا ہے اسی وجہ سے میں نے اس وقت اس آیت کو لیا ہے چنانچہ ہر وقت ہمیں یہی فکر ہے کہ کسی طرح سے دنیا ہو۔ مال و دولت بڑھے دنیا کا طرح طرح کا ساز و سامان ہو۔ دن رات اس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد ”جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے“

جس وقت دیکھو یہی دھن ہے یہی فکر ہے۔ آگے وجہ شکایت کی بیان فرماتے ہیں۔

والآخرة خير وابقى کہ آخرت بہتر ہے اور ابقیٰ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان حیات دنیا کو ترجیح دیتا ہے حالانکہ آخرت بہتر اور باقی تر ہے۔ ترجیح اس کو دینا چاہئے اور زیادت دو قسم کی ہوتی ہے کما اور کیفا اسی لئے خیر سے تو آخرت کا کیفا زائد ہونا بیان کیا ہے اور ابقیٰ سے کما زائد ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت دنیا سے کما بھی زائد ہے اور کیفا بھی زائد ہے۔

کما تو اس لئے کہ آخرت چونکہ زمانہ کے اعتبار سے ابقیٰ ہے اور اس کی شان ہے **لاتقف عند حد** کہ وہ غیر محدود ہے کہ اس کی نہایت ہی نہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا ہے کب تک رہے گی ظاہر ہے کہ غیر محدود چیز کا اندازہ ہی کیا ہو سکتا ہے اس وجہ سے وہ کما زائد ہے اور کیفا اس لئے زیادہ ہے کہ نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا میں لذت وغیرہ کے لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ حاصل یہ کہ آخرت دونوں اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے مگر تم پھر بھی دنیا کو ترجیح دے رہے ہو۔ یہ وجہ ہے شکایت کی۔

ترجیح دنیا کی مذمت

اس مضمون کو سن کر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مولوی بھی عجیب ہیں کہ دنیا کو چھڑانا چاہتے ہیں ایک تو مسلمان مفلس ہیں ہی سواری ان کے پاس نہیں گھر ان کے پاس نہیں یہ اور بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں مثل مشہور ہے مرتے کو مارے شاہ مدار یہ چاہتے ہیں کہ اور بھی مفلس ہو جائیں میں نے اس وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے تاکہ یہ بتلا دوں کہ شارع علیہ السلام کا مقصود کیا ہے آیا دنیا کا چھڑانا مقصود ہے یا کچھ اور مقصود ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس مقام پر **تؤثرون** ارشاد فرمایا۔ **تطلبون یا تکسبون** ارشاد نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا **بل تطلبون الحیوۃ الدنیا** کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا **تکسبون الدنیا** کہ تم

دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو سو اور الفاظ کو چھوڑ کر جو **توثرون** فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھڑائی نہیں جاتی دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مذمت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص ہے جس نے جیب میں گنیاں اور پیسے بھر رکھے ہیں سو اس پر تو اس کو ملامت نہ ہو گی کہ پیسوں کو گنیوں کے ساتھ کیوں جمع کر رکھا ہے اب سنئے کہ اس نے یہ کیا کہ جیب میں سے گنیاں تو پھینکنی شروع کر دیں اور اس کی بجائے اور پیسوں کو بھر لیا اس پر اس کو ملامت کی جائے گی۔ پس اس نے جو گنیوں کے ہوتے ہوئے پیسے حاصل کئے اس پر ملامت نہ ہو گی بلکہ ملامت ایثار پر ہو گی کہ گنیوں کو تو چھوڑا اور پیسوں کو حاصل کیا بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ دنیا طلب کرنے اور کمانے پر ملامت نہ ہو گی بلکہ دین کی گنیوں کے پھینک دینے اور دنیا کے پیسوں کو اختیار کر لینے پر ملامت ہو گی حق تعالیٰ نے **توثرون** کا لفظ ارشاد فرما کر اس شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

حاصل یہ کہ دنیا کے ارادہ کرنے کے دو درجے ہیں ایک ایثار اور ایک محض طلب ایثار جائز نہیں رہی طلب اس میں حرج نہیں مگر دنیا کا طلب کرنا ہی مذموم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ **طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ** کہ طلب کرنا حلال کا فرض ہے بعد اور فرائض کے۔

دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔

حب الدنیا راس کل خطیئۃ[1] (کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے)

یوں نہیں فرمایا کہ **کسب الدنیا راس کل خطیئۃ** کہ دنیا کمانا تمام خطاؤں کی جڑ ہے کسب کا لفظ چھوڑ کر حب کا لفظ اختیار کیا اس کی کیا وجہ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ حب دنیا اور چیز ہے اور کسب دنیا اور چیز اگر کسی کو کسب دنیا کی ضرورت پیش آئی اور اس نے اسباب اختیار کر لئے تو کوئی حرج نہیں۔

علامت حب اللہ

مگر ایک شرط ہے کہ اس کی محبت غالب نہ ہو بلکہ محبت حق تعالیٰ ہی کی غالب ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ تعارض کے وقت یہ شخص کیا کرتا ہے آیا دین کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا

---

[1] کنز العمال ۶۱۱۴۰، مشکوۃ المصابیح ۵۲۱۳، الدر المنثور ۲: ۳۴۱

کو۔ اگر دین کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حب دین غالب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حب دنیا غالب ہے۔

مثلاً کوئی شخص تجارت کرتا ہے اور اس میں کوئی معاملہ خلاف شرع پیش آیا اور اس کے کرنے سے اس کو دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر شریعت اس کو منع کرتی ہے تو اب تعارض ہوا دین میں اور دنیا میں اب اگر اس نے نفع دنیا پر خاک ڈال دی اور دین کو اختیار کیا تو سمجھا جائے گا کہ محبت الٰہی اس میں غالب ہے۔ اور اگر دنیا کو لے لیا اور شریعت کو پس پشت ڈال دیا تو سمجھا جائے گا کہ حب دنیا غالب ہے۔

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ جب دنیوی معاملات واقع ہوتے ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو دنیا کو ترجیح دیتے ہیں خواہ آخرت کا نقصان ہو جائے یوں کہتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں ہم دنیا دار ہیں یہ پرہیز ہم سے نہیں ہو سکتا۔ بس باتیں بنا کر اور تاویلیں کر کے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں' دین پر یہ علامت ہے اس کی کہ یہ لوگ محبت دنیا ہیں گو معتقد دنیا نہیں۔ معتقد تو دین ہی کے ہیں ورنہ اپنے کو گنہگار کیوں کہتے مگر نرا اعتقاد اطاعت کے لئے کافی نہیں جب تک محبت نہ ہو اسی کو تو عراقی کہتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

''مجھ کو طریق رشق میں چلائے عزا زہد خسک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے''

رہ قلندر کے معنی ہیں رہ محبت۔ رہ قلندرا اور رہ پارسائی میں جزو کل کی نسبت ہے نہ یہ کہ رہ قلندر رہ پارسائی کا متبائن ہے۔ جیسے آج کل لوگ قلندری اسی کا نام سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت سے بالکل آزاد ہو جاوے بس مطلب یہ ہوا کہ رہ قلندر جو جامع ہو محبت اور پارسائی کو وہ مجھ کو دکھا۔ کیونکہ بدوں محبت کے صرف رہ پارسائی دور دراز ہے۔ جب تک محبت نہ ہو پارسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی محبت ایسی چیز ہے۔

دیکھئے بادشاہ کی ایک اطاعت تو ہوتی ہے قانونی کہ قانون کی رو سے جتنا کام ذمہ تھا اس کو پورا کر دیا اور ایک بادشاہ کا عاشق ہے اور وہ محبت کی وجہ سے اطاعت کرتا ہے۔ اس میں اور پہلے شخص میں بڑا فرق ہے سو یہ مطلب ہے اس شعر کا نہ وہ جیسا کہ بعض نے غضب ڈھایا ہے کہ نماز روزہ بالائے طاق اور داڑھی اور مونچھ صفاء چٹ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اور پنے آپ کو قلندر سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں انہدام ہے تمام شریعت کا خلاصہ یہ ہے کہ بدوں محبت نرا اعتقاد کافی نہیں تو بس دنیا داروں کو نرا اعتقاد ہے محبت نہیں۔ اور محبت نہ ہو تو پھر طاعت اس قسم کی ہوتی ہے کہ

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند   تو بروں در چہ کردی کہ دروں خانہ آئی
بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا بر آمد   کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

یعنی بدوں محبت کے کامل اطاعت نہیں ہوتی اور جس کو محبت ہوگی وہ طاعت میں تو کیا کمی کرے گا وہ تو مصائب سے بھی نہ گھبرائے گا۔ کوئی مصیبت اس کو پریشان نہیں کرسکتی۔ اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ عراقی کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کے لئے سلامت رہے)

یعنی وہ عبادت سے تو کیا گھبراتا وہ تو ہلاکت سے بھی نہیں گھبراتا سو یہ کاہے کا اثر ہے۔ محبت ہی کا تو ہے پس طریق محبت ایسی چیز ہے اور چونکہ ان لوگوں کو آخرت کی محبت نہیں ہے اس لئے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ آخرت پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت **بل تؤثرون** الخ میں ترجیح کی مذمت ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

من كان يريد العاجلة عجلنا لهٗ فيها مانشاء لمن نريد ثم جعلنا لهٗ جهنم.

یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانہ جہنم کو بناتے ہیں۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں **ومن ارادالاخرة** (اور جو شخص اخرت کا ارادہ کرے) پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے ارادہ آخرة کے یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوئیں ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ **لم يرد الاخرة** ہو۔ پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے ایک اور موقع پر ہے۔ **من كان يريد حرث الأخرة نزدلهٗ في حرثه و من كان يريد حرث الدنيا نؤته منها و ماله في الآخرة من نصيب.** (جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں)

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ **من كان يريد حرث الدنيا و لم يرد حرث الآخره** مقابل قرینہ ہے اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا

چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

من کان یرید الحیوۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا و ھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الأخرۃ الاالنار و حبط ما صنعوا فیھا و باطل ماکانوا یعملون.

(جو شخص (اپنے اعمال خیر سے) محض حیات دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ ثواب وغیرہ نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے)۔

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے کہ **من کان یرید الحیوٰۃ الدنیا و زینتھا و لم یرد الآخرۃ** پس یہ معلوم ہوگیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھڑوانا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہوگیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترفین بھی اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں لہٰذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے وہ یہ کہ **الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ** کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ بس بقدر ضرورت اس کو حاصل کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں۔ جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے آیت میں بھی **وزینتھا** کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد

ہوسواول کی مذمت نہیں، ثانی کی مذمت ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔

اعمال کی حقیقت

اس بیان سے ایک اور آیت کی تفسیر نہایت پاکیزہ ہوگئی۔ قرآن شریف میں احد کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس واقعہ میں بعض صحابہؓ سے لغزش ہوگئی تھی کہ وہ غلطی اجتہادی تھی۔ صحابہ کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جیسے ہم لوگ قصداً مخالفت کرتے ہیں وہ بھی قصداً مخالفت کرتے تھے۔ وہ حضرات حضور کے سچے محب تھے۔ گو زبان سے محبت کے دعوے زیادہ نہ کرتے تھے مگر ان میں اطاعت کامل درجہ کی تھی۔ اور ہم لوگ زبان سے تو محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں مگر ہم میں اطاعت خاک نہیں ہماری اور ان کی محبت میں یہ فرق ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست
لیک عشق بے زباں روشن ترست

عشق زباں کو روشن گر اور عشق بے زبان کو روشن تر فرما رہے ہیں۔ عاشق کامل وہ ہے کہ اپنے دعوے عشق کو بھی فنا کردے کیونکہ فنا عشق کے لوازم سے ہے۔ محبوب کے سامنے دعوے کو فنا ہی کردینا چاہئے سو محبت وہی ہے جس میں فنا ہو اور دعویٰ نہ ہو۔ صرف دعوے کرنے کا نام تو محبت نہیں ہے۔ آخر اس کی کوئی علامت بھی ہے کیا عشق کی یہ علامت ہے کہ محبوب ایک راستہ پر لے چلے اور یہ دوسرے راستہ پر چلے۔ ہرگز نہیں عاشق تو وہ ہے کہ محبوب کے راستہ پر ہولے۔ پس ہم لوگ جو عشق کا دعویٰ کرتے ہیں اور حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے۔ سو یہ کیسا عشق ہے عاشق کو تو محبوب کے سامنے مٹ جانا چاہیے۔

اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ کسی صومعہ میں رہتے تھے شب و روز عبادت میں مشغول تھے ایک روز آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں، خواہ کچھ بھی کرو۔ مگر وہ پھر بھی عبادت ہی میں مصروف رہے۔ ان کے ایک مرید نے کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی ہے کہ وہ تو رخ پھیرتے ہیں اور تم اس قدر مشقت اٹھاتے ہو وہ تو دھتکارتے ہیں اور تم لپٹے جاتے ہو۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے اس پر وہ رونے لگے اور کہا کہ یہ تو میں جب کروں کہ اور کوئی در ہو کہ اس در کو چھوڑ کر دوسرے در پر چلا جاؤں۔

توانی ازاں کے دل پر داختن
کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

اس شخص سے دل کیسے خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزر کر سکتے ہو۔

اب تو میرا یہ مذہب ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں۔

خلوص و صدق خالی تھوڑا ہی جاتا ہے۔ بس فوراً آواز آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

قبول ہے اگرچہ کمال کی کوئی بات اسمیں نہیں سوائے اس بات کے کہ تم نے کہہ دیا کہ ہمارے سوا پناہ کی دوسری جگہ نہیں۔

جواب بھی دیا اور اس میں ایک چرکہ محبوبانہ بھی لگا دیا کہ گو تم اس قابل تو ہو نہیں مگر خیر آ جاؤ۔ واقعی یہ ہے کہ ہمارے اندر کمال ہی کون سا ہے ہماری کوئی حالت کمال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے پاس بڑی چیز اعمال ہیں۔ سو اول تو ان میں ویسے ہی ہزاروں نقصان ہیں۔ پھر اگر کامل بھی ہوئے تو یہ دیکھئے کہ وہ پیدا کہاں سے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ قوت ارادیہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ہاتھ پاؤں اور جتنی چیزیں اعمال کے لئے شرط ہیں وہ بھی ان ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہماری ہے ہی کیا چیز!

ان اعمال کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ہو' کھیت بھی اسی کا نوکر بھی اسی کے' پانی بھی اسی کا' زمین بھی اسی کی' بیج بھی اسی کا' غلہ بھی اسی کا۔ یہاں تک کہ کھیتی پیدا ہوئی اب کوئی دعویٰ کرے کہ کھیتی کا میں مالک ہوں تو کیا اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ مالک یہی کہے گا کہ یہ بتلاؤ کہ تم کون سے قاعدہ سے مالک ہو۔ ظاہر بات ہے کہ غلہ اسی کی ملک ہے جس کے اسباب ہیں اسی طرح آپ صاحب ذہین ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں جو بمنزلہ نوکر اور غلام کے ہیں' خدا کی ملک ہیں۔ آپ کی قوت ارادیہ حق تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس مجموعہ سے جو ثمرہ ہوگا وہ دیکھ لو کس کی ملک ہوگا اگر ہمارے اعمال کامل بھی ہوئے تو اس میں ہمارا کیا کمال ہوا۔ اب ان پر جو انعام ہم کو ملے گا وہ مبادلہ تھوڑا ہی ہوگا مبادلہ کے معنی تو ہیں کہ ان کی چیز لے لیجئے اور اپنی مدد دے دیجئے اور یہاں اپنا کچھ ہے ہی نہیں پھر مبادلہ کیسا فرمائیے کہ پھر کوئی کیا ناز کر سکتا ہے۔ کہ میں کچھ کر سکتا ہوں۔

عبدیت اور رسالت

اس لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا اس پر حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے پوچھا اور آپ بھی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا کہ میں بھی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ ہاں اگر حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں اور اس میں یہ بھی تصریح فرمادی کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہوں اور آپ کا یہ کمال ہے اور جتنا افتقار آپ کا خدا تعالیٰ کی طرف ثابت کیا جائے گا' اسی قدر آپ کی فضیلت ہوگی۔ ایاز کے واسطے یہی فضیلت ہے کہ محمود سے وابستہ رہے۔ اس کی ظرف حاجت مند رہے حتیٰ کہ جتنے کمالات بھی ہیں سب عبدیت کی فرع ہیں۔ بڑا کمال عبدیت ہے۔ اسی لئے جس قدر عبدیت کامل ہوگی اسی قدر رسالت کامل ہوگی کیونکہ عبدیت کی فرع رسالت ہے نہ کہ رسالت کی فرع عبدیت۔ عبدیت تو فطری ہے اور رسالت اس پر مرتب ہے رسالت سے پہلے بھی آپ میں شان تھی اطاعت اور عبدیت کی۔ آپ خدا تعالیٰ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت تک کچھ بتلایا بھی نہ گیا تھا اس وقت بھی آپ مُطیع تھے اسی عبدیت کاملہ کے صلہ میں آپ کو رسالت ملی تھی۔

عمل اور جنت

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضور کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ عمل عامل کا کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی کامل ہو مگر وہ محدود ہی ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود ہی ہوگا۔ رحمت حق کا اول تو تجزیہ ہو نہیں سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسب نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے۔ بمرات متناہیہ متناہی ہوتا ہے۔ بہر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں

کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے (یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔) سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا کیونکہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔

غرض آپ کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور کے اعمال ہر طرح کامل ہیں مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے۔ چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے۔ پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔

خیال تو فرمایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا تو پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ چار دن نماز پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جنت کے مستحق ہو گئے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کے اندر کوئی کمال نہیں ہو سکتا اگر اعمال بھی کامل ہوں تب بھی بندہ کا کوئی کمال نہیں کیونکہ وہ اعمال بھی خداتعالیٰ ہی کی رحمت پر مرتب ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے۔

لولا اللہ ما اھتدینا[1] (کہ اگر اللہ میاں رحمت نہ فرماتے تو ہم ہدایت نہ فرماتے)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر خداتعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ نماز کی توفیق ہوتی نہ روزہ کی۔ ہم ہیں ہی کیا چیز۔ جب یہ ہے تو ہم اس عمل پر کیا ناز کر سکتے ہیں۔ بس رحمت ہی ہے کہ ہمیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو استطراداً بیان ہو گیا۔

محبت اور اطاعت

اصل میں بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب ہم حضورؐ کے طریقہ پر نہیں چلتے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ حضور

---

[1] الصحیح للبخاری ۵: ۱۴۰، ۸: ۱۵۸

صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کریں۔ بلکہ اگر کسی قدر ہم کو محبت بھی ہے تو وہ آپ ہی کی محبت کا عکس ہے۔ دیکھئے ہماری کوئی رات ایسی نہیں کہ درود شریف پڑھنے میں ختم کی ہو۔ بخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ہمارے لئے ساری ساری رات کھڑے رہتے اور ہماری بخشش کی دعا کرتے تھے ہماری محبت کا تو صرف یہ حاصل ہے کہ زبان سے دعویٰ ہے محبت کا اور ویسے نافرمانی کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت ایسی نہ تھی۔ وہ زبان سے نہ کہتے تھے مگر کرتے تھے۔ صحابہ کو جب حضورؐ کے ساتھ یہ محبت تھی تو اگر صحابہ سے جنگ احد میں لغزش ہوگئی تو ضرور وہ اجتہادی غلطی ہوگی۔ قصداً ہرگز نہ ہوگی۔

واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمی تیز انداز نگہبانی کو گھاٹی پر مقرر کر دیئے باقی لشکر لڑنے لگا جب ان تیراندازوں نے فتح اور غلبہ دیکھا تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آویں اور فتح میں شریک ہوں اور غنیمت لوٹیں۔ ان کے امیر نے اس سے منع کیا وہ نہ مانے وہاں صرف تھوڑے سے آدمی رہ گئے۔ پس کافروں کی فوج پیچھے سے آ پڑی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اس میں خطا اجتہادی ان کی یہ تھی کہ وہ لوگ اس مورچہ پر کھڑے رہنے کے حکم کو اس وقت تک محدود سمجھے کہ جب تک غلبہ نہ ہو۔ جب مسلمانوں کو غلبہ دیکھا تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس وجہ سے کہ اب تو غلبہ ہو ہی گیا ہے۔ اب یہاں کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غلطی اجتہادی ان سے ہوئی خدا تعالیٰ نے اس قصہ کو بیان کیا ہے اور پھر فرمایا ہے۔ **منکم من یرید الدنیا و منکم من یرید الاخرۃ** یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطار اسکندری کا ہے۔

وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرۃ۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی۔ مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بیباک ہوا ہی کرتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔

نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد ”وہ اللہ والا شخص نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے“

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی

حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آ کر ان کو پکڑ لیا اور کہا دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں اور وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو۔ ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محجوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا۔

نہ مرد است آنکہ دنیا دوست دارد ''وہ اللہ والا شخص نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے''

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہئے

اگر دارد برائے دوست دارد ''اگر وہ دنیا کو دوست رکھتا ہے تو محبوب حقیقی کی رضا کیلئے دوست رکھتا ہے''

دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا میں کیا حرج ہے ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف کرتے ہیں۔ آپ کچہری میں جا کر دیکھیں۔ وہاں خزانچی کا عہدہ ہے۔ اس کے سپرد خزانہ کی حفاظت ہے اور وہ مالک نہیں۔ خزانہ میں سے بلا اجازت لے نہیں سکتا۔ اگر وہ خزانہ کو قفل نہ لگائے اور چوری ہو جائے تو اس پر مقدمہ قائم ہو۔ اسی طرح ان حضرات میں سے بعض کو دنیا کی مال و دولت حق تعالیٰ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کو انتظام سے نہ رکھیں تو حق تعالیٰ ان سے ناراض ہوں اور بعض کو یہ حکم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھیں۔ اہل اللہ کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

''پھول سے کیا کہہ دیا کہ ہنس رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا کہ وہ رو رہی ہے''

ہر ایک کے ساتھ حق تعالیٰ کا جدا معاملہ ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی شان جدا ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ باقی ان کے اندر تمام صفات ہوتی ہیں۔

کمالات انبیاء

آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی ہے اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دے کر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا۔ آپؐ کے تو کمالات ظاہر کئے

ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترحم تھا باقی اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترحم نہ تھا، کسی میں یہ صفت نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی۔ ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں۔ تو ایسی مدح سے حضورؐ کب خوش ہو سکتے ہیں۔ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے۔ دیکھو نوح میں ترحم نہیں ترحم کا مادہ کم تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا۔ درویشانہ زندگی تھی۔ میرے سامنے یہ کتاب (۱۔ سیرۃ النبیؐ اس کا نام ہے، مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے۔) لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ سفید، قیمتی، خط نہایت نفیس پر رونق۔ ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں یہ خرافات بھری ہے کہ نوح علیہ السلام میں ترحم نہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست نہ تھی۔ کس قدر بے ادبی ہے انبیاء کی شان میں۔ اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاءؑ میں یہ مادے نہ تھے۔ کیا مادہ کے لئے ظہور بھی لازم ہے۔

اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اس وقت دیکھا کہ وہ کچھ بھی خرچ نہیں کر رہا تھا۔ بس آپ نے حکم لگا دیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے۔ اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے ظہور کا موقع نہ ہوگا۔ ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ کتنا بڑا سخی ہے۔ ایسے ہی انبیاء میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نو سو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے۔ مگر بددعا نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہوگا۔ کیا نظیر ہو سکتی ہے اس ترحم کی۔ پھر بددعا اس وقت فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا۔

انه لن یؤمن من قومک (الا من قد امن) (کہ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائیگا)

معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں۔ نو سو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلا دو۔ اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر وہ۔ دیکھو تو نوحؑ میں ترحم کیسا تھا کہ نو سو پچاس برس تک قوم کی تکلیف پر صبر کیا اور بددعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تختہ مشق بنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس وہ تو

فقیر اور صوفی تھے۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی۔ ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک کلہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا سامنے کر دو۔ مصنف صاحب نے حضرت عیسیٰ کا یہ حق ادا کیا ہے۔

اول تو میں کہتا ہوں کہ مصنف صاحب مدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل ہے اس کی کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے تو عدم وجود لازم نہیں آتا۔ دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے۔ ان کے سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی۔ سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیسے ہو سکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔

حضرت یہ حالت ہو رہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادہ سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔

شان اولیاء

اسی طرح اولیاء اللہ کی حالت ہے۔ ہر ایک کی جدا شان ہوتی ہے جیسے دنیا کے عہدے ہیں۔ کوئی اہل قلم میں سے ہے اور کسی کو اہل سیف میں سے کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ میں شانیں مختلف رکھی ہیں۔ کسی کو غریب اور کسی کو امیر بنایا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے۔ بعض اولیاء اللہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور بعض تنگ دست ہوئے ہیں۔ ہر زمانہ میں ہر شان کے بزرگ پیدا کر دیئے ہیں اگر مختلف شانیں نہ ہوں تو کام نہ چلے۔

راز اس کا یہ ہے کہ طالبین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے اس کے مناسب حال شیخ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص نے مولانا فضل الرحمان صاحب کی نسبت مجھ سے کہا کہ وہاں تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ایسا پیر بتلاؤ جہاں قدر ہو۔ وہاں تو جا کر غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سو طالب اس شان کے بھی ہوتے ہیں اگر سارے بزرگ ایسی ہی شان کے ہوں تو بتلایئے ایسا شخص کہاں جائے۔ اس لئے ضرورت ہے مختلف قسم کے بزرگوں کی۔ یہ تو خدا تعالیٰ کا باغ ہے اس میں ہر قسم کے پھول ہیں۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست “ہر پھول کا رنگ اور خوشبو جدا ہے”

کسی کو کسی سے مناسبت ہے اور کسی کو کسی سے۔ کسی کی گردن ایسی جگہ جھکتی ہے جہاں شان و شوکت ہو۔ اس لئے (ایسے مشائخ کی بھی ضرورت ہے) چنانچہ آج کل اکثر مشائخ کے یہاں بہت نرمی کی جاتی ہے اور میرے

١-اسی طرح دوسرے مشائخ کے یہاں نہ بیعت میں تنگی ہے نہ مریدین کے افعال پر گرفت ہے نہ معمولات اور قواعد معین اور حضرت والا کے یہاں یہ سب باتیں ہیں۔ اور ان کی ضرورت بھی ہے بعض طبائع کو یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں اور وہ اس کو سختی سمجھتے ہیں اور ناقدری خیال کرتے ہیں حالانکہ ان باتوں میں راحت ہی راحت ہے اور خانقاہ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے رابا کسے کارے نباشد

''بہشت وہ جگہ ہے جہاں تکلیف کا نام ونشان نہیں ہی کو کسی سے کوئی کام نہیں ہے''

ان امور کی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے وہاں رہ کر دیکھا ہو ان باتوں کے جو فوائد ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتے مشاہدہ کے متعلق ہیں جب کہ عقل سے بھی کام لیا جائے ورنہ ظاہر میں تو سختی ہی سمجھے گا۔١٢ جامع)

یہاں گو نہ سختی کی جاتی ہے پس جس کو جونسا مذاق پسند ہوتا ہے وہ وہاں چلا جاتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ کیا اچھی شان ہے کہ ان کے یہاں کھانے کو خوب ملتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ اگر ان کے یہاں لوگوں کا کھانا وغیرہ ہوتا تو میں ان کے یہاں کبھی نہ آتا۔ بس یہ سمجھتا کہ لوگ پیٹ کی خاطر یہاں آن پڑے ہیں۔

غرض کہ اہل اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کسی کے اندر امارت کی شان ہوتی ہے اور کسی کے اندر فقیر کا رنگ ہوتا ہے۔ بس اصل مشترک یہ ہے کہ غناء ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے اور فقر ہو تو وہ خدا تعالیٰ کے لئے۔

حضرت سلیمان اور سلطنت

حضرت سلیمان کے بارہ میں ارشاد ہوا۔ **ھٰذا عطاء نا فامنن او امسک بغیر حساب** یہ ہماری عطا ہے چاہے کسی کو دیجئے یا نہ دیجئے۔ آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ مواخذہ کے خوف سے جاہ وثروت اور سلطنت سے گھبراتے تھے۔ اس پر ارشاد ہو **ھٰذا عطاء نا** (یہ ہماری عطا ہے) **الخ** کہ تم سلطنت سے گھبراؤ نہیں تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ کو سلطنت دینے میں خدا تعالیٰ کی حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت میں بڑے بڑے متکبرین اور جابر بادشاہ تھے ان کی گردنیں پست کرنے کے لئے آپ کو ایسی سلطنت دی کہ سب کی گردنیں پست ہوگئیں۔ سب کے دعوے کو توڑ دیا۔ سلطنت تو آپ کا معجزہ تھا۔ سو دیکھئے آپ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ آپ تو سلطنت سے گھبراتے تھے اور ادھر سے دلاسا دے دے کر سر کی جاتی تھی۔ بس جس کے لئے جو مناسب ہوتا ہے اس میں اس کو مقید کر دیتے ہیں۔

بہر حال دنیا اگر حد کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ

دنیاللدنیا اور دوسری ارادہ دنیا الملآخرۃ۔ تو جو ارادہ دنیا آخرت کے لئے ہو اس میں کیا حرج ہے۔

ایمان اور تردد

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ جتنا رزق تمام عمر کے اندر میری قسمت میں لکھا ہے وہ مجھے ایک دم سے مل جاوے۔ اس پر خطاب ہوا کہ کیا ہمارے وعدہ پر وثوق نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ وثوق تو پورا ہے مگر شیطان پریشان کرتا ہے جب عبادت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ تو کھائے گا کہاں سے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دے گا تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ دے گا مگر یہ تو معلوم نہیں کہ کب دے گا۔ وہ مجھے پریشان کرتا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر کا ایک دم سے مل جاوے تو اس کو کوٹھڑی میں مقفل کر دوں۔ جب شیطان کہے گا کہاں سے کھائے گا تو فوراً کہہ دوں گا کہ اس کوٹھڑی کے اندر سے کھاؤں گا۔ بس پھر وہ وسوسہ نہ ڈالے گا۔ وہ بزرگ عقلاً تو غالب تھے شیطان پر لیکن طبعاً غالب نہ تھے۔

اس حکایت کو سن کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ کیسے بزرگ تھے کہ ان کو حق تعالیٰ پر اطمینان نہ تھا یہ بات تو بزرگی کے خلاف ہے مخلوق کے وعدہ پر تو ایسا وثوق ہو جاوے کہ وسوسہ بھی نہ آوے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اتنا بھی وثوق نہ ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے اور یہی شبہ اکثر واعظوں کی زبان پر عام مسلمانوں کے حق میں دائر ہوتا ہے کہ کوئی دعوت کر جاوے تو کیسے بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر ایسا بھروسہ نہیں۔ مگر سمجھ لیجئے کہ یہ الزام ہے مسلمانوں پر۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقت معین نہیں ہے اور ابہام میں خاصیت طبعیہ ہے بے اطمینانی نہ کہ بے یقینی اور مخلوق کی طرف سے وقت معین ہوتا ہے اور تعین میں خاصیت طبعیہ ہے۔ اطمینان چنانچہ اگر مخلوق کی طرف سے بھی وقت متعین نہ ہو۔ مثلاً کوئی اس طرح دعوت کرے کہ ہم جب دل چاہے ایک وقت کا کھانا بھیجیں گے تو ان کے وعدہ سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یہ کوئی الزام کی بات نہیں یہ تو امر طبعی ہے ہاں اگر حق تعالیٰ کا وعدہ معین ہوتا پھر اگر کوئی یقین نہ کرتا تو الزام تھا۔

پس چونکہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں تین قسم کا ابہام ہے ایک یہ کہ کب ملے گا۔ ایک یہ کہ کس درجہ سے ملے گا۔ زراعت سے یا تجارت سے یا اور کسی طریقہ سے۔ ایک یہ کہ کتنا ملے گا پیٹ بھی بھرے گا یا نہیں۔ چنانچہ کبھی کم ملتا ہے اور کبھی زیادہ ملتا ہے۔ اس واسطے تردد ہوتا ہے کیونکہ طبعی

بات ہے کہ ابہام سے تردد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ پر وثوق نہیں اور یہ تردد ایمان کے منافی نہیں بلکہ کمال ایمان کے بھی منافی نہیں۔

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کا ایمان ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل الایمان ہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ وہ عرض کرتے ہیں۔ ولکن لیطمئن قلبی. (اور لیکن میرے دل کی تسلی کے لئے) آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کسی درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمایئے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تردد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ تردد جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ اول تو ابراہیم علیہ السلام کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں ایسا تردد تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تؤمن کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ بلیٰ یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا۔ شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تردد کا وہ زمانہ تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ

اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون کے ہیں۔ یہ یقین کا مرادف نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ کر اس سے دھوکہ ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا یہی تو وجہ ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا بھی نہ چاہئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کے متعلق مجھ کو پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ ووجدک ضالاً فهدیٰ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ میں ضالاً کا ترجمہ گمراہ کردوں گا۔ اور گمراہ فارسی میں تو عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو کسی مترجم نے ضالاً کا

ترجمہ لفظ گمراہ سے کردیا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر دل میں اعتراض آیا ہوگا۔ میں نے کہا سنئے ترجمہ یہ ہے پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پھر واقف بنادیا۔ اس کو سن کر چپکے ہی تو ہوگئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن شریف میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کشاف نے مفسر کے لئے چودہ علوم کی ضرورت لکھی ہے میں نے ایک موقعہ پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت کردیا تھا کہ اگر نحو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کردیا تھا کہ اتنے علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے آج کل ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے۔ اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے یہ اردو میں تو مرادف ہے ایمان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

وساوس اور اسباب

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے کریں گے۔ یہ دیکھا دیجئے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا **انی یکون لی غلام** کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتلا دیجئے کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا۔ انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیف بمعنی سوال عن الکیفیت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کرتے ہیں۔ **رب ارنی کیف تحی الموتیٰ** کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا۔ **فخذ اربعة من الطیر الخ** (پس چار پرندے پکڑو) ان کو ہلالو۔ پھر ذبح کر کے خوب ان کا قیمہ کرلو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا۔ بس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا بس اس سے معلوم ہوگیا کہ مطلق تردد نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سالکین کے کام کی بات ہے ان کو بعض اوقات وسوسے گھیرتے ہیں تردد پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے سمجھتے ہیں کہ پہلی حالت کی طرف عود ہوگیا ہم مردود ہوگئے۔ یہ غلطی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ

وساوس کے آنے میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے اطمینان کی حالت پیش آ گئی تھی۔ اس وقت ناز ہونے لگا تھا۔ حق تعالیٰ اس کی اصلاح کے واسطے تردد میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ تردد خطرات وسواس مطلق منافی نہیں کمال کے۔ یہ علامت ضعف کی نہیں۔

خیر ان بزرگ کی حکایت یہ ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دفعہ دے دیجئے تاکہ وسواس سے نجات ہو جاوے۔ تو یہ حضرت جمیعت قلب کے لئے اسباب دنیا اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال کا وظیفہ عیال کے لئے جمع کر لیتے تھے۔ آپؐ نے ہماری تعلیم کے لئے ایسا کیا۔ آپؐ کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ امت کے ضعف کی رعایت فرمائی اگر آپؐ ایسا نہ کرتے تو امت یوں سمجھتی کہ جائز تو ہے مگر کمال کے خلاف ہے آپؐ نے عمل کر کے بتلا دیا کہ یہ کمال کے بھی خلاف نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذاق کے خلاف امت کے مذاق کی رعایت فرمائی۔ اگر آپؐ اسباب کو ترک فرما دیتے تو باوجود ہونے کے بھی ذخیرہ رکھتے ہوئے بہت سے متبعین کی طبیعت رکتی۔ ... کیا ٹھکانا ہے اس شفقت کا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بڑا فصیح ہو اور وہ بچہ کی رعایت کر کے توتلا بولنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اسباب کو اختیار نہ فرماتے تو آپ کا کوئی ضرر نہ تھا۔ بس صرف شفقت تھی جس کی وجہ سے ایسا کیا۔ مگر آپؐ نے اسباب کو ایک حد کے اندر رکھا۔

فضیلت آخرت

اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمہ تن اسی کی طرف مصروف ہو جاویں۔ اور ان کو دنیا میں انہماک کا ایک بہانہ ہو جاوے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک شخص نے کسی سے پوچھا تھا کہ تمہیں قرآن میں کون سا حکم پسند ہے تو کہا ہے کلوا واشربوا کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا دعا کون سی پسند ہے تو کہا ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء. (اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما)

اسی طرح بہت سے نئے تعلیم یافتوں کو صحابہ میں سے وہی حضرات پسند آئے ہیں جو مالدار تھے جیسے عبدالرحمٰن بن عوف ؓ حضرت عثمان غنی ؓ۔ جہاں مال جمع کرنے کی مذمت ہوتی ہے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ مال حاصل کرنا تو اچھی چیز ہے۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مالدار تھے اور جو مالدار نہ تھے وہ ان کو پسند نہیں۔ تو بات کیا ہے وہ ان کے مذاق کے موافق ہیں اس لئے پسند ہیں۔

غرض یہ کہ ہمارے اندر کثرت سے بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا (بلکہ تم دنیوی زندگی کو

ترجیح دیتے ہو) کا قصہ ہو گیا ہے۔ خاص کر عورتوں میں۔ میں عورتوں سے کہا کرتا ہوں کہ کبھی چوبیس گھنٹے میں کسی وقت تمہیں خدا تعالیٰ بھی یاد آتے ہیں۔ گوٹے ٹھپے، زیورا کی دھن میں دن رات رہتی ہیں۔ یہ حالت ہے کہ آج ایک زیور بنایا ہے۔ کسی عورت کے پاس دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا اب اس کو میاں سے ضد کر کے تڑوا رہی ہیں۔ اور دوسرے نمونہ کا بنوا رہی ہیں۔ وہ سمجھاتا بھی ہے مگر ایک بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک بنوا نہ لیں چین ہی نہیں آتا۔ خاوند کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان میں غالب دنیا کی محبت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے نہ کہ دنیا کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا۔ **بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا** اور یہ نہیں فرمایا **بل تطلبون الدنیا** آگے فرماتے ہیں۔ **والاٰخرۃ خیر و ابقٰی** یعنی (تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو) حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور ابقٰی بھی اس کو ترجیح دینا چاہیے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو وجہ سے دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ کے باغ، نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا، نہایت شیریں غرض ہر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔

دوسرے اس وجہ سے کہ ابقٰی (باقی رہنے والی) ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ کے لئے ہوں گی۔ کبھی زائل نہ ہوں گی۔ تندرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ ہوگا۔

اگر ایک محل ہو نہایت ہی اچھا کہ جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب میں اس میں پائی جاتی ہیں مگر وہ ایک دن کے لئے تو وہ کچھ بھی نہیں اور ایک مکان ہو عمدہ نفیس اور ہو بھی عمر بھر کے لئے تو وہ بڑی دولت ہے۔ تو آخرت میں دونوں صفت جمع ہیں۔ خیر بھی ہے اور باقی بھی۔ واللہ دنیا اور آخرت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا۔

سو حق تعالیٰ نے شکایت اس کی فرمائی ہے کہ آخرت کو تو اختیار نہیں کرتے ہو اور دنیا کو اختیار کرتے ہو۔ یہاں سے فیصلہ ہو گیا اس کا کہ دنیا کے طلب کرنے کی شکایت نہیں بلکہ دنیا کو ترجیح دینے کی شکایت ہے۔

مومن اور دنیوی متاع

اب میں مخاطبین کو متوجہ کرتا ہوں کہ اپنا اپنا امتحان کر لیجئے۔ جانچ کر دیکھ لیجئے کہ مال و دولت اور دنیوی مشاغل میں آپ سے آخرت ترک ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ترک ہوتی ہے تو ایسی دنیا قابل احتراز ہے اور اگر ترک نہیں ہوتی تو وہ حال ہے جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

گرت مال وزر ہست زرع وتجارت   چو دل باخدا نیست خلوت نشینی

"اگر مال وزر کھیتی اور تجارت کے مشاغل ہیں اور دل خدا کے ساتھ نہیں تو یہ خلوت نشینی ہے"

غرض دنیا کو قلب میں سے نکالئے' ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالئے۔ ہاتھ سے نکالنے کو ہم نہیں کہتے۔ مولانا نے مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

آب در کشتی ہلاک کشتی ست   آب اندر زیر کشتی پشتی است

کیا عجیب مثال ہے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے ہو تو اس کے جاری ہونے کا سبب ہے اگر وہ نہ ہو تو چل نہیں سکتی۔ اور جو کشتی کے اندر پہنچ جاوے تو ہلاک کر دے۔ مال کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر دل سے باہر رہے تو دین میں معین ہے اور جو دل میں گھس جائے تو باعث ہلاکت ہے۔ مومن کو دنیوی متاع کی بھی ضرورت ہے مگر جب کہ باہر رہے۔ قلب سے اسی کی بابت مولانا فرماتے ہیں۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول   نعم مال' صالح گفت آں رسولؐ

"اگر مال ودولت کو دین کیلئے حاصل کرو تو ایسے مال کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا مال فرمایا ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **نعم المال الصالح للرجل الصالح**[1] (اچھا نیک مال نیک آدمی کا مال ہے) مال سے مدرسہ بنا سکتا ہے۔ مساکین کی خدمت' طلباء کی اعانت کر سکتا ہے' حقوق ادا کر سکتا ہے۔ دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کر سکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے البتہ حب مال مضر ہے پس ہاتھ میں رہے۔ قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیار دست بکار۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسولؐ کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات مار دے۔ سو ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے۔ جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیا دار نہ ہوگا۔

تارک الدنیا اور متروک الدنیا

اب اس مضمون کی تکمیل کی ضرورت ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکالے کیسے تاکہ ہر مسلمان اسی طریقہ کو اختیار کرے۔ جہاں بی اے' ایم اے کے پاس کرنے کی ضرورت ہے اس دوسرے بی

---

[1] مسند الامام احمد ۱۹۷:۴ ؛ الادب المفرد للبخاری: ۲۹۹، اتحاف السادة المتقین ۱۳۹:۸، ۸۷:۹

اے ایم اے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔ بس ایک پاس اور کرنا ہوگا اگر کوئی کہے کیا فقیر بناؤ گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ فقیر تو اب ہیں۔ اس وقت فقیر نہ رہو گے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مال تو ہے مگر چین نہیں۔ یہ کیا امارت ہے۔ ہم ایسا امیر بنائیں گے کہ الغنی غنی النفس (غنی وہ ہے جو دل کا غنی ہو) اس وقت حقیقی امیر ہو گے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے۔ آپ کے بارہ میں جو مسکین کا لفظ آیا ہے اس کے یہ معنی نہیں جیسے آج کل غریب مسکین ہیں کیا غریب کی یہ شان ہوتی ہے کہ قربانی میں سو اونٹ ذبح کر دے سو سو اونٹ مساکین کو تقسیم کر دے۔ غریب اسے کہتے ہیں کہ لینے پر مرتا پھرے اور نہ ملے۔ نہ یہ کہ ملتے ہوئے کو چھوڑ دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے من جانب اللہ حق پوچھا گیا کہ اگر آپ کہیں تو آپؐ کے لئے احد پہاڑ کو سونا کر دیں اور آپؐ کے ساتھ ساتھ رہا کریں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ مجھ کو تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجا لاؤں۔ اور جب نہ ہو تو آپ سے مانگوں۔ غریب متروک الدنیا ہوتا ہے۔ آپ تارک الدنیا تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سلطنت تھی۔ آپ کو سلطنت کے اختیارات تھے۔ سو اس کو غریب نہیں کہتے

غرض کہ آپ کو فقیر ہونے کو نہ کہا جاوے گا۔ یہ غلط ہے کہ مال و متاع دنیا کا ترک کرایا جاتا ہے۔ نہیں کمائے کھائے ہاں طلب دنیا مذموم طریقہ سے نہ ہو۔

حب حق

یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ حب حق آپ کے اندر غالب ہو جہاں سب چیزیں حاصل کی ہیں ایک حب حق بھی حاصل کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حب حق آپ کے اندر بالکل نہیں آپ میں حب حق ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے بتی بھی ہے سارا مصالحہ بھی موجود ہے مگر اس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرائع ابھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی۔ آپ کے پاس کمی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کسی اور سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یک سبد پر ناں ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب ناں دربدر

"روٹیوں سے بھرا ایک ٹوکرا تیرے سر پر ہے اس کے باوجود تو در بدر روٹیاں تلاش کر رہا ہے"

سب کچھ ہمارے پاس ہے مگر اسے بڑھانے کی ضرورت ہے سو آپ میں حب حق تو ہے مگر غالب نہیں حب حق کا غلبہ ہونا چاہیے اس کی ضرورت ہے۔ شاید آپ یوں خیال کریں کہ تسبیح لینے کو یا مرید ہونے کو کہے گا میں اس کو نہیں کہتا میں یہ کہتا ہوں کہ تھوڑی سی مشقت کی ضرورت ہوگی۔ یہ

نہیں کہ تکلیف ہوگی۔ آپ کا کھانا یا سونا چھڑوایا جائے گا۔ مشقت بایں معنی ہے کہ نفس ایک بات کو نہیں چاہتا اور یہاں اس کو کرنا پڑے گا پس مشقت صرف یہ ہے کہ نفس کے خلاف کرنا ہوگا۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس کام کے اختیار کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ یہ کہ آپ نے کبھی مسہل لیا ہوگا۔ اگر خود نہ لیا ہوگا تو دیکھا تو ہوگا ہی۔ طبیب تھوڑے دنوں پرہیز کراتا ہے۔ منضج پلاتا ہے پھر مسہل دیتا ہے۔ جس دن مسہل دیتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ گھر میں بیٹھے چلئے پھرئے نہیں۔ مسہل میں نہ باتیں کرو نہ سنو نہ سوؤ۔ اگر ایسا کیا تو دست نہیں آئیں گے۔ بس تم اس تصور میں بیٹھے رہنا کہ اب آیا دست اب آیا دست وہ اس قدر پابندی کراتا ہے پھر بھی صحت کے بعد اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب مقدمات کا وقت ہے۔ اب فلاں کام درپیش ہے بلکہ سب چھوڑ چھاڑ کر اس کے تابع ہوجاتے ہیں اور اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

بس اسی طرح مشائخ مسہل دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مسہل کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ طبیب مسہل میں تھوڑی دیر کے لئے مشورہ خلوت کا بھی دیتا ہے اس کو بجان و دل منظور کرتے ہیں اور اگر شیخ اس کو کہے تو دم نکلتا ہے۔ طبیب تو بڑے بڑے پرہیز کراتا ہے اور یہاں شیخ تھوڑے سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے یعنی معاصی کا پرہیز کراتا ہے۔ مگر ان کے ساتھ لوگ الجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو جی اتنے دن اپنے پاس رہنے کو ہی بتلا دیا۔ کوئی اتنی فرصت کہاں سے لائے۔ اتنے دنوں کی خلوت اور خاموشی تجویز کردی۔ کوئی کہاں تک خاموش رہے۔ ان کی تجویزوں پر لوگ الجھتے ہیں اور طبیب کی تجویز پر کوئی نہیں الجھتا۔ طبیب کی تجویز پر بھی تو الجھنا چاہیے کہ بس جی ہم باز آئے علاج سے مگر وہاں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ یہاں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام طبیب کرتا ہے وہی شیخ کرتا ہے۔ مگر شیخ کو تو الزام دیں اور طبیب کے ممنون ہوں۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تم ساری عمر رگڑتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھوڑے دنوں پرہیز بتلائیں گے۔ ساری عمر نہ رگڑیں گے۔ پھر تو خود ہی چاٹ ایسی پڑ جائے گی کہ چھوٹے ہی کی نہیں اور نیز جیسے کہ اپنی اصلاح ضروری ہے بچوں کی بھی ضروری ہے۔ پس خود اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بچوں کی اصلاح کی بھی ابھی سے فکر کرو۔ کیونکہ بچپن میں اخلاق زیادہ درست ہوتے ہیں اب اس کا طریقہ کیا ہے وہ میں بتلاتا ہوں۔

طریق اصلاح

وہ طریقہ ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے۔ صحبت اہل اللہ اگر کوئی کہے کہ بچوں کے لئے اتنا خرچ

کہاں سے آئے کہ اہل اللہ کے پاس بھیجیں اور وہاں ان کو رکھیں میں کہتا ہوں کہ کیا بچہ کے لئے اتا نہیں رکھتے۔ ماسٹر کو تنخواہ نہیں دیتے۔ اس کے لئے بائیسکل نہیں خریدتے۔ لندن نہیں بھیجتے۔ کیا سینکڑوں روپے خرچ نہیں کرتے۔ جہاں اور تمام باتوں کا انتظام کرتے ہو اللہ والوں کی صحبت کا بھی انتظام کردو۔

اس کی صورت بہت ہی آسان ہے کچھ مشکل نہیں۔ وہ یہ علاج روحانی کے لئے دو عمل کی ضرورت ہے جس میں ایک جزو یہ صحبت بھی ہے ایک تو یہ کہ روزانہ کوئی وقت لے لو جس میں کسی کام کا حرج نہ ہو۔ تو سب سے زیادہ بیکار وقت سونے کا ہے یہی لے لو۔ بس اس میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے لے کر اس میں یہ کرو کہ کوئی کتاب دین کی بچہ کو دیجئے کہ وہ خود پڑھے یا آپ اس کو سنا دیں۔ کوئی دن اس سے خالی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی دو دن چار دن جب زمانہ چھٹی اور اسکول کی تعطیل کا ہو صحبت اہل اللہ اختیار کریں بلکہ اگر تمام زمانہ چھٹی کا اس میں خرچ نہ کریں تو یوں کریں کہ اسکول میں مہینہ بھر کی چھٹی ہوتی ہے اس کے دو حصے کریں ایک حصہ کھیل کود میں گزاریں اور ایک حصہ اہل اللہ کی صحبت میں مگر یہ ضرور ہے کہ پہلے انتخاب کسی محقق کر لیجئے اور وہ محقق ایسا ہوگا کہ ان پر کچھ تشدد نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ نماز وغیرہ کو بھی ان سے نہ کہے گا۔ وہ ایسا طرز اختیار کرے گا کہ بلا کہے تمام باتوں کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے پاس بیٹھنا ہی سب باتوں کی اصلاح کے لئے کافی ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزانہ کا عمل تو وہ ہے کہ کتاب خود پڑھا کریں یا آپ سنایا کریں اور کبھی کبھی کا عمل یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ اول ہی سے ان بچوں کے لئے اس طریق کا التزام کر لیجئے پس اس طریقہ کے اندر دو چیزیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ دوسرے مسائل دین اور احکام دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں بس اس کا التزام کیجئے اور ابتداء ہی سے کیجئے۔ ابتداء سے کریں گے تو وہ آسانی سے پابند ہو جاویں گے اور اس کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں گے۔ مثلاً اگر غیبت کریں تو روک دیجئے اور کہئے کہ بری چیز ہے ان کو نفرت دلایئے ان سے کبر کی شان ظاہر ہو تو روک دیجئے اور بتلایئے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ جھوٹ بولے تو اس کی خرابی بتلایئے۔ جماعت کی نماز کے ترک پر تنبیہ کیجئے اگر سکول میں جماعت کی پابندی نہ ہو تو تعطیل کے ایام میں تو ضرور ہو۔

بچوں کی تربیت

اب تو خود مساجد کی حاضری بھی امراء میں متروک ہو گئی ہے۔ جس کی ایک کھلی خرابی یہ ہے کہ ان حضرات کو مسجد کی ضروریات تک کی خبر نہیں رہتی۔

میں شاہجہان پور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں مٹی کے تیل کی ڈبیا رکھی

ہوئی ہے اور اس کے دھوئیں سے تمام مسجد کالی ہو رہی ہے اور مسجد کے قریب ہی ایک رئیس صاحب رہتے تھے اس وقت ان کے یہاں میری دعوت تھی۔ ان کے یہاں جو گیا تو بجلی کی روشنی تھی۔ میں نے ان کو اس پر شرم دلائی ان کے ہاں تو بجلی کی روشنی ہے اور مسجد میں ڈبیا جلتی ہے تب انہوں نے تیل کا انتظام کیا۔

وجہ یہ ہے کہ مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نماز اپنے گھر پڑھتے ہیں جب یہ حالت ہے تو مسجد کی طرف توجہ کیسے ہو۔ کسی چیز پر نگاہ پڑنے سے بہت خیال ہوتا ہے۔

ایک رئیس صاحب تھے۔ میں نے ان سے مسجد میں نماز پڑھنے کو کہا تو کہنے لگے کہ صاحب مسجد کی تو یہ حالت ہے کہ نہ فرش ہی ٹھیک ہے نہ وضو ہی کرنے کا انتظام ہے۔ مسجد میں کیا جاویں میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو اپنے ہی اوپر ہے یہ قصور تو آپ کا ہے آپ مسجد کی خبر نہیں رکھتے۔

تو بچوں کو ابتداء ہی سے اس کا پابند کیجئے کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھا کریں۔ اسی طرح بچوں میں بچپن سے یہ بات پیدا کیجئے کہ ان کو مسلمانوں سے اجنبیت نہ ہو۔ ان کو غرباء سے اختلاط کی تعلیم دیجئے۔ صاحبو! غربا کے ساتھ اختلاف میں دنیوی جاہ بھی ہے ان سے ملو گے تو وہ قدر کریں گے اور امیروں کے ساتھ اختلاط میں کچھ عزت نہیں ہوتی کیونکہ امراء تو خود ہی اینٹھ مروڑ میں رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ پس یہ مادہ بچپن ہی سے پیدا کرو کہ غرباء سے نفرت نہ ہو۔ یہ باتیں بچپن سے پیدا ہوں گی بڑے ہونے کے بعد پھر ذرا دشوار ہے اسی طرح بچوں کو اس کی تاکید بھی کیجئے کہ لباس خلاف شرع نہ پہنیں۔ دوسری قوموں کی وضع نہ اختیار کریں۔ بعض لوگ تشبہ کے مسئلہ میں کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب غیر قوموں کے ساتھ تشبہ میں حرج کیا ہے۔ کیا کافروں کے ساتھ مشابہ ہونے سے کافر ہو جاویں گے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مرد زنانہ لباس پہنے تو اس کو کیا کہو گے۔ اگر تشبہ میں خرابی نہیں تو تشبہ بالنساء کیوں نہیں کرتے۔ کوئی عورت کا لباس پہن کر دکھا تو دے عورتوں کا لباس پہننے سے بھی تو عورت نہ ہو گا۔ پھر کیوں نہیں پہنتے۔ بس کچھ بھی نہیں دین کو اپنے تابع بنا رکھا ہے یہ بھی تو نہیں کہ اس کے پہننے پر عہدے موقوف ہوں۔ بعض اسلامی روش پر ہیں مگر بڑے بڑے عہدے ان کو ملے ہوئے ہیں۔

حاصل یہ کہ بچوں کے لئے صحبت اہل اللہ کا بھی انتظام کیجئے اور تعلیم دین کا بھی سلسلہ رکھئے اور پھر اس پر عمل بھی کرائیے یہ اجمالی تدبیر ہے اصلاح کی یہ تمام عمر کے لئے دستور العمل ہے۔

اہل اللہ کی صحبت

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ عمر کا ایک معتد بہ حصہ سال دو سال ایسا مل جاوے کہ اس

میں اہل اللہ کی صحبت متصل میسر ہو جاوے تو یہ بہت ہی نافع ہے۔ سال بھر نہ ہو تو چھ ماہ سہی یہ بھی نہیں تو چالیس ہی دن سہی۔ حدیث میں اس حدود کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

شنیدم رہروے در سر زمینے　　ہمیں گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ بود صاف　　کہ در شیشہ بماند اربعینے

بس چالیس دن نکال کر کسی شیخ کامل کے پاس رہ پڑے۔ مگر گھر بار اور جتنے تعلقات ہیں سب کا بندوبست ایسا کر کے جائے کہ قلب کو تشویش نہ ہو۔ نوکری میں رخصت لے لے۔ غرض بے فکری سے رہے چالیس دن کے لئے اپنے کو بالکل شیخ کے سپرد کر دے۔ شیخ دو کام کریں گے کچھ تو اعمال بتلائیں گے کچھ اوراد۔ اور اس سے بے فکر رہئے کہ تحمل سے زیادہ نہ بتلائیں گے۔ اور وہاں کسی سے تعلق مت رکھو کسی سے بلا ضرورت شدید بولو بھی مت۔ اصل کام ذکر اللہ اور اطاعت الٰہی رکھو چالیس دن میں جو مادہ خبیث آپ کے اندر ہے حسد، غصہ، کبر، حب دنیا وغیرہ وہ سب نکل جائے گا۔ اور جو شبہ یا جو حالت پیش آئے بے تکلف شیخ کے سامنے پیش کر دو اور اطلاع کے بعد اپنے کو شیخ کے سپرد کر دو کہ جو ان کی سمجھ میں آئے وہ کریں۔ علاج مشکل ہو یا آسان سب کو برداشت کر دو ہوگا تو آسان ہی مگر اول اول دشواری معلوم ہوگی پھر کوئی دشواری نہ معلوم ہوگی۔

چنانچہ میں نے بھی ایک صاحب کا علاج کیا ہے ویسے وہ عالم و فاضل ہیں۔ مگر مجھ کو آثار سے معلوم ہوا کہ ان میں کبر ہے۔ میں نے علاج یہ تجویز کیا کہ خانقاہ والوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر کے رکھا کریں تاکہ ان کو پہننے میں سہولت ہو۔ اس کو سن کر ان کی یہ حالت ہوئی جیسے گولی ماردی اور خیال ہوا کہ انہوں نے یہ کیا کام بتلایا مگر مجبور تھے کرنا پڑا۔ جوتیاں سیدھی تو کیں مگر عشاء کے وقت کہ کوئی دیکھے نہیں۔ یہ نفس کی خباثت تھی۔ پھر دن کو جوتیاں سیدھی کرنا شروع کیں۔ یہ حالت ہوگئی کہ اول تو وہ شرماتے تھے اب لوگ شرمانے لگے۔ بعض لوگ ان کو منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان سے تعرض مت کرو۔ جیسے کریں کرنے دو۔ چند روز تک تو یہ رہا اس کے بعد میں نے کہا کہ نمازیوں کو وضو کیلئے پانی بھر بھر دیا کرو۔ یہ بھی کیا جب ایک زمانہ گزر گیا تو میں نے کہا کہ بس چھوڑ دو۔ پہلے تو کرتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی اب یہ حالت ہوگئی کہ چھوڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ایک تو اس لئے کہ ان کو اس سے ایک مناسبت سی ہوگئی تھی۔ دوسرے نفس کہتا تھا کہ سب کے سامنے ظاہر تو ہو ہی گیا اور لوگ بزرگی کے معتقد بھی ہونے لگے اب یہ کام چھوڑا جاتا ہے نفس نے کہا کہ

اب اگر چھوڑوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب پھر انہیں تکبر ہو گیا۔ اب چھوڑنے میں ذلت ہے جیسے پہلے کرنے میں ذلت تھی۔ نفس چھوڑنے میں بڑے رنگ لایا کہنے لگے کہ مجھ کو چھوڑنے کا حکم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ بس اب اس کو چھوڑ دو۔ اب یہ کرو کہ نہ کسی سے ملو جلو نہ بات کرو۔ تنہا حجرہ میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ پہلے تو کہتے تھے کہ انہوں نے یہ کیا کیا کہ جوتے سیدھے کرنے کو کہہ دیا۔ مگر پھر قسم کھا کر کہتے تھے کہ مجھ کو اس عمل سے اتنا بڑا نفع ہوا کہ سالہا سال میں بھی نہ ہوتا۔

جس کے اندر کبر ہو یہ تو اس کا علاج ہوا اب فرض کرو کہ کسی میں زینت بہت ہے۔ مانگ پٹی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو اس سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ شیخ اس کا علاج یوں کرے گا کہ جھاڑو ہاتھ میں دے گا اور کہے گا سڑک پر جاؤ اور جھاڑو دو۔ مسلمانوں کو آرام پہنچے اس عمل کے کرنے سے وہ شخص زینت کو چھوڑ دے گا۔

پہلے بزرگ اس طرح کرتے تھے۔ وظیفے زیادہ نہ بتلاتے تھے وظیفے تو اب ہوئے ہیں کہ جہاں طالب نے کسی مرض کی شکایت کی بس ایک وظیفہ بتلا دیا۔ امراض کہیں وظیفوں سے جاتے ہیں ان کا ازالہ تو اسی طرح ہوتا ہے یا کسی میں حسد کا مادہ ہے تو شیخ محسود کے پاؤں دبانے کو کہے گا۔ سائنس کی رو سے اس کا راز یہ ہے کہ اس سے محسود کے دل میں اس کی محبت ہوگی تو پھر اس کو بھی ہوگی اور جب اس کو اس کے ساتھ محبت ہو جاوے گی تو پھر حسد جاتا رہے گا۔ سو اس طریقہ سے ازالہ ہوتا ہے ان امراض کا۔

علم اور اصلاح علم

اب لوگ ان کے مذموم ہونے کے صرف علم کو کافی سمجھتے ہیں کہ جب ان کی برائی معلوم ہو گئی تو خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ اصلاح کے لئے تنہا علم کافی نہیں۔ دو دو جملے کے سننے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ عملی صورت سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تا در نہ کشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

”صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے۔ پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے“

اخلاق کی درستی تو خبیث مادہ کے نکلنے ہی سے ہوگی۔ دیکھئے آپس کی نااتفاقی سب جانتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے مگر پھر بھی اس کو نہیں چھوڑتے وجہ یہ کہ مذموم ہونے کا علم صرف کافی نہیں۔ اس کے مادہ کو اپنے اندر سے نکالنے کی ضرورت ہے۔ پس سوچنا چاہئے کہ اس کا مادہ کیا ہے جس سے یہ نااتفاقی پیدا ہوتی ہے تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کبر سے پیدا ہوتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق تو کرتے ہیں مگر ان کو اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ بس اتفاق ہو جائے گا۔ آج کل جو اتفاق نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اتفاق کے معنی سمجھ رہے ہیں کہ دوسرا میرے تابع رہے میں تابع نہ ہوں۔ یہ حالت ہے کہ باپ بیٹوں میں لڑائی بلکہ پیر مرید میں لڑائی یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر شخص اپنے کو بڑا بنانا چاہتا ہے پس اس کی جڑ کبر ہے۔

ان خصائل کو برا تو سب کہتے ہیں مگر ان کو مٹاتے ہیں اہل اللہ ان کے ازالہ کا علاج بس انہیں کو آتا ہے۔ ان کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے وہ ان اخلاق ذمیمہ کو نکالیں گے۔ یہ رذائل مٹ گئے تو ساری سعادت کی کنجی ہاتھ میں آ گئی۔ غرض یہ کہ ایک تو وہ یہ کام کریں گے اور دوسرے اوراد میں مشغول کریں گے وہ بھی ایسے جو آپ سے ہو سکیں۔ اللہ کا نام لینے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلق طبعی ہو جاوے گا اللہ سے۔ اس میں یہ خاصیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس وقلب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے بعد حدود سے تجاوز نہ کرو گے۔ معصیت سے ایسی نفرت ہو جاوے گی جیسے پاخانہ سے۔ اس وقت گناہ چھوڑنا مصیبت ہے اس وقت گناہ کرنا مشکل ہوگا۔ بس کسی قدم پر نافرمانی نہ ہوگی اگر مال بھی ہوگا تب بھی یہ حالت ہوگی کہ جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو کارخانہ سپرد کرتا ہے۔ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے انتظام میں پھرتا ہے اور اس کے اندر وہی تصرف کرتا ہے جس سے محبوب خوش ہو اس کی مرضی کے خلاف اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا خاص کر جب کہ یہ علم ہو کہ محبوب دیکھ بھی رہا ہے ساری دنیا اس کے پاس ہوگی مگر قلب میں سوائے محبوب کچھ بھی نہ ہوگا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے پاس بڑے بڑے کارخانے ہیں مگر وہ صغیرہ بھی نہیں کرتے سو اصلاح کا ایک تو یہ اثر ہوگا کہ معاصی سے نفرت ہو جاوے گی۔ دوسرے اس کا یہ بھی اثر ہوگا کہ خلق کی نظر میں جاہ بڑھے گا۔

اہل اللہ کی قوت قلبیہ وجسمانیہ

ایک اور عجیب بات ہے کہ اس سے قوت جسمانی بھی بڑھتی ہے۔ اہل اللہ میں قوت جسمانیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گو کہ ان کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ راتوں کو جاگنے اور مجاہدہ کرنے سے دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر روح میں افسردگی نہیں ہوتی۔ ہر وقت تازہ رہتے ہیں۔ اور راز تازگی کا یہ ہے کہ ان کو معیت ہے محبوب حقیقی سے۔ آپ محبوب مجازی کو دیکھ کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ جب ادنی

سے محبوب کی معیت میں یہ اثر ہے تو پھر خدا تعالیٰ کی معیت میں کیوں نہ اثر ہو۔ اسی واسطے وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو معیت ہے حق تعالیٰ سے۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ   جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں   فوق گردوں است نے قعر زمیں
با تو دوزخ جنت است اے جانفزا   بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

’’جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب خوش و خرم بیٹھا ہو وہ جگہ آسمان سے بلند تر ہے نہ کہ پست زمین۔ اے پیارے دوست تیرے ہمراہ دوزخ بھی جنت ہے اور اے دلربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے‘‘۔

یہ راز ہے ان کے خوش رہنے کا اور خوش رہنے سے جسمانی قوت زیادہ ہوتی ہے نیز چونکہ ان کو معیت ہوتی ہے محبوب سے ان کا قلب بھی قوی ہوتا ہے۔ آپ ایک ہزار کے جاتے رہنے سے دلگیر ہوں اور وہ لاکھ روپے کے بھی جاتے رہنے سے نہ ہوں۔ یہ حالت ہوتی ہے ان کے قوت قلب کی بلکہ ان میں جو غریب ہیں ان کی بھی یہ حالت ہوتی ہے۔

ہم نے ایک غریب کو دیکھا کہ وہ کھیتی کرتے تھے ان کو روپے کی ضرورت ہوئی لیکن کہیں سے بلا سود نہ ملتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں سودی قرض نہ لوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ اب ان کی اولاد ہے ان کا بھی وہی طریقہ ہے تھوڑی سی زمین میں کھیتی ہوتی ہے مگر اس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے کہ اور کسی کے یہاں اس سے زیادہ زمین میں بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک خراب زمین خریدی تھی۔ وہ ایسی اچھی ہوگئی کہ قصبہ میں ایک زمین بھی ویسی نہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو یہ بھی نصیحت کی تھی کہ دودھ کا جانور نہ رکھا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے جماعت نہیں ملتی۔ جو جماعت کا وقت ہوتا ہے وہی دودھ دوہنے کا ہوتا ہے۔

ان ہی کی قوم میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لڑکیوں پر روپیہ لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے لڑکے کی شادی کرنی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ پیغام دیا وہاں سے روپیہ کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ شرع میں ایسا روپیہ لینا حرام ہے۔ اس لئے میں ہرگز نہ دوں گا۔ چاہے شادی ہو یا نہ ہو۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ ہاتھ جوڑتے آئے اور کہا لڑکیاں موجود ہیں ہم روپیہ نہیں لیتے۔

لوگ ہر بات کی سائنس ڈھونڈتے ہیں چنانچہ یہاں پر بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب اگر

دین کے مقابلہ میں دنیا کے فائدہ کو چھوڑ دیا کریں گے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بات میں خدا کو کیوں نہ دیکھو انہیں بزرگ کو دیکھ لو کہ انہوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات ماری تو خدا تعالیٰ نے ان کا کام کس طرح چلایا۔

خلاصہ یہ کہ جو دستور العمل میں نے بیان کیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت ہوگی کہ اگر دنیا کا زیادہ کاروبار بھی کریں گے تو دل اس کے اندر مشغول نہ ہوگا۔ اس وقت تو آپ کو قدرت نہیں ہے کہ لمبے پیمانہ پر کام کریں اور قلب اس کے اندر مشغول نہ ہو۔ اور جب اصلاح ہو جاوے گی تو پھر بڑے پیمانہ پر بھی کام کرو گے تب بھی قلب مشغول نہ ہوگا۔ پس اہل اللہ کے پاس رہنے کیلئے چالیس دن تو ضرور نکالنے چاہیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کی صحبت کافی ہے۔ یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ ہر کسی کو موقع مل سکتا ہے اس کے بعد اب گنجائش نہیں رہی، اس عذر کی کہ ہم دنیا میں مشغول تھے ہم دین کا کام کیسے کرتے۔ چنانچہ لوگوں کا آج کل یہی گمان ہو گیا ہے اور واقع میں مذاق بگڑ گیا ہے کہتے ہیں کہ اگر دین حاصل کریں گے تو بھوکے مریں گے یہ واقعات میں نے بیان کئے ہیں۔ اس طریق پر یقینی کامیابی ہے۔ اب وہ لوگ بتلائیں تو سہی کہ میں نے کون سی نوکری چھڑائی۔ کون سی مشقت کے کام لئے اس طریقہ پر عمل کرنے میں کون سی دشواری ہے۔ پس اب ہمت کر کے اس پر عمل شروع کر دیجئے جب تم اس طریقہ پر عمل کرو گے تو یقینا کامیابی ہوگی اور پھر تؤثرون الحیوۃ الدنیا کے مصداق نہ بنو گے۔

حیات آخرت

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوۃ الدنیا اور آخرت کے ساتھ لفظ حیات نہ لائے یوں نہیں فرمایا۔ وحیوۃ الآخرۃ خیر و ابقی (آخرت کی زندگی بہتر اور باقی رہنے والی ہے) یہ کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں ممات کا کچھ کام نہیں پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے بھی ہو۔ پس جب کہ حیات آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں ورنہ اس کی طرف توجہ تام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف رخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو اسی کو سوچو اگر اس کی

پوری حقیقت سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا کے عاشق ہوئے ہو ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بدہیئت عورت نے پوڈر مل رکھا ہو اور دو چار چندھے اس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت ہے۔

حال دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانہ! گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانہ
باز گفتم حال آنکس کو کہ دل دروے بہ بست گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ

ایک عقلمند سے میں نے دنیا کا حال دریافت کیا اس نے کہا کہ یا تو خواب ہے یا غول بیابانی یا افسانہ ہے پھر میں نے کہا کہ اس شخص کا حال بیان کرو جس نے اسمیں دل لگالیا۔ اس نے جواب میں کہا یا تو وہ بھتنا ہے یا شیطان ہے یا دیوانہ ہے۔

حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی ہے۔ **بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا والآخرۃ خیر و ابقیٰ** (بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے) کہ دنیا ایسی رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور اچھی ہے ہر چند کہ عورتوں کے متعلق کوئی خاص مضمون ذکر نہیں ہوا۔ مگر جو مضامین بیان ہوئے وہ جیسے مردوں کے لئے نافع ہیں عورتوں کے لئے بھی مفید ہیں۔

کچھ عورتوں کے متعلق

خیر اب چند باتیں خاص ان کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں حب دنیا میں ہیں تو سب مبتلا مگر یہ زیادہ ہیں۔ ان کو علم کم ہے۔ صلحاء کی صحبت کم کیونکہ یہ گھر سے تو نکل نہیں سکتیں۔ لیکن ان کے لئے یہی تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو اہل اللہ کی خدمت میسر نہیں تو ان کا کلام تو میسر ہو سکتا ہے بزرگوں کے کلمات اور ملفوظات تو موجود ہیں۔ اگر خود ان سے وعظ نہیں سن سکتیں تو چھپے ہوئے وعظ تو ہیں۔ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عورتیں جمع ہوا کریں۔ جو ان میں پڑھی لکھی ہو وہ پڑھا کرے اور سب سنا کریں۔ جیسے اور دنیا کے کاروبار کرتی ہیں۔ بس ایک اس کو بھی معمول کر لیں۔ جو برکت اہل اللہ کی خدمت میں حاصل ہوتی وہ اس طرح ان کو حاصل ہو جاوے گی۔

ایک یہ کہ ضروری مسائل کی کتابیں پڑھیں یا سنیں اور خیال رکھیں کہ ان کے موافق عمل ہو۔ کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔

ایک یہ کہ اپنے عیوب کو ٹٹولیں اور ان کا علاج کریں۔ کتابیں دیکھنے سے اس کا پتہ چل سکتا

ہے۔ اگر کسی بات کا علاج معلوم نہ ہو اور کتاب میں نہ ملے تو اپنے مردوں سے خواہش کریں کہ وہ کسی بزرگ کے پاس لکھ کر بھیج دیا کریں وہ تجویز کریں اس کے موافق عمل کریں۔

ایک تدبیر تمام معاصی کی مشترک تدبیر ہے۔ اس سے ہر معصیت کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور وہ تدبیر مرد اور عورت دونوں کے کام کی ہے اور یہ کہ جس فعل کا مادہ تقاضا کرے اسے مت کرو۔ مثلاً پرائی عورت کے دیکھنے کو جی چاہا تو نگاہ کو روکو۔ ہرگز مت دیکھو۔ غصہ آئے تو روکو۔ غرض جس مادہ کا تقاضا ہو اس کے خلاف کرو مثلاً ایک شادی ہی ہے اس میں رسومات جو کی جاتی ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ نام ہو جاوے منشاء اس کا کبر اور تفاخر ہے اور وہ ہے حرام۔ پس یہ رسومات بھی حرام ہوئیں تو ان کے مادہ کے مغلوب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ رسومات کو مت کرو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ناچ گانا ہی رسم ہے ناچ گانے کے علاوہ بس اور کوئی رسم نہیں۔ کھانا کھلانا وغیرہ اس میں رسم کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ناچ گانے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جتنی باتیں نام کی وجہ سے کی جاتی ہیں وہ سب رسوم قبیحہ ہیں۔

علاج یہ ہے کہ ان قصوں میں مت پڑو۔ جہیز دینے کو طبیعت چاہے خوب دو مگر ساتھ مت کرو۔ دکھاؤ مت۔ لڑکی کو خالی بھیج دو جب گھر واپس آوے تو اس کو ان تمام چیزوں پر قابض بنا دو۔ اب اس کی ملک ہو گیا جب چاہے لے جاوے۔ اسے مشورہ دو کہ جس چیز کی بالفعل ضرورت نہیں اسے مت لے جا۔ جہیز کو مجتمعاً مت جانے دو۔ یہ ہے علاج کبر کا۔ نہ یہ کہ ان رسموں کو تو کرتے رہیں اور دل سے فخر اور نام کی نیت نکال دیں یاد رکھو کہ جب تک ان کو ترک نہ کرو گے اس وقت تک دل سے فخر اور تکبر ہی نہیں نکل سکتا تاوقتیکہ علاج طریقہ سے نہ کرو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھ کو ایک وقت میں تعجب تھا کہ علماء بیواؤں کے نکاح کی تاکید اس قدر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں اتنا پیچھے پڑتے ہیں۔ بس سمجھا دیا کریں کہ نکاح سنت ہے یا مستحب اصل مقصود تو عقیدہ کی اصلاح ہے اس کو برا نہ سمجھیں۔ ورنہ دوسرا نکاح کرنا واجب تو ہے نہیں بے شبہ کئی سال تک لازم ہے کہ ان کی اس وحشت کو دور کیا جائے جس کا یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے پاس کھڑے ہو کر بہت زور زور سے اذان دیا کریں تاکہ ان کی جھجک دور ہو یہ طریقہ مناسب نہیں کہ مسجدوں کی اذان کو بند کیا جائے یا آہستہ کیا جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں پر ہمارا راز کھلے گا۔

اسی طرح اس وقت مسلمانوں کو جو مضمون مال سے گھبراہٹ ہے اس کے رفع کرنے کے لئے بھی اسی تدبیر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین بار بار بیان کئے جائیں میرا یہ مطلب نہیں کہ وحشت رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ سے چندہ مانگا جائے ہرگز نہیں نہ اس وقت میرا یہ

مقصود ہے نہ میرا جی چاہتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس مال ہی کہاں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان آیات کے صحیح معنی بیان کردیئے جائیں تاکہ ان کی گھبراہٹ اور وحشت رفع ہو جائے یہ جو آپ کو مال کے بیان سے وحشت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان آیات واحادیث کے صحیح معنی معلوم نہیں جس میں انفاق مال کا حکم ہے۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کو زیادہ تر کھال کھسوٹوں سے پالا پڑا ہے۔ اس لئے یہ مال کے ذکر سے گھبراتے ہیں۔ اب چاہے کوئی واعظ کھال کھسوٹ بھی نہ ہو اس سے بھی اگر مال کا ذکر سنتے ہیں تو گھبراتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے میرا ایک بھتیجا ایک بار میرے وعظ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا اس کو پیاس لگی اور وہاں پانی کا انتظام نہ تھا۔ وعظ رہا اس کے بعد یہ شبہ مٹ گیا اور سمجھ میں آ گیا کہ واقعی اس پر عمل کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ ہوگا تو عقیدہ سے بھی اس کی برائی نہ نکلے گی۔ اس میں کامیابی جب ہی ہوگی کہ عمل کریں اگر عمل نہ کریں گے تو عیب بھی سمجھیں گی اور جب اس کا رواج ہو جائے گا تب اس کو عیب بھی نہ سمجھیں گی صرف اس کا سمجھ لینا کہ نکاح کرنا چاہئے کافی نہیں تاوقتیکہ نکاح نہ کیا جاوے پس جب تک کہ عملی علاج نہ ہو اس وقت تک عقیدہ کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

علاج شیخ کی اہمیت

اب اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ لوگ یا تو اپنا علاج خود تجویز کریں یا شیخ تجویز کرے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ مگر شیخ کی تجویز کرنے میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ شیخ طبیب ہے علاج کو خوب سمجھتا ہے اس لئے اس کا علاج تجویز کیا ہوا اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ دوسرے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر چھری چلانا مشکل ہے نشتر لگانا مشکل ہے جیسے محسود کے خود پاؤں دبانا مشکل ہے اور جب شیخ نے کہا کہ پاؤں دباؤ تو اب آسان ہو جاوے گا شیخ کے کہنے کے بعد اس کے خلاف نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر طبع سلیم ہو تو خود بھی علاج سمجھ سکتا ہے مگر پھر بھی شیخ کی تجویز میں جو برکت ہے وہ کہاں سے لائے گا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند   نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

"جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرے لازم نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو جیسے جو شخص بھی آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو"۔

شیخ فلسفی ہے مگر اس کا فلسفہ نہیں (جیسے اہل یونان کا فلسفہ ہے) بلکہ اس کا نورانی فلسفہ ہے۔ اگر کوئی چار تدبیریں یاد کرلے تو شیخ تھوڑا ہی ہو جاوے گا۔

ہزارنکتہ باریک تر زموایں جا است　　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

’’اس میں ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہیں اس راہ میں ہر سر منڈانے والے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو‘‘

خلاصہ یہ کہ ایک گر سیکھ لو۔ وہ یہ کہ جس چیز کا تقاضا ہو اور ہو وہ معصیت اسے چھوڑ دو۔ اس سے تقاضا معصیت کا ضعیف ہو جاوے گا۔ ضعیف اس لئے کہا کہ یوں نہ خیال کیا جاوے کہ بالکل زائل ہو جاوے گا۔ بالکل ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے شریر گھوڑا کہ وہ پہلے بہت دق کرتا تھا اب بعد اصلاح کے دق نہیں کرتا مگر کبھی کبھی شرارت لے ہی آتا ہے مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ نفس پہلے بہ دشواری قابو میں آتا تھا اب آسانی سے آجاتا ہے۔ مثلاً نگاہ ہٹانا غیر عورتوں سے پہلے نہایت دشوار تھا اب بعد اصلاح کے آسان ہو جاوے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ نفس سے بالکل تقاضا ہی موقوف ہو جاوے ریاضت کا یہ طریقہ بہت عمدہ ہے کہ تقاضا معصیت کے خلاف کرے۔

مداومت کی ضرورت

یہ حاصل ہے سارے تصوف اور اصلاح نفس کا میں سب کو فقیر نہیں بناتا صرف اس پر عمل کرنے کو کہتا ہوں پھر اس میں سختی کیا ہوئی میں کہتا ہوں کہ تہجد نہ پڑھے۔ مگر اللہ کا نام لیجئے اور معاصی کو چھوڑیے لیکن پھر بھی اس میں نصرت حق کی ضرورت ہے اور وہ بوسائط ہوتی ہے کہ شیخ کی طرف رجوع کرے اس لئے کہتے ہیں۔

بے عنایت حق و خاصان حق　　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

’’بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق بھی سیاہ ہے‘‘

بس تصوف ایک مرکب تدبیر ہے وہ یہ کہ دواعی نفس کے خلاف کرو اور التجا کرو حق کی طرف ذکر کرو چاہے پندرہ منٹ ہو مگر نبھاہ کر کرو جیسے کنواں ایک بالشت روزانہ بھی کھودو مگر کھودو نبھا کر تو سال بھر میں پانی نکل آئے گا۔ کام مداومت سے کرو۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا اور کبھی نہ کیا۔

عورتوں کو یہ بھی چاہیے کہ عمدہ کپڑا پہن کر کہیں نہ جائیں۔ جہاں جائیں انہیں کپڑوں سے چلی جائیں جو پہلے سے پہنے ہوئے ہوں۔ اس عمل سے جو حصہ تکبر کا ہے وہ ٹوٹ جائے گا مگران کی یہ حالت ہے کہ جہاں جائیں گی لد پھند کر جائیں گی تاکہ شان ظاہر ہو۔ زیور بجتا ہوا دکھاوے کی یہ حالت ہے کہ کان اگر دوپٹہ سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ کسی کی نظر نہیں پڑتی تو کھجلانے ہی کے

بہانے سے ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے پاس اتنا ہے اگر اپنے پاس نہ ہو تو مانگ کر زیور میں لدتی ہیں۔ ان کا خیال زیور اور کپڑے پر رہتا ہے جب ان کا مجمع ہوتا ہے تو اوروں کے زیور اور کپڑے پر نگاہ رہتی ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جب مردوں کا مجمع منتشر ہوتا ہے تو کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ فلاں کی ٹوپی کیسی تھی کرتا کیسا تھا بخلاف عورتوں کے کہ سب کا زیور اور کپڑا بتادیں گے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان میں حب دنیا کا غلبہ زیادہ ہے۔ علاج یہ ہے کہ خاوند کے روبرو خوب پہنا کریں مگر حالت یہ ہے کہ براوری میں جائیں گی تو خوب بن ٹھن کر اور جب آئیں گی تو فوراً اتار دیں گی۔ تاکہ جس حال میں خاوند نے پہلے دیکھا تھا اسی میں دیکھے اس کا علاج یہ ہے کہ خاوند کے سامنے پہنیں اور کہیں جائیں تو نہ پہنیں ایسے ہی علاج غیبت کا ہے اس میں استغفار کافی نہیں بلکہ مغتاب سے کہو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے تم معاف کردو۔

خاوند کے حق میں گستاخی ہو جاوے توبہ کرو۔ اور اس سے معاف کراؤ تم خاوند کو برابر کا دوست سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتی ہو یاد رکھو کہ وہ جیسے دوست ہے حاکم بھی تو ہے۔ دوست تو اس واسطے ہے کہ اس کے حقوق ادا کرسکو۔ کیونکہ محبت میں جیسے حقوق ادا ہو سکتے ہیں بغیر محبت کے ادا نہیں ہو سکتے۔ نہ اس لئے کہ اس کے جوتیاں مارو۔ عورتیں اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں خوش خلقی کے لئے تو سب اور بدخلقی کے لئے شوہر۔ خاوند کی ناراضگی ایسی بری چیز ہے کہ اس سے فرشتے لعنت کرتے ہیں عورتوں کی عادت ہے کہ شوہر کے سامنے زبان درازی بہت کرتی ہیں بھلا اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی چاہیے۔ اول تو ہر وقت ہی اس کا مزاج دیکھ کر بات کہو۔ ایسی بات نہ کہو جو اس کو ناگوار ہو لیکن خاص کر جب وہ باہر سے گھر میں آوے تو اس وقت تو ضرور ہی اول اس کے مزاج کو دیکھ لو کہیں کسی سے لڑ کر نہ آیا ہو کسی وجہ سے غصہ میں نہ ہو۔ مگر ان کو ذرا صبر نہیں ہوتا۔ بس آتے ہی ناٹک لیتی ہیں۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی شکایت فرمائی ہے کہ لوگ زندگی دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ آخرت بہتر اور اچھی ہے اس کے متعلق بقدر ضرورت مفصل بیان ہو گیا اور حجت الٰہی قائم ہو گئی اب عمل نہ کرنے پر کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ جو مناسب حال تھا میں نے اپنی طرف سے سب پہنچا دیا۔ عمل کرنا آپ کا کام ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی
توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

مطاہر الاموال

تزکیہ نفس کے متعلق یہ وعظ بروز اتوار ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۳۵ھ سالانہ جلسہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں منبر پر کھڑے ہوکر ارشاد فرمایا۔ جو ڈھائی گھنٹے میں ختم ہوا۔ سامعین کی تعداد قریبا ۲۰۰۰ تھی۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے قلمبند فرمایا۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمْ وَتُزَکِّیْہِمْ بِہَا وَصَلِّ عَلَیْہِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (التوبہ:۱۰۳)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکے مالوں میں سے صدقہ (جو کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے (لینے کے) ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کر دیں گے اور ان کیلئے دعا کیجئے بلا شبہ آپ کی دعا ان کیلئے موجب اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔

تمہید: اس آیت میں ایک ضروری مضمون کا بیان ہے اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا ہے اور ہر چند کہ قرآن کی سب آیتوں میں ایسے ہی مضامین ہیں جو سب ضروری ہیں اور خاص خاص ضرورتوں کے لئے کافی ہیں مگر اس وقت خاص اس آیت کے اختیار کرنے کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ میں ابھی دیوبند گیا تھا اور وہاں اس سے پہلی آیت **وآخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً واخر سیئاً عسی اللہ ان یتوب علیھم ان اللہ غفور رحیم۔**

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا انہوں سے ایک کام نیک اور ایک بد۔ قریب ہے کہ اللہ معاف کرے ان کو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کی تقریر ہوئی تھی جس میں اعتراف خطا کا بیان ہے اور اہل علم میں یہ خطا عام ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے۔ بلکہ تاویلات وتوجیہات کرنے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو وہاں اختیار کیا تھا۔ اور یہ مرض طالب علمی ہی کے وقت سے ان میں پیدا ہوتا ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ کتب درسیات میں بعض مصنفین سے جو غلطی ہوگئی ہے شراح اور محشین ان کی تاویلات وتوجیہات کیا کرتے ہیں تاکہ مصنف سے اہل علم کو بدگمانی نہ ہو۔ اس سے طلباء کو تاویل وتوجیہ کی عادت پڑ جاتی ہے حالانکہ محشی اور شارح کی تاویل وتوجیہ کا منشاء تواضع ہے۔ کہ وہ باوجود دوسرے کی غلطی معلوم ہوجانے کے اس کے کلام کو محمل حسن پر محمول کرتے اور اپنے مواخذہ کو ضعیف کردیتے ہیں مگر طلباء نے اس سے الٹا سبق سیکھا کہ اپنی خطاؤں میں خود ہی تاویل کرنے لگے۔ جس کا منشاء محض کبر ہے جس کی اصلاح ضروری ہے اس لئے میں نے وہاں اس مضمون کو بیان کیا تھا۔

پھر چونکہ سہارنپور کا سفر اسی کے متصل ہوا تو خیال ہوا کہ جیسے یہاں کا سفر دیوبند کے سفر کے متصل ہے تو بیان بھی وہاں کے بیان سے متصل ہو۔ یعنی مناسب یہ معلوم ہوا کہ یہاں بیان ایسی آیت کا ہو جو پہلی آیت سے متصل ہو تاکہ اتصال صوری کے ساتھ اتصال معنوی بھی جمع ہوجائے اس خیال کے بعد جو اگلی آیت میں غور کیا تو وہ اس جلسہ کی حالت کے بہت ہی مناسب معلوم ہوئی۔ اس واسطے اس کو اختیار کرلیا گیا۔

یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ بس یہاں جس آیت کا بیان کیا جارہا ہے اس کا منشاء صرف یہی ہے کہ اس سے پہلی آیت کا بیان اس سے پہلے ہوچکا ہے اور فی نفسہ اس آیت کا بیان ضروری نہ تھا۔ تو یہ ایسا ہوا جیسے ایک وزیر نے ایک قاضی کو لکھا تھا۔

ایها القاضی بقم قد عزلناک فقم اے قاضی اٹھ جاؤ ہم نے تم کو معذول کردیا۔ پس اٹھ کھڑے ہو۔ اور اس نے خط دیکھ کر کہا تھا۔

واللّٰہ ماعزلتنی الاھذہ السجعة خدا کی قسم تو نے مجھے معذول نہیں کیا بلکہ اس رقعہ نے معذول کیا ہے۔

سو یہ بات نہیں بلکہ واقع میں بھی اس آیت کا مضمون اس جلسہ کے لئے بہت مناسب ہے چنانچہ تقریر آیت سے معلوم ہوجائے گا۔

مال اور مسلمان

دوسری وجہ اس آیت کے اختیار کی وہ ہے جو **اموالھم** کے سننے سے آپ کے ذہن میں آئی

ہوگی چونکہ قرآن سے مسلمانوں کو عام طور پر مناسبت ہے۔ اس لئے وہ لوگ بھی جو عربی پڑھے ہوئے نہیں اجمالاً الفاظ ہی سے مقصود کو سمجھ لیتے ہیں۔ تو آپ نے خذمن اموالھم صدقۃ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے) ہی سے سمجھ لیا ہوگا کہ میں آج انفاق مال کا ذکر کروں گا۔ اس کو سیت اختیار میں اس لئے دخل ہے کہ آج کل مسلمانوں کو انفاق مال کے مضمون سے نہایت توحش ہے اس کے سننے سے بھی گھبراتے ہیں اور اسی وجہ سے میں اپنے بیانات میں مال کا ذکر بہت کم کرتا ہوں مگر یہ ایک بڑی کوتاہی ہے میری بھی اور سامعین کی بھی۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قرآن میں جابجا ذکر فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید کے ساتھ اس کو بیان فرمایا ہے۔ تو یہ بھی شریعت کا ایک جزو ہے۔ پس میری یہ کوتاہی ہے کہ میں اس جزو کا بیان بہت کم کرتا ہوں اور مسلمانوں کی یہ کوتاہی ہے کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور گھبراتے ہیں شریعت کے کسی جزو سے متوحش ہونا سخت مرض ہے جس کی اصلاح ضروری ہے اور توحش کا علاج یہ ہے کہ جس مضمون سے توحش ہو اس کو بار بار سنا جائے۔

جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے ایک حکایت سنی ہے کہ ایک ہندو ریاست کے راجہ سے پنڈتوں نے شکایت کی کہ مسلمانوں کی اذان سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں اس لئے مسلمانوں سے کہا جائے کہ اذان آہستہ کہا کریں۔ راجہ نے وزیر کو مخاطب کر کے کہا کہ ہمارا ایک گھوڑا توپ کی آواز سے بدکتا تھا تو ہم نے اس کی چمک اس طرح نکالی تھی کہ اس کو توپ کے پاس بندھوا کر توپ سے فائر کئے گئے چند روز میں اس طرح کرنے سے اس کی چمک دور ہوگئی۔ اسی طرح ہمارے دیوتا مسلمانوں کی اذان سے بھاگتے ہیں تو بڑی مشکل کی بات ہے اگر مسلمانوں کو یہ راز معلوم ہوگیا تو جب ہم دیوتاؤں سے کچھ کہنے جایا کریں گے مسلمان زور سے اذان دے دیا کریں گے اور دیوتا ہماری بات بھی نہ سن سکیں گے پس دیر تک ہوا اور اس کا پیاس کے مارے برا حال ہوا اس روز سے وہ وعظ سے ہی ڈر گیا۔ اب جب کبھی اس سے کہا جاتا ہے کہ وعظ میں چلو گے' کہتا ہے نا' پیاسا مرنا پڑے گا۔

ایسے ہی ہمارے بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ جس وعظ میں مال کا ذکر ہوگا' ہماری کھال کھسوٹی جائے گی۔ صاحبو! قرآن و حدیث میں جو انفاق مال کی ترغیب ہے اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہر وقت مال خرچ کیا کرو یا جب کسی واعظ کو انفاق مال کا واعظ کہتے ہوئے سنو اس کے بعد ہر جلسہ میں مال دینا تمہارے ذمہ ضروری ہو جائے گا۔ بلکہ شریعت نے اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کئے ہیں ان حدود و

قواعد کے سننے سے معلوم ہوگا کہ نہ ہمیشہ مال خرچ کرنا ضروری ہے نہ ہر وعظ اور ہر جلسہ میں ضروری ہے بلکہ خاص وقت اور حالت میں دینا ضروری ہے۔ اب مسلمانوں کا ذکر مال سے گھبرانا اور یہ سمجھنا کہ ایسے مواعظ کے سننے سے مال دینا پڑے گا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مسہل سے اس واسطے گھبرائے کہ اس کے پینے سے ہمیشہ دست بہتے رہیں گے کبھی بند ہی نہ ہوں گے بتلایئے اگر کوئی مسہل کو ایسا سمجھے اور اس وجہ سے ہمیشہ مسہل سے ڈرے تو وہ غلطی پر ہے یا نہیں۔ یقیناً غلطی پر ہے سو یہی آپ کی حالت ہے۔

طلب منصب

اس پر مجھے کانپور کا ایک واقعہ یاد آیا کہ وہاں جمعہ کے دن ایک بزرگ آئے اور انہوں نے خود درخواست کی کہ جمعہ کی نماز میں پڑھاؤں گا۔ مسجد والوں نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ اول تو یہی بے قاعدہ کام ہوا کہ طالب کو امامت دی گئی جو قانون شریعت کے خلاف ہے اسلام کی تعلیم ہے اور ہم بڑے فخر سے اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

طالب التولیة لا یولی کہ طالب منصب کو کوئی منصب نہ دو۔

کوئی قوم اس حکم کی نظیر پیش تو کرے۔ ان شاء اللہ اسلام کے سوا کسی مذہب میں یہ تعلیم نہ ملے گی۔ آج کل ساری دنیا کے بادشاہوں کو بھی یوں ہی دیکھا جاتا ہے کہ وہ طلب کرنے والوں ہی کو عہدے دیتے ہیں۔ ہر عہدہ کے لئے ان کے پاس سینکڑوں درخواستیں پہنچتی ہیں۔ انہی میں سے کسی ایک کو عہدہ مل جاتا ہے۔ منجملہ ان مناصب کے ایک منصب مولویوں کے واسطے بھی رکھا گیا ہے یعنی شمس العلماء کا خطاب یہ بھی گورنمنٹ خود کسی کو نہیں دیتی بلکہ جو شخص کوشش کرتا ہے اور بہت سی سفارشیں پیش کرتا ہے اور روپیہ خرچ کرتا ہے اس کو یہ خطاب مل جاتا ہے۔ دنیا میں کیسا کایا پلٹ ہوا ہے کہ لوگ اپنے واسطے خود ہی لمبے چوڑے لقب تجویز کرتے ہیں اور حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو یہ لقب دے دو۔ اور حکومت بھی ایسی سخی ہے کہ ان درخواست کرنے والوں ہی کو خطاب دے دیتی ہے۔ کسی کو شمس العلماء کہہ دیا کسی کو بدر العلماء خطاب دے دیا۔

پھر یہ لوگ خطاب ملنے کے بعد قوم کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ویسی ہی اصلاح جیسے حجام کیا کرتے ہیں۔ وہ تو بالوں کو مونڈتا ہے اور یہ مسلمانوں کے دین کو مونڈنا شروع کرتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ زائد بال کو مونڈتا ہے۔ اور یہ اصلی اجزائے دین کو۔

وجہ یہ کہ جو لوگ خود اپنے لئے القاب کی کوشش کریں گے ان کا دیندار ہونا تو معلوم۔ ان کی

لیاقت وقابلیت بھی معلوم۔ جو شخص واقع میں صاحب کمال ہوتا ہے اس کو ہرگز یہ فکر نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے کیا کہتا ہے نہ وہ اپنے لئے القاب وخطابات تجویز کرتا ہے یہ کام انہی لوگوں کا ہے جن کو حقیقی کمال حاصل نہیں۔ مگر ان لمبے چوڑے خطابات سے عوام دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جب ان کو شمس العلماء کا خطاب دیا ہے تو یہ بہت ہی بڑا عالم ہوگا وہ ان کی تحقیقات کو علمی اور شرعی تحقیقات سمجھتے ہیں حالانکہ علم دین اور شریعت سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا۔ غالب حالت اہل خطاب کی یہی ہے۔ شاذ ونادر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کو بدوں درخواست کے خطاب مل جاتا ہے اور وہ واقع میں اس خطاب کا اہل ہوتا ہے ورنہ عام حالت یہی ہے کہ یہ خطاب اکثر نااہلوں کو ملتا ہے اور ان کی درخواست اور کوشش کے بعد ملتا ہے۔

چنانچہ ایک شمس العلماء نے آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھی ہے۔ جس پر ان کی جماعت کو فخر وناز ہے اور نوتعلیم یافتہ مسلمان محض اس وجہ سے کہ اس کا مصنف ایک خطاب یافتہ شمس العلماء ہے اس کو بہت شوق سے دیکھتے اور منگاتے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ یہ خطاب ایک جال ہے جس میں ناواقفوں کو پھنسایا جا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر   تاکہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر
"جبکہ صیاد نے چھوٹی آواز لگائی تاکہ مرغ پکڑنے والا مرغ پکڑے"

مدح میں قدح

میں نے اس سوانح عمری کا صرف ایک مقام اتفاقاً دیکھا ہے بس اسی سے مجھ کو مصنف کے دین کا حال معلوم ہوگیا اور اسی سے قیاس ہوسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سوانح کیسی ہوگی عنوان تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کا اختیار کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو نام ہی ایسا ہے کہ سنتے ہی ہر مسلمان جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے مگر مدح نبوی کے عنوان میں مضمون ایسا لکھا گیا ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو سخت ایذا دی گئی ہے اس میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات تھے۔ آپ میں نبوت کے ساتھ سلطنت وانتظام کا بھی کامل مادہ تھا اور عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسلطنت کا سلیقہ نہ تھا اسی لئے وہ جنگلوں میں پھرتے تھے۔ نوح علیہ السلام میں ترحم کم تھا اسی واسطے غرق کی دعا فرمائی۔

صاحبو! کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے کہ دوسرے انبیاء کی تحقیر وتوہین کی جا رہی ہے۔ انبیاء علیہم السلام سب بھائی بھائی ہیں اور یقیناً ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کی تحقیر کو گوارا

نہیں کر سکتا۔ خصوصاً دیندار بھائی خصوصاً انبیاء علیہم السلام جو کہ نفسانیت سے بالکل مبرا ہیں وہ ہرگز اپنی ایسی مدح سے خوش نہیں ہو سکتے جس میں ان کے دوسرے بھائی کی تنقیص کی گئی ہو۔

رہا یہ کہ ہم کو یہ کیسے معلوم ہوا کرے کہ فلاں مدح میں دوسرے حضرات کی تنقیص ہے سو اس کا معیار یہ ہے کہ ہر بات میں یہ سوچ لیا کرو کہ اگر اس جلسہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام تشریف فرما ہوں تو کیا ہم اس بات کو سب حضرات کے سامنے کہہ سکتے ہیں اس معیار کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا یہ شخص ایسے مجمع میں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہوں اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بھی ہوں یہ بات کہہ سکتا ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جامع کمالات ہیں اور نوح علیہ السلام میں نعوذ باللہ ترحم کا مادہ نہ تھا اور عیسیٰ علیہ السلام کو سلیقہ تمدن و سلطنت نہ تھا۔ یقیناً ایسے جلسہ میں اس بات کی کسی کو جرات نہیں ہو سکتی۔ پس لامحالہ یہ تنقیص و توہین انبیاء میں داخل ہے۔

کمالات انبیاء

افسوس اس شخص نے محض اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زمانہ میں سلطنت کا موقع نہیں ملا یہ نتیجہ نکال لیا کہ ان میں اس کا سلیقہ ہی نہ تھا کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع ہوتے ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ بعض بعض سے اکمل ہیں لیکن ناقص ان میں کوئی نہیں۔ کوئی نبی رحم سے خالی نہیں اور نہ کوئی سلیقہ سلطنت سے خالی ہے۔ ہر ایک میں تمام کمالات حسنہ موجود ہیں لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ کے اذن پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے ارادہ و اختیار کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ جس کمال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں وہ اسی کو ظاہر کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

من چو کلکم درمیان اصبعین　　　نیستم در صف طاعت بین بین

اور

خستہ از احوال دنیا روز و شب　　　چوں قلم در پنجہ تقلیب رب

ان کی مثال ایسی ہے جیسے قلم کہ قلم سب کچھ لکھ سکتا ہے مگر کب؟ جب کہ کوئی دوسرا ہاتھ میں لے کر اس کو چلائے پھر وہ وہی لکھے گا جو یہ شخص لکھنا چاہے گا اگر وہ عربی لکھوانا چاہے تو یہ عربی لکھے گا فارسی لکھوانا چاہے تو فارسی لکھے گا۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس قلم سے عربی لکھی گئی ہے وہ فارسی نہیں لکھ سکتا۔ یا بالعکس ہرگز نہیں۔ بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جس کے ہاتھ میں قلم تھا اس نے

عربی ہی لکھوائی تھی اگر وہ فارسی لکھواتا تو قلم میں اس کی بھی قابلیت تھی۔

یوں ہی انبیاء علیہم السلام کو سمجھو کہ ان میں تمام اخلاق حمیدہ وملکات فاضلہ موجود ہیں مگر حق تعالیٰ جس وقت جس ملکہ سے کام لینا چاہتے ہیں اس وقت وہ اسی ملکہ سے کام لیتے ہیں اس سے دوسرے ملکات کی نفی پر استدلال کرنا اس مورخ کی عقلمندی ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اب تک حق تعالیٰ نے انتظام سلطنت کا کام نہیں لیا اس لئے یہ ملکہ ظاہر نہیں ہوا۔ لیکن جس وقت وہ آخر زمانہ میں تشریف لائیں گے اور بہت بڑی سلطنت کریں گے جس کی مدح وثنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس وقت معلوم ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام میں سلطنت کا سلیقہ ایسا ہے کہ کوئی بادشاہت بھی ان جیسی نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ انتظام سلطنت وتمدن کا سلیقہ ان میں اس وقت بھی بدرجہ اتم موجود تھا مگر ظہور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کرنا نہیں چاہا۔ اخیر زمانہ میں اس کا ظہور ہو جائے گا۔

اگر عیسیٰ علیہ السلام میں اس وقت یہ ملکہ موجود نہیں تھا تو کیا آسمان میں رہ کر یہ سلیقہ حاصل ہو گیا۔ وہاں تو سارے فرشتے نیک ہی ہیں۔ نہ وہاں کوئی مفسد نہ چور نہ کافر نہ مشرک نہ وہاں ٹیکس کی ضرورت ہے نہ فوج کی نہ محصول لینے کی نہ قواعد حرب سکھلانے کی۔ ایسی جگہ رہ کر سلطنت کا طریقہ کیونکر آ گیا۔ اور اگر کہو کہ حق تعالیٰ نے سکھلا دیا یا فرشتوں نے بتلا دیا تو یہ بات تو ان کو زمین میں رہ کر بھی حاصل تھی۔ کیونکہ وہ نبی اولو العزم ہیں جن کے پاس جبرئیل علیہ السلام ہمیشہ آتے رہتے تھے پھر اس مورخ نے ان کو سلیقہ تمدن وسلطنت سے کیوں خالی مانا۔

اب بتلایئے اس سوانح عمری کا پڑھنا اور دیکھنا اور خریدنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ نص میں صاف حکم موجود ہے۔

اذا سمعتم ایات اللّٰہ یکفربھا و یستھزء بھا فلا تقعدوا معھم حتیٰ یخوضوا فی حدیث غیرہ انکم اذا مثلھم ان اللّٰہ جامع المنافقین والکافرین فی جھنم جمیعاً

جب (کسی محفل میں یا کسی جگہ) اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر انکار ہوتے ہوئے یا ہنسی مذاق ہوتے ہوئے سنو تو نہ بیٹھو ایسے لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ کسی دوسری بات میں مشغول ہوں (اگر ایسا نہ ہو کرو گے) تو تم بھی انہیں جیسے ہو گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ اکٹھا فرمائے گا۔

یعنی جب آیات اللہ واحکام الٰہیہ کے ساتھ کفر واستہزاء ہو رہا ہو تو تم وہاں نہ بیٹھو جب تک

یہ بیہودہ گفتگو ختم ہو کر دوسری بات شروع نہ ہو اگر تم کفر و استہزاء کی باتوں کو سنو گے تو تم بھی انہی کے مثل ہو گے جو کفر و استہزاء کے مرتکب ہیں اور یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو ان باتوں کے بند کرنے پر قدرت نہ رکھتے ہوں اور جس کو قدرت ہو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ ان لوگوں کا منہ بند کر دے اور ایسی کتابوں کی اشاعت روک دے ان کو ضبط کر کے ضائع کر دے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم کسی کا منہ بند نہیں کر سکتے نہ کسی کتاب کو ضبط کر کے ضائع کر سکتے ہیں یہ کام حکومت کا ہے واقعی حکومت بھی عجیب چیز ہے۔ ہمارے مولانا کا ارشاد ہے۔

الوعظ ینفع لو بالعلم و الحکم   والسیف ابلغ و عاظ علی القمم

حقیقت میں سیف سب سے بڑا واعظ ہے مگر جب یہ نہیں تو اب وہی حکم ہے کہ ایسی باتوں کو سنو ہی نہیں اور جن کتابوں میں ایسی خرافات ہوں ان کو دیکھو نہیں نہ خرید و نہ ان کی اشاعت کرو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کل حالت یہ ہے کہ طالبوں کو عہدے اور خطاب دیئے جاتے ہیں اس پر گفتگو طویل ہو گئی اور شریعت کا قانون یہ ہے کہ جو شخص عہدہ کا طالب ہو اس کو ہرگز مت دو۔ کیونکہ وہ خود غرض ہو گا تو کانپور کی جامع مسجد میں اول تو یہی کام بے قاعدہ ہوا کہ طالب کو امانت دی گئی مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بزرگ طالب امانت ہونے کی وجہ سے بزرگ نہ رہے نہیں وہ واقعی بزرگ تھے۔

بزرگوں کی قسمیں

مگر بزرگ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کامل نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حضرات بھولے نہیں ہوتے بلکہ ہوشیار ہوتے ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام سب ہوشیار تھے کوئی نبی بھولے نہیں ہوئے انبیاء علیہم السلام کا اعقل الناس ہونا کفار کو بھی مسلم ہے بلکہ وہ ہم سے زیادہ انبیاء کی عقل کے معتقد ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے جو کچھ کارنمایاں ہوئے ہم تو ان کو خدا تعالیٰ کا کیا ہوا سمجھتے ہیں اور مخالف سارا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سمجھتا ہے اور سب کارناموں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و تدبیر کا نتیجہ بتلاتا ہے۔ تو وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانشمندی کا معتقد ہے۔ ہم تو قرآن کو جو عقول کو حیران کرنے والا کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے ہیں اور مخالف اس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف بتلاتا ہے۔ تو بتلایئے وہ ہم سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کا معتقد ہے یا نہیں۔؟

ایک بزرگ وہ ہیں جو مقام نبوت کے وارث نہیں بلکہ مقام ولایت کے وارث ہیں۔ ان میں

بعض بھولے ہوتے ہیں بعض مجذوب بھی ہوتے ہیں گو وہ بزرگ بھولے تھے انہوں نے سادگی کے طور پر امامت کی درخواست کی تھی۔ تکبر اس کا منشاء نہ تھا اور گرمی سخت پڑ رہی تھی اور بزرگ صاحب نے سورہ ق کی تلاوت نماز میں شروع کر دی پھر بعض لوگ تو ایسی روانی سے پڑھتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دریا بہتا ہوا جا رہا ہے ایسے شخص کی طویل قراءت بھی گراں نہیں ہوتی بلکہ لذیذ ہوتی ہے مگر بزرگ صاحب نے ایسی ترتیل کی کہ لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ آخر لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بعض کو تے ہو گئی۔ کسی کو چکر آ گیا اور ایک آدمی کا عجیب قصہ یہ ہوا کہ وہ نیا نمازی تھا اس کو بعض لوگ گھیر گھار کر نماز کے لئے لائے تھے جب بزرگ صاحب نے سورہ ق شروع کی اور کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تو وہ نیت توڑ کر یہ کہہ کر چل دیا کہ اسی واسطے تو ہم نماز نہیں پڑھتے۔

تو جیسے یہ نیا نمازی ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ کر سب کو انہی پر قیاس کر کے نماز ہی سے ڈر گیا اسی طرح ہمارے بھائی کھال کھسوٹوں کے بیانات چندہ کے متعلق سن کر سب سے ڈر گئے اور اب وہ کسی کی زبان سے انفاق مال کا مضمون سننا نہیں چاہتے اور واقعی جن واعظوں سے ان کا پالا پڑتا ہے ان کا بیان ہے ہی ڈرنے کے قابل یہ لوگ اس بری طرح سے مسلمانوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ سامعین کو خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

چنانچہ ایک جلسہ میں ایک مولوی صاحب نے چندہ کے لئے بڑی کوشش اور تقریر میں بہت ہی زور لگایا مگر کسی نے کچھ بھی نہ دیا۔ تو مولانا کیا کہتے ہیں کہ افسوس علماء کی قدر رنڈی کے برابر بھی نہیں۔ اگر اتنی دیر کوئی رنڈی ناچتی گاتی تو اس کے اوپر ہزاروں روپیہ نثار کیا جاتا۔

آہ! بھلا غور تو کیجئے۔ کیا یہ مضمون تہذیب سے خارج نہ تھا۔ کیا اس میں اس شخص نے علماء کو اور مسلمانوں کو ذلیل نہیں کیا۔ اب ایسے بیانات سن کر عوام اگر چندہ کے نام سے نہ ڈریں تو کیا کریں۔ عوام کا کچھ قصور نہیں اس میں زیادہ قصور ایسے مقرروں کا ہے جو یوں تہذیب سے باہر ہو کر چندہ مانگتے ہیں۔ البتہ عوام کا اتنا قصور ضرور ہے کہ انہوں نے سب علماء کو انہی کھال کھسوٹوں پر قیاس کر لیا اور بعض تو شریعت کے اس حکم انفاق سے ہی ڈر گئے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ خوف نکالا جائے اور ایک حکم شرعی سے جو ان کو انقباض ہو گیا ہو اس کو نکالا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے احکام شرعیہ کے صحیح مطالب بیان کئے جائیں۔

ترغیب انفاق

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر احکام شرعیہ اپنی اصلی صورت میں پیش کئے جائیں تو ہرگز کسی

مسلمان کو ان سے انقباض نہیں ہوسکتا۔ بھلا جس نبی کی یہ تعلیم ہو۔

الا لا یحل مال امرأ مسلم الابطیب نفس منه[۱]

کہ کسی مسلمان کا مال بدوں ان کے طیب قلب کے لینا حلال نہیں ہے۔

ان کے احکام سے کسی کو وحشت اور گھبراہٹ کیونکر ہو سکتی ہے اور جس خدا کا یہ ارشاد ہے۔

وان تؤمنوا و تتقوا یؤتکم اجورکم ولا یسئلکم اموالکم یعنی اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو تو تم کو اجر و ثواب دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگیں گے۔

ان کے احکام سے کون منقبض ہوسکتا ہے آگے اللہ تعالیٰ ہمارے اترے پترے کھولتے ہیں۔

یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال مانگنے لگیں پھر اصرار کے ساتھ مانگیں تو تم بخل کرنے لگو۔ اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کردے پس اس سے بے فکر رہو۔

اللہ تعالیٰ تم سے تمہارا مال زور ڈال کر نہیں مانگتے اور صدقات واجبہ کی مقدار اتنی قلیل ہے کہ ان میں ناگواری کا احتمال ہی نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

ھانتم ھؤلآء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل

تمہاری تو یہ حالت ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے سو اس پر بھی بعضے تم میں سے بخل کرتے ہیں۔

یعنی تم سے لپٹ کر سوال نہیں کیا جاتا۔ صرف ترغیب دی جاتی ہے جس کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوتا ہے چنانچہ شریعت نے جن مصارف میں صرف کی ترغیب دی ہے ان کے معلوم ہونے کے بعد اس کا یقین ہو جائے گا کہ آخرت کا نفع تو جدا رہا دنیا میں بھی ان مواقع میں صرف کرنا نافع ہے۔ پھر بھی بہت لوگ بخل کرتے ہیں۔ آگے نہایت استغنا سے فرماتے ہیں۔

ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه کہ جو کوئی انفاق فی سبیل اللہ سے بخل کرتا ہے وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ (یعنی اپنے ہی کو نفع دائمی سے محروم کرتا ہے خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا)

واللہ الغنی وانتم الفقراء اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں بلکہ تم سب اس کے محتاج ہو۔

پس تمہارے بخل کرنے سے یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ نعوذ باللہ خدا کو کچھ ضرر پہنچے گا بلکہ خود تم کو

---

[۱] کتاب التمهید لابن عبدالبر ۱۰: ۲۳۱

ہی ضرر پہنچے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن مواقع میں صرف کی ترغیب دی ہے تمہاری ہی مصلحت کے لئے اور تمہارے ہی نفع کے لئے دی ہے۔

اس میں بخل کرنا ایسا ہے جیسے کسی مریض کو طبیب نسخہ لکھ کر دے اور کہے کہ یہ چار روپے کا نسخہ ہے۔ چار روپے خرچ کر کے اس کو بنالو۔ اس پر مریض کہے کہ میں تو چار روپے خرچ نہیں کروں گا۔ تو حکیم کہے گا بھائی میرا کیا نقصان ہے۔ اگر تم اس میں بخل کروگے اپنی ہی جان سے بخل کروگے۔

غرض اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے مال مانگتے نہیں صرف ترغیب دیتے ہیں۔ وہ بھی ایک قلیل حصہ کی جو زیادہ نہیں۔ پھر وہ ترغیب دے کر تم کو لپٹتے نہیں بلکہ نہایت استغناء سے فرماتے ہیں کہ جو بخل کرے گا اپنے ہی سے بخل کرے گا۔ اپنے ہی کو دولت ابدیہ سے محروم کرے گا۔

ایک عجیب سوال وجواب

اب یہاں یہ سوال ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے نعمت آخرت کو انفاق مال پر ہی کیوں موقوف کیا۔ مفت ہی دے دیتے وہ تو ایسا بھی کر سکتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

’’جو شخص ارزانی اور آسانی سے کوئی چیز حاصل کرتا ہے وہ اونے پونے دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے جیسے بچہ ایک روٹی کے بدلے موتی دے دیتا ہے‘‘

جو شخص کوئی چیز مفت پالیتا ہے اس کی قدر نہیں ہوتی ہم نے ارزاں خروں کی حکایتیں سنی ہیں کہ ایک شخص پچاس روپیہ کی شال سے دو روپیہ کا جوتا صاف کر رہا تھا کسی نے ملامت کی کہ ایسی قیمتی شال کی تم نے کیسی بے قدری کی کہنے لگا بات یہ ہے کہ جوتا تو میرا خریدا ہوا ہے اور شال میراث میں باپ کے ترکہ سے ملی ہے۔

ارزاں خر پر ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک ولایتی سے کسی رئیس نے گھوڑے کی قیمت سن کر کہا تھا کہ تم بڑے گراں فروش ہو۔ اس نے بے ساختہ جواب دیا کہ تم بڑے ارزاں خر ہو۔ غرض مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک کتاب طبع کے لئے عطا فرمائی تھی کہ اس کو چھاپ کر شائع کر دینا۔ پھر فرمایا کہ کسی کو مفت مت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی بلکہ کچھ قیمت رکھ دینا چاہے دو تین ہی پیسہ ہو اسی طرح بے شک حق تعالیٰ قادر ہیں کہ آپ کو مفت ہی

سب کچھ نعمتیں دیدیں کہ آپ کو نہ مال خرچ کرنا پڑے نہ محنت کرنا پڑے۔ مگر ان قیود میں یہ حکمت ہے کہ اس سے نعمت کی قدر ہوتی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی یہ حکمت تو کھلی ہوئی ہے جس کو ہم جیسے بھی سمجھتے ہیں۔ اور اگر غور کیا جائے تو واللہ حق تعالیٰ تو اب بھی آپ کو مفت ہی سب نعمتیں عطاء فرماتے ہیں کیونکہ جو نعمتیں انفاق مال کے بعد ملتی ہیں صرف ظاہر میں وہ مفت نہیں معلوم ہوتیں مگر حقیقت میں مفت ہی ملی ہیں۔ کیونکہ جو مال آپ نے خرچ کیا ہے بتلایئے وہ کہاں سے آیا اور کس نے دیا۔ یقیناً وہ حق تعالیٰ کا مال ہے اور حق تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔

تدبیر و تقدیر

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوا ہے جیسا کہ قارون نے کہا تھا۔ قال انما اوتیتہ' علی علم عندی (قارون (یہ سن کر) کہنے لگا کہ مجھ کو یہ سب کچھ ذاتی ہنر مندی سے ملا ہے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا دو طالب علم بی اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلباء یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں سے زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوگا مگر نتیجہ امتحان میں اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہو جاتا اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہو جاتا ہے۔ بتلایئے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا۔ اگر تدبیر پر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا۔ مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے دوسرا بیوقوف اور جاہل ہے تدبیر کا مقتضا یہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صدہا نظائر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوا خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہوا کرتے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تیس کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں' تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا

چاہئے کہ تدبیر وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے۔ یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں ورنہ مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر موثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت کی بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الٰہیہ ہی کا نام ہے۔

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال کیوں لگا۔ اگر تمہارے قبضہ میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں یہ ایجاد کر لی ہوتی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے قبضہ میں ہے پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضہ میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے ایجاد کر لے بلکہ زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی ہے یا ایک سال پہلے بھی خود بخود دل میں آ گئی۔ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے۔ کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔ بہر حال یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا جو کچھ ہمارے پاس ہے دوسرے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں تھوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں۔ یقیناً مفت ملی۔

جنت کی کنجی

مگر انسان کی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی ناتمام تدبیر کے بعد جو کچھ اسے ملتا ہے یہ اس کو اپنا مال سمجھتا ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی ظاہراً اس کے جذبہ کی رعایت فرمائی ہے کہ اس کے مال کو اسی کا مال کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم تم سے تمہارے مال نہیں مانگتے ہاں اللہ کے راستہ میں جس نے تم

کو یہ مال دیا ہے کچھ خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس کا نفع تم ہی کو ملے گا۔ مگر انسان کا اس سے بھی دل دکھتا ہے تم چاہتے ہو کہ یہ حکم بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا تا کہ دل بھی نہ دکھتا تو یہ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارا ہی ہے۔ ہم نے ہی تم کو دیا ہے اور ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ بدوں تمہارا مال دکھائے جنت دے دیں مگر ایسا نہ ہوگا۔

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا و هم لا یفتنون

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کر کے چھوٹ جائیں گے کہ ہم تو ایمان لے آئے ہم اور ان کے اعمال کی آزمائش نہ ہوگی۔

کیا تمہارا امتحان بھی نہ کیا جائے۔ تم کو آزمایا بھی نہ جائے۔ یاد رکھو مال ہمارا ہی ہے مگر تم اپنے ہاتھ سے دو جبھی جنت ملے گی۔

حضرت غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا حق تعالیٰ نے جنت پر قفل تو لگا رکھا ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی موجود ہے۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ کنجی کو گھما دیں قفل کھل جاوے گا۔ پھر سب نعمتیں ہمارے ہی واسطے ہیں یعنی حق تعالیٰ نے جن کاموں پر جنت کو موقوف کیا ہے ان کے اسباب بھی سب ہم کو خود ہی عطا فرما دیئے۔ مال خرچ کرنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو مال ہم کو خود ہی دیا۔ نماز پڑھنے پر بعض نعمتیں موقوف ہیں تو ہاتھ پیر زبان اور ارادہ وہ اختیار ہم کو عطا کر دیا اور اس کے بعد دل میں داعیہ بھی خود ہی پیدا کر دیا۔ بس ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ اس داعیہ کا اتباع کریں مخالفت نہ کریں اب بتلایئے میرا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں کہ قفل تو ہے مگر قفل کے اندر کنجی بھی لگ رہی ہے۔ صرف گھمانے کی دیر ہے۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرے تو وہ نہایت کام چور ہے۔

مصیبت و راحت

اس پر مجھے ایک کام چور کی حکایت یاد آئی وہ ایک بزرگ کے پاس رہتا تھا اور یوں چاہتا تھا کہ میرا کام صرف توجہ و تصرف سے بن جائے کچھ کرنا نہ پڑے۔ شیخ نے بہت سمجھایا کہ کچھ کام کر اور تصرف کے بھروسہ پر رہنے سے منع فرماتے تھے کہ اس کو یہ وسوسہ ہو گیا کہ شیخ صاحب تصرف نہیں حالانکہ اگر ایسا بھی ہو تو کچھ نقص نہیں۔ مگر چونکہ وہ صاحب تصرف بھی تھے اس لئے انہوں نے اس خطرہ کو دفع کرنا چاہا۔ ایک روز مسجد کے دروازہ پر ایک مٹکہ میں پانی بھر کر اور ایک پچکاری لے کر بیٹھ گئے اور راہگیروں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جس پر پانی پڑتا تھا وہ بے اختیار کلمہ پڑھنے لگتا

تھا۔ سینکڑوں کافروں نے کلمہ پڑھ لیا پھر اس مرید کو بلا کر فرمایا کہ تصرف تو اللہ تعالیٰ نے ایسا دیا ہے مگر تجھ کو چکی ہی پسوا کر دوں گا۔ تجھے بدوں محنت کے نہ دوں گا۔ تو ابتدا ہی سے کندھے سے جوا ڈال کر پہنچنا چاہتا ہے ارے تھوڑا بہت خود بھی تو کچھ کیا ہوتا۔ اس کے بعد ہی شیخ کامل کے کمال پر بھروسہ کرتا۔ یہ کیا کہ شروع ہی سے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے۔

تو یاد رکھو جو شخص کچھ تھوڑا بہت کام کرتا ہے اس کو تو اللہ تعالیٰ مفت بھی دولت دے دیتے ہیں باقی کام چوروں کو مفت نہیں ملا کرتی۔ (الانادرا والنادر ملحق بالعدم)

ایک دفعہ مجھے بھی اس خیال نے ستایا تھا۔ طریق میں سے مجھے ایک الجھن پیش آئی۔ اس وقت خیال ہوا کہ ہم میں طلب بھی ہے گو ناقص سہی اور حق تعالیٰ کو ہماری طلب کا علم بھی ہے۔ اور وہ طلب ناقص کے بھی قدر دان ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی کامل ہے اور قدرت بھی کاملہ ہے وہ جلدی بھی طالب کا کام بنا سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ جلدی سے واصل نہیں کر دیتے۔ اس خطرہ کا جواب میرے ذہن میں کچھ نہ آیا تو میں نے بسم اللہ کر کے مثنوی کھولی میں اس کا معتقد نہیں کہ مولانا کی روح آتی ہے اور وہ تصرف کرتی ہے بلکہ صرف یہ خیال ہے کہ مثنوی ایک مقبول بندہ کا کلام ہے اللہ تعالیٰ اس میں تسلی کی بات ہم کو بتلا دیتے ہیں چنانچہ بسم اللہ کر کے جو مثنوی کھولی تو یہ اشعار نکلے جو عینہ میرے سوال کا جواب تھے۔

چارہ می جوید پے من درد تو (تیرا درد میری طرف علاج ڈھونڈتا ہے)

اس میں طلب کو تسلیم کیا گیا ہے۔

می شنیدم دوش آہ سرد تو (میں نے تیری آہ سرد سنی)

اس میں طلب کے علم کا ذکر ہے۔

می توانم ہم کہ بے ایں انتظار   رہنمایم وا دہم راہ گزار

میں تم کو بغیر انتظار کے منزل مقصود تک جلد پہنچا سکتا ہوں۔

اس میں قدرت کا بیان ہے کہ تم کو بدوں انتظار کے بھی مقصود تک جلدی ہی پہنچا سکتے ہیں۔

تا ازیں طوفان دوراں وارہی   برسر گنج و سالم پا نہی

تاکہ تم پریشانی سے محفوظ رہو اور راحت کے ساتھ پہنچ جاؤ۔

پھر ہم تم کو انتظار میں کیوں ڈالتے ہیں اور جلدی کیوں نہیں پہنچاتے۔ اس کی وجہ سنو۔

لیک شیرینی و لذات مقر   ہست بر اندازہ رنج سفر
آنگہ از فرزند و خویشاں برخوری   کز غریبی رنج و محنت بابری

لیکن وصل کی شیرینی اور قرب منزل کی لذت سفر کے مشقتوں کے اعتبار سے محسوس ہوتی ہے۔ جس کو سفر میں جتنی مشقت ہوگی منزل پر پہنچ کر اتنی راحت ہوگی۔

کہ منزل پر پہنچ کر لذت اور شیرینی اپنی قرارگاہ کی اس قدر حاصل ہوتی ہے جتنی سفر میں تکلیف پیش آتی ہے۔ جس کو سفر میں جتنی مشقت ہوگی منزل پر پہنچ کر اتنی ہی راحت ہوگی۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد   گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

جو ارزاں خریدتا ہے ارزاں دیتا ہے بچہ ایک روٹی کے بدلے ایک موتی دے دیتا ہے۔

جواب کا حاصل یہ تھا کہ سارے مقدمات تو تمہارے ذہن میں آ گئے مگر یہ مقدمہ ذہن میں نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں حکمت کا مقتضا یہی ہے کہ انتظار کے بعد دولت دی جائے جلدی نہ دی جائے تا کہ مصیبت کے بعد راحت کی قدر ہو۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم بارات میں کیرانہ گئے تھے۔ راستہ میں لوٹتے ہوئے بارش زور سے ہونے لگی تمام جنگل پانی سے بھر گیا رات ہو گئی سخت پریشانی ہوئی بس اس وقت یہ شعر ہماری حالت کا ترجمان تھا۔

شب تاریک وبیم موج گردابے چنیں حائل   کجا دانند حال ماسبک ساران ساحل ہا

ہماری حالت (حیرت) ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موت کا خوف ہو اور ورطہ ہولناک میں آ گئی ہو تو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کیسے خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں۔

او کصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہ و اذا اظلم علیھم قاموا.

یا (ان منافقوں کو کی ایسی مثال ہے) جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے اسمیں اندھیری بھی ہو اور رعد و برق بھی جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونس لیتے ہی اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہے کافروں کو۔ برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انکی بینائی اس نے

لی۔ جہاں ذرا ان کو (بجلی کی) چمک محسوس ہوئی تو اس (کی روشنی) میں چلنا شروع کر دیا اور پھر جب ان پر تاریکی ہوئی تو پھر کھڑے رہ گئے۔

گھر بہت دور نہ تھا۔ صرف چار پانچ کوس رہ گیا تھا مگر اس مصیبت کی وجہ سے وہ چار کوس طے ہونا مشکل ہو گئے۔ اس کے بعد خدا خدا کر کے جب گھر پہنچے تو گھر پر پہنچنے کی لذت مجھے اب تک یاد ہے کہ اس وقت کیسی راحت اور چین حاصل ہوئی تھی۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

آنکہ از فرزند و خویشاں برخوری   کز غریبی رنج و محنت ہا بری

”جس کو سفر میں جتنی مشقت اور تکلیف ہوگی منزل پر پہنچ کر اتنی ہی راحت ہوگی“

تو جس کو سلوک میں جتنی زیادہ پریشانی ہوگی اتنی ہی وصول کے بعد اس کو راحت ہوگی اور اس نعمت کی بڑی قدر کرے گا اسی طرح جس کو دنیا میں زیادہ کلفت ہوگی۔ آخرت میں اتنی ہی راحت اور جنت کی قدر ہوگی۔

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور جنت پھر بھی خالی رہے گی اور حق تعالیٰ سے وہ عرض کرے گی کہ مجھے بھریئے کیونکہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا تو حق تعالیٰ جنت کو بھرنے کے لئے اسی وقت ایک نئی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تو یہ نئے لوگ بہت اچھے ہوں گے کہ ان کو مفت جنت مل گئی فرمایا کیا اچھے ہوں گے ان کو جنت سے خاک بھی لذت نہ ہوگی وہ تو سمجھیں گے کہ زندہ ہو کر یوں ہی چین ہوتا ہوگا جیسا جنت میں ہو رہا ہے اچھے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ہوں گے کہ جنت میں دنیا کی تکالیف جھیل کر پہنچیں گے ہم کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حظ آئے گا کہ وہاں قدم رکھتے ہی بے ساختہ زبان سے نکلے گا۔

الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا
دار المقامة من فضله لا یمسنا فیها نصب و لا یمسنا فیها لغوب

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہم سب رنج والم دور کر دیا بے شک
ہمارا رب بڑا بخشنے والا قدر دان ہے۔ جس نے ہمیں محض اپنے فضل سے دار الحزن سے
نکالا جہاں سے نکل کر ہم نے نہ تکان محسوس کی اور نہ ہمیں خستگی و درماندگی پہنچی۔

(نیز ہم کو مجاہدہ اور طاعات دنیویہ کی وجہ سے قرب حق اور معرفت بھی ان سے زیادہ ہوگی) پس جن لوگوں کو دنیا میں زیادہ سامان عیش نہیں دیا گیا وہ پریشان نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ ان کو امراء سے زیادہ جنت میں راحت ہوگی۔

زیادت مال کے اثرات

دوسرے یہ کہ زیادہ سامان تم کو دے دیا جاتا تو تم دنیا ہی کے ہو رہتے خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے۔ آج کل مسلمانوں کی رال ٹپکتی ہے دوسری قوموں کے سامان عیش کو دیکھ کر مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے۔ اگر ہم کو زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا ہی کی فکر میں رہتے۔ آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپور میں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلہ رومال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنا دے۔ وعظ میں کسی مولوی سے سن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں قبول نہ ہوئی۔ ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہے وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندہ کے لئے مصلحت ہو خدا کا شکر کرو کہ یہ سونا نہ بنا ورنہ تم آپس ہی میں مر کٹ جاتے۔

واقعی سچ کہا بعض لوگوں کے لئے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شاید ان کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں اور اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں، تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد بھی باقی رہیں گی یا نہیں اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی۔ جب میرے بعد ممالک و بلاد مفتوح ہوں گے اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام و خادم ہوں گے۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔ **نتفرغ للعبادة و نکفی المونة** حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آج کل ہے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے لئے زیادت مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی اور دنیا میں منہمک نہیں ہوئے پھر ہمارے لئے کثرت مال کیونکہ مفید ہو سکتی ہے۔ بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہئے۔ **اولئک عجلت لھم طیباتھم فی حیوٰتھم الدنیا**[۱]

---

[۱] السنن الکبری للبیھقی ۲۲۹۰۹، ۱۰: ۱۰۸، الترغیب والترھیب ۴: ۲۰۰

ان کو سب راحت یہیں دے دی گئی۔ اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے بس مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنا چاہئے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور ستر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان اور اتنا بحمد اللہ اکثر مسلمانوں کو آج کل حاصل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہ کو اتنا بھی سامان میسر نہ تھا۔ ہم لوگ تو اس زمانہ کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

اصبح معافی فی جسدہ امناً فی سربہ عندہ قوت یومہ فکانما حیزت لہ الدنیا بحذافیرھا[1]

کہ جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ بدن میں صحت اور نفس میں بے فکری ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔

جب صحت واطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو تو' تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آ گئی۔ اگلے دن کی فکر نہ کرو۔

مترس از بلائے کہ شب درمیانست

جس مصیبت کے درمیان میں رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو۔ جب کل ہو گی دیکھا جائے گا۔ کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں۔

چوں ترا نانے و خرقہ نے بود ہر بن موئے تو سلطانے بود

''جب تک تیرے پاس کھانے کی اشیاء ہیں تیرا بال بال بادشاہ ہے''

غرض حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ بعض لوگوں کو غریب رکھتے ہیں اس کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کے لئے یہ نیت ہی درجات عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا حق تعالیٰ کے یہاں عجیب دربار ہے۔ وہاں کچھ انفاق ہی پر مدار نہیں۔ غریب کے حق میں نیت انفاق بھی بمنزلہ انفاق کے ہے خود نص میں ارشاد ہے۔

قول معروف و مغفرة خیر من صدقة یتبعھا اذی واللہ غنی حلیم

نرم جواب دینا اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے دینے کے پیچھے ستانا ہو

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین ١٥.٨، الترغیب والترھیب ١: ٥٩٠، الادب المفرد للبخاری: ٣٠٠

اور اللہ تعالیٰ مستغنی اور حلم والا ہے۔

پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے۔

لاخیل عندک تھدیھا ولا مال
فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

"نہ تیرے پاس ہدیہ دینے کیلئے گھوڑا ہے اور نہ مال پس تو زبان سے بہتر کلام کر (دعا دے) اگرچہ تیرا حال بہتر نہیں ہے"

اور جس کو اللہ خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت کے موافق خرچ کر کے خدا تعالیٰ کو راضی کرے۔

علماء کی کوتاہی

اس میں واعظین وعلماء بھی داخل ہیں ان کو بھی خرچ کرنا چاہئے۔ اگر زیادہ نہیں کر سکتے تو کچھ تو کریں علماء کا اکثر طبقہ اس میں بہت کوتاہی کرتا ہے سارا امر بالمعروف اپنی ہی بچت کے واسطے ان کو سوجھتا ہے خود خرچ کرنا بہت کم جانتے ہیں آپ کو چاہیے کہ اپنے بھائی کی روٹی بچائیں اور اپنے پاس سے خرچ کریں اور جب کسی کام کے لئے چندہ کی تحریک کریں تو سب سے پہلے خود بھی چندہ دیا کریں یہ صورت اچھی نہیں کہ دوسروں ہی کو ترغیب دی جائے اور اپنے گھر سے کچھ نہ نکالا جائے۔ اس صورت میں اثر بھی نہیں ہوتا اور لوگ متوحش ہوتے ہیں اگر تم بھی خرچ کیا کرو تو لوگوں کو وحشت نہ ہوگی۔ اب تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چندہ کے سارے وعظ کا حاصل یہ ہے کہ مولوی اپنی بچت کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے وصول کرنا چاہتے ہیں۔ اگر علماء یہ کہیں کہ ہمارے پاس کہاں ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں جو مزدور دو آنہ مہینہ دیتا ہے تم اس سے کم نہیں ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم دو آنے بھی نہ دو۔

مامون رشید کے پاس ایک شخص سوال کرنے آیا۔ مامون نے کہا کہ ہٹے کٹے مضبوط آدمی کو سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں مامون رشید کے پاس فتویٰ لینے نہیں آیا۔ فتویٰ دینے والے بہت ہیں میں آپ کو بادشاہ سمجھ کر آیا ہوں اگر دینا ہو تو دے دو ورنہ صاف جواب دے دو۔ مامون رشید نے اس کو بہت سارو پیہ دیا۔ اس کے اخلاق بہت اچھے تھے رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا تھا جیسا ماموں بھانجہ کے ساتھ کرتا ہے مگر عقائد اچھے نہ تھے۔

میرا مقصود اس حکایت سے یہ ہے کہ جب امر بالمعروف سے اپنی بچت مقصود ہو تو اس کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ پس علماء کو خود بھی خرچ کرنا چاہئے تا کہ عوام کا یہ خیال دور ہو جائے کہ مولوی اپنی

بچت کے لئے ہم سے چندے وصول کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ چندہ میں استغناء کے ساتھ تحریک کرنا چاہیے۔ لگنا لپٹنا نہیں چاہیے صاف کہہ دو **لا اسئلکم علیہ اجراً** جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ام تسئلھم خرجاً فخراج ربک خیر وھو خیر الرازقین کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے جو کفار اعراض کرتے ہیں۔ کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ آپ ان سے چندہ مانگتے ہیں تو (یہ وجہ تو ہرگز نہیں) کیونکہ خدا کی عطا سب سے بہتر ہے اور وہ سب سے بڑھ کر روزی دینے والا ہے۔

(پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے چندہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ چندہ مانگنا مخاطبین کی وحشت کا سبب ہوتا ہے پس تم لگ لپٹ کر ہرگز تحریک نہ کرو۔ وہاں استغناء کے ساتھ ترغیب دو۔ جیسا قرآن وحدیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ پس صاحبو! شریعت کے حکم انفاق سے آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ آپ سے کوئی مانگتا نہیں ہے ہاں خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ اگر نیک کام میں اپنے نفع کے لئے خرچ کرنا چاہو تو اس کی یہ صورت ہے آگے تمہیں اختیار ہے اور یہ بھی محض تمہاری مصلحت کے واسطے طریقہ بتلایا گیا ہے۔

حفاظت دین کا انتظام

ورنہ خدا تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت کے واسطے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ **وان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم ثم لایکونوا امثالکم** اگر تم (دین کے واسطے خرچ کرنے سے) روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح بخیل نہ ہوگی۔

بلکہ جان ومال سے خدا کے دین پر قربان ہوگی۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک یہ دین محفوظ چلا آ رہا ہے کیا آپ کے ہی تان گاڑی چل رہی ہے ہرگز نہیں بلکہ یہی قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ جس قوم نے دین کی خدمت سے پہلوتہی کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ دوسری قوم پیدا کر دی صاحبو! مجھے اس کی شکایت نہیں کہ مسلمان چندہ نہیں دیتے یا کم دیتے ہیں بلکہ اصل شکایت یہ ہے کہ دین پر توجہ نہیں۔ آپ چاہے کچھ بھی خرچ نہ کریں لیکن اپنی حالت کی اصلاح کر کے دین پر توجہ کریں اور توجہ کا طریقہ یہ ہے کہ قلوب کو یکجا کریں سب مل کر دین کی حفاظت کا اہتمام کریں اجتماع میں برکت اور طاقت ہے۔

دو دل یک شوند بشکند کوہ را (دو دل ایک ہو جائیں تو وہ پہاڑ کو توڑ دیتے ہیں)

جب توجہ کرو گے تو احکام دین پر عمل بھی کرو گے۔ پھر عمل کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کا بھی سامان ہو جائے گا ہم کو دوسری قوموں کی تقلید کی ضرورت نہیں کہ جس طرح وہ ترقی کر رہی ہیں اسی طرح ہم بھی ترقی کریں اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ مسلمان بھوکے ہیں ان کے گھر میں ترقی کے ذرائع موجود نہیں دوسروں سے مانگتے پھرتے ہیں۔ صاحبو! ہم کو واللہ اپنے گھر کی دولت کی خبر نہیں اس لئے ہماری یہ حالت ہے۔

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر   تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تابہ زانوی میاں قعر آب   وز عطش وز جوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے مگر تو روٹی کے ایک ٹکڑے کیلئے دربدر پھر رہا ہے تو زانوں تک نہر میں کھڑا ہے مگر پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے)

ہمارے گھر میں ترقی کے وہ ذرائع موجود ہیں جن کے سامنے تمام عالم گردن جھکا چکا ہے۔ پھر ہم دوسروں سے بھیک کیوں مانگیں اور وہ ذریعہ یہی ہے کہ اجتماعی حالت کے ساتھ سب اپنے دین پر توجہ کریں۔ اور دین کی پابندی کریں اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مولوی بن جاؤ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین سے باخبر بن جاؤ۔ کچھ تو پڑھ لکھ کر باخبر بنیں اور باقی لوگ علماء کی صحبت اختیار کریں اور ان سے مل کر دین کے احکام معلوم کریں مگر صحبت ان علماء کی اختیار کرو جن کے یہاں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ زیادہ رہتا ہو نہ کہ دنیا کا اور اس کے منتظر نہ رہو کہ علماء خود تمہارے گھر آ کر وعظ کہا کریں بلکہ تم خود ان سے جا کر ملو اور دین کی باتیں دریافت کرو۔ اس طرح کر کے دیکھو۔ ان شاء اللہ تم کو ترقی حاصل ہو جائے گی اور غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھلایا ہے۔

سادگی اور عزت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے اگر ان کا وہی حلیہ ہوا جیسے اس کتاب میں ہے تو ہم بدوں لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المومنین یہاں تشریف لے آئیں۔ شاید یہ قلعہ بدوں لڑائی کے فتح ہو جائے امیر المومنین نے

اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا اب غور فرمایئے کہ یہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسری و ہرقل بھی تھراتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیض میں آپ نے سفر کیا ہے اس میں چند در چند پیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام......! آج کل ادنی سے ادنی ڈپٹی کے دورہ میں بڑا سامان ہوتا ہے یہاں خلیفہ اعظم کے دورہ میں کچھ بھی سامان نہ تھا پھر آج کل ادنی حاکم کے دورہ میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کے لئے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستو اور ایک تھیلے میں چھوارے بندھے ہوئے تھے۔ منزل پر اتر کر ستو گھول کر پی لئے اور چھوارے کھا لئے نہ رعایا سے نہ مرغے لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔

جب آپ اس شان سے کبھی سوار اور کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے اس لئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیص اتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جایئے تا کہ ان کی نظر میں عزت ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔

ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے مگر صحابہ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا کہ میرے دوستو! تم نے تو اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا۔ واللہ! میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے۔ تم میرا وہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ۔ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے تو کیا ہمارا دل اور ہمارا من نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور یہ جو حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ **نحن قوم** الخ واقعی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست   باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

”جمال محبوب ہمارے عشق ناتمام سے مستغنی ہے۔ جس طرح زیبا صورت کو رنگ وروپ اور خط وخال کی حاجت نہیں ہے“

خوبصورت چہرہ کو زیب وزینت کی حاجت نہیں وہ تو ہر لباس میں حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے، جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو چنانچہ حضرت عمرؓ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور اسی سواری پر آپ کو دیکھ کر نصاریٰ نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھول کر حضرت عمرؓ کے حلیہ کو ان اوصاف سے ملانے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے لباس اور ایسی سواری پر تشریف لائیں گے اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔

کہ آب چشمہ حیواں درون تاریکی ست   ”چشمہ آب حیات کے اندرونی حصہ میں اندھیرا ہے“

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر گر پڑا اور کہا جلدی سے قلعہ کھول دو۔ (بخدا یہی وہ شخص ہے، جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے) یہی فاتح بیت المقدس ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدوں جنگ وجدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔ تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔

سادگی کی چند مثالیں

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹننٹ گورنر نے ملنے کی اجازت چاہی۔ یہاں سے اجازت ہو گئی اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹننٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چونکہ لفٹننٹ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آ رہے تھے اور مہمان کی مدارات اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اس لئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ لفٹننٹ گورنر کس دن آئیں گے۔ چنانچہ جب دن آیا اور لفٹننٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں

پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمایا جائے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا مٹھائی کی ہنڈیا میں کچھ ہو تو ان کو دے دے۔ یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دیا گیا جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے کہ مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا مگر آخر میں یہ سب منصوبے مٹ گئے اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی

غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے اگر کسی مہمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے مبالغہ نہ کیا جائے اسی میں ہماری عزت ہے مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں ان کا لباس ان کا طرز معاشرت ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی اس میں عزت نہیں ہے۔

ایک بار میں بریلی میں تھا بھائی سے جنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں بھائی نے مجھ سے پوچھا میں نے کہا ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا (مناسب بھی نہیں) ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے۔ میں چلوں گا بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں اسی میں جاؤں گا چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں ان سے ملنے گیا وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور میں نے اور بھائی نے ان کے بنگلہ ہی پر نماز پڑھی پھر وہ آ کر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بٹھلایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو کر آ گئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں اس سے ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

کلکتہ میں مولوی عبدالجبار صاحب وائسرائے سے عبا اور چوغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر ملے۔ دوسرے روسا انگریزی لباس میں گئے تھے۔ تو وائسرائے نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب

آپ اس لباس میں شہزادہ معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو شریعت نے جو تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہئے بس ہو چکا خاتمہ ہم کو دوسروں کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں اپنی ہی ذلت ہے گویا زبان حال سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے گھر میں ترقی کے اسباب وذرائع موجود نہیں ہیں۔

طلب اور اتباع

تعلیم شریعت کا اتباع یوں ہی ہو سکتا ہے کہ علماء کا اتباع کیا جائے مگر ایسے علماء کا جو خود آپ کے متبع نہ ہوں۔ یعنی وہ آپ کے مذاق کا اتباع نہ کریں بلکہ آپ سے اپنے مذاق کا اتباع کرائیں۔ کیونکہ جو طبیب مریض کے مذاق کا اتباع کرے گا' وہ اسے ہلاک کرے گا۔ طبیب وہ ہے جو مریض سے اپنے مذاق کا اتباع کرائے۔ آج کل بعض علماء تو طالب جاہ ومال ہیں۔ ان کو تو علماء کہنا ہی غلط ہے کیونکہ علم کتاب پڑھنے کا نام نہیں بلکہ علم دوسری چیز ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد
بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

"معشوق وہ نہیں جو اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو"

ایسے ہی مولویوں نے عوام کو چندہ کے نام سے متوحش کیا ہے۔ جنہوں نے صرف کتابی علم حاصل کیا ہے اور حقیقی علم یعنی دین کی روح حاصل نہیں کی۔ اور بعض علماء محقق ہیں صاحب علم ہیں اور طالب آخرت وہ دنیا کے طالب نہیں مگر محقق ہیں۔ خوش اخلاق بہت ہیں وہ اکثر دوسروں کے مذاق کا اتباع کراتے ہیں جس میں نیت صرف دوسروں کی دینی مصلحت ہوتی ہے مگر ان سے اپنے مذاق کا اتباع نہیں کراتے۔ ان سے مخلوق کو نفع عام تو ہوتا ہے مگر تام نہیں ہوتا۔ اور بعضے متعارف معنی کر خوش اخلاق نہیں بلکہ کم فہموں میں بداخلاق مشہور ہیں کیونکہ وہ مریض کی رائے اور مذاق کا اتباع نہیں کرتے بلکہ مریضوں کو اپنی رائے اور اپنے مذاق پر چلاتے ہیں ان سے نفع عام تو نہیں ہوتا کیونکہ لوگ ان سے گھبراتے ہیں مگر نفع تام ضرور ہوتا ہے کہ پھر وہ کسی کے قابو میں نہیں آسکتا۔ یہ لوگ محقق ہیں اور محقق سے طالب کے مذاق کا اتباع نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو طبیب کی خیانت ہے کہ مریض میں ایک مرض دیکھ رہا ہے اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اس کو مرض پر مطلع نہیں کرتا کہ یہ ناراض ہو جائے گا اگر وہ سسرا ناراض ہونے آیا ہے تو پھر علاج اور طلب صحت کا نام کیوں لیتا ہے۔ وہ مہمان

بن کر آئے پھر ہم اس کے لئے سونے کی کرسی تک کی فکر کریں گے۔ جیسے شاہ فضل الرحمٰن صاحب نے کی تھی۔ گو وقت پر یاد نہ آئے غرض ہم مہمان کے مذاق کا اتباع کرنے کو تیار ہیں۔ کوئی صرف مہمان بن کر دیکھے۔ ان شاء اللہ ہم بھی خوش اخلاق بن کر دکھلا دیں گے باقی مریض اور طالب علاج کے مذاق کا اتباع ہم سے نہیں ہو سکتا۔ یہ گفتگو درمیان میں آ گئی تھی۔

بے جا گھبراہٹ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ لوگوں کو استغناء کے ساتھ ترغیب دینا چاہئے۔ لگ لپٹ کر چندہ نہ مانگنا چاہئے جس سے دوسروں کو علماء پر احتیاج کا شبہ ہو کیونکہ یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے یہاں تو یہ حالت ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو   دار و گیر و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

"جب دل چاہے آؤ جب دل چاہے چلے جاؤ اس دربار میں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں"

بلکہ یہ طریقہ شرافت کے بھی خلاف ہے شریف آدمی کو احتیاج بھی ہو جب بھی وہ لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی فقراء کی شان قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

للفقرآء الذین احصر و افی سبیل اللّٰہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف تعرفھم بسیماھم لایسئلون الناس الحافاً

ہم نے عرب میں سائلوں کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جہاں ان سے کسی نے اللہ اکبر کہہ دیا تو فوراً اللہ کریم کہتے ہوئے چل دیئے اس لفظ کے سننے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں مانگتے۔ اب اگر کسی کو دینا ہو تو خود دوڑ کر انہیں دے دے وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور جو لوگ سر ہو جاتے ہیں وہ اکثر ہندوستان کی نسل ہیں عرب نہیں ہیں۔ مگر وہاں رہ کر صورت عربوں کی سی بنالی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کو عربی بولنا بھی نہیں آتی۔

چنانچہ ایک عرب مجھ سے ملے میں نے ان سے پوچھا کہ عرب میں آپ کتنے دنوں سے ہیں تو بولے

ثلث پیڑھی فی المدینۃ کہ مدینہ میں تین پیڑھیاں گزر چکے ہیں۔

میں نے دل میں کہا کہ تیرے پیروں میں تو بیڑیاں ڈالنا چاہئیں۔ اگر تیری ایک پشت بھی عرب میں گزرتی تو پیڑھی کا لفظ تیری زبان سے قیامت تک نہ نکلتا۔ ایسے لوگ عرب ہرگز نہیں بلکہ ہندوستان و بنگال کی نسل ہیں ورنہ جو خالص عرب ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ اول تو وہ مدینہ

سے نکلنا ہی نہیں جانتے ان کو مکہ مدینے سے ایسی محبت ہے کہ اس کے باہر ان کو چین ہی نہیں مل سکتا چنانچہ ایک بدو کے لڑکے کو بعض حاجیوں نے ہندوستان ساتھ لانا چاہا اور اس کے سامنے ہندوستان کی سرسبزی اور ارزانی کا خوب تذکرہ کیا۔ وہ سب اوصاف سن کر کہنے لگا کہ ہندوستان میں کعبہ بھی ہے؟ کہا نہیں کعبہ تو وہاں نہیں تو وہ صاف کہتا ہے کہ پھر ہندوستان میں کچھ بھی نہیں، جب وہاں کعبہ نہیں، ہائے خوب کہا۔

و من دینی حب الدیار لا ھلھا　　　وللناس فیما یعشقون مذاھب

''اور میرے دین اہل وطن سے محبت ہے اور لوگ مختلف طریقوں سے محبت رکھتے ہیں''

مولانا نے مثنوی میں ایک عاشق و معشوق کی گفتگو نقل فرمائی ہے۔ اس بدو کے لڑکے کا جواب بالکل اسی جواب کے موافق ہے جو مولانا نے عاشق کی طرف سے بیان فرمایا ہے۔

گفت معشوقے بعاشق اے فتا　　　تو بہ غربت دیدہ بس شہرہا
پس کدامی شہر زانہا خوشترست　　　گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں　　　فوق گردون است نے قعر زمیں
ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ　　　جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ

کسی معشوق نے عاشق سے پوچھا کہ تم نے سیاحت میں کون سا سفر پسند کیا ہے اس نے جواب دیا عمدہ شہر وہ ہے جہاں محبوب کی رہائش ہو جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو۔ اے محبوب بے تمہارے جنت بھی دوزخ ہے اور تمہارے ساتھ دوزخ بھی جنت ہے۔

واقعی اہل عرب کی نظر میں جہاں کعبہ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں تو یہ لوگ اول تو باہر کم جاتے ہیں اور کبھی جاتے ہیں تو بہت جلد واپس ہو جاتے ہیں اور جو لوگ برسوں ہندوستان کا دورہ لگاتے رہتے ہیں ان میں خالص عرب کم ہیں زیادہ تر یہیں کے لوگ ہیں جو عبا قبا پہن کر عرب بن گئے ہیں اسی لئے ان میں عربوں کی سی غیرت نہیں کہ سوال میں الحاح ولجاج کرتے ہیں۔

ہمارے ساتھ حج میں ایک عالم چٹنے والے تھے۔ انہوں نے وہاں چٹنے ہی کا کام کیا تھا وہ یہ کہ جعفر آفندی پاشا کے مترجم اصل میں ہندی تھے اہل ہند سے محبت کرتے تھے ایک دفعہ حرم میں ان مولوی صاحب کا سامنا ہو گیا مصافحہ کیا مولوی صاحب سمجھے کہ کوئی سائل ہے۔ بہت خشک لہجہ میں پوچھا کچھ کہنا ہے۔ جعفری آفندی میں ظرافت بہت تھی کہنے لگے حضور بھوکا ہوں کچھ دے دیجئے وہ مولوی صاحب بڑے غصہ سے بولے تم کو شرم نہیں آتی ایسا عبا جبہ پہن کر سوال کرتے ہو

اس کو بیچ کر نہیں خرچ کیا جاتا۔ جعفر نے کہا حضور اگر معمولی لباس میں ہم سوال کریں گے تو آپ پیسہ دو پیسہ دے کر ٹال دیں گے اور اس لباس میں دیکھ کر کم از کم دو تین روپے تو دیں گے مولوی صاحب اس جواب سے اور بھی جھلائے اور بڑ بڑ کرتے چل دیئے دوسرے وقت وہ مولوی صاحب حرم میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ جعفر آفندی سامنے سے آئے۔ میں ان کی تعظیم کو اٹھا وہ چندہ والے مولوی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو کوئی سائل نہیں معلوم ہوتا کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر آفندی نے بیٹھ کر باتیں کیں اور یہ بھی کہا کہ آپ تو میری تعظیم کرتے ہیں اور یہ مولوی صاحب ہم سے بے رخی کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ایسے نادم ہوئے اور سر نہ اٹھا سکے کہا صاحب معاف فرمایئے گا میں معذور ہوں۔ میں نے کتاب میں دیکھا تھا کہ مکہ میں قیمتی عبا قبا والے سوال کرتے ہیں اور اس کا مشاہدہ بھی میں نے کیا ہے اس لئے مجھے آپ پر بھی یہی شبہ ہوا۔ جعفر آفندی نے کہا کہ آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ حالت عمامے والوں کی ہے یا ترکی ٹوپی والوں کی کہنے لگے کہ ہاں صاحب جتنے سائل میں نے دیکھے وہ سب عمامے ہی والے تھے۔ جعفر آفندی نے کہا پھر آپ نے مجھے ان پر کیوں قیاس کیا۔ میں تو ترکی ٹوپی پہن رہا تھا۔

چندہ کی تحریک

صاحبو! جیسے وہ چندہ والے مولوی صاحب عمامے اور عبا والوں کی صورت سے گھبراتے تھے ایسے ہی آج کل مسلمان مولویوں کی صورت سے گھبرانے لگے ہیں کہ بس اب چندہ کا سوال ہوگا حالانکہ علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں۔ وارثان رسولؐ سے مسلمانوں کو وحشت ہونا سخت مضر ہے اس کی اصلاح ضروری ہے۔ جس کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علماء چندہ کی تحریک نہ کیا کریں اور بحمد اللہ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وارث ہیں وہ اس سے خود ہی بچتے ہیں۔ بس صحیح طریقہ یہ ہے کہ استغناء کے ساتھ لوگوں کو ترغیب عام دی جائے چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے پھر ان شاء اللہ وحشت نہ ہوگی۔

ایک بات اور قابل اہتمام ہے وہ یہ کہ جو لوگ چندہ کا وعدہ کرلیں پھر کسی وجہ سے وہ چندہ نہ بھیجیں تو ان کے پاس تقاضے کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ نہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے نام فہرست خارج کردگان میں شائع کئے جائیں اس سے بھی لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔

یہ تو تمہید تھی مگر تمہید بہت طویل ہوگئی اب میں آیت کا بیان شروع کرتا ہوں۔

آیت متلوہ کا شان نزول

اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تھے اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے مدینہ ہی میں رہ گئے جن میں زیادہ تر تو منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے آپ کی واپسی پر منافقین نے تو آ کر جھوٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھا۔ یہ سب پیش آ گیا تھا مگر مخلصین نے اپنی خطا کا صاف صاف اقرار کر لیا کہ یا رسول اللہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔ محض کاہلی اور سستی سے پیچھے رہ گئے۔ حضور نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا۔ اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ خواہ معاف فرماویں یا سزا تجویز کر دیں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی ان سے بات چیت اور سلام وکلام نہ کرے۔ پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی تو یہ حضرات خوش خوش حضور کے پاس آئے اور شکریہ قبول توبہ میں اپنا مال حضورؐ کے پاس لائے کہ اس کو کار خیر میں صرف فرما دیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مال قبول کرنے میں سوچ ہوئی۔ آپؐ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے اس وقت محض جوش میں دے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتائیں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرما لیجئے۔ یہ لوگ مخلص ہیں۔

جیسا کہ بعض دفعہ ہمارے سامنے کوئی شخص بہت زیادہ رقم لاتا ہے اور اس کے لینے سے رکاوٹ ہوتی ہے کہ شاید یہ اپنی وسعت سے زائد دے رہا ہو تو احباب سفارش کرتے ہیں کہ یہ تو بڑی آمدنی والے ہیں مگر سادہ لباس پہنتے ہیں اس لئے یہ رقم ان کی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ کانپور میں ایک شخص میرے پاس ساٹھ روپے لائے اور مجھے ان کے لینے سے تامل ہوا۔ پھر بعض لوگوں نے بیان کیا کہ ان کی آمدنی تو کئی سو روپے ماہوار کی ہے جب میں نے قبول کیا۔ اور ان سے کہا کہ ذرا اپنی صورت ایسی بناؤ جس سے معلوم ہو کہ خدا نے تم کو کتنا دیا ہے۔ حدیث میں یہی حکم ہے۔

لیرا ثر النعمة علیک تا کہ نعمت کا اثر تم پر معلوم ہو تو ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ سفارش فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ہیں ان کا صدقہ منظور کر لیا جائے اور اسلامی کاموں میں لگا دیا جائے۔

اور من اموالھم میں ظاہر یہ ہے کہ من تبعیضیہ ہے۔ گو احتمال یہ بھی ہے کہ بیانیہ ہو تو من تبعیضیہ

کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جز قبول کرلیا جائے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیق اکبر ؓ کی اور شان ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے۔ پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

مال دادن خود سخائے صادق ست　　جان دادن خود سخائے عاشق ست

”اپنا مال دینا بھی سخاوت ہے اپنی جان دینا عاشق کی سخاوت ہے“

لیکن ہر شخص کی یہ شان نہیں اس لئے من تبعیضیہ سے جزو مال لینے کا امر کیا گیا مگر جزو مال عام ہے۔ اگر ثلثین لے لیا جائے جب بھی جزو صادق ہے اور ایک لاکھ میں ایک روپیہ لے لیا جائے تو اس پر بھی جزو مال صادق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا مقتضا یہ تھا کہ آپ جزو اقل پر کفایت فرماتے کیونکہ آپ کو تو سرے سے اسی میں تردد تھا کہ لوں یا نہ لوں۔ اب حق تعالیٰ کی سفارش کے بعد لینے کا خیال تو ہوا مگر جزو قلیل کی طرف ذہن گیا ہوگا کہ تھوڑا سا لے لیا جائے لیکن اس سے دینے والے کا جی بھلا نہ ہوتا۔ تو حق تعالیٰ آئندہ اس کا معیار بیان فرماتے ہیں کہ کس قدر لینا چاہئے اور یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کسی کا ہدیہ محض اس وجہ سے قبول فرماتے ہیں تاکہ دوسرے کا دل خوش ہو جائے کیونکہ واپس کرنے سے اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہی شان اہل اللہ کی ہے کہ لوگ سر ہو کر ان کو دیتے ہیں۔ ناک رگڑتے ہیں جب وہ ہدیہ قبول فرماتے ہیں۔

اس پر مجھے اپنے ایک بھتیجے کی بات یاد آئی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو شوخی کرتا پھرتا تھا میں نے اسے بلایا کہ آؤ باتیں کریں۔ چنانچہ وہ آیا اور میں نے اس سے پوچھا کہ بتلاؤ عربی اچھی ہے یا انگریزی۔ کہنے لگا کہ عربی میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگا کہ قرآن عربی میں ہے میں نے کہا ٹھیک! لیکن عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے؟ کہنے لگا بات یہ ہے کہ جب آدمی عربی پڑھتا ہے وہ اللہ کا ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈالتا ہے کہ اس کو دو۔ وہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سچ ہے مگر اس کو ذلت سمجھتے ہیں کہنے لگا ذلت کی کیا بات ہے یہ خود تو کسی سے نہیں مانگتا لوگ خوشامد کر کے خود دیتے ہیں مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی کہ ذرا سی عمر میں اس نے حقیقت کو خوب سمجھا۔

میں نے یہ واقعہ بھائی سے بیان کیا اور کہا کہ اس بچہ کو تو خواہ مخواہ تم نے انگریزی میں ڈالا۔ اس کو عربی پڑھائی ہوتی وہ بھی بہت ذہین ہیں۔ کہنے لگے کہ جب اس کی طبیعت میں عربی سے مناسبت اور شوق ہے تو اس کو تو یہ خود بھی حاصل کرلے گا۔ مجھے تو وہی تعلیم دینا چاہئے جس سے اس کو مناسبت نہیں اور ہے ضرورت کی چیز تاکہ میرے اثر سے اس کو حاصل کر کے دنیا میں راحت

سے رہے۔ پھر دین کا علم تو یہ اپنی مناسبت کی وجہ سے خود حاصل کر لے گا۔ میں نے کہا کہ یہ مناسبت جو اس وقت ہے وہ انگریزی پڑھنے سے زائل ہو جائے گی پھر یہ محض دنیا کا رہ جائے گا اور جو جوہر اس میں اس وقت ہے برباد ہو جائے گا۔

غرض میرا مطلب یہ ہے کہ شریعت تو اس چندہ کو قبول کرتی ہے جس کی یہ حالت ہو کہ واپس کرنے میں دینے والوں کی دل شکنی ہو اور وہ خود اصرار کریں کہ ہمارے مال کا معتدبہ حصہ لے لو اور اگر ہم تھوڑا سا لے لیں تو اس سے ان کا جی خوش نہ ہو بلکہ زیادہ لینے کے لئے خوشامد کریں تو ایسے چندہ میں کوئی حرج نہیں۔

یہ سب بیان مقصود سے پہلے ہی کا ہے۔ ابھی میں نے مقصود عرض نہیں کیا۔ مقصود آگے ہے۔ یہ تو تمہید تھی جس میں میں نے بتلا دیا کہ علماء مسلمانوں سے مال نہیں مانگتے بلکہ محض ترغیب دیتے ہیں۔ آگے آپ کو اختیار ہے چاہے دو یا نہ دو اور جو لوگ ترغیب سے آگے بڑھتے ہیں وہ شرعی حدود سے تجاوز کرتے ہیں پس ان کے فعل کی بناء پر مسلمانوں کو حکم شرعی سے متوحش نہ ہونا چاہئے۔ خیر یہ گھاٹی تو پار ہو گئی۔

طہارت ظاہری و باطنی

اب مقصود سنئے۔ اس وقت میرا مقصود اس آیت کے اس جزو کو بیان کرنا ہے۔ **صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا** جس میں حضورؐ کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے اور ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے آپ ان کو پاک کریں اور طاہر کریں۔ **بھا** میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ **تزکیھم** کے متعلق ہو **تطھرھم** کے متعلق نہ ہو اس صورت میں **تطھرھم** میں خطاب نہ ہوگا۔ بلکہ یہ صیغہ غائب کا ہے جو صدقۃ کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے پاک کرنے والا ہو اور آپ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اس صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی پھر حضور کا فعل مذکور ہوا کہ آپؐ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسمانوں کے تزکیہ کے لئے اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ **بھا** دونوں کے متعلق ہو **تطھرھم** کے بھی اور **تزکیھم** کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے خطاب کے ہیں اور **بھا** دونوں کے متعلق ہے اس میں تناسب و تناسق کلام بھی باقی رہے گا بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے۔

دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔

اب آج کل عام مذاق یہ ہے کہ لوگ پاک ہونا ہی نہیں چاہتے نہ اس کا قصد کرتے ہیں نہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ وقلیل ما ہم۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم کو استنجا کرنا تو آتا ہے ہم تو روز غسل کرتے ہیں پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم پاک ہونا نہیں چاہتے۔

تو صاحبو! بس آپ نے اسی پاکی کو سیکھا ہے اور اسی پر کفایت کر لی ہے کہ بدن کو دھویا مانجا اور نستعلیق ہو گئے اس کے سوا اور کوئی پاکی آپ کو معلوم ہی نہیں اس لئے اس کا قصد کیونکر کریں سو اس پاکی کا یہاں ذکر نہیں جس کو آپ پاکی سمجھتے ہیں بلکہ یہاں وہ پاکی مراد ہے جس میں صدقہ کو بھی بڑا دخل ہے ورنہ کیا معاذ اللہ آپ یہ کہیں گے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو استنجا کرنا اور نہانا دھونا نہیں آتا تھا۔ حضرت یہ وہ پاکی ہے جو سات سمندروں کے پانی سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ظاہری ناپاکی اس کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچاتی۔

رامپور کے ایک قاری صاحب کی میں نے حکایت سنی ہے کہ ان کو حج کا اشتیاق ہوا لیکن روپیہ پاس نہ تھا کہیں سے ان کو سوا روپیہ مل گیا تھا۔ اس میں سے چار آنے کا ایک تھیلہ منگوایا اور ایک روپیہ کے چنے بھنوا کر اس میں بھر لئے اور پیادہ پا چل پڑے۔ راستہ میں کہیں کسی نے دعوت کر دی اور دل نے منظور کیا تو دعوت قبول فرمالی ورنہ چنے چاب کر پانی پی لیا اور آگے چل پڑے۔ اسی طرح کئی مہینے میں بمبئی پہنچے۔ جب جدہ کو جہاز جانے لگا تو قاری صاحب جہاز پر پہنچے اور کپتان سے کہا کہ اگر جہاز میں کوئی نوکری خالی ہو تو میں نوکری چاہتا ہوں۔ کپتان نے کہا کہ نوکری تو ہے مگر آپ کے مناسب نہیں کیونکہ اس نے صورت سے دیکھا کہ ایک شریف بزرگ انسان ہے اس کے لئے کوئی پاکیزہ کام چاہیے۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ آپ مناسب وغیر مناسب کو نہ دیکھئے اگر کوئی ملازمت خالی ہو مجھے دے دیجئے۔ کپتان نے کہا ایک بھنگی کی ملازمت خالی ہے۔ مگر آپ اس کو نہیں کر سکتے کیونکہ قوت کا کام ہے اور آپ ضعیف ونحیف آدمی ہیں۔ فرمایا تم اس کی فکر نہ کرو میں سب کام کر لوں گا اس نے امتحان کے طور پر کہا کہ اچھا یہ بورا پڑا ہے اس کو تو اٹھاؤ۔ وہ بورا اڑھائی تین من کا تھا جس کو قوی مزدور بھی نہ اٹھا سکتا تھا قاری صاحب نے اس کو ہاتھ لگایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں تک تو میرا کام تھا آگے آپ کا کام ہے میری مدد فرمائیے دعا کر کے جو بسم اللہ کر کے اٹھایا ہے تو سر سے اوپر لے گئے اور نہایت سہولت سے دوسری جگہ رکھ دیا۔ کپتان نے کہا شاباش! تم واقعی یہ کام کر لو گے اور آپ کا نام لکھ لیا۔ دو غریب مسلمان شائق حج اور کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی کپتان سے ملازمت کی درخواست کی۔ کپتان نے کہا کہ یہی ملازمت خالی ہے اگر تم کرنا چاہو تم بھی

آ جاؤ۔ اس کام کو سن کر سب رک گئے کہ یہ تو ہم سے نہ ہوگا۔ قاری صاحب نے فرمایا کہ اللہ کے بندو! محبوب کے دربار میں جانے کے لئے راستہ موجود ہے اور تم محض اس کام کی وجہ سے رکتے ہو۔ چلو تم نام لکھوالو میں تمہارا کام بھی کردیا کروں گا۔ چنانچہ ان کا نام بھی لکھوادیا اور خود سب کے کام کا ذمہ لیا۔ جب جہاز میں دن بھر آپ بھنگی کا کام کرتے اور نماز کے وقت نہا دھو کر پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھتے اور رات کو تہجد میں قرآن پڑھتے۔ ہائے کیسے عجیب لوگ تھے۔

ایں چنیں شیخ گدائے کو بکو — عشق آنند لا ابالی فاتقوا

"ایسا فقیر صفت شیخ میں بڑا لاابالی ہے پس ڈرتے رہو"

ایک اور شاعر کہتا ہے

عشق را نازم کہ یوسف را بازار آورد — ہمچو صنعا زاہدے را زیر زنار آورد

"میرے عشق کو ناز ہے کہ یوسف علیہ السلام کو بازار لے آیا صنعا جیسے زاہد کو زنار پہنادیا"

ایک رات قاری صاحب تہجد میں قرآن پڑھ رہے تھے۔ قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے کہ کپتان ان کے پاس سے گزرا۔ اس کو ان کا قرآن پڑھنا پسند آیا۔ کھڑا ہوگیا۔ جب نماز سے سلام پھیرا تو پوچھا کہ تم کیا پڑھتا ہے۔ کیا یہ خدا کا کلام ہے کہا ہم کو بھی سکھلا دو۔ فرمایا کہ ہاں مگر ایک شرط ہے کہ پہلے غسل کرو۔ پھر ایک کلمہ پڑھو۔ اس کے بعد قرآن سکھلائیں گے چونکہ اسے قرآن کا شوق ہوگیا تھا اس نے غسل بھی کیا اور کلمہ بھی پڑھا الحمد اور قل ھو اللہ سیکھی اور شوق میں چلتے پھرتے ان کو پڑھتا تھا دوسرے انگریزوں نے جو اس کو قرآن پڑھتے سنا کہا یہ تم کیا پڑھتے ہو؟ کہا ہمارے بھنگی نے ہم کو سکھایا ہے ہم قرآن پڑھتے ہیں انگریزوں نے کہا کہ تم تو مسلمان ہوگیا کہا نہیں ہم مسلمان نہیں ہوا۔ انگریزوں نے کہا کہ نہیں تم مسلمان ہوگیا۔ تو وہ دوڑا ہوا قاری صاحب کے پاس آیا کہ کیا ہم مسلمان ہوگیا۔ قاری صاحب نے کہا کیا آج ہوئے تم تو کئی روز سے مسلمان ہو چکے ہو۔ اس کو یہ سن کر اول تو کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ پھر کہنے لگا اگر اس کے پڑھنے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم مسلمان ہی رہیں گے لیکن اس کلام کو نہ چھوڑیں گے اس کے بعد اپنی میم سے کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ ورنہ تم بھی ہم سے الگ ہو جاؤ۔ میم نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس نے اس کو الگ کردیا۔ پھر جب جدہ آگیا تو قاری صاحب کے ساتھ وہ بھی جہاز کی ملازمت سے استعفادے کر مکہ چلا گیا اور حج ادا کیا۔

تو حضرت یہ وہ پاکی ہے جو پاخانہ اٹھانے سے زائل نہیں ہوتی ہاں اس میں رذائل باطنی سے ضرور کمی آجاتی ہے۔

اہل اللہ کی اصلاح

اس پر اس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ایک واقعہ یاد آیا۔ مقصود تو یہی واقعہ ہے مگر اس سے پہلے ایک اور واقعہ ان ہی کا بیان کرتا ہوں کیونکہ اس کا واقعہ مقصود سے تعلق ہے۔

وہ تمہیدی واقعہ یہ ہے کہ ایک بار بادشاہ دہلی نے آپ کو بلایا اور یہ حضرات سلاطین کی توہین نہ کرتے تھے بلکہ ان کے حقوق حاکمانہ کی رعایت فرماتے تھے چنانچہ بادشاہ کے بلانے پر آپ چلے اور قیمتی لباس پہن کر چلے۔ راستہ میں ایک کتے کا بچہ ایک گندی نالی میں سردی سے سکڑا ہوا پڑا دیکھا اول خادم سے فرمایا اس کو باہر نکالے وہ ذرا منقبض سا ہوا آپ سے نہ رہا گیا۔ فوراً اپنے ہاتھ سے نکالا اور حمام وہاں قریب تھا وہاں لے جا کر اس کو گرم پانی سے غسل دیا اس کو گرمی پہنچی تو وہ حرکت کرنے لگا پھر اس محلہ کے آدمیوں سے فرمایا کہ اگر تم اس کی خبر گیری کا وعدہ کر لو تو میں اس کو یہاں چھوڑ دوں ورنہ اپنے ساتھ لے جاؤں۔ کسی نے ذمہ لے لیا تب آپ اس کے حوالے کر دربار شاہی میں تشریف لے گئے۔

اس واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ مقصودہ یہ ہوا کہ ایک دن آپ جنگل میں بٹیا کے راستہ سے جا رہے تھے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بٹیا کے دونوں طرف پانی اور کیچڑ تھا۔ صرف بٹیا کا راستہ خشک تھا کہ سامنے سے ایک کتا اسی بٹیا پر آ گیا۔ بٹیا اتنی پتلی تھی کہ شاہ صاحب کتے سے بچ کر نہ نکل سکتے تھے بلکہ دونوں میں سے ایک کو پانی کیچڑ میں اترنا پڑتا تھا۔ اب شاہ صاحب ٹھہر گئے اور کتا بھی سامنے کھڑا ہو گیا۔ شاہ صاحب نے اس سے فرمایا کہ بھائی تم کیچڑ میں اترو۔ کہا کیوں میں ہی کیوں اتروں؟ کیا تم اپنے کو مجھ سے افضل سمجھتے ہو۔ فرمایا نہیں! صرف اس لئے تم سے اترنے کو کہہ رہا ہوں کہ میں مکلف ہوں نماز وغیرہ پڑھتا ہوں کیچڑ میں میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ تو غیر مکلف ہے پانی سے نکل کر سوکھ جائے گا تیرا کچھ خرچ نہ ہوگا کتے نے جواب دیا کہ ہاں میرا اترنے سے کوئی حرج نہیں لیکن یہ سمجھ لو کہ اگر تم اترے تو صرف کپڑے ناپاک ہوں گے جو ایک لوٹا پانی سے پاک ہو جاویں گے لیکن میں اتر گیا اور تمہارے دل میں وسوسہ آ گیا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں تو تمہارا دل اتنا ناپاک ہو جائے گا کہ سات سمندروں سے بھی اس کی نجاست زائل نہ ہوگی۔ اب تم کو اختیار ہے جس شق کو چاہو اختیار کرو۔ بس یہ سن کر شاہ صاحب نے کپڑے سنبھالے اور بسم اللہ کر کے خود ہی کیچڑ میں اتر گئے اور کتا بٹیا کے راستے سے چلا گیا۔

اس کے بعد شاہ صاحب کو الہام ہوا کہ عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ یہ علم عظیم تم پر کتے کی زبان سے کیوں ظاہر کیا گیا تم نے جو فلاں دن ایک کتے کے بچہ کی خدمت کی تھی۔ یہ اس کی برکت سے عطا ہوا اور ہم نے کتے ہی کے واسطہ سے تم کو یہ علم دیا تا کہ تمہارا اس کتے کے بچہ پر احسان نہ رہے کیونکہ اسی کی برادری کے ایک فرد نے اس کی مکافات کر دی حضرات اہل اللہ کی یوں اصلاح ہوتی ہے کسی کو کیا خبر ہے کہ ان حضرات کے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آتے ہیں۔

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا برسر خورند

تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کا حال کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے۔

ان کو پریشانی بھی ایسی پیش آتی ہے کہ اہل دنیا کی پریشانی اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھی اور خوشی بھی ایسی ہوتی ہے کہ دنیا داروں کو اس کی ہوا نہیں لگی۔ اس خوشی کا یہ حال ہے۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے

ایک ساعت ایک لحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دار و گیر شاہی سے بہتر ہے۔

بعض لوگ اہل اللہ کو ظاہر میں خوش پوشاک اور بے فکر دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو کچھ فکر نہیں۔ ہاں سچ ہے۔ جس چیز کی تم کو فکر ہے اس کی انہیں فکر نہیں یعنی دنیا کی اور جس کی انہیں فکر ہے اس کی تم کو خبر ہی نہیں یعنی خدا کے تعلق میں کمی نہ ہونے کا۔ تم اہل اللہ کی ریس نہ کرو۔ ان کی طرح خوش پوشاک نہ بنو نہ ان کے اقوال کی نقل کرو۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ سلامتی اسی میں ہے کہ ان مضامین میں سکوت کیا جائے۔

اگر تم نقل کرو گے تو وہی حالت ہوگی جیسے ایک بندر نے بڑھئی کی نقل کی تھی کہ اس کو لکڑی چیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ بھی اس کے جانے کے بعد لکڑی پر آ بیٹھے اور میخ جو دو تختوں کو چیرتے ہوئے درمیان میں لگا دی جاتی ہے ان کے درمیان میں اتفاق سے آپ کی سب جمع پونجی آگئی اور آپ نے اسی میخ کو ہلانا شروع کیا۔ اس پر جو زور پڑا وہ میخ نکل آئی اور دونوں تختے باہم مل گئے اور دونوں کے بیچ میں آپ کی سب جمع پونجی آگئی۔ اب کیا تھا قرنطینہ ہو گیا۔ لگا چیخنے چلانے کچھ دیر

کے بعد جو بڑھئی آیا اس نے خوب مرمت کی اسی لئے کہتے ہیں۔

کار بوزینہ نیست نجاری   ”بندر ترکھان کا کام نہیں کر سکتا“

یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بلا تحقیق اہل اسرار کی نقل کرتے ہیں۔ بس بزرگوں کا اتباع ان افعال واقوال میں کرو جن کے اتباع کا وہ حکم کریں۔ باقی ان کی خاص حالت یا ان اقوال کی نقل نہ کرو جو اسرار کے متعلق ہیں۔ غرض دل کی طہارت اور چیز ہے وہ استنجا سے یا دھونے مانجنے سے حاصل نہیں ہوتی اس کے حصول کا طریق دوسرا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ ایک بار چلے جا رہے تھے کتا سامنے آ گیا آپ نے اس سے دامن بچایا کتے نے کہا کہ مجھ سے دامن اس لئے بچاتے ہو کہ میں ناپاک ہوں۔ مگر یاد رکھو میرا تو ظاہر ہی ناپاک ہے اور تمہارا باطن تکبر کی وجہ سے ناپاک ہے میری ناپاکی تو سات بار پانی بہانے سے دور ہو سکتی ہے مگر تمہاری ناپاکی باطنی سات سمندروں سے بھی پاک نہیں ہو سکتی۔ حضرت بایزید روئے اور کہا آؤ دونوں دوستی کر لیں۔ ہم بھی ناپاک تو بھی ناپاک۔ اس نے کہا میری تمہاری کیا دوستی تم جہاں جاتے ہو تمہاری تعظیم کی جاتی ہے اور میں جہاں جاتا ہوں دھتکارا جاتا ہوں آپ پھر روئے اور فرمایا جو شخص کتے کی دوستی کے لائق نہ ہو وہ خدا تعالیٰ کی دوستی کے کب لائق ہو گا۔

صاحبو! اہل اللہ کی اس طرح اصلاح ہوتی ہے اور یوں ان کے دل کو پاک کیا جاتا ہے ان ہی حضرت بایزید کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک بار عید کے دن حمام سے نہا دھو کر عمدہ لباس پہن کر نکلے آ رہے تھے کہ راستہ میں ایک شخص نے اپنے مکان سے کوڑے اور راکھ کا ٹوکرا غلطی سے آپ کے اوپر ڈال دیا۔ تمام بدن اور لباس ملوث ہو گیا مگر آپ کے چہرہ پر بل نہیں پڑا۔ فوراً نفس کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نفس تو تو جہنم کے لائق ہے اگر راکھ ہی پر صلح ہو جائے تو تیری خوش نصیبی ہے۔

صاحبو! یہ ہے دل کی پاکی جس کا اس جگہ بیان ہے اس سے آج کل مسلمان بالکل بے خبر ہیں۔ اس بے خبری کی بدولت ہماری یہ حالت ہے کہ دشمنوں سے تو کیا موافقت کرتے دوستوں سے بھی اختلاف وجدال کرتے رہتے ہیں۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا   دل دشمناں ہم نکر دند تنگ
ترا کے میسر شود ایں مقام   کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

مردان راہ خدا نے دشمنوں کے دل کو بھی رنجیدہ نہیں کیا۔ تجھ کو یہ مرتبہ کب حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ دوستوں کے ساتھ بھی تیری لڑائی اور ان سے مخالفت ہے۔

حضرت جس کو اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس کو اتنی مہلت ہی نہیں ہوتی جو کسی سے لڑائی جھگڑا کرے۔ اس کو دشمنوں سے لڑائی کا موقع تو کیا ملتا دوستوں سے ملاقات کا وقت بھی نہیں ملتا۔ وہ سب سے الگ رہتا ہے نہ کسی سے دوستی بڑھاتا ہے نہ دشمنی پیدا کرتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

خود چہ جائے جنگ وجدل نیک و بد   کیں ولم از صلح ہا ہم ے برد

اچھی اور بری لڑائی کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ میرا دل صلح و آشتی سے جیتا جاسکتا ہے۔

کیونکہ تجربہ ہے کہ دشمن اتنا وقت ضائع نہیں کرتا جتنا دوست ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ دوستی سے بھی گھبراتے ہیں۔ صاحبو! اللہ والے بن کر دیکھو اس وقت تم کو اس کا یقین آئے گا کہ ان کو نہ دوستی کی فرصت ملتی ہے نہ عداوت کی سعدی فرماتے ہیں کہ۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوئی   چو بگذشت بر عارف جنگ جوئی
گر ایں مدعی دوست بشناختے   بہ پیکار دشمن نپرداختے

بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ ایک عارف جنگجو پر گزرے۔ اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا۔

اس تقریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دل کا پاک ہونا کیا ہے اور اس کی کس قدر ضرورت ہے بس ضروری مضمون تو اسی قدر تھا کہ لوگ جس چیز کی ضرورت سے غافل ہیں اس کی ضرورت کو ظاہر کردیا جائے اب ایک ضرورت اس کی رہ گئی کہ اس کے حصول کا طریقہ بتا دیا جائے۔

طہارت باطنہ کے حصول کا طریقہ

سو وہ بھی اس آیت کے سیاق وسباق اور شان نزول میں غور کرنے سے معلوم ہوجائے گا۔ وہ یہ کہ جن حضرات صحابہ سے یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ غزوہ تبوک سے متخلف ہوگئے انہوں نے اس کا تدارک یوں کیا کہ اول تو اپنی خطا کا اعتراف صاف صاف کیا کوئی عذر یا بہانہ نہیں تراشا۔ پھر حضورؐ نے قطع کلام وسلام کا حکم فرمایا اور وہ اس سزا پر راضی رہے (یہ غزوہ تبوک سے واپسی میں ہوا) پھر جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تو حضورؐ کی خدمت میں اپنا مال لے کر حاضر ہوئے کہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کردیا جائے۔

مجھے ان واقعات کی صورت مقصود نہیں بلکہ ان کی اصل مقصود ہے اصل ان سب کی مجاہدہ ہے جس کے معنی لغت میں مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور شریعت میں مجاہدہ کی تفسیر یہ ہے کہ نفس کی ان خواہشوں کی مخالفت کرنا تو ہر شخص کے نزدیک ضروری ہے علماء ظاہر بھی اس کے وجوب کا انکار

نہیں کر سکتے۔ مگر شاید مقدمات معصیت کی مخالفت میں کسی کو کلام ہو لیکن علماء ظاہر نے بھی طے کر دیا ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب ومقدمۃ الحرام حرام اس لئے اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ ان خواہشوں کی مخالفت بھی ضروری ہے جو مقدمات معاصی ہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ نے اپنے تجربہ سے کثرت کلام مباح وکثرت اختلاط مباح وکثرت طعام مباح وکثرت منام مباح کو مقدمہ معاصی سمجھا ہے اور تفصیل کا موقعہ نہیں ورنہ میں ثابت کر دیتا کہ واقعی زیادہ تر معاصی ان مباحات کی کثرت ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب تک ان میں تقلیل نہ کی جائے گی اس وقت تک مخالفت تقاضائے معاصی پر آسانی سے ہرگز قدرت نہ ہوگی۔ اس لئے صوفیہ تقلیل کلام وتقلیل اختلاط مع الانام وتقلیل منام کا حکم فرماتے ہیں اور تقلیل تو میں کہہ رہا ہوں ورنہ وہ تو ترک کا حکم کرتے ہیں لیکن مراد ان کی بھی تقلیل ہے۔ جس کو ترک سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ بمرگش گیر تا بہ تپ راضی شود۔

صوفیاء کی یہ تعلیم ایسی ہے جیسے طبیب مسہل میں باتیں کرنے اور سونے سے منع کیا کرتا ہے کیونکہ باتیں کرنا اور سونا مسہل کے اثر کو باطل کرتا ہے اسی طرح صوفیا کہتے ہیں کہ یہ اعمال صلوٰۃ و صوم وغیرہ جو شریعت نے بتلائے ہیں یہ باطن کے لئے مسہل ہیں۔ مگر ان کی تاثیر جبھی ظاہر ہوگی جب کہ کلام ومنام واختلاط وطعام میں تقلیل کی جائے ورنہ مسہل کا اثر ظاہر نہ ہوگا۔

اس مثال سے میرا مقصود یہ ہے کہ حضرت صوفیہ کوئی نئی بات نہیں بتلاتے بلکہ وہی طریقہ بتلاتے ہیں جو تم معالجہ اجسام میں استعمال کرتے ہو مگر حیرت ہے کہ علماء ظاہر اطباء پر تو اعتراض نہیں کرتے کہ یہ سکوت وسہر کو کدھر سے لازم کر رہے ہیں اور صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ دونوں کے التزام کا منشاء ایک ہی ہے پس معلوم ہو گیا کہ طہارت باطنیہ کا طریقہ مجاہدہ ہے یعنی مخالفت نفس جس میں اصل مقصود تو مخالفت تقاضائے معاصی میں ہے مگر تجربہ سے اس کا حصول مخالفت تقاضائے بعض مباحات پر موقوف ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ باتیں کم کرو اور سوچ کر کرو۔ کوئی بات خلاف شریعت نہ کرو اور کلام مباح بھی ضرورت سے زیادہ نہ کرو۔ اور سونا کم کرو۔ اگر زیادہ نہیں جاگ سکتے تو کم از کم عشاء کی نماز سے پہلے مت سوؤ۔ تتجافیٰ **جنوبھم عن المضاجع** کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کر سوتے ہیں اس لئے اگر تہجد میں نہ اٹھ سکو تو کم از کم اتنی ہی بیداری کے عادی ہو جاؤ کہ عشاء کے بعد سویا کرو اس سے پہلے نہ سوؤ۔ مگر اب تو مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ بس ہمیں کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور خود بخود سارا کام ہو جائے باطن کی طہارات حاصل ہو جائے اے صاحبو! آخر کچھ تو ظاہری طہارت میں بھی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ پھر ستم ہے کہ باطنی طہارت میں جو اس سے اہم واشد ہے اتنا اہتمام بھی نہ ہو جتنا ظاہری صفائی میں کیا جاتا ہے۔

حالت یہ ہے کہ نماز میں نیند کی شکایت ہے روزہ میں گرمی اور پیاس کی شکایت میں کہتا ہوں کہ تم یہ

شکایت اسی وقت تک کر رہے ہو جب تک توجہ نہیں کی۔ بخدا تم توجہ کر کے دیکھو۔ اگر تم توجہ کرو گے تو ان شاء اللہ تم کو ایسے پاک کرنے والے بھی ملیں گے جو آسان راستہ سے آپ کو پہنچا دیں گے۔ جیسے ظاہری سفر میں آج کل سہولت ہو گئی ہے کہیں پسنجر ہے کہیں ڈاک کہیں اسپشل ہے اسی طرح آج کل طریق باطن میں بھی ڈاک اور اسپشل موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے وہ اپنے بندوں کی حالت سے واقف ہیں جب تک لوگوں میں قوت تھی اس وقت تک یہ سہولت کے سامان موجود نہ تھے۔ جب سے لوگوں میں ضعف آ گیا ہے اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں بھی سہولت کے سامان کر دیے اور باطن میں بھی۔ پس آپ مجاہدہ کا نام سن کر نہ گھبرائیں۔ آج کل بعض لے جانے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے راستہ کو آسان کر دیا ہے۔ لیکن اتنا مجاہدہ تو کرنا پڑے گا کہ ارادہ کرو۔ قصد کرو اسٹیشن پر پہنچو۔ ٹکٹ خریدو۔ پھر ان شاء اللہ بہت جلد پہنچ جاؤ گے۔ نہ راستہ میں لٹنے کا خطرہ ہو گا نہ پیاس اور بھوک کا اندیشہ۔ بلکہ ہر مقام پر راحت کا سامان ملتا رہے گا۔ بہت سے اللہ کے بندے راحت کے ساتھ مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ آپ بھی توجہ کر کے دیکھئے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ترک معاصی کی ضرورت: میں یہ بات تجربہ اور تحقیق سے کہہ رہا ہوں کہ آج کل بعض مشائخ نہایت سہولت سے طریق طے کراتے ہیں۔ ہمارے حاجی صاحب فرماتے تھے کہ بعض مشائخ ایک مقام سے دفعۃً دوسرے مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ درمیانی مقامات کی بھی اطلاع نہیں ہوتی گویا طریق باطن کا یہ طفرا ہے۔ اسی کو مولانا جامی فرماتے ہیں۔

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند　　　کہ برند ازرہ پنہاں بحرم قافلہ را
ہمہ شیران جہاں بستہ ایں سلسلہ اند　　　روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

نقشبندیہ عجب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے سالکین کو خدا رسیدہ بنا دیتے ہیں۔ تمام دنیا کے شیر ان جہاں اس سلسلہ میں وابستہ ہیں۔

اور یہ محض نقشبندیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر محقق کی یہی حالت ہے اب بعض نادان یوں کہتے ہیں کہ ہم کو بعض کیفیات تو پیش آئی ہی نہیں جو دوسروں کو پیش آتی ہیں۔ اب یہ شیخ سے شکایت کرتے ہیں اور اس کے احسان کا شکر نہیں کرتے کہ اس نے سب گھاٹیوں سے دفعۃً پار کر کے اتنا جلدی پہنچا دیا ہے کہ کیفیات وغیرہ سب درمیان میں رہ گئیں اور یہ مقصود تک پہنچ گیا۔ اگر میں اس کی تفصیل کرنے بیٹھوں تو وقت بہت چاہئے۔ مگر تفصیل سے کیا ہوتا ہے یہ تو کرنے کا کام ہے تفصیل یاد کرنے سے کام نہ چلے گا۔ توجہ کرو کام میں لگو خود مشاہدہ ہو جائے گا یہ طریقہ پہلے مشائخ کا تھا کہ تمام رات بیداری کراتے تھے اب تو شیوخ کا یہ طرز ہے کہ اگر مرید تمام رات جاگنا بھی چاہے تو اس کو روکتے ہیں اور تمام دشواری کی صورتوں سے منع کرتے ہیں۔ بس اب طالبین کی وہ حالت ہے جو حدیث میں پرندوں کی حالت مذکور ہے کہ

تغدوا خماصاً و تروح بطاناً[1] صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں شام کو پیٹ بھر کر اپنے گھونسلے میں چلے جاتے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں تدبیر کا ابطال کر رہا ہوں ہرگز نہیں بلکہ اس مثال سے بھی تھوڑی سی تدبیر کا تو اثبات ہو گیا کیونکہ پرندے جو شام کو پیٹ بھر کے لوٹتے ہیں وہ اسی کا تو نتیجہ ہے کہ صبح کو گھونسلوں سے نکل کر جنگل کی طرف اڑ کر جاتے ہیں تو اس تدبیر کی ضرورت تو ہر حال میں ہے کہ طالب بن کر کسی کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں مطلقاً تدبیر کا ابطال نہیں کر رہا بلکہ سہولت تدبیر بتلا رہا ہوں کہ آج کل شیوخ محققین تو سط کا امر کرتے ہیں مبالغہ سے منع کرتے ہیں بس دو باتوں کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ معاصی کو قاطبہ چھوڑ دو اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ معاصی کا چھوڑنا بہت آسان ہے اس میں کچھ تکلیف نہیں ہوتی بلکہ ترک معاصی پر قلب کو لذت و راحت ہوتی ہے جب کسی نامحرم پر نظر پڑتی ہے اس وقت دل چاہتا ہے کہ اس کو خوب گھور کر دیکھنا اور گھورنے کے بعد دل میں ایک وحشت و پریشانی پیدا ہوتی ہے اور نگاہ نیچی کرنے میں اس وقت تھوڑی دیر تو کلفت ہو گی لیکن اس عورت کے چلے جانے کے بعد قلب پر نگاہ کرو تو ایک حلاوت موجود ہو گی اور دل خوش ہو کر یوں کہتا ہو گا۔

شکر للہ کہ بمردیم و رسیدیم بدوست　　　آفریں باد بریں ہمہ مردانہ ما

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین ہے۔

حدیث میں وعدہ ہے کہ جب کوئی شخص نامحرم سے نگاہ ہٹا لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں خاص حلاوت پیدا کرتے ہیں اور ثواب آخرت جدا رہا۔ دنیا میں یہ ثمرہ حاصل ہوتا ہے کہ دل کو چین و حلاوت نصیب ہوتی ہے جس سے واللہ موت بھی شیریں ہو جاتی ہے۔ اس کے واقعات سے بھی مزے لیتا ہے۔ اسی کو حضرت غوث اعظم فرماتے ہیں۔

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست　　　گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

اگر منکر نکیر آئیں اور دریافت کریں کہ تیرا رب کون ہے تو جواب دوں گا کہ وہ ہے دیوانہ ما جس نے ہمارے دل دیوانہ کو چھین لیا ہے۔ پس گناہوں سے قاطبۃً احتراز کرو اور اگر کسی سے سب گناہ دفعۃً نہ چھوٹ سکیں تو کم از کم وہ گناہ تو چھوڑ دے جن کے ترک میں دنیا کا بھی کوئی نقصان نہیں جیسے بدنگاہی، جھوٹ، فریب، دغابازی، تکبر، ریا، نخوت وغیرہ اور صورت یا لباس میں کفار فساق کا تشبہ کرنا وغیرہ وغیرہ اور جن معاصی کے ترک میں دنیا کا نقصان معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ تھوڑی ہو اور رشوت لیتا ہو ان سے میں یہ کہتا ہوں کہ ابھی آپ اس ملازمت کو ترک نہ کریں بلکہ اسی وقت سے جائز ملازمت اور حلال روزی کی فکر میں سچے دل سے لگ جائیں اور جب تک حلال روزی اور جائز ملازمت نہ ملے اسی حرام ملازمت میں رہے۔ مگر خدا کے لئے اس کو حرام سمجھے اور یوں سمجھے کہ میں مجبوری میں کھا رہا ہوں ایک کام تو یہ کیجئے۔

دوسرا کام یہ کیجئے کہ روزانہ اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کیجئے کہ میرا اس حرام ملازمت کا گناہ

---

[1] فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳۰۶، تفسیر القرطبی ۸: ۱۰۷

معاف کیجئے اور دعا کیجئے کہ اللہ مجھے حلال روزی عطا کیجئے اس طرح آپ عمل کرتے رہیں۔ ان شاء اللہ کوئی سبیل خلاصی کی پیدا ہو جائے گی۔ اور جب تک خلاصی نہ ہو آپ ناجائز ہی ملازمت میں رہئے۔ مگر اس عمل کو ترک نہ کیجئے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں بلکہ اس ناجائز ابتلاء کو دوسری بلا کا وقایہ بتا رہا ہوں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں۔

ایں بلا دفع بلاہائے بزرگ (یہ بلا بڑی بلاؤں کو دفع کرنے والی ہے)

کیونکہ آج کل زمانہ ایسا ہے کہ بعض لوگ فاقہ اور تنگی میں ایمان کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور جو مفتی اپنے زمانہ سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے اس لئے میں کسی کو جلد ترک ملازمت کا مشورہ نہیں دیا کرتا بلکہ یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم اسی حالت میں رہ کر محبت خدا دل میں پیدا کرو جب محبت پیدا ہو جائے گی تو پھر فاقہ اور تنگی سب آسان ہو جائے گی۔

نسبت راسخہ کا اثر: حضرت رابعہ کی یہ حالت تھی کہ جب مسلسل کئی روز تک کھانے کو ملتا اور فاقہ نہ ہوتا تو رویا کرتیں کہ شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے روٹھ گئے جو فاقہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ اپنے دوستوں ہی کو فاقہ دیا کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت رابعہ کے یہاں مہمان آئے۔ آپ کے گھر میں کل دو روٹیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر سائل آ گیا آپ نے وہ روٹیاں سائل کو دے دیں۔ مہمانوں کو حیرت ہوئی کہ اتنے تو مہمان گھر میں ہیں اور سوائے دو روٹیوں کے کچھ اور ہے ہی نہیں وہ بھی گھر میں نہ رکھیں۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ خدا کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص خوان لایا کہ فلاں رئیس نے حضرت کے واسطے کھانا بھیجا ہے۔ فرمایا ذرا دسترخوان کھول کر۔ آپ نے روٹیاں شمار کیں تو اٹھارہ تھیں۔ فرمایا واپس لے جاؤ۔ یہ میرے واسطے نہیں دی ہیں کسی اور کو دی ہوں گی کیونکہ میرے لئے بیس سے کم نہیں ہو سکتیں۔ میں نے ابھی فقیر کو دو روٹیاں دی ہیں اور میرے محبوب کا وعدہ ہے۔ الحسنة بعشرة امثالها تو اس حساب سے پوری بیس روٹیاں ہونا چاہئیں۔ قاصد نے کہا حضور آپ کا حساب درست ہے۔ دو روٹیاں میں نے چرائی تھیں وہ یہ ہیں۔ اب آپ نے وہ کھانا قبول کیا اور مہمان سمجھ گئے کہ حضرت رابعہ نے دو روٹیاں سائل کو کس لئے دی تھیں۔ حضرت جب نسبت راسخ ہو جائے گی تو اس وقت آپ بھوکے بھی رہیں گے تو مزے میں رہیں گے اور یوں کہیں گے۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا مقدر یہ نہ ہو کہ آپ کی تلوار سے ہلاک ہو جائے۔ آپ کے خنجر آزمانے کیلئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔ اور یوں کہیں گے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو اس پر قربان کرتا ہوں۔

اب آپ سے نوکری بھی چھڑوا دیں گے اور آپ کو کچھ تکلیف نہ ہوگی۔ اے صاحبو! ایک ادنی معشوق

کی محبت میں کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے۔ اس کی نظائر رات دن مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اس سے کوئی پوچھے کہ اب یہ فاقہ کیونکر گوارا ہو گیا۔ پھر عشاق خداوندی پر کیوں تعجب ہے۔ اگر وہ فاقہ سے خوش ہوں حضرت اہل اللہ کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب سے مل کر بھی ان کا دل سیر نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی وہ تڑپتے ہی رہتے ہیں پھر وہ فاقہ اور بھوک کی کیا پرواہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے عشق کا اضطراب دنیا میں ختم نہیں ہو سکتا۔ یہ تو آخرت ہی میں ختم ہو گا۔ عشاق مجاز تو وصال محبوب سے پہلے ہی کھانا پینا' سونا چھوڑتے ہیں وصال کے بعد ہر چیز کے ہوش آ جاتے ہیں۔ مگر عشاق خدا کو عمر بھر کسی چیز کا ہوش نہیں آتا یعنی وہ کسی چیز کے طالب نہیں ہوتے۔

عجب داری از سالکان طریق　　　که باشند در بحر معنی غریق
نگویم که بر آب قادر نیند　　　که بر ساحل نیل مستقیند

سالکین طریق سے تم کو تعجب ہے کہ حقیقت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں' بلکہ دریائے نیل کے ساحل پر کھڑے ہیں اور پیاسے ہیں۔

اور یہ ایسی باتیں ہیں کہ جب چاہو اپنے اندر ان کا مشاہدہ کر لو۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ　　　تو زغنچہ کم ندمیدہ دردل کشا بچمن درآ

تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو۔

مجاہدہ کی ضرورت: ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک تو معاصی کو قاطبہ چھوڑ دو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ تھوڑا سا مجاہدہ کیا کرو یعنی نفس کی مخالفت کیا کرو۔ اور مجاہدہ کے دو شعبے ہیں۔

ایک　مجاہدہ　بدنیہ　　دوسرے　مجاہدہ　مالیہ

مجاہدہ مالیہ میں بہت لوگ کوتاہی کرتے ہیں اکثر سالکین مجاہدہ بدنیہ پر تو جلد جلد راضی ہو جاتے ہیں مگر مجاہدہ مالیہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ بس وہی حالت ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست　ور زر طلبی سخن دریں است

اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں ہے اگر مال مانگو اسمیں کلام ہے۔

حالانکہ مجاہدہ مالیہ کی ایک فرد ہے اس کو بھی اختیار کرنا چاہیے بعض لوگ ایسے ہیں جو نہ مجاہدہ بدنیہ کریں نہ مجاہدہ مالیہ وہ محض وظیفوں ہی سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ بھلا جس کا قلب مریض ہو اس کا علاج زبان کے وظائف سے کیونکر ہو سکتا ہے۔ بس اس معالجہ کی وہی حالت ہے جو مثنوی میں طبیب روحانی کے قصہ میں مولانا نے فرمایا ہے کہ جب وہ طبیب روحانی آیا اور اس نے دوسرے اطباء کا طریقہ علاج دیکھا تو کہا۔

گفت آں دارو کہ ایشاں کردہ اند　　　آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

۱؎ سنن النسائی ب: ۷۵، مسند احمد ۲: ۲۳۴، ۴۱۱، سنن الدارمی ۲: ۳۱۴، المستدرک للحاکم ۴: ۲۴۱

بے خبر بودند از حال دروں استعیذ اللہ ما یفترون

اس طبیب روحانی نے کہا کہ ان حکمائے یونان نے جو علاج بھی کیا ہے وہ سب غلط اور بجائے تعمیر کے تخریب کی راہ ہے۔ اندر کے حال سے وہ بالکل بے خبر تھے۔ میں ان کے افترا اور بہتان سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

ایک صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ رات کو آنکھ نہیں کھلتی۔ کوئی وظیفہ بتلا دو۔ میں نے کہا اگر اس وظیفہ کو پورا نہ کر سکے تو پھر دوسرا وظیفہ اس وظیفہ کی تکمیل کے واسطے پوچھنے آ ؤ گے۔ اور اگر آنکھ کھل بھی گئی اور اٹھنے میں سستی رہی تو پھر سستی کے لئے وظیفہ پوچھو گے۔ بس ایک دن یوں ہی مجموعۃ الوظائف ہو جاؤ گے۔ اس طرح کام نہیں چلا کرتا۔ پابندی تہجد کا طریقہ یہ ہے کہ ایک دن ناغہ ہو تو چار آنے نفس پر جرمانہ کر کے کسی غریب کو دے دو اور جماعت صبح کی قضا ہو تو آٹھ آنے دو اور غیبت ہو جائے تو بیس رکعت پڑھو۔ چند دن میں ان شاء اللہ تہجد کی عادت اور نماز با جماعت کی عادت ہو جائے گی وظیفوں سے بھی کہیں امراض قلب کا علاج ہوا ہے۔ ان کا علاج بجز مجاہدہ کے کچھ نہیں ہاں ایک تدبیر اور ہے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور مجاہدہ میں بھی برکت و تاثیر اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو اور ان کے پاس جایا کرو۔ اگر جا نہ سکو خط و کتابت ہی رکھو اور غیبت کی حالت میں ان کے ملفوظات و مواعظ روزانہ مطالعہ کیا کرو۔ ناول ہی سمجھ کر ان کو دیکھ لیا کیجئے۔ جیسے ایک گھنٹہ ناولوں کے دیکھنے میں صرف کرتے ہو۔ تھوڑا سا وقت اسی میں سے اہل اللہ کے مواعظ کے مطالعہ کے لئے بھی نکال لو۔ ان شاء اللہ چند روز میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

مراقبہ موت کی ضرورت: ایک کام اس کے ساتھ یہ بھی کرو کہ رات کو لیتے ہوئے اپنے اعمال کا محاسبہ کیا کرو دن بھر کے کاموں کو سوچا کرو کہ آج ہم نے کتنے گناہ کئے ہیں اور کتنے نیک کام کئے۔ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور رونے کی صورت ہی بنا لو اگر رونا نہ آئے اور نیک کاموں پر شکر کیا کرو۔ اس کے بعد سونے سے پہلے موت کا تصور کر لیا کرو کہ جیسے ہم آج سو رہے ہیں اسی طرح ایک دن ایسے سوئیں گے کہ قیامت ہی میں آنکھ کھلے گی۔ پھر ملک الموت کے آنے کا اور روح قبض کرنے کا اور قبر میں تہہ دفن ہونے کا تصور کرو۔ اس سے دنیا کی محبت اور اس کے ساتھ دلی وابستگی کم ہو گی اور گناہوں سے نفرت ہو گی۔ کیونکہ گناہوں کی منشاء غفلت عن الآخرۃ ہی تو ہے۔ جب موت اور آخرت کا دھیان غالب ہو گا تو گناہ خود بخود چھوٹنے لگیں گے۔ اس کو کر کے دیکھو پھر تو آپ بچوں کی طرح کھینچکر بلائے جائیں گے۔ کہ پا بدست دگرے دست بدست دگرے۔ پھر ان شاء اللہ ایک دن وہ بھی ہو گا کہ آپ بچپن سے نکل کر بلوغ کی حد میں داخل ہو جائیں گے اور باطنی بلوغ کیا ہے اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

خلق اطفالند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(مخلوق میں وائے مست خدا کے سب بچے ہیں جو خواہش نفسانی نہ چھوڑ سکا وہ بالغ نہیں ہے)

بالغ وہ ہے جو ہوائے نفس سے نکل جائے جب تک مسلمان ہوائے نفس سے نہ نکلے نابالغ ہے طفل ہے اور جب اس سے نکل گیا بالغ ہوگیا۔ پھر جیسے بالغ ہوکر کوئی نابالغ نہیں ہوسکتا گو اس سے سارا سامان عیش چھین لیا جائے کپڑا اور روپیہ کچھ بھی اس کے پاس نہ رہے۔ مگر اس سے وہ نابالغ نہیں ہوسکتا اسی طرح طریق باطن میں وصول کے بعد رجوع نہیں ہوتا۔ قبول کے بعد رد نہیں ہوتا جتنے لوٹے ہیں، راستہ میں سے لوٹے ہیں۔ واصل ہوکر کوئی راجع نہیں ہوتا۔ الفانی لا یرد کے یہی معنی ہیں۔

پھر بہر حال یہ طریقہ ہے پاکی قلب کا جس کا حاصل مجاہدہ ہے اور مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ بالمال ایک مجاہدہ بالبدن۔ پس اب دونوں مضمون ادا ہوگئے اور معلوم ہوگیا کہ طہارت قلب کا طریق کیا ہے۔ اور طہارت قلب کی ضرورت پہلے معلوم ہوچکی تھی تو اب مقصود مکمل ہوگیا۔

خاتمہ البیان: اس مضمون کو سن کر معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس مقام کے مناسب یہی مضمون تھا اور اس کی یہاں ضرورت تھی اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ شریعت نے مال کے خرچ کرنے کی کس طرح ترغیب دی ہے کہ کسی پر جبر و اکراہ نہیں ہے بلکہ انفاق مال کو چونکہ تطہیر و تزکیہ میں دخل ہے اس لئے شریعت نے ہم کو اس کا امر کیا ہے۔ باقی سوال کسی سے نہیں کیا جاتا ہر شخص کو اختیار ہے جو پاک ہونا چاہے وہ مجاہدہ مالیہ کرے جو پاک نہ ہونا چاہے وہ اپنے گھر بیٹھے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا۔ جو علماء احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے والے ہیں وہ انفاق مال کا مضمون بھی محض تبلیغ کے طور پر بیان کیا کرتے ہیں۔ کسی سے اصرار و الحاح نہیں کرتے ہیں۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس مضمون سے اس مدرسہ کو بھی نفع ہوگا جہاں یہ بیان ہو رہا ہے اور میں صاف عرض کرتا ہوں کہ اس مضمون کے اختیار کرنے سے میرا یہ مقصود بھی ضرور تھا کہ سامعین کو امداد مدرسہ کی ترغیب ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مقصود ضرور تھا کہ ان کو ترغیب کا طریقہ بتلا دوں کہ اہل حق اس طرح ترغیب دیا کرتے ہیں جس سے کسی کو وحشت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ محض مبلغ احکام شریعت ہوتے ہیں اور شریعت نے جس استغناء کے ساتھ ترغیب دی ہے اس سے وحشت ہو ہی نہیں سکتی۔

میں اس وعظ کا نام تزکیہ و تطہیر رکھتا۔ مگر دوسرے بیانات کے ناموں کی مناسبت سے انہی کے وزن پر مطاہر الاموال رکھتا ہوں۔ جس میں اضافت بسوئے سبب ہے اور جمع کا صیغہ دلالت علی الانواع کے لئے ہے۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق ہو۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ الہ

واصحابہ وبارک وسلم واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین.

تاسیس البنیان

علیٰ تقویٰ من اللہ و رضوان

احکام و آداب عمارات کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذوالحجہ سنہ ۱۳۲۵ھ کو کاندھلہ میں کھڑے ہو کر بیان فرمایا۔ جو تین گھنٹہ میں ختم ہوا۔ مولوی اشفاق صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حاضری ۱۵۰ کے قریب تھی۔

خطبۂ ماثورہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانْھَارَ بِہٖ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا یَزَالُ بُنْیَانُھُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: کیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا اور خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ میں جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو پھر اس کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے اور اللہ تعالیٰ اسے ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی ہاں مگر ان کے دل فنا ہو جائیں اور اللہ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔

تمہید: یہ دو آیتیں ہیں جن میں ایک خاص مضمون ایک خاص موقع کے مناسب مذکور ہے مگر مجھے اس سے ایک عام مضمون بیان کرنا ہے۔ لیکن اس بناء پر اس خاص مضمون کی آیات کا تلاوت کرنا بیکار اور زائد نہ سمجھا جائے نیز اس خاص مضمون سے یہ خیال نہ کیا جاوے کہ کل جو بنیاد مدرسہ کی رکھی ہے اس کے متعلق وعظ ہوگا۔ اور تحریک چندہ کے لئے وعظ ہوگا۔ ایسا خیال محض غلط خیال ہے اس لئے کہ میں یہ مضمون بیان نہ کروں گا اور نہ مجھے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو دینا ہوگا خود ہی دے گا۔ مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ میں اس وقت ایک دوسرا مضمون بیان کرنا چاہتا ہوں۔ گو یہ آیت خاص ہے اور خاص موقع پر نازل ہوئی ہے مگر اس وقت اس آیت سے کوئی خاص مضمون بیان کرنا مقصود ہے اور مد نظر نہیں ہے بلکہ ایک عام مضمون بیان کرنا ملحوظ خاطر ہے گو وہ زیادہ عام بھی نہیں جس کا تعلق تمام حالات سے ہو بلکہ ایسا عام اس خاص کے اعتبار سے ہے۔ اس میں ایک درجہ کا ایسا عموم ہے کہ اکثر لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے یعنی آیات تو خاص مساجد کے احکام کے متعلق ہیں اور میں ذکر کروں گا عام عمارات کے متعلق۔ جس کا عموم بھی بہ نسبت

خاص عمارات مساجد کے ظاہر ہے اور جس سے بکثرت لوگوں کو سابقہ بھی پڑتا ہے۔ مگر جن بعض لوگوں کو مطلقاً عمارات سے سابقہ نہیں پڑتا ان کے لئے عام نہیں پس یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ عام تو ہے مگر زیادہ عام بھی نہیں ہے۔ تفصیل اس عموم وخصوص اور اس کے اعتبار سے درجات ضرورت کے تفاوت کی یہ ہے کہ مخاطب عام مکلفین ہیں۔ اور ان سے سب کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض مضامین وہ ہیں جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہے اور بعض کو نہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے وہ زیادہ قابل اہتمام ہیں جن سے اکثر کو سابقہ پڑتا ہے گو قدر قلیل کو نہ پڑتا ہو۔ اور جن سے بعض کو سابقہ پڑتا ہو نہ کہ اکثر کو وہ اس درجہ کے اہتمام کے لائق نہیں۔

اس میں اصل کلیہ یہ ہے کہ احکام تابع واقعات کے ہیں اور ہر واقعہ کے متعلق کچھ احکام شرعیہ ہیں۔ جس کو وہ واقعہ پیش آوے اس کو وہ احکام سیکھنا فرض اور ضرور ہو جاتا ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کے احکام ہیں کہ ملک مال سے متعلق ہیں جب تک آدمی مال کا مالک نہ ہو اس وقت تک اس کو احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا فرض اور ضروری نہیں۔ گو اعتقاد فرضیت کا فرض ہے اور جب مال کا مالک ہو اس وقت احکام عملیہ زکوٰۃ کے سیکھنا ضروری اور فرض ہو گئے۔ اور احکام عملیہ کی قید اس لئے لگائی کہ عقیدہ کے درجہ میں تو ہر شخص سے زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ کا تعلق ہے جیسا اوپر بیان ہوا مگر عمل کے درجہ میں ہر شخص سے نہیں بلکہ اسی شخص سے ہو گا جس کے پاس بقدر نصاب مال ہو اور عملی سے بھی مراد عمل ظاہری ہے نہ کہ عمل باطنی کیونکہ عمل باطنی کا بھی ہر شخص سے تعلق ہے جیسا عنقریب آتا ہے۔

اعمال باطنیہ: ہرچند کہ عمل باطنی کو آج کل عمل ہی نہیں سمجھتے حالانکہ اعمال باطنی بھی ضروری ہیں (بلکہ اس وجہ سے اعمال باطنیہ زیادہ ضروری ہیں کہ ان پر ہی مدار قبول اور عدم قبول کا ہے اور نیز اعمال باطنیہ کا تعلق بحسبُ العمل سب سے ہے۔) مثلاً زکوٰۃ کے اندر اعمال باطنی یہ ہے کہ یہ عزم ہو کہ اگر مال ہوا تو میں زکوٰۃ دوں گا۔ یہ عمل باطنی ہے تو یہ عمل ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور اس عمل کا تعلق ہر شخص سے ہے۔ اس مفلس کو جو مالدار نہ ہو یہ عزم رکھنا ضروری ہے کہ اگر میں مالدار ہوا تو زکوٰۃ دوں گا اور یہ فرض ہے اور اگر یہ عزم نہ کرے یا یہ عزم کرے کہ میں اگر مالک مال ہوا تو زکوٰۃ نہ دوں گا۔ تو اس سے گنہگار ہو گا۔ کیونکہ اس نے ایک عمل باطنی فرض کو ضائع کیا۔ غرض یہ عزم عمل باطنی ہے اور ضروری و فرض ہے اور اس عمل کا ہر شخص سے تعلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض احکام باعتبار عمل ظاہر کے وہ ہیں جن کا تعلق سب سے نہیں بلکہ بعض سے ہوتا ہے۔ اس وقت کا بیان بھی ایسا ہی خاص ہے کہ جس کو تعلق بعض اعمال ظاہرہ سے ہے اعمال باطنہ سے نہیں جس کا ہر ہر فرد مکلف انسان سے تعلق ہوتا۔ اس وجہ سے ایسا تو عام نہیں ہے جیسا کہ عمل باطنی یا بعض عمل ظاہری عام ہوتا ہے اور نہ ایسا خاص ہے جیسا کہ بعض احکام ظاہرہ مخصوصہ ہوا کرتے ہیں۔ لہذا یہ مضمون بہ نسبت عمل باطنی و بعض عمل ظاہری کے تو خاص ہے اور بلحاظ عمل ظاہری خاص کے عام ہے کہ سب سے تعلق نہیں صرف اکثر سے تعلق ہے چنانچہ آیت سنتے ہی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ وہ عمل جس کو میں

بیان کرنا چاہتا ہوں مکان بنانا اور تعمیر کرنا ہے۔ سو اس کے متعلق بھی احکام شرعیہ ہیں اور ان احکام کے وہی مخاطب ہوں گے جن کو تعمیر کا اتفاق پیش آتا ہے اور جن کو کبھی ایسا اتفاق ہی پیش نہیں آیا اور انہوں نے کبھی اینٹ بھی نہیں رکھی، ان لوگوں سے ان احکام کا تعلق نہ ہوگا۔ جیسے جو شخص مالک مال نہ ہو اس سے احکام زکوٰۃ کا تعلق نہیں۔ اسی طرح سفر حج کے احکام ہیں۔ یہ احکام بھی اسی شخص سے متعلق ہوں گے جس پر حج فرض ہے۔ اسی طرح وہ احکام ہیں جن کا وہاں جانے کے بعد سیکھنا اور معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے احکام طواف احکام عمرہ، احکام احرام، احکام رمی وغیرہ اور جس شخص پر حج فرض نہیں اسے ہنوز احکام حج سیکھنا فرض نہیں۔ اور جن کے ذمہ فرض نہیں ہے مگر وہاں پہنچنے سے فرض ہو جاتا ہے اس وقت ان کو بھی احکام سیکھنا فرض ہوں گے۔

اعتدال شریعت: (سبحان اللہ! شریعت بھی نہایت اعتدال اور سہولت کا اور جامع قانون ہے۔ چنانچہ جامعیت کی دلیل یہ ہے کہ دنیا میں اس قدر مشاغل کثیرہ ہیں کہ ہر شخص کے بے حد و حساب مشاغل ہیں مگر قانون شریعت سب کو محیط ہے کوئی جزئی قانون شریعت سے خارج نہیں عادۃً اس قدر مشاغل کثیرہ پر کسی قانون کا احاطہ تامہ سخت دشوار تھا یہی بڑی دلیل ہے قانون شریعت کے من جانب اللہ ہونے کی) اور اسی طرح سے کسی شخص نے نکاح نہ کیا ہو اور نہ ارادہ نکاح کا ہو۔ اس پر احکام نکاح سیکھنا ضروری نہیں اور جس وقت نکاح کا ارادہ کرے اس وقت احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہے۔

اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ کرے کہ احکام شرعیہ کا معلوم کرنا اس طرح سے فرض ہو تو شریعت میں بے حد تنگی اور حرج لازم آوے گا کیونکہ ایک عمل کے متعلق بہت بہت احکام ہیں جن کا مجتمعاً حاصل کرنا ظاہر ہے کہ سخت دشوار ہے۔ حالانکہ قرآن میں صاف واضح طور پر موجود ہے و ما جعل علیکم فی الدین من حرج (تمہارے اوپر دین میں کچھ تنگی نہیں ڈالی) جس سے بین طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دین میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حرج اس وقت ہوتا کہ ایک وقت میں تمام احکام کا علم واجب ہوتا۔ اس لئے کہ یہ امر بدیہیات سے ہے کہ سب احکام کا ایک وقت میں محفوظ کرنا سخت دشوار ہے مگر ایسا نہیں بلکہ جس وقت جس عمل کی ضرورت ہو اس وقت اس کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں۔ لہٰذا روز روشن کی طرح معلوم ہو گیا کہ حرج علمی بھی دین میں نہیں۔ اور حرج تنگی نہ ہونا تو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ اس میں اعمال کا اجتماع نہیں ہوتا۔ ایک ایک وقت میں ایک ایک عمل ہے اور وہ بھی بہت سہل اور کوئی حکم دشوار نہیں۔

سہولت احکام: تمام احکام سہولت پر مبنی اور بے حد سہل ہیں۔ باقی اگر خود ہی کوئی شخص دشوار سمجھنے لگے اور عہدی بن جاوے اس کا علاج نہیں ورنہ کسی کام میں بھی تو مصیبت اور تنگی نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت ہے۔

چنانچہ دیکھئے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا فرض ہے اگر کسی شخص کو قیام پر قدرت نہ ہو بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے اور اس کے لئے حکم ہے کہ بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھ سکتا ہے

اسی طرح رمضان کے روزے فرض ہیں لیکن اگر کوئی شخص مریض ہو اور اس کو رمضان کے روزے پر قدرت نہ ہو تو اسے اجازت ہے کہ اور ایام میں رکھ لے اور اگر یہ یقین ہو کہ اب مجھے عمر بھر قدرت نہ ہو گی تو فدیہ دے دے اور اگر فدیہ پر بھی قدرت نہ ہو تو استغفار کرے۔

غرض اسی طرح سے احکام میں تشقیق و تفصیل ہے۔ جو تخفیف سہولت کی وجہ سے کی گئی ہے تو دین پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تنگی اور حرج نہیں۔ اسی طرح جو شخص نکاح کا ارادہ کرے اس پر نکاح کے احکام سیکھنا ضروری اور فرض ہیں مگر اس وقت وہی احکام فرض ہوں گے کہ جو وقت تزوج کے ہیں۔ طلاق کے احکام اس وقت سیکھنے فرض نہ ہونگے کیونکہ نکاح بہ نیت طلاق موجب معصیت ہے یعنی اس نیت سے نکاح کرنا کہ میں طلاق دے دوں گا موجب گناہ ہے۔ اور اس نیت سے گناہ ہوتا ہے البتہ نکاح ہو جاوے گا مگر گناہ ضرور ہوگا۔ اور نکاح نافذ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زنا کا گناہ نہ ہوگا۔ بہر حال جب یہ عزم اور یہ ارادہ معصیت ہوا تو یہ ارادہ نہ کیا جائے گا کہ طلاق دوں گا اور جب یہ ارادہ نہ ہوگا تو تزوج کے وقت احکام طلاق کا سیکھنا ضروری اور فرض بھی نہ ہوگا البتہ جب عزم طلاق ہو اس وقت احکام طلاق سیکھنے فرض ہونگے کہ طلاق کس وقت دینی چاہئے۔ طہر میں یا حیض میں اور کے دینی چاہئیں۔ مثلاً تین طلاق دفعۃً دینی چاہئیں یا متفرق طور سے۔ پھر جب طلاق موافق سنت دے دی تو اب یہ احکام سیکھنے ضروری ہیں کہ یہ طلاق رجعی ہوئی یا بائن اور عدت کے احکام سیکھنے لازم ہوں گے کہ عدت میں نفقہ ضروری ہے یا نہیں تو ان احکام کا اس وقت سیکھنا ضروری ہے۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں۔ پس اسی طرح یہ مضمون مقصود بالبیان بھی اسی قسم سے ہے کہ اس کی ہر شخص کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ مکان تعمیر کرنے کا ہر شخص کو سابقہ نہیں پڑتا ہے گو شوق اور خبط تقریباً عام طور پر سب کو تعمیر مکانات کا ہے الا نادراً چنانچہ جو لوگ مکان بناتے ہیں اگر ان کو گنجائش نہیں بھی ہوتی تب بھی اپنی وسعت سے زیادہ صرف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک اگر حوصلہ سو کا ہے تو پانچ سو خرچ کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ غرض تعمیر مکان کی تمام شخصوں کو حاجت نہیں ہے البتہ اکثر کو بے شک ضرورت ہے۔ ایسے افراد بہت کم ہیں کہ جن کو تعمیر مکان کی حاجت نہیں ہے۔ زیادہ وہی ہیں جن کو ضرورت ہے پکا نہ سہی تو کچا سہی اور لحاظ زیادہ افراد کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ **للاکثر حکم الکل** اس لئے اگر کوئی شخص اس مجمع میں ایسا ہو کہ اس کو تعمیر مکان کی حاجت نہ ہو تو اس کی رعایت سے اس وقت اس بیان کو چھوڑا نہ جائے گا کیونکہ **النادر کالمعدوم**۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ مضمون یعنی تعمیر مکان کا اکثر کے متعلق ہے اور چونکہ اس کے آداب اور شرائط معلوم نہیں اور ہم خود مختار ہیں نہیں اور کچھ احکام ہم پر اس کے متعلق بھی ہیں اس لئے ان احکام کے بتلانے کی ضرورت ہے اس سے بعضے جہلا یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت میں بڑی تنگی ہے کہ ہر چیز کے احکام ہیں کہ اس طرح کھاؤ اور اس طرح پیو۔ تمام چیزوں کے قواعد بتا دیئے ہیں بلکہ مزید بر آں فی زمانہ بہت لوگ تو احکام شرعیہ کو مولویوں کی گھڑت خیال کرتے ہیں۔

خداوندی حکم بھی خیال نہیں کرتے اور جو خداوندی احکام خیال کرتے ہیں وہ ان احکام میں تنگی سمجھتے ہیں حالانکہ احکام میں بے حد سہولت ہے اور حیرت تو یہ ہے کہ گمان یہ ہو گیا ہے کہ احکام تنگی کے واسطے موضوع ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی طبیب کسی مریض کے واسطے مسہل کا نسخہ تجویز کرے مگر مریض اس مسہل کی غایت پر نظر نہ کرکے اس کے ذائقہ کی تلخی دیکھ کر طبیب کو برا بھلا کہنے لگے۔ تو جیسے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر بھی حیرت ہے جو دین کے احکام کو تنگی کے واسطے موضوع قرار دے۔ چنانچہ ہر شخص مریض کی باتوں کو سن کر یہی کہے گا کہ اس مریض نے غایت پر نظر نہیں کی۔

صاحبو! مسہل کی ناگواری اسی وقت تک ہے جب تک مواد فاسدہ دفع ہو کر قوت عود نہ کرے اور جب مواد دفع ہو جاوے گا اور دو میل تک تفریح کے لئے بے تکلف جا سکے گا اور فرحت اور تازگی پیدا ہوگی جو پہلے نہ تھی اس وقت مجوز مسہل کی قدر ہوگی کہ واقعی طبیب بہت شفیق تھا جس نے غایت شفقت سے مسہل دے کو مواد فاسدہ کو دفع کر دیا۔ اسی طرح سے احکام شرعیہ کی حالت ہے جو لوگ عمل کرتے ہیں ان کو عمر بھر بھی تنگی اور پریشانی پیش نہیں آتی بلکہ وہ بے حد راحت میں رہتے ہیں۔ اس مضمون کو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ ہم تو اہل اللہ کو بھی تنگی اور مصیبت میں دیکھتے ہیں وہ راحت میں کہاں ہیں تو اصل یہ ہے کہ معترض تنگی و پریشانی کو ذات واقعہ کی صفت اور اثر خیال کرتا ہے حالانکہ یہ اسکا محض خیال ہی ہے۔

تنگی اور پریشانی کی وجہ: حقیقت میں تنگی اور پریشانی ذات واقعہ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے عوارض کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ جزئیہ ہے کسی کو بغل میں دبا لینا سو اس کے متعلق ایک حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آ کر دبا لیا۔ جب اس نے پیٹھ پھیر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک جانی دشمن ہے تو اس وقت اس کی حالت جو کچھ ہوگی وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہی کوشش کرے گا کہ کسی صورت سے جلدی چھوٹوں اور جس صورت سے بھی ہو میں اسکے ہاتھ سے نکل جاؤں۔

ایک حالت یہ ہے کہ یہ چلا جا رہا تھا اور پیچھے سے کسی شخص نے آ کر دبا لیا۔ اس نے پیٹھ پھیر کر جو دیکھا تو اس کا وہ محبوب تھا جس کی برسوں سے تلاش میں تھا اور مدت سے اس کی وجہ سے خاک چھانتا پھرتا تھا۔ وہ اس کو دبائے ہوئے ہے۔ بتلائیے اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی کیا اس کا دبانا چھوٹنا گوارا ہوگا۔ ہرگز نہیں بلکہ اگر وہ محبوب اس سے یوں کہے کہ اگر تجھے میرا دبانا ناگوار معلوم ہو تو میں اس تیرے رقیب کو اسی طرح سے دبا لوں تو ہرگز یہ شخص پسند نہ کرے گا بلکہ یہی خواہش کرے گا کہ جتنا جی چاہے مجھے دبالے اور اپنی کمر کو اس سے ملا دے گا۔ تو ظاہر ہے کہ دونوں صورتوں میں واقعہ ایک ہی ہے یعنی دونوں جگہ وہ واقعہ بغل میں دبا لینا ہی ہے۔ مگر دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے۔ تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذات واقعہ موجب پریشانی اور حزن نہیں بلکہ عوارض موجب حزن ہوتے ہیں۔ اگر واقعات فی نفسہ موثر ہوتے تو اس واقعہ میں دونوں جگہ اثر یکساں ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ واقعہ فی نفسہ موثر نہیں بلکہ عارض موثر ہے۔ انتساب الی العدو کا اور اثر ہے اور انتساب الی الصدیق کا اور اثر ہے۔ یہی فرق ہے ان واقعات میں جو اہل اللہ اور اہل دنیا دونوں کو پیش آتے ہیں کیونکہ ذات واقعہ تو پریشانی اور حزن میں موثر ہے۔

اہل دنیا کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو تنگ اور بدحواس ہوتے ہیں اور اہل اللہ کو اگر کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو ان کے لئے موجب فرحت ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کلفت دہ چیز سے ان کو طبعی تکلیف بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس تکلیف میں بھی ان کو فرحت عقلیہ ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کے پھوڑا نکل رہا ہو۔ جراح یا ڈاکٹر نے اس کی حالت دیکھ کر نشتر لگانا تجویز کیا مگر ڈاکٹر کے پاس بیہوش کرنے کی دوا (کلوروفارم) اس وقت موجود نہ تھی۔ اس نے ہوش ہی میں نشتر لگا دیا۔ نشتر لگتے ہی تکلیف کی وجہ سے ایک آہ نکلی مگر جب مواد نکل چکا اس وقت ہنس رہے ہیں اور ڈاکٹر کو انعام میں پچاس روپیہ دیئے جا رہے ہیں مگر ڈاکٹر اس کو کم سمجھ کر واپس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ انعام لوں گا اور یہ خوش ہو رہے ہیں۔ گو نشتر لگتے ہی طبعاً تکلیف بھی ہوئی اور آہ بھی نکلی مگر باوجود اس کے بعد میں خوش ہو رہے ہیں اور انعام دیا جا رہا ہے اور مانگا جا رہا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ گو رنج طبعی ہوا مگر فرحت عقلی کی وجہ سے وہ رنج رنج نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح سے جو لوگ اہل اللہ ہیں ان کو جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے خواہ کتنا ہی موجب حزن و پریشانی ہو مگر ناگواری جس کا نام ہے وہ ان کے پاس بھی نہیں آتی۔ گو کسی واقعہ کلفت دہ سے طبعی تکلیف ہو مگر ناگواری کا نام نہیں ہوتا بلکہ فرحت عقلیہ ہوتی ہے انتساب الی الحق کی وجہ سے کیونکہ ذات واقعہ تو موثر نہیں بلکہ انتساب موثر ہے۔ تو انتساب الی الحق کی وجہ سے ان کو فرحت ہوتی ہے اور اس وقت وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

"زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور مار ڈالیں میں آپ پر فدا ہوں میں دل و جان سے آپ کا عاشق ہوں آپ کی مرضی جو چاہیں کریں" غرض یہ بات ثابت ہو گئی کہ احکام شرعیہ تنگی کے واسطے موضوع نہیں اور احکام شرعیہ میں فی نفسہٖ آسانی ہے محض آثار سے تنگی ہوتی ہے اور وہ آثار اسی شخص کے حالات ہوتے ہیں جن کو یہ درست کر سکتا ہے۔ اس کی شرح یہ ہے۔ یہ تنگی اسی وقت تک ہے کہ صرف علم الیقین کا درجہ ہو جو شرط ایمان ہے۔ اور عین الیقین میسر نہ ہوا ہو۔ جب عین الیقین کا مرتبہ میسر ہو گا۔ (یہی معنی ہیں ان آثار کے درست کرنے کے) اس وقت آپ کو بھی ہر حکم میں سہولت معلوم ہو گی۔ اور یہ درجہ کوئی سلف صالحین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اب بھی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مقام ولایت کا ایک درجہ ہے اور نبوت تو بے شک ختم ہو گئی مگر ولایت ختم نہیں ہوئی۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست خم و خمخانہ بامہر و نشان است

"اب بھی رحمت کا بادل درخشاں ہے خم و خمی نہ مع مہر و نشاں کے موجود ہے"

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے جب طاعت کرو گے اسی وقت اثر معلوم ہو گا کہ کس قدر اور کس درجہ عمل میں سہولت ہے اور کس قدر عمل سے فرحت ہوتی ہے۔ غرض احکام شریعت میں یہ خیال کر لینا کہ ان میں تنگی ہے محض خیال خام ہے۔ شریعت میں اصلاً تنگی نہیں۔ شریعت کی تنگی تو ایسی تنگی ہے جیسے ایک حکیم نے

ایک مریض کے واسطے بہت سی چیزیں بتلادیں کہ یہ مضر ہے اور یہ مفید ہے اس پر کوئی یہ کہے کہ ان حکیم صاحب کے مزاج میں تنگی ہے۔ ان سے تو فلانے حکیم بڑے اچھے ہیں کہ وہ کسی چیز کو بھی منع نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ وہ محض نام ہی کا حکیم ہے جو کسی چیز سے نہیں روکتا اور وہ حکیم شفیق ہے جو مضرات سے روکتا ہے اور اس وقت ہر شخص یہ کہے گا کہ طبیب کا مقصود تنگی نہیں بلکہ مقصود شفقت ہے۔ اسی طرح احکام شرعیہ کا مقصود تنگی نہیں بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی مقتضی ہوئی ہے ہر امر سے تعرض کرنے کی اور احکام بتلانے کی۔ تو احکام کا اصل منشا رحمت ہے تنگی نہیں ہے اس لئے ہر چیز کا قانون اور حکم معلوم کرنا ضروری ہے۔ البتہ احکام میں درجات ہیں سب میں اہم تو عقائد ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ شعائر دین کا ہے جیسے نماز روزہ اس کے بعد بقیہ احکام مجھ کو اس وقت عقائد یا نماز روزہ کے متعلق بیان کی چنداں ضرورت نہیں گو وہ سب سے زیادہ ضروری ہیں مگر اس کی ضرورت اور جزو دین ہونا سب کو معلوم ہے بلکہ ایسے حکم کے بیان کی حاجت ہے جو واقع میں جزو دین ہے مگر لوگ اس کو جزو دین نہیں خیال کرتے۔ ایسے مضمون کے بیان کی سخت ضرورت ہے اور میں نے ایسا ہی مضمون اختیار کیا ہے۔ مگر یہ مضمون اس بنیاد کی بابت نہ سمجھا جاوے جو کل رکھی گئی ہے جو بوجہ عموم کے اس کو بھی مشتمل ضرور ہے اور نہ مجھ کو اس بنیاد کی بابت زیادہ مضمون بیان کرنیکی ضرورت ہے اور نہ کسی زور دینے اور نہ ترغیبی مضمون بیان کرنے کی حاجت ہے وہ کام خود اپنی ضرورت ظاہر کردے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید (مشک وہ ہے جو خود خوشبو دے نہ کہ عطار ہے)

ہاں کوئی اس کام کو کام ہی نہ سمجھے تو دوسری بات ہے اس وقت استطرادا بنیاد مدرسہ پر ایک مضمون ذہن میں آ گیا وہ یہ کہ بعض لوگ دینی مدارس و مساجد پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ ان میں انتظام اور صفائی نہیں نہ بورئیے درست ہیں نہ کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے اگر ہم کبھی جائیں بھی تو کہاں بیٹھیں مگر میں ان معترضین سے کہتا ہوں کہ آپ یہ اعتراض کس پر کر رہے ہیں صاحب مدرسہ کسی مہتمم یا متولی کا گھر نہیں سب مسلمانوں کا مشترک مدرسہ ہے اگر وہاں کی بے انتظامی اور عدم صفائی سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو اپنے مدرسہ کی صفائی اور نظافت کا آپ خود کیوں نہیں خیال کرتے۔ مگر ہماری یہ حالت ہے کہ دوسروں کو کہتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ہے اور واقع میں وہ خود اپنی حالت ہے اور وہ اعتراض خود اپنے اوپر پڑتا ہے۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(اے بے وقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسا ایک مشہور قصہ ہے کہ ایک بیوقوف کا لڑکا روٹی کھا رہا تھا۔ پانی پینے کی غرض سے اٹھا تو ٹکڑا لوٹے میں جا پڑا جھانک کر دیکھا تو اس میں اپنی صورت نظر پڑی۔ باپ کو آواز دی کہ ابا اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ باپ نے آ کر دیکھا تو اسے اپنی صورت نظر پڑی۔ تو آپ کہتے ہیں کہ تف ہے تیرے اوپر بوڑھے ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ شرم نہیں آتی تف ہے تیری اوقات پر۔

تو جیسے وہ اپنے زعم میں دوسرے کو کہہ رہا تھا اور واقعہ میں اپنے ہی کو کہہ رہا تھا۔ یہی حال ہمارا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے بے وقوف تو اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

مساجد کی عدم خبر گیری: میں ایک دفعہ شاہجہانپور گیا ایک رئیس کے یہاں دعوت تھی۔ ہم لوگ دعوت میں گئے مگر نماز عشاء کا وقت قریب تھا اس لئے میں نے کہا کہ پیشتر ہم نماز پڑھ لیں۔ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھاویں گے۔ چنانچہ ہم لوگ مسجد میں گئے مگر وہ میزبان صاحب تشریف نہ لائے۔ وہ نماز تو پڑھتے تھے مگر مسجد میں نہ آتے تھے۔ مسجد کی حالت بہت خراب تھی۔ افسوس ہے کہ اللہ میاں کے گھر کی ایسی بے قدری کی جاتی ہے کہ نہ اس کی صفائی کا اہتمام ہے نہ خبر گیری کی جاتی ہے۔ غرض اس مسجد میں کسی قسم کا بھی انتظام نہ تھا۔ مٹی کی ایک ڈبیا رکھی تھی اور روشن ہو رہی تھی۔ جس کے دھوئیں اور بو سے سخت کلفت ہوئی۔ مسجد سے واپسی کے بعد میں نے اس حالت پر افسوس کیا تو وہ رئیس شرما گئے۔

غنیمت ہے بعضے تو ایسے موقع پر شوخی سے یوں کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو اسی واسطے اپنے گھر پر نماز پڑھ لیتے ہیں کہ مسجد میں صفائی کا اہتمام نہیں۔ مگر میں ادب و تہذیب سے عرض کرتا ہوں کہ آپ جو گھر پر نماز پڑھتے ہیں اسی لئے تو وہاں صفائی نہیں۔ کیونکہ اب نماز پڑھنے والے صرف غرباء ہیں۔ وہ بیچارے اپنی ہمت کے موافق جو کچھ ان سے ہو سکتا ہے انتظام کرتے ہیں تو آپ کا مسجد والوں پر اعتراض کرنا درحقیقت اپنے اوپر اعتراض ہے کیونکہ مسجد سب مسلمانوں کی ہے صرف غریبوں کی نہیں ہے۔ آپ بھی تو مسجد والوں میں داخل ہیں۔ پھر آپ خود کیوں نہیں انتظام کرتے جب کوئی پردیسی مسجد کو اس حالت میں دیکھے گا وہ تو یہی کہے گا کہ یہاں کے مسلمان بہت ہی ناقدرے ہیں جو مسجد کو اس حال سے رکھتے ہیں جس میں آپ بھی داخل ہوں گے کم از کم ایک آدھ وقت کی نماز تو آپ مسجد میں پڑھ لیا کیجئے۔ اور مسجد کی خبر گیری رکھئے۔ مسجد خود بتلا دے گی کہ میرے اندر فلاں فلاں کمی ہے۔ اسی طرح سے مجھے یہاں کچھ ضرورت ترغیبی مضامین بیان کرنے کی نہیں ہے۔ مدرسہ خود بتلا دے گا کہ مجھے اعانت کی حاجت ہے اور اگر اس پر بھی اعانت نہ کریں تو حق تعالیٰ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔ اگر میں اس پر ترغیبی مضمون بیان کرتا تو اس وقت تو سامعین جوش میں کچھ دے دیتے مگر بعد میں بعضے لوگ میری طرف نسبت کرتے کہ ہم نے اس کی وجہ سے دے دیا۔ لہٰذا مجھے احسان لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ دین کا کام سب مسلمانوں کا ہے میں اپنے اوپر کیوں احسان لوں۔

ابھی قریب کا واقعہ ہے کہ جلال آباد میں ایک شخص نے مدرسہ کے لئے کچھ رقم دی' مرض موت کی حالت میں' پھر اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے لئے فرائض کا مسئلہ مجھ سے پوچھا گیا میں نے جواب تو لکھ دیا جس میں وصیت اور میراث دونوں حکموں کی تحقیق لکھ دی مگر دستخط نہیں کئے۔ بعض لوگوں نے

دستخط پر اصرار کیا میں نے کہہ دیا کہ دستخط سے ورثاء مجبور ہو جائیں گے اور یوں کہیں گے کہ ہم نے فلاں شخص کے کہنے کی وجہ سے وصیت کو مان لیا ورنہ نہ مانتے۔ تو میں خواہ مخواہ کیوں احسان لوں۔ ضروری جواب میں نے لکھ دیا ہے اگر اس میں شبہ ہے کسی اور عالم سے فرائض نکلوا لیں اور اپنا اطمینان کر کے جو کچھ کریں خود کریں میرے اوپر احسان رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔

سفارش کی خرابیاں: صاحبو! اسی واسطے تجربہ کاروں کی طبیعت آج کل سفارش سے رک گئی ہے۔ اس لئے کہ اولاً تو سفارش کا اس زمانہ میں کوئی اثر ہی نہیں اور اگر اثر بھی ہو تو بہت ذلت سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ ساری عمر دوسرے کا اپنی گردن پر احسان رہتا ہے کہ اس کی سفارش سے ہم نے ایسا کر دیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہم جیسوں کا کوئی اثر بھی نہیں۔ مگر جہاں اثر نہیں ہوتا وہاں کے لئے کوئی سفارش بھی نہیں چاہتا۔ سفارش وہیں کراتے ہیں جہاں کچھ اثر ہو سو ایسی جگہ دوسرے کو تکلیف ہے اور جہاں اثر نہ ہو وہاں اپنی ذلت ہے۔

اس تقریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں ایجاب وسلب کا مقابلہ ہے اور یہ حصر عقلی ہے اصل یہ ہے کہ یہ حصر عقلی نہیں ہے بلکہ ان میں باہم تضاد ہے۔ جہاں ارتفاع دونوں کا ممکن ہے اس لئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نہ ذلت ہو اور نہ کسی کو تکلیف ہو بلکہ سفارش کا اثر ہو محبت کی وجہ سے۔ تو جہاں یہ صورت ہو وہاں سفارش کا مضائقہ نہیں۔ مگر آج کل ایسا نادر ہے و نادر کالمعدوم۔

الحاصل سفارش کی تین صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ نہ تو محبت کا اثر ہو اور نہ وجاہت کا اس میں تو ذلت ہے۔ ایک یہ کہ وجاہت کا اثر ہو محبت کا نہ ہو اس میں مخاطب کو تکلیف ہے۔

ایک یہ کہ وجاہت کا اثر نہ ہو محض محبت کا ہو۔ اس میں مضائقہ نہیں اس میں نہ سفارش کرنے والے کو ذلت نہ مخاطب کو تکلیف۔ بشرطیکہ محبت کافی ہو اور بے تکلفی بھی ہو۔ چونکہ تیسری قسم نادر الوجود ہے اس لئے میں نے سفارش کرنی چھوڑ دی۔ اسی طرح تحریک چندہ کی بھی یہی دو حالتیں ہیں یا تو محرک کا اثر ہے یا نہیں۔ اگر محرک کا اثر نہیں تو ذلت ہے اور اگر ہے تو تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اثر وجاہت ہی کا عموماً ہوتا ہے اور اس اثر سے چندہ لینا حلال نہیں **الا لا یحل مال امرء مسلم الابطیب نفس منه**[1] (کسی مسلمان آدمی کا مال بدوں اس کے طیب خاطر کے حلال نہیں) حدیث ہے اور اس وجہ سے میں بھی تحریک نہیں کرتا اور اس میں زبان کا بند کرنا ہی بہتر خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ خدا کا کام ہے اس لئے زبان سے چنداں تحریک کرنے کی حاجت بھی نہیں۔ اس کی صورت خود ہی شفاعت کرے گی اور کرتی ہے۔ صرف خلوص کی ضرورت ہے کسی اثر ڈالنے اور پالیسی کی حاجت نہیں کام شروع کر دینا چاہئے۔

چنانچہ حضورؐ نے تبلیغ اسلام میں کوئی تدبیر نہیں کی کوئی کاوش نہیں کی۔ ہم لوگ گر اس وقت موجود ہوتے تو ہم تو یہی مشورہ دیتے کہ پہلے ذی اثر لوگوں کو اپنا متفق کرنا چاہئے جب وہ متفق اور ہم خیال ہو جاویں گے تو اور لوگوں پر زیادہ اثر ہو گا مگر حضورؐ نے ہرگز ہرگز یہ تدبیر نہیں کی با اثر لوگوں کو مدد کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ چند غرباء ہی اول حضورؐ کے ہم خیال ہوئے اور پھر آپؐ نے کفار کے مقابلہ میں کتنی سخت بات کہی تھی کہ خدائے وحدہ

لاشریک لہ پر ایمان لاؤ اور اپنے جھوٹے معبودوں کو چھوڑ دو۔ سو ایسی ناگوار بات پھر وہ بھی علی الاعلان۔ پھر اس میں ذی اثر لوگ ہم خیال بھی نہیں مگر پھر بھی آپ کو تبلیغ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی اور نہ کسی تدبیر کا اہتمام ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپؐ کو ذی اثر لوگوں کو ہم خیال کرنے کی حاجت ہی کیا تھی۔ حضورؐ کا تو سچا رنگ تھا جو خود لوگوں کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ اس کو کسی دوسرے اثر کی ضرورت نہ تھی۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است　　بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(محبوب کا جمال ہمارے عشق و عرفان ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ اور خط و خال کی حاجت نہیں ہے)

حضورؐ کی تبلیغ اسلام: صاحبو! شعبدوں کی اس کو ضرورت ہوتی ہے جو واقعی تصرفات پر قادر نہ ہو اور جو واقعی تصرفات پر قادر ہوں انہیں شعبدوں کی کیا ضرورت ہے۔ حضورؐ کو یہ حکم ہوا تھا کہ **فاصدع بما تؤمر و اعرض عن المشرکین** اور یہ حکم ہوا تھا کہ **وانذر عشیر تک الاقربین** اور انجمن کرنے کا اور انجمن بنانے کا حکم آپ کو نہیں ہوا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم سنتے ہی پہاڑ پر تشریف لے گئے اور تمام آدمیوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک غنیم پڑا ہوا ہے اور وہ تم کو لوٹنا چاہتا ہے تو تم میرے قول کو کیا سمجھو گے۔ سب بولے کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امین دیکھا ہے اس لئے ہم ضرور آپؐ کے قول پر یقین اور اعتماد کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ اس خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ورنہ سخت عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہ سن کر سب لوگ بگڑ گئے اور گستاخیاں کرتے ہوئے واپس ہوئے اس کے بعد بھی اسلام میں ضعفاء ہی داخل ہوئے اور کسی ذی اثر کے متفق کرنے کی سعی نہیں کی گئی مگر جب حق واضح ہوگیا تو بے ساختہ ذی اثر لوگوں کو بھی حلقہ بگوش اسلام ہونا پڑا اور سمجھ گئے کہ واقعی یہی طریق فلاح ہے۔

اسی طرح ہم کو بھی اول کام کرنا چاہئے اور کسی کے متفق بنانے کا وہم نہ کرنا چاہئے۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ جب تک کسی ذی اثر کو کام میں داخل نہ کریں اس وقت تک یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری انجمن کو ترقی نہ ہوگی بس انجمن کی ترقی کا موجب بااثر لوگوں کو خیال کرتے ہیں۔ یہاں تک مذاق بگڑ گیا ہے۔

کانپور میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ ایک صاحب نے تقریر کی اور پہلے سے ایک سیٹھ کو اثر ڈالنے کے واسطے پڑھا کر لائے تھے کہ جب میں تقریر کر چکوں تو کھڑے ہو کر کہہ دینا کہ میں تائید کرتا ہوں چنانچہ جلسہ میں ان صاحب نے تقریر کی جب تقریر کر چکے تو وہ مہاجن صاحب کھڑے ہو کر بولے میں بھی تاریدکرتا ہوں۔ ان صاحب نے آہستہ سے کہا کہ تائید تو انہوں نے کہا کہ تردید کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے آہستہ سے تعلیم کی مہاجن صاحب بولے کہ میں تاکید کرتا ہوں۔ خیر وہ ساکت ہو گئے کہ تاہم تائید ہو گئی۔

غرض یہ حالت ہو گئی ہے یہ بھی سلیقہ نہیں رہا کہ تائید کا کون اہل ہے اور کون نااہل۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کس شخص کا اثر ہوگا۔ پس جس شخص کو ذی اثر سمجھتے ہیں اسی کو تلاش کرتے ہیں۔

نااہل کو منتظم یا مہتمم بنانا: حدیث میں ہے **اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة**[1] (جبکہ کام کو اسکے غیر اہل کے سپرد کرو تو قیامت کا انتظار کرو) آج کل یہی حالت ہے کہ نااہل کے کام سپرد کر دیتے ہیں اور اہل کے اس واسطے سپرد نہیں کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں ان کے کرتے پاجامے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بے قدری ہوگی۔

اس لباس پر نظر کرنے پر ایک واقعہ یاد آ گیا مجھے ایک مرتبہ مدعو ہو کر اپنے احباب کے ساتھ شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ بعد جمعہ میرا بیان تھا۔ کرنل عبدالمجید خان جن کی طرف سے وعظ کا اعلان تھا ان سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ کیا انہیں کا بیان ہوگا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ تو وہ صاحب بولے کہ ان کا لباس کیسا ہے جیسے پاخانہ میں سے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بعد وعظ کے کہنا۔ چنانچہ انہوں نے بیان سنا۔ بعد وعظ کے بولے کہ میں تو یہ سمجھا تھا کہ جیسے کپڑے ہیں ویسی لیاقت ہوگی مگر یہاں تو برعکس قصہ ہے۔

یہ قصہ مجھے بھی معلوم ہوا تو دوسرے بیان میں میں نے کہا کہ صاحبو! بعضے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مولویوں کو اعلیٰ درجہ کے اور قیمتی کپڑے پہننا چاہئیں۔ میں اس رائے کی تائید کرتا ہوں کیوں کہ اس کا منشاء محض دینی مصلحت ہے کہ باوقعت لباس سے واعظ کے اثر کی وقعت ہوگی مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کو قیمتی کپڑے بنانے دشوار ہیں اس لئے کہ اگر جائز آمدنی سے روپیہ کمانا چاہیں تو کوئی مولوی تجلید کتب کا کر کے کھاتا ہے اور کوئی تدریس میں مشغول ہے جن میں کوئی دس کا ملازم ہے اور کوئی بیس کا۔ انتہائی معراج اور نہایت عزت ہوئی تو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ اس آمدنی میں تو قیمتی کپڑے بننا دشوار ہیں اور اگر اس کے سوا دوسرے طریقہ اختیار کریں کہ وعظ کہتے اور وصول کرتے پھریں۔ سو وہ عقلاً و نقلاً دونوں طرح ناجائز ہے۔ بس اس حالت میں صرف ایک یہ طریقہ رہ گیا کہ آپ لوگ ایک جوڑا بنا دیجئے اور جتنی قیمت کا چاہے بنوا دیجئے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے اپنے گھر نہ لے جاویں گے بلکہ شملہ میں ہی رکھ جاویں گے اور جب یہاں آنا ہوا کرے گا تو اسے پہن کر وعظ کہہ دیا کریں گے اور اگر کسی دوسری جگہ بھی اس مذاق کے آدمی ملیں گے ہم ان سے بھی جوڑا بنوا کر رکھ لیں گے۔ اب میں منتظر ہوں کہ یہ معترض صاحب جنہوں نے محض خیر خواہی کی وجہ سے ہمارے لباس پر اعتراض کیا ہے کیسا قیمتی جوڑا بنا کر لاتے ہیں۔ ان معترض صاحب کو یہ سن کر بے حد غیرت آئی۔

بس آج کل لباس کو دیکھا جاتا ہے۔ جس کے کپڑے اچھے ہوئے اس کو لیڈر اور سیکرٹری بنا لیا جنہیں کام کا طریقہ بھی معلوم نہیں۔ محض نکمے لوگ انجمن کے منتظم ہیں۔ ایسے مواقع میں کام کے آدمی رکھے نہیں جاتے۔ چنانچہ آج کل ایسے منتظمین بہت ہیں اور وہ جو جی میں آتا ہے کرنے لگتے ہیں۔ یہ حالت ہے آج کل کے کام کرنے والوں کی اسی کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ **اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة** (جبکہ کام کو اسکے غیر اہل کے سپرد کرو تو قیامت کا انتظار کرو) صاحبو! حضورؐ نے تو ضعفاء کو پہلے متوجہ کیا تھا اور ہم ذی اثر لوگوں کو پہلے لیتے ہیں۔ حالانکہ حضورؐ کے انتخابات سے ضعفاء کا مرتبہ پہلے ہے اقویاء کا پیچھے۔ ضعفاء میں باطنی قوت، ہمت، برکت، خلوص زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اقویاء کے۔

چنانچہ مجھے ایک مرتبہ یہ قصہ پیش آیا کہ ایک گاؤں ہے کیرانہ کے راستہ میں وہاں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور اس نے مجھے اڑھائی آنے دیئے میں نے فوراً لے لئے اور دعا دی اس لئے کہ اڑھائی آنے کے پیسے میں اگر کوئی زبردستی بھی ریا کی نیت کرے تب بھی قادر نہیں۔ خدا تعالیٰ جانتا ہے اگر کوئی سو پچاس دیتا ہے تو طبیعت رکتی ہے کیونکہ احتمال ریا وغیرہ کا ہوتا ہے اور اڑھائی آنے کے پیسہ میں کسی چیز کا بھی احتمال نہیں۔ بہر حال غرباء اور ضعفاء ہی کے پیسہ میں خاص برکت ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے **هل تنصرون و ترزقون الا بضعفائكم**[1] (ضعفاء ہی کی بدولت تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے) معلوم ہوا کہ نصرت علی الاعداء بھی ضعفاء ہی کی وجہ سے ہے۔ تو بیرونی برکت اور اندرونی برکت دونوں ضعفاء ہی کی وجہ سے ہیں۔ نصرت سے مراد بیرونی برکت ہے اور رزق سے مراد اندرونی برکت ہے۔ یہ سب غرباء کی بدولت ہے گو یہ ظاہری سائنس کے خلاف ہے کیونکہ ضعفاء میں کوئی ظاہری اثر نہیں ہوتا مگر مشاہدہ یہی ہے۔

غرض آج کل ظاہری وجاہت پر نظر کر کے ہر کام نااہل کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور ہر کام میں نااہل گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو بجائے کام کے روپیہ جمع کرنے کو بڑا مقصود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اصل مقصود کام ہے خواہ کسی پیمانہ پر ہو۔ پس جس پیمانہ پر کام کرنا قدرت میں ہو اس کے موافق شروع کر دینا چاہئے۔

کام کی برکت: حق تعالیٰ نے کام میں یہ برکت رکھی ہے چنانچہ چند ضعفاء نے اسلام کا کام شروع کر دیا تھا تو مشرق سے مغرب تک آواز گونج گئی۔ چنانچہ انجیل کی ایک مثال ضعفاء اہل حق کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن میں نقل فرمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں۔

كزرع اخرج شطاه' فآزره فاستغلظ فاستوى علىٰ سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار (کہ جیسے دانہ زمین میں ڈالا گیا تو) جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی پھر اس نے اس کو قوی کیا پھر وہ کھیتی موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی تا کہ ان سے کافروں کو جلا دے۔ یہ برکت ہے کام کی کہ اگر رائی کا بھی دانہ ڈالو تو کھیت میں کس قدر بڑا درخت ہو جاتا ہے جب کام شروع کرنے میں اس قدر برکت ہے تو مجھے تحریک چندہ کی کیا ضرورت ہے۔ میں کانپور میں تھا جب کام شروع کیا اور مدرسہ جامع العلوم کی ابتداء ہوئی تو صرف پانچ روپیہ ہاتھ میں تھے۔ مدرسہ خدا کے نام پر شروع کر دیا پھر بحمد اللہ مدرسہ نے اس قدر ترقی کی کہ کانپور میں باوجود بکثرت مدرسے تھے مگر اس کے سامنے سب ماند پڑ گئے۔ لوگ دوسرے مدارس کے چندہ کی تحریک کرتے مگر سننے والے انہیں تو دیتے نہیں تھے اور جامع العلوم میں دیتے تھے شہر کے لوگ کسی جگہ کے متولی کا اعتبار نہ کرتے تھے اگر کوئی مسلمان ہوتا تو اس کے اسلام کا اعتبار نہ کرتے جب تک جامع العلوم میں آ کر مسلمان نہ ہوتا۔ ان سب امور کی وجہ صرف نیت خالص تھی کوئی دنیاوی غرض نہ تھی۔ کسی سے یہ بھی نہیں کہا کہ ہمارے مدرسہ میں چندہ دو اور اگر از خود دینا چاہا اور قرائن سے معلوم ہو گیا کہ یہ دوسرے میں دیا کرتا ہے اور وہاں کا چندہ یہاں منتقل کرتا ہے تو لینے سے انکار کر دیا جاتا تھا کیونکہ یہ نیت کر لی تھی کہ جب نہیں

---

[1] کتاب التمهيد لابن عبدالبر ۲۳۱:۱۰

چلے گا چھوڑ دیں گے اس لئے کہ غایت تو حق تعالیٰ کی خوشنودی تھی اپنی ذات کے واسطے نہیں کیا تھا بس جب تک انہوں نے چاہا کام لیا اگر وہ نہ چاہتے تو ہم کو چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جاتے۔

صاحبو! مدارس اور مساجد کی غایت یہی ہونی چاہیے اور اگر اس کے خلاف ذہن میں ایک مقدار معین کر لیتے کہ مدرسہ اس قدر اونچا ہونا چاہئے ایسے انداز کا ہو تو جب اس انداز کا حلال آمدنی سے نہ بنتا تو حرام سے بنانے کی سعی کرتے اس کا انجام سوائے بربادی کے کچھ نہ ہوتا۔ مگر چونکہ رضامندی خدا تعالیٰ غایت تھی اس لئے کسی قسم کی سعی نہیں کی گئی خدا نے اس میں برکت کر دی۔ واللہ خدا کے واسطے کام کر کے تو دیکھو۔ ان شاء اللہ خوب خوب ترقی ہو گی۔ پیلی بھیت میں ایک بزرگ تھے اور وہ اصطلاحی عالم بھی نہ تھے۔ کنگھی بنایا کرتے تھے ایک دفعہ شاہ صاحب نے اسٹیشن پر مسجد بنانا شروع کی۔ ہندوؤں نے بھی مندر بنانے کی درخواست دے دی۔ کلکٹر نے بخوف فساد مسجد کی تعمیر کو بھی روک دیا۔ شاہ صاحب کو خبر کی گئی فرمایا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے اور تعمیر بند کر دی لوگوں نے کہا کہ حضور اس میں کوشش کی اجازت دیجئے ضرور کامیاب ہو گی فرمایا ہم کو اس کی ضرورت نہیں ہم مسجد کس کے واسطے بناتے تھے ہم تو خدا کے لئے بناتے تھے لوگ نہیں بننے دیتے بس نہیں بناتے ہم اپنا گھر کب بناتے تھے کلکٹر کو جو کہ مسلمان تھے اس امر کی اطلاع ہوئی۔ کلکٹر خود شاہ صاحب کے مکان پر آئے اور ایسی صورت سے کہ لوگ نہ پہچانیں شاہ صاحب دروازہ میں بیٹھا کرتے تھے وہاں ایک تخت آنے والوں کے لئے پڑا ہوا تھا اور ایک چارپائی پر شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ کلکٹر پہنچے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس نے بیٹھ کر کہا کہ سنا ہے کہ آپ کوئی مسجد بنانا چاہتے تھے اس کا کیا واقعہ ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی ایک مسجد بنانا چاہتے تھے مگر کلکٹر نے روک دیا۔ ہم نے کہہ دیا اچھا بھائی خدا تیرا بھلا کرے ہمیں تو ثواب مقصود تھا اور وہ نیت سے مل گیا۔ اگر خدا کو منظور ہوتا مسجد بھی بن جاتی۔ اب ان کو منظور نہیں ہے تو ہم بھی اصرار نہیں کرتے۔ شاہ صاحب نے جب کلکٹر سے یہ بیان کیا تو وہ اس سادگی سے متاثر ہوا اور کہا کہ وہ کلکٹر میں ہی ہوں۔ چلئے آپ مسجد کی تعمیر جاری کر دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا خدا تمہارا بھلا کرے۔

اس پر کچھ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا کیونکہ مسجد کوئی کسی کے باوا کا گھر تھا جو کسی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ ارے خدا کا گھر ہے جو بنوا دے گا اسے خود ثواب ملے گا۔ ہم پر کیا احسان ہوا۔ مگر آج کل یہ بھی ایک طریقہ نکلا ہے کہ جب کوئی مدرسہ میں چندہ دیتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں نہ معلوم یہ کس چیز کا شکریہ ہے۔

میں نے ایک جلسہ میں کہہ دیا تھا کہ ہم کسی چندہ دینے والے کا شکریہ ادا نہیں کریں گے بلکہ دینے والوں کو الٹا ہمارا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ہم مصیبت جھیل کر ان کی رقم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کو موقع خیر میں صرف کرتے ہیں۔ اور جو لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے گھر رکھنا چاہتے ہیں۔ دیکھئے شاہ صاحب کی اس سادگی اور خلوص کی کس قدر برکت ہوئی اور کس قدر اثر ہوا۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ

دلفریبان نباتی ہمہ زیور بستند   دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد
(خود رو پودے زیور سے آراستہ ہیں ہمارے محبوب میں خداداد حسن ہے)

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند ۔۔۔ اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

سادگی اور جاذبیت: غرض سادگی تو خود جاذب ہوتی ہے مگر ہم پر تکلفات لدے ہوئے ہیں اس لئے اس جذبہ کا احساس نہیں ہے واللہ اگر علماء اس سادگی کو اختیار کریں اور یہ تصنع اور بناوٹ چھوڑ دیں تو اہل دنیا ان کے دروازہ پر خود ہی آ کر ماتھا رگڑنے لگیں۔ پچھلے دنوں دیوبند میں کچھ مخالفت تھی کچھ آدمی شہر کے مدرسہ کا ممبر ہونا چاہتے تھے اور مدرسہ والوں کی طرف سے انکار تھا۔ حضرت مولانا گنگوہی سرپرست تھے میں نے مولانا کی خدمت میں گنگوہ خط لکھا کہ اگر یہ لوگ ممبر بنا دیئے جاویں تو کسی سے اندیشہ تو کچھ ہے نہیں کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ فیصلہ تو کثرت رائے پر ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مدرسہ کے لوگ کثیر ہیں۔ اس وقت مصلحت اسی کو مقتضی ہے کہ ان لوگوں کو ممبر بنا دیا جاوے ورنہ یہ لوگ مخالف رہیں گے جس میں مدرسہ کی قوی مضرت کا اندیشہ ہے۔

مگر ان حضرات کی عقل تو قدسی ہوتی ہے وہ دوسری ہی عقل ہے کہ اس کے برابر کسی عقل کا ہونا مشکل ہے۔ حضرت نے تحریر فرمایا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اگر ہم ان کو مدرسہ میں داخل نہ کریں گے تو غایت ما فی الباب وہ لوگ مخالفت کریں گے۔ اور ان کی مخالفت مدرسہ کو مضر ہوگی۔ اور مدرسہ ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے ٹوٹ جاوے ہم تو نہیں توڑتے جو ہم سے سوال ہو اور اگر ہم نے ان کو داخل کر لیا تو آخرت میں یہ سوال ہوگا کہ تم نے نااہل کو کیوں داخل کیا اور تحریر فرمایا کہ ہم کو حق تعالیٰ کی رضا مقصود ہے مدرسہ مقصود نہیں۔ اللہ اکبر! کس قدر قوت کی بات ہے۔ پھر حضرت نے اہل شہر کی ممبری کو منظور ہی نہ کیا۔ آخر دو چار دن چلا کر سب خود ہی بیٹھ رہے اور بعد کو سب سیدھے ہوگئے۔ یہ کاہے کا اثر تھا صرف اس کا کہ حضرت کو رضائے حق مطلوب تھی بقاء مدرسہ مقصود بالذات نہ تھی۔ جس کا یہ مذاق ہوگا وہ اہل دنیا کی ہرگز خوشامد نہ کرے گا اہل مدارس کو یہی طرز اختیار کرنا چاہئے پس یاد رکھو کہ بڑی چیز دین کی محبت اور عزت ہے۔ علماء کو دین کی عزت کا لحاظ رکھنا چاہئے جس میں ان کی بھی عزت ہوگی اور دین کی عزت استغناء میں ہے۔ علماء دنیاداروں سے جب تک استغناء نہ کریں گے اس وقت تک ان کی عزت نہ ہوگی۔ اور جب علماء استغناء کرینگے اسی وقت عزت اور عظمت رونما ہوگی اور یہ دنیادار خود انکے دروازوں پر ماتھا رگڑتے پھریں گے۔

خودداری کا تقاضا: مگر آج کل تو علماء نے اپنی قدر خود کھو دی ہے کہ دنیاداروں کے دروازوں پر جاتے اور کھانا لاتے ہیں چنانچہ دیوبند کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک تحصیلدار صاحب تھے ایک طالب علم کا کھانا ان کے ہاں مقرر تھا وہ طالب علم روزانہ کھانا لینے کے واسطے آیا کرتے تھے اور کھانے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی تو ان کا خالی وقت بیکار جاتا تھا۔ انہوں نے تحصیلدار صاحب سے ایک دن دلسوزی سے کہا کہ میں روزانہ اتنی دیر بیکار رہتا ہوں اور آپ کا لڑکا بھی کھیلا پھرتا ہے اگر آپ فرمائیں تو میں اتنی دیر آپ کے لڑکے کو کچھ عربی پڑھا دیا کروں۔ تحصیلدار صاحب نے فرمایا کہ مولانا کیا ہوگا آپ نے پڑھ کر کیا کیا۔ میرے

---

[1] الصحیح للبخاری ۱: ۲۳، کنز العمال: ۳۸۴۳۲، فتح الباری لابن حجر ۱: ۱۲۳

دروازہ پر بھیک مانگنے آتے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ کے دروازہ پر بھیک مانگنے جاوے گا۔ یہ ہے آج کل علم دین کی قدر علماء کو بھی چاہئے کہ ایسوں کے دروازوں پر پیشاب بھی نہ کریں مگر صرف احتیاج کی وجہ سے ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ دوڑنے والے عذر کرتے ہیں کہ

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج   احتیاج است احتیاج است احتیاج

(جو چیز شیروں کو لومڑی بنادیتی ہے وہ احتیاج تو ہے) مگر دوسرا شعر اس کا جواب بھی ہے کہ

شیر نر کے میشود روباہ مزاج   میزند بر کفش خود صد احتیاج

(شیر نر کب لومڑی مزاج ہوتا ہے وہ سو احتیاجوں کو اپنی جوتی پر مارتا ہے)

انبیاء علیہم السلام کی تو یہ شان اور حالت تھی کہ جب وعظ و پند فرماتے تو صاف فرماتے ہیں۔ **یقوم لا اسئلکم علیہ اجراً** اور **یقوم لا اسئلکم علیہ مالا** کہ ہم تم سے اجر اور مال نہیں مانگتے یہی تمہاری بھی حالت ہونی چاہیے اگر یہ کہا جاوے کہ اگر نہ مانگیں تو کام کس طرح چلے گا۔ تو صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ کام خود ہی چلے گا۔ میں تو اکثر وعظ میں یہی کہہ دیتا ہوں کہ آپ مانگنا چھوڑ کر دیکھئے کہ اہل دنیا خود ماتھا رگڑیں گے اور آپ کو دیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی خود یہ حالت ہو گئی کہ ایک جگہ ایک مدرسہ تھا اس کے جلسہ میں ایک واعظ صاحب فرمارہے تھے کہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی دیر اگر ایک کسبی ناچتی تو اس کو لوگ کس قدر روپے دیتے ہمیں ایک کسبی کے برابر بھی نہیں سمجھتے کہ گھنٹہ بھر سے ہم مانگ رہے ہیں اور کوئی کچھ نہیں دیتا افسوس اس واعظ کو بیان کرتے ہوئے غیرت بھی تو نہ آئی مجھے تو اگر کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ایسی بات زبان سے کبھی نہ نکلے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ میں نواب صاحب کی خواہش پر میرا ڈھاکہ جانے کا قصد ہوا اور راہ میں کلکتہ بھی ٹھہرنا ہوا وہاں نواب صاحب کے ایک دوست ہم لوگوں کو لینے آئے ہوئے تھے وہ مل کر کہنے لگے ہمیں آپ کے تشریف لانے سے بہت مسرت ہوئی کیونکہ آنے کی اس لئے امید نہ رہی تھی کہ یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے یہ شرط لگائی ہے کہ کچھ دیا نہ جائے۔ میں نے کہا یہ شرط کون سی دشوار تھی کہنے لگے ایسا کب ہو سکتا ہے اپنے محبوب کی خدمت کو تو جی چاہتا ہی ہے میں نے کہا کیا محبوب کی خدمت اسی میں منحصر ہے کہ محبوب ہی محب کے گھر جاوے محب بھی تو محبوب کے گھر جا کر خدمت کرسکتا ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ معاف کیجئے پیاسا کنوئیں کے پاس جایا کرتا ہے۔ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جایا کرتا۔ بدتمیزی تو دیکھئے۔ مجھ کو بے حد غصہ آیا اور میں نے کہا کہ صاحب آپ کا تو یہ خیال ہے کہ ہم پیاسے ہیں اور ہمارا یہ خیال ہے کہ آپ ہی پیاسے ہیں۔ مگر ہمارے پاس تو دلیل ہے آپ کے پاس دلیل نہیں وہ دلیل سنئے کہ ہمارے پاس دین ہے اور اس کی آپ کو ضرورت ہے اور وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں اور آپ کے پاس دنیا ہے اور وہ بحمد اللہ ہمارے پاس بقدر ضرورت موجود ہے اب آپ خود فیصلہ فرمادیں کہ پیاسا کون ہے وہ صاحب یہ سن کر معافی کے خواستگار ہوئے اور پشیمان ہوئے۔

میں نے قولاً تو اپنے مجمع کا استغناء اس طور سے ظاہر کیا اور عملاً اس طرح ظاہر کیا کہ میں پھر ڈھاکہ نہیں گیا

کلکتہ ہی سے واپس ہو گیا اور مکان چلا آیا۔ اس پر بعض تو تعلیم یافتہ لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ ہم کو تمہارے ڈھاکہ جانے کا بہت افسوس تھا اور اب یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ کلکتہ ہی سے واپس چلے آئے۔

علماء اور ترقی: صاحبو! آپ لوگ جو ہمیں رائے دیتے ہیں کہ ترقی کرنی چاہیے تو ہمارے اندر اولاً تو وسائل بھی ترقی کے نہیں اور وسائل اختیار کریں مثلاً حکام سے ملیں نوابوں کے یہاں وفد بنا کر لے جائیں تو بعد میں پھر آپ ہی اعتراض کریں گے کہ مولویوں کو ایسا مناسب نہیں۔ چنانچہ میرا ڈھاکہ جانا بظاہر مذاق اہل ترقی کے موافق تھا۔ مگر دیکھئے انہیں لوگوں نے بعد میں اس کا نامناسب ہونا ظاہر کیا اور واپسی پر مسرت کا اظہار کیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس قسم کے وسیلے اختیار کرتا ہے کہ حکام سے ملاقات وغیرہ کرے تاکہ مسلمانوں کو نفع پہنچے اور اس میں مشغول ہو کر اسے شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل جائے تو یہی ترقی کی رائے دینے والے بعد میں اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو مخبر ہیں اور چناں ہیں اور چنیں ہیں میں ایسے لوگوں کی حمایت نہیں کرتا جن کو شمس العلماء وغیرہ کا خطاب مل گیا ہے اور نہ مجھے حمایت کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو ان پر اعتراض کا حق نہیں کیونکہ آپ کی تو رائے کے موافق انہوں نے عمل کیا۔ مگر افسوس اہل دنیا کی رائے پر عمل کر کے بھی وہ نیک نام نہ ہوئے بلکہ بدنام ہو گئے اگر ہم اس قسم کے وسائل اور ذرائع کو اختیار نہ کرتے تو بے اعتبار نہ ہوتے اس وقت ترقی کا صرف ایک اعتراض ہوتا کہ مولوی ترقی نہیں کرتے۔ مگر وہ حالت عدم ترقی کی اس ترقی کی حالت سے ہزار درجہ افضل تھی۔

شان علماء: بس مولویوں کو اس طرح رہنا چاہئے

نہ بر اشتر بر سوارم نہ چوں اشتر زیر بارم ۔۔۔ نہ خداوند رعیت نہ غلام شہر یارم
(نہ میں اونٹ پر سوار ہوں اور نہ مثل اونٹ کے زیر بار ہوں نہ رعیت کا مالک ہوں نہ بادشاہ کا غلام ہوں)

یعنی ان حضرات کو صرف تبلیغ عام یا خاص سے تعلق رکھنا چاہیے دل سے تعلق ہی نہ رکھنا چاہئے۔ بلکہ اس باب میں نہایت آن بان سے رہنا چاہئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے یہاں پانچ روپے بھیجے۔ اور یہ لکھا کہ طلباء سے دعا کرا دینا۔ میں نے روپے واپس کر دیئے۔ اور یہ لکھ دیا کہ یہاں دعا کی دوکان نہیں ہے اور دعا بکتی نہیں ہے۔ ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ ایک شخص پانی پت کے قریب کے رہنے والے تھے اور مجھ سے بیعت تھے انہوں نے مدرسہ کے لئے پندرہ روپیہ مجھے دیئے۔ میں نے کہا کہ باوجود پانی پت میں مدرسہ ہونے کے جو آپ سے قریب ہے آپ یہاں کے مدرسہ میں کیوں دیتے ہیں۔ اس میں مجھے یہ شبہ ہے کہ تم یہاں اس نیت سے دیتے ہو کہ مدرسہ میں بھی یہ روپیہ صرف ہوگا۔ اور پیر صاحب بھی خوش ہوں گے۔ دونوں باتیں حاصل ہو جاویں گی اور میں نے یہ بھی کہا دیکھو سچ بتانا اخفاء نہ کرنا۔ انہوں نے کہا جی ہاں مقصود تو یہی تھا میں نے کہا ایسے روپیہ کو میں پسند نہیں کرتا جس سے خوشنودی خداتعالیٰ اور میری خوشی دونوں مقصود ہوں میں اسے شرک سمجھتا ہوں آپ نے تقرب خداتعالیٰ میں مجھے بھی شریک کیا۔ ان کی سمجھ میں آ گیا اور واپس

---

[1] الصحیح للبخاری ۴: ۴۴، الترغیب والترہیب ۴: ۱۳۹، مشکوۃ المصابیح: ۵۲۳۲

لینے پر رضامند ہوگئے پھر صبح کو انہوں نے کہا کہ بے شک اس وقت تو میرا یہی مقصود تھا لیکن اب رات کو میں نے سوچا تو اب میرا جی یہی چاہتا ہے کہ اسی مدرسہ میں دوں اور دوسری نیت سے توبہ کرلی۔ اس وقت وہ روپے میں نے لے لئے۔ میری اس غیرت سے اخروی فائدہ تو ظاہر تھا مگر ظاہری اور دنیاوی فائدہ بھی نہ ہوا۔

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ایک صاحب نے دو سو روپے میرے پاس مدرسہ کے لئے بھیجے اور اسی کے ساتھ وہاں بلانے کی تحریک بھی کی۔ میں نے روپے واپس کر دیئے اور ان کو لکھ دیا کہ اگر ان کے ساتھ میرے بلانے کی درخواست نہ ہوتی تو میں قبول کر لیتا۔ اب تو یہ شبہ ہے کہ آپ مدرسہ میں یہ رقم دے کر گویا مجھ پر احسان رکھ کر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں سو مدرسہ میں رقم دینے کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ ان صاحب کا جواب آیا آپ روپیہ وصول کر لیجئے میں نہیں بلاتا۔ تو یہ سارا استغناء محض اس وجہ سے ہے کہ مجھے مدرسہ کا چلانا مقصود نہیں بلکہ محض رضائے حق مطلوب ہے اور یہ نیت کر لی ہے کہ اگر حدود کے اندر کام چلتا رہا چلاتے رہیں گے اور جس دن کچھ تجاوز کرنا پڑا یا تدبیریں سوچنا پڑیں کہ اب کیا انتظام کریں، کہاں سے رقم لائیں اسی دن مدرسہ بند کر دوں گا۔ غرض یہ نیت رکھنی چاہئے کہ جس روز مدرسہ نہ چلے گا نہ چلے ٹوٹ جاوے گا تو بلا سے کوئی ہمارا ذاتی کام تو ہے نہیں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اس طرح مسلمانوں کی سبکی اور ذلت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علوشان کی حاجت ہی کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام تو ہماری علوشان کے لئے اسلام کافی ہے۔ ہمیں تو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے۔ اگر مسجد چونا اور پتھر کی نہ بنے بلا سے نہ بنے۔ جعلت الارض لنا مسجد او طهورا تمام زمین مسجد ہے۔ یہ نیت کر لینا کہ اس قدر طول وطویل ہو اور ایسی ہیئت و شکل پر ہو فضول ہے ہر کام میں یہی نیت رکھئے کہ کوئی شخص آپ کے ساتھ خوشی سے شریک ہو فبہا ورنہ چھوڑ دیجئے یہ نیت رکھو کہ بالکل بند ہے گا نہ سہی اور کم پیمانہ پر ہوگا تو کم ہی سہی۔

ایک ہندو کی حکایت ہے کہ وہ بے پورے ہردوار کو چلا جس کے پاس گنی تھی۔ پھر کسی موقع پر خیرات کرنے کے لئے روپوں کی ضرورت ہوئی تو ایک دکاندار سے کہا کہ مجھے ایک گنی کے روپے دے دو۔ اس نے کہا کہ پورے پچیس روپے نہ دوں گا بلکہ بیس دوں گا یہ راضی ہو گیا تو اس نے اور کم کرنا شروع کئے اور یہ راضی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ دس تک نوبت آگئی اس نے کہا کہ لا تو دس ہی دے دے۔ تو وہ بولا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم چرا کر لائے ہو جو اس طرح کم کرتے جاتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا کہ اصل یہ ہے کہ میں اس وقت دان پن کے واسطے چلا تھا۔ تو تو جس قدر کم دیتا میں اس میں پن کی نیت کر لیتا۔ اگر تو یہ بھی کہتا کہ میں کچھ بھی نہیں دیتا تب بھی میں راضی ہو جاتا اور تجھے گنی دے دیتا۔ تو صاحبو! حیرت ہے کہ ایک ہندو تو مقصود اصلی کو سمجھا اور مسلمان مقصود اصلی کو نہ سمجھے۔ جس طرح اس نے یہ سمجھ لیا کہ مقصود ثواب ہے خواہ گنی زیادہ میں جائے یا کم میں مجھے ثواب پورا ہی ملے گا۔ اسی طرح مسلمان کو سمجھنا چاہئے کہ کام خواہ اعلیٰ پیمانہ پر چلے یا ادنیٰ پیمانہ پر مقصود تو ثواب ہے اس کی فکر نہ ہونا چاہئے کہ اعلیٰ پیمانہ پر ہی کام ہو۔

طاعت اور توفیق: صاحبو! اسلام نے غیرت کی بھی تعلیم دی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ انلزمکموها و انتم لها کارهون تو کیا ہم اس کو تمہارے گلے مڑھیں اور تم اس سے نفرت کئے

چلے جاؤ اور فرماتے ہیں کہ **لست علیھم بمصیطر** آپ ان پر مسلط نہیں ہیں اور فرماتے ہیں

ولوشاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین وما کان لنفس ان تؤمن الاباذن اللہ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے۔ سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں۔ جس میں وہ ایمان لے ہی آویں حالانکہ کسی شخص کا ایمان لانا بدوں خدا کے حکم کے ممکن نہیں۔ اور فرماتے ہیں۔

وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبغی نفقاً فی الارض او سلماً فی السماء فتاتیھم بایۃ ولوشاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ فلاتکونن من الجاھلین.

اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے اور اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سب کو راہ پر جمع کر دیتا۔ سو آپ نادانوں میں نہ ہوجیے۔ اور فرماتے ہیں۔

قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ تو ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو استغناء کے ساتھ رہنا چاہئے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑے۔ اسی طرح مدرسہ والے بھی اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ بھی مدرسہ میں کچھ دے دے۔ وہ بھی کچھ امداد کر دے کسی کے پیچھے پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جب خدا کا حکم ہوتا ہے جب ہی کوئی دیتا ہے۔

زکوٰۃ، خیرات اور احسان: جب کوئی دیتا ہے تو کسی پر کیا احسان ہے۔

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی　　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

(یہ احسان مت جتاؤ کہ بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں اس کا احسان مانو کہ اس نے تم جیسے کو خدمت میں رکھ لیا ہے)

خدا کا احسان ہے کہ وہ ہم کو اپنی طاعت کی توفیق دے دیں اور ہماری طاعت بدنیہ اور مالیہ کو قبول فرمالیں۔ اگر وہ قبول نہ فرماویں تو ہم کیا کر سکتے ہیں غرض جو کوئی مدرسہ کی امداد کرتا ہے خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ مہتمم مدرسہ پر کیا احسان ہے پھر وہ کیوں کسی کی خوشامد کرے اور کیوں کسی کا شکریہ ادا کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغناء ہی سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ایک شخص منافق تھا۔ اس نے بکریاں پالیں اور حضورؐ سے دعاء برکت چاہی۔ آپؐ نے دعا فرما دی۔ وہ بہت بڑھ گئیں۔ اس سے زکوٰۃ مانگی گئی تو اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی۔ پھر خود لایا تو حضورؐ نے بوجہ وحی کے نہ لی پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں زکوٰۃ دینا چاہی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں زکوٰۃ نہ قبول کی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دینی چاہی اس وقت بھی نہیں قبول کی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی نہیں لی۔ پھر وہ آپ کے زمانہ میں مر گیا۔ اس وحی خاص میں جس کی متابعت حضرات خلفاء نے بھی کی یہ بھی نکتہ تھا تاکہ ظاہر ہو جاوے کہ زکوٰۃ ادا کرنے میں کسی پر کچھ احسان نہیں صرف اپنا ہی نفع ہے اگر تم ایک بار انکار

کرو گے تو ہم دس بار واپس کر دیں گے۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان نہیں بلکہ چندہ لینے والے کا احسان ہے کہ اس نے لے کر آپ کو پاک صاف کیا۔

بقاء علم کی صورت: خاص کر جب کہ یہ ایسی جگہ ہے جو ایک زمانہ تک مرجع خلائق رہی ہے تو اس کا حق ادا کرنا سب ہی کے ذمہ ہے نہ کہ ایک شخص پر تمام بار ڈال کر اس کا انتظام کیا جاوے۔ کیا وہ سب سے ماتگے اور وہ زمانہ مفتی الٰہی بخش صاحب کا تھا جو اپنے وقت کے آفتاب تھے اور وہ حق یہ ہے کہ ایسی جگہ درس تدریس کا سلسلہ ضرور قائم و باقی رکھا جاوے۔ اس کی بقاء کی صورت ہمارے تجربہ سے تو یہ ثابت ہوئی ہے کہ مدرسہ کا ایک خاص مکان ہو جس میں کچھ جگہ درس تدریس کے لئے ہو اور کچھ جگہ طلباء کے رہنے کی ہو اور کتب خانہ بھی ہو اور وہ مکان وقف ہو اور مدرسہ کی ملک ہو اور اس میں طلبہ و مدرسین درس و تدریس میں مشغول رہیں اگر عقلاء اس کے سوا ہمیں اور کوئی صورت قیام علم کی بتلاویں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر مجھ کو سمجھا دی جاوے تو میں ضرور قبول کر لوں گا۔ اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ دو چار مدرسے جن میں میرا من وجہ اختیار ہے ان کے ویران کرنے کی سب سے اول میں ہی کوشش کروں گا۔ مگر یہ شرط ہے کہ وہ ایسی صورت ہو کہ تجربہ سے اس کا صحیح اور درست ہونا معلوم ہو گیا ہو۔ تو اس وقت میں ان منظم مدرسوں کو مجذوب کی لنگوٹی کی طرح رخصت کر دوں گا۔

جیسے ایک مجذوب کا قصہ ہے یہ خدا کو معلوم ہے کہ واقع میں بھی مجذوب تھے یا نہیں۔ غرض وہ ننگے پھرا کرتے تھے ایک دفعہ مریدوں نے لنگوٹا باندھ دیا مگر چونکہ مجذوب تھے اس واسطے کھانا اس طرح کھاتے تھے کہ روغن وغیرہ سب لنگوٹے پر گرتا تھا آخر وہ چکنا ہو گیا چوہوں نے اسے کترنا شروع کر دیا۔ جب چوہے بکثرت ہو گئے تو ان کے لئے بلی پالی گئی تاکہ چوہوں کو کم کرے۔ بلی نے ہر چیز کھانی شروع کر دی جو چیز کھانے کو رکھی گئی وہی کھا گئی اس کے واسطے کتا پالا گیا۔ جب کتے نے ستانا شروع کیا تو اس کی حفاظت کے واسطے ایک نوکر رکھا گیا اور جب وہ ادھر ادھر نظر کرنے لگا تو اس کا نکاح کر دیا گیا اور اقتران صغریٰ و کبریٰ سے نتیجہ پیدا ہو گیا۔ ایک دن مجذوب صاحب کو جو کچھ افاقہ ہوا تو ایک ہجوم دیکھ کر پوچھا یہ کیسا قصہ ہے میرے آس پاس یہ ہجوم کیسا ہے مریدوں نے سارا قصہ بیان کیا تو مجذوب صاحب نے لنگوٹی اتار کر پھینک دی کہ یہی بکھیڑے کی جڑ ہے ہم اسی کو نہیں باندھتے۔

تو ہم بھی اگر آپ بقائے علم کی اور کوئی تدبیر بتلائیں گے اور سمجھا سکیں گے تو ان مدرسوں کو لنگوٹا سمجھ کر پھینک دیں گے مگر جب بقاء علم کی صورت اہل تجربہ کے تجربہ سے اسی صورت میں منحصر ہو گئی ہے تو اب اس کے ابقاء کی کوشش میں کیا عذر ہے اور اس کو خوب سمجھ لیجئے کہ صرف مدرسہ ہی آپ کا محتاج نہیں بلکہ آپ بھی اس کے محتاج ہیں یعنی مدرسہ جیسے آپ کی اعانت کا محتاج ہے اسی طرح آپ مدرسہ کی برکت کے محتاج ہیں بلکہ مدرسہ تو مجازاً ہی محتاج ہے مگر آپ حقیقت میں محتاج ہیں جیسے فقیر سخاوت کا حقیقۃً محتاج ہے اور سخاوت کو فقیر کی مجازاً حاجت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

بانگ می آید کہ اے طالب بیا　　　جود محتاج گدایاں چوں گدا

(آواز آئی کہ اے طالب آ، سخاوت مثل گدا کے فقیروں کی محتاج ہے)

اور احتیاج سے مراد توقف ظہور ہے مجازاً احتیاج سے تعبیر کر دیا اور عجیب بات ہے کہ باوجود یکہ ظاہراً مولانا پر جذب کا غلبہ کم ہے عارف شیرازی سے مگر اس مضمون کو حافظ شیرازی نے نہایت متین عنوان سے تعبیر کیا ہے اور مولانا کا عنوان ذرا موہم ہے اس لئے کہ مولانا نے احتیاج سے تعبیر کیا ہے برخلاف حافظ صاحب کے کہ انہوں نے شوق سے تعبیر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سایۂ معشوق گر افتاد بر عاشق چہ شد　　　مابہ او محتاج بودیم او بما مشتاق بود

(معشوق کا سایہ عاشق پر پڑے گا تو کیا ہوا ہم اسکے محتاج اور وہ ہمارا مشتاق ہے)

تو حافظ کا اشتیاق سے تعبیر کرنا مولانا کی اس تعبیر سے سہل ہے گو حق تعالیٰ تو اشتیاق لغوی سے بھی جو کہ ایک قسم کا انفعال ہے منزہ ہیں۔ مگر اس کے سہل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لفظ اشتیاق حدیث میں وارد ہے۔ چنانچہ حدیث بیہقی میں ہے۔ **قال جبریل علیہ السلام ان اللّٰہ قد اشتاق الی لقائک** (کذا فی نشر الطیب) تو اشتیاق کا لفظ حدیث میں موجود ہے برخلاف لفظ احتیاج کے کہ وہ حدیث میں موجود نہیں ہے۔ یہ سب کلام مدارس دینیہ کی ضرورت کے متعلق تھا۔

مسجد ضرار کی وجہ تسمیہ: اب مقصود آیت کی طرف عود کرتا ہوں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اس وقت مدرسہ کی عمارت کی نسبت خصوصاً اور جملہ عمارات کی بابت عموماً بیان ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **افمن اسس بنیانہ علیٰ تقوی** (ایک شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہو) یہ آیت ایک خاص قصہ اور ایک خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے اس سے علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم بیان کرنا ہے اور اس پر پھر جملہ تعمیرات کو قیاس کرنا ہے۔ غرض یہ آیت مسجد خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔ مختصر قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے۔ قبا اس کا نام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلّہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس جگہ آپ نماز پڑھتے تھے وہاں اس محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا کرتے کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد　　　باخاک آستانش داریم مرحبائے

(جس منزل میں محبوب کسی روز پہنچے ہوں ہم اس کی چوکھٹ کی خاک کو مرحبا کہتے ہیں)

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اور اس کا پریذیڈنٹ ابوعامر راہب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا۔ اور ابوعامر کا ہرقل شاہ روم سے میل

جول تھا۔ ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہرقل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔ جس سے اسلام نیست و نابود ہو جائے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان الله معنا کی تھی کہ کفار کسی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس ہے کہ آج کل یہی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کند ہو رہی ہے کیونکہ مرضیات الٰہی سے مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آ جائے گا جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے مسجد کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورۃً مسجد کی شکل تھی غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرانا تھا جیسے بیع نامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تا کہ وسعت و سہولت ہو گرمی سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے ایک مسجد میں سب سما نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہو گئی نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جا سکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے۔ حضورؐ نے بنا پر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا غرض حضورؐ نے وعدہ فرما لیا کہ تبوک سے آ کر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

> **والذين اتخذوا مسجداً ضراراً و كفراً و تفريقاً بين المؤمنين و ارصاداً لمن حارب الله و رسولهٗ من قبل و ليحلفن ان اردنا الا الحسنىٰ والله يشهد انهم لكاذبون لاتقم فيه ابداً لمسجد اسس على التقوىٰ من اول يوم احق ان تقوم فيه فيه رجال يحبون ان يتطهروا والله يحب المطهرين۔**

اور بعضے ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں۔ اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا و رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپؐ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر

رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی کہ یہ مسجد صرف صورۃً ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے اور ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار کی گئی ہے اور یہ لوگ قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہو جائے اور نہ نماز پڑھئے۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھئے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔ غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے کی ممانعت ہو گئی چنانچہ حضورؐ نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوادی اور منہدم کرا دی۔ اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لئے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرز نصیحت: اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں افمن اسس بنیانه علیٰ تقویٰ من اللّٰہ ورضوان خیرامن اسس بنیانه علیٰ شفا جرف هارفانهاربه فی نارجهنم.

(کیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا اور خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گھاٹی کے کنارے پر رکھی ہو جو گرنے ہی کو ہو پھر اسکو ساتھ لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑے) ہمزہ استفہام کا ہے اور فا تفریع کا ہے اوپر دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک تو بنا تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے جب بناؤں کی حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو گئی اور بنیان مصدر ہے مبنی کے معنی میں اور کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تا کہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من جانب اللہ ہے اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو۔ یہ طرز بلاغت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا۔ پس دونوں کے افعال بیان کر دیئے اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا موثر ہے اور اگر ناصح خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرانی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تائید میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مدرسہ میں جلسہ تھا ایک واعظ صاحب نے وعظ فرمایا اور وعظ میں یہ فرمایا کہ علی گڑھ کالج والے سودی ڈگریاں کرتے ہیں اس لئے ملعون ہیں۔ بات تو صحیح تھی مگر

الفاظ سخت تھے اس لئے سامعین کو گراں گزرا اور ناگوار ہوا۔ سامعین بگڑ گئے جب لوگوں کی ناگواری کا مہتمم جلسہ کو احساس ہوا تو اس کا تدارک کرنے کے واسطے کھڑے ہوئے اور خود تقریر کی کہ خدا اور رسولؐ نے بھی کہا ہے جو واعظ صاحب نے فرمایا ہے۔ وہ غیر ذٰلک مگر مہتمم صاحب کی تقریر سے بھی اس کا کوئی تدارک نہ ہوا۔ تو مہتمم صاحب میرے پاس بھاگے ہوئے آئے۔ غریب کی جورو سب کی بھابھی۔ چونکہ مجھ کو اپنے کرم فرماؤں سے انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے اس لئے ہر ایسے موقع پر مجھے ہی سب پھنسانا چاہتے ہیں۔ اول تو میں نے کہا کہ تمہاری یہی سزا ہے۔ بات کہو گر نرمی سے کہو سختی کی کیا ضرورت ہے کہ تم اور بھگتوں میں یہ اچھی رہی مگر وہ اصرار کرنے لگے تو میں کھڑا ہوا۔

میں نے کہا صاحبو! اعمال و افعال مباحہ میں نیت پر مدار ہے۔ تو اگر کوئی شخص سخت لفظ کہہ دے مگر نیت مذموم نہ ہو تو ناگوار نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ نیت تو مذموم نہیں ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ مولوی صاحب کی نیت کیا تھی ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے محض شفقت کی راہ سے کہا ہے جیسے کسی کا لڑکا زہر کھانے لگے اور وہ اس کو سختی کے ساتھ دھمکائے تو اس سے کسی کو ناگواری نہیں ہوتی کیونکہ جانتے ہیں کہ منشاء اس کا محض شفقت ہے اب بتلائیے کہ ہم لوگ جو برے افعال کرتے ہیں ان سے مولوی صاحب کا کیا نقصان ہے اور اگر ہم پارسا ہو جائیں تو اس سے مولوی صاحب کا کیا نفع ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع نقصان جو کچھ ہے ہمارا ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ہم کو مضر باتوں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے تو یہ اس کی شفقت ہے یا نہیں۔ اس کو آپ کی حالت بگڑنے پر افسوس ہوتا ہے اس لئے غصہ اور تیزی کے ساتھ آپ کو روکنا چاہتا ہے۔ اگر شفقت نہ ہوتی تو اس کی جوتی کو غرض پڑی تھی جو کسی کی اصلاح کے درپے ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھ کو حیرت ہے کہ آپ لوگ تو فطرت کے بہت معتقد ہیں اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ آدمی فطرۃً مختلف المزاج پیدا ہوئے ہیں مزاجوں میں باہم بہت بڑا تفاوت ہے چنانچہ انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تیزی سب کو معلوم ہے اور ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ایک ہمارے حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو آپ نے مولوی صاحب کی سختی کو فطرت کا تابع کیوں نہ تجویز کرلیا۔ پھر میں نے اسلامی احکام اور کالج والوں کا ان سے بعد بیان کر کے اخیر میں کہا کہ اب آپ ہی بتلائیے کہ ایسا شخص جو ان احکام کی پابندی نہ کرے مرحوم برحمت خاص ہو سکتا ہے یا رحمت خاص سے اس کو بعد ہوگا اور یہی معنی ہیں لعنت کے۔ بس آپ ہی فیصلہ کر دیجئے ہم کچھ نہیں کہتے تو میں نے دونوں قسم کے افعال بیان کر کے فیصلہ خود ان سے چاہا۔ جس سے سب سامعین خود معترف ہو گئے کہ ہم ہی خطاوار ہیں۔

تو ایک طرز تو یہ ہے کہ ان کے اقوال و افعال اجمالاً نہ طور پر بیان کر دیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے۔ پھر خود ان سے ہی فیصلہ دریافت کرلیا جائے تو یہ طرز زیدہ موثر ہوتا ہے

اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو۔ جیسے ان مولوی صاحب نے کیا تھا یہ طرز موثر نہیں ہوتا۔ تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون خیر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا وہ بھی گر گیا یہ سب سے زیادہ ضرر ہے اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔

تعمیری بنیاد: ایک نظیر یاد آ گئی۔ میں بھرت پور گیا تھا خواجہ عزیز الحسن صاحب میرے ہمراہ تھے۔ چند وعظ بیان کرنے کا اتفاق ہوا جو خواجہ صاحب نے لکھے وہ سفر میں تھے ان کے ہمراہ ایک بیگ تھا جس میں وعظ بھی تھے۔ وہ بیگ ریل میں چوری چلا گیا خواجہ صاحب کو وعظوں کے ضائع ہونے کا بہت رنج ہوا۔ میں نے ان کے رنج دفع کرنے کو کہا کہ میاں سر سلامت چاہیے ٹوپیاں بہت یعنی واعظ رہے تو وعظ بہت۔

اسی طرح اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں مکان بہت بن سکتے ہیں۔ اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔ اس بیٹھ جانے کے متعلق ایک بات یاد آ گئی کہ آج کل یہ بھی مرض ہے کہ بہت اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں پھر جب وہ گرتی ہیں تو کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ سب کو لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ان آفات سے محفوظ تو گاؤں کے مکان ہیں جو نیچا ہونے کی وجہ سے زلزلہ میں بھی نہیں گرتا۔ ۲۸ اپریل منگل کے دن کانگڑے میں زلزلہ آیا۔ زلزلہ میں شدت تھی۔ ایک تو زلزلہ کی شدت دوسرے بڑے اور اونچے مکانوں میں حرکت تو میں نے کہا یا اللہ تیرا شکر ہے کہ ہمارے مکان چھوٹے چھوٹے ہیں جو زلزلوں کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اس واسطے کہ یہ قاعدہ ہے کہ مرکز سے محیط کو جس قدر بعد ہوگا اس میں حرکت زیادہ ہو گی دیوار جس قدر لمبی ہو گی زلزلہ میں حرکت زیدہ ہوگی۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ نیچے نیچے گھر والے دنیا میں بھی شدت زلزلہ سے محفوظ رہیں گے اور خدا تعالیٰ کے یہاں بھی محفوظ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ کو یہ مسئلہ بھی بتانا تھا کہ مکان ایسا بنانا چاہئے۔ جو مکین کو نہ لے بیٹھے اور کچے مکانوں اور نیچے گھروں میں گو بعض تکالیف ہوتی ہیں مگر راحتیں زیادہ ہیں۔ اگر کبھی گر پڑا تو جلدی سے دوسرا ویسا ہی بن سکتا ہے۔

خدا گر بحکمت بہ بندد درے
کشاید بہ فضل و کرم دیگرے

(اللہ تعالیٰ اگر حکمت سے ایک در بند کر دیتے ہیں تو اپنے فضل و کرم سے دوسرا دروازہ کھول دیتے ہیں)

اور یہاں اللہ تعالیٰ نے تاسیس بنیان پر نکیر نہیں فرمایا بلکہ بنیاد مقید بقید خاص پر نکیر فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ خود مکان بنانا مذموم نہیں بلکہ وہ تو اگر بقید ضرورت ہو تو محمود ہے۔

مکان کی اہمیت: ہاں بناء الفاسد علی الفاسد نہ ہو۔ وجہ یہ کہ بغیر مکان کے گزر نہیں ہو سکتا اور سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب مکہ تشریف لے گئے تو فاقوں کو جھیل لیا مگر مکان کی تکلیف نہ برداشت فرما سکے۔ ایک روز مطاف میں تشریف رکھتے ہوئے ذکر میں مشغول تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی تشریف لائے اور کچھ پیسے ہاتھ پر رکھے اور فرمایا تمہارے ہاتھوں لاکھوں کا خرچ رکھا گیا حضرت نے عرض کیا میں اس کا متحمل نہیں۔ البتہ ایک ایسا گھر چاہئے فرمایا یہ بھی ہو جائے گا جس کا غیب سے یہ سامان ہوا کہ ایک شخص نے حضرت کے نام مکان خرید دیا۔ حضرت نے اس مکان میں بیٹھتے ہی معاً وقف نامہ لکھا کہ حیات تک میں رہوں گا پر میرے بعد یہ مکان دوسرے اغراض محمودہ کے لئے وقف ہے اور اس طرح کی شرط لگانا وقف میں جائز ہے کہ اپنے انتفاع کی یا اپنی اولاد کے یا اولاد کی اولاد کی اولاد کے انتفاع کی شرط لگا لے یہ بھی ثواب کا مرتبہ ہے مگر میں اس کا کسی کو مشورہ نہیں دیتا۔ کیونکہ بعض دفعہ وقف کرنے کے بعد اولاد کو کوئی ایسی تکلیف ہوتی ہے جس سے اولاد کو مجبوری کی وجہ سے مکان بیچنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی وقت وہ محلہ ویران اور خطرناک ہو گیا یا ہمسائے شریر ہو گئے۔ اب مکان بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر وقف کی وجہ سے اس کو بیع نہیں کر سکتے۔ آگے ہر شخص اپنی مصلحت سمجھ سکتا ہے۔

غرض مکان کے نہ ہونے کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ حافظ شیرازی بھی مقام امن کی ضرورت کو فرماتے ہیں۔

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق رفیق اگر تم کو ہمیشہ میسر ہو جائیں تو بہت ہی اچھی توفیق ہے)

ہاں شرط یہ ہے کہ مقام امن ہو گڑبڑ نہ ہو ورنہ پھر مکان سے خاک بھی فراغت نہیں ہوتی۔

اپنے اختیار کی جگہ نہ ہونے کی تکلیف پر ایک قصہ یاد آیا۔ ہم ایک دفعہ عدن میں اترے۔ عدن مشہور جگہ ہے اور یہ بھی عوام میں مشہور ہے کہ وہاں بہشت تھی مگر وہ جنت اسی قبیل سے ہے کہ **تسمع بالمعید خیر من ان تراہ** (معید کو سن لینا اسکے دیکھنے سے بہتر ہے) غرض یہ غلط مشہور ہے کہ وہاں بہشت ہے۔ تو میں جب عدن پہنچا ایک دو ساتھی اور بھی ہمراہ تھے۔ ہم کو عدم کی سیر کرتے کرتے شام ہو گئی۔ سوچا کہ مسجد میں جا کر سو رہیں گے کیونکہ مسجد خدا کا گھر ہے وہاں کسی کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ چنانچہ مسجد میں پہنچے پھر سوچا کہ چپکے سے چھت پر جا کر لیٹ رہیں۔ تا کہ مؤذن وغیرہ آ کر نہ نکال دیں۔ چنانچہ چھت پر بستر بچھا کر چپکے سے لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد مؤذن آیا اس نے آ کر کہا نکلو کون ہے میں نے دل میں کہا کہ ہم نے بھی بہت مسافروں کو مساجد سے نکالا ہے آج اس کی قدر ہو گی غرض ایک ساتھی نے موذن کو دھمکایا اور کہا کہ تمہیں خبر نہیں کہ ہم آتے جاتے ہمیشہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں اور عربی میں کہا کہ تو جانتا نہیں ہم عرب ہیں۔ تو وہ موذن ذرا ٹھنڈا ہوا اور کہا

کہ آکر اندر مسجد میں لیٹ جاؤ۔ اس وقت ہم چھت سے اتر کر مسجد کے اندر آگئے اور پردہ چھوڑ کر لیٹے اور کہا کہ خدا تیرا بھلا کرے تو واقعی مکان نہ ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم عاد کی تقلید: مگر مختصر مکان ضرورت کے لائق کافی ہے زیادہ اونچا مناسب نہیں حدیث میں ہے **وبیت یتدخل فیہ** کہ مکان ایسا ہو جس میں بہ تکلیف داخل ہو سکے زیادہ اونچا کرنا مکان کا قوم عاد کی میراث ہے قوم عاد شان کے لئے نئے نئے اونچے اونچے مکان بنایا کرتے تھے ہمارے یہاں تھانہ بھون میں بھی بعض مکان اندر سے تو بہت ہی مختصر ہیں مگر دروازہ نہایت عالیشان اور نہایت بلند ہے عذر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چوروں سے حفاظت رہتی ہے مگر یہ سب امور فضول اور لغو ہیں۔ چور تو جہاں چوری کرنا چاہتے ہیں تو اونچے سے اونچا مکان بھی مانع نہیں ہو سکتا۔ وہ تو نقب کے ذریعے سے کام کرتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں جس کے مکان بہت چھوٹے چھوٹے اور نیچے ہیں مگر چور ساری عمر میں بھی کبھی ان کے گھر نہیں آئے تو اونچے مکان کے لئے چور کا نہ آنا اور نیچے مکان کے واسطے چور کا آنا لازم نہیں چور کے آنے کے اسباب اور ہیں۔

غرض بلا ضرورت اونچا اور وسیع مکان بنانا فضول ہے بقدر ضرورت بنانا چاہیے ہاں اگر کسی شخص کو ضرورت زیادہ ہو کہ آدمی بھی ہوں اور جانور بھی ان کی مقدار کے موافق وسعت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے غرض اللہ تعالیٰ نے نفس بنیان پر نکیر نہیں مذموم پر نکیر فرمایا چنانچہ اس کی ایک فرد کے باب میں فرمایا ہے کہ **فانهار به فی نار جهنم** (تو اس کو ساتھ لے کر دوزخ میں گر پڑی) اور تاکید وعید کے لئے یہ بھی فرمایا **واللہ لا یهدی القوم الظالمین** (اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو سمجھ ہی نہیں دیتا)

غرض یہاں دو مسجدوں کا ذکر ہوا ہے ایک وہ مسجد جس کی بناء میں غرض باطل اور نیت فاسد پر تھی اور ایک وہ جس میں غرض صحیح تھی یہ تو مساجد خاصہ تھیں جن کا ذکر اس مقام پر ہے اب میں ان سے اور مساجد کی طرف حکم کا تعدیہ کروں گا۔ پھر مدارس کی طرف پھر جملہ عمارات کی طرف مگر اول ایک غلطی پر متنبہ کر دینا ضروری ہے۔

اہل فتاویٰ کی غلطی: یہاں پر بعض اہل فتاویٰ کو مساجد کے متعلق سخت غلطی ہوئی وہ یہ ہے کہ جب کسی قدیم مسجد کے مقابلہ میں کوئی جدید مسجد بنی تو انہوں نے جدید پر فوراً مسجد ضرار کا حکم لگایا کہ یہ مسجد فساد اور لڑائی کی وجہ سے ہے اور محض تفاخر پر مبنی ہے یہ یقینی امر ہے کہ اگر نیت مذکورہ ہے تو معصیت ضرور ہے مگر اس سے یہ حکم لگانا کہ مسجد ضرار ہے کیسے صحیح ہے غرض جو مسجد جدید بنی اس کو مسجد ضرار فوراً کہہ دیا اور **الشیء اذا ثبت ثبت بلوازمه** (جو شئے ثابت ہوتی ہے وہ اپنے لوازمہ کے ساتھ ثابت ہوتی ہے)

ہی کے قاعدہ سے بعض اس سے آگے بڑھے کہ اس کے جلانے اور گرانے کا حکم کر دیا بے شک مسجد ضرار کا تو یہی حکم ہے مگر پہلے یہ تو ثابت ہو جاوے کہ یہ مسجد ضرار ہے یا نہیں۔ اس کے بعد ہی تو بقیہ تفریعات ہو سکتی ہیں تو جو مسجد ریا اور تفاخر کے لئے بنائی جاوے مجھے اس کے مسجد ضرار کہنے میں کلام ہے۔

اگر کوئی کہے کہ مسجد ضرار پر قیاس ہے تو میں کہوں گا کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ مقیس علیہ میں تو درحقیقت مسجد ہی بنانے کی نیت نہ تھی کیونکہ ان کے اعتقاد سے مسجد بنانا موجب تقرب نہ تھا بخلاف مقیس کے کہ وہاں بانی مسجد بنانے ہی کی نیت کر رہا ہے اور مسجد بنانے کے موجب کو تقرب سمجھتا ہے گو اس میں نیت فاسد بھی ملی ہوئی ہے تو فساد نیت کو فساد عقیدہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

اصل یہ ہے کہ مساجد کی تین قسمیں ہیں۔ ایک مسجد صلوۃ ایک مسجد ضرار ایک مسجد صلوۃ و ضرار یعنی ایک تو وہ محض نماز کے لئے ہو اور ایک وہ جو محض ضرار کے لئے ہو وہ مسجد ضرار ہے اور جو نماز اور اضرار دونوں کے لئے ہو وہ مسجد ضرار نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ مسجد ضرار کے لئے اصل شرط یہ ہے کہ مسجد ہی بنانے کی نیت نہ ہو جو حاصل ہے آیت کا اور جب یہ شرط متحقق نہ ہو گویا اور کوئی دوسری غرض بھی شامل ہو تو مسجد ضرار نہ ہوگی اس لئے احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے گو عند اللہ وہ مقبول نہ ہو۔

جیسے کوئی شخص کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور نیت خالص نہ تھی تو گو وہ عند اللہ شہید نہ ہو مگر ظاہری احکام شہید کے تو اس پر لگائے ہی جاویں گے۔ غرض مسجدیت اور مقبولیت میں تلازم نہیں۔ فقہاء جن کی شان یہ تھی کہ **لا یغادر صغیرة ولا کبیرةً الا احصھا** کہ تمام جزئیات کا انہوں نے احاطہ کیا ہے مگر یہ جزئی کہیں ان سے منقول نہیں کہ مسجد بہ نیت ریا وغیرہ احکام میں بھی مسجد نہیں ہوتی۔ اگر کوئی صاحب منقول ہونے کا دعویٰ کریں تو مہربانی کر کے دکھائیں ہم نے کسی مجتہد سے کہیں یہ جزئی منقول نہیں دیکھی۔ باوجودیکہ فقہاء کے زمانہ میں بھی اس کی ضرور ضرورت ہوتی تھی۔ مگر فقہاء نے کہیں یہ تفریع نہیں کی حالانکہ احکام مساجد کتب فقہ میں موجود ہیں۔ اور مسجد ہونا نہ ہونا احکام فقہیہ میں سے ہے پھر عدم تعرض دلیل ہے اس امر کی کہ مسجد تفاخر وغیرہ کی نیت سے بنانا احکام ظاہری اور فقہی کے اعتبار سے مسجد ہی کا حکم رکھتی ہے لہذا ہر مسجد کو ضرار کہہ دینا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

پھر جب ایسی مسجد مسجد ضرار کے حکم میں نہیں ہو سکتی تو یہ خیال کر کے کہ یہ مسجد ضرار ہے اس کے ویران کرنے کی کوشش جائز نہیں ہو سکتی پھر کسی کی نیت پر فتویٰ کا مدار کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نیت کا علم کسی کو سوائے خدا کے نہیں ہو سکتا پہلے اس شخص سے تو تحقیق کر لو جو بانی مسجد ہے ممکن ہے کہ اس کی نیت اچھی ہو۔ (اور وہاں تو نیت کا حال وحی سے معلوم ہو گیا تھا اب بوجہ انقطاع وحی ہمیں نیت کا حال معلوم ہو نہیں سکتا) اور جس طرح کسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہہ سکتے اسی طرح کسی مدرسہ پر بھی مدرسہ ضرار کا حکم نہیں لگا سکتے اس لئے کہ مسجد دار العمل ہے اور مدرسہ دار العلم ہے۔

مدرسے اور کھالیں: جب ایک شہر میں مساجد متعدد ہو سکتی ہیں تو مدارس کے متعدد ہونے میں کیا مضائقہ ہے البتہ اسی طرح دو دو یا تین تین مدرسے چلانے سے کیا فائدہ جیسے مدارس آج کل چل رہے

ہیں اور چلتے ہیں کہ جب قربانی کے دن آئے تو جہاں مدارس متعدد ہیں وہاں گھر گھر مدرسہ والے بھاگے پھرتے ہیں پھر ہر ایک اپنے مدرسہ کے لئے کھال لینے کی کوشش کرتا ہے جانوروں کی کھال اترنے سے پہلے آدمیوں کی کھال اترنے لگتی ہے اس قدر رذیل افعال سے غیرت بھی تو نہیں آتی۔ ایسے مدرسہ کے چلانے سے کیا فائدہ؟ ایسی صورت میں تو مدرسہ والوں کو چاہئے کہ ایک جگہ دو مدرسے چلانے کا نام بھی نہ لیں۔ اور کھال کی کوشش تو مدرسہ والوں کو کسی حال میں بھی مناسب نہیں گو ایک ہی مدرسہ ہو۔ اس میں دوسرے اہل حاجت سے کشمکش ہوتی ہے چنانچہ جہاں پہلے سے قربانی کی کھال موذنوں کو دینے کی عادت تھی وہاں موذنوں کی کھال اترتی ہے جہاں بقرعید کے دن آئے اور موذنوں نے مدرسہ والوں کو دیکھا' کوسنا شروع کر دیا کہ خدا ان مدرسہ والوں کو کھودے۔ انہوں نے ہماری آمدنی تباہ کر دی غرض کھال کے قصہ میں مولویوں سے اکثر لوگ ناخوش ہیں تو علماء بلا ضرورت کیوں مبغوض بنیں۔

فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ علماء کو دستاویز پر دستخط نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس سے عداوت ہوتی ہے اسی طرح علماء کو کھال کے قصہ میں بھی نہ پڑنا چاہئے کیونکہ یہ بھی باعث عداوت ہے اگر کہیں سے آگئی لے لی ورنہ پھرنے پھرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدرسہ دیوبند پھر غنیمت ہے کہ وہ اس طرح کھالوں وغیرہ پر زور نہیں دیتے بلکہ یہ لکھ دیتے ہیں کہ جہاں اوروں کا خیال کرتے ہو وہاں ہمارا بھی خیال کر لینا غرض علماء کو آزاد رہنا مناسب ہے۔ خوب کہا ہے۔

زیر بارند درختاں کہ ثمرہا دارند　　خوشتر آں سرو کہ از بند غم آزاد آمد

(پھلدار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ ہر غم سے آزاد ہے)

خصوصاً جہاں کئی مدرسے ہیں وہاں تو بہت ہی چپقلش ہے اور کسی کا کسی پر بس تو چلتا نہیں لہذا مسجد ضرار و مدرسہ ضرار کے لقب سے ملقب کر کے اپنے دل کا غبار نکالتے ہیں حالانکہ صاف اور واضح طور سے قرآن میں ایسے القاب سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ ولا تنابزوا بالالقاب بلکہ اگر واقعی بھی کسی کا کوئی برا لقب ہو تو چڑانے کی نیت سے بھی نہ کہنا چاہئے۔

تعمیر مساجد اور احتیاط: اب میں خاص مسجد کی خاص عمارت سے متعلق مساجد کی عمارت عامہ کی طرف حکم کا تعدیہ کرتا ہوں اور مساجد کی عمارات میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں ان کا مختصر بیان کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ آج کل لوگ تعمیر مساجد میں اپنے کو شتر بے مہار سمجھتے ہیں کسی قسم کی حدود و قیود کی رعایت نہیں کرتے اور اس جواب کو کافی خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنا گھر تو نہیں بناتے حالانکہ یہ جواب بالکل ناکافی ہے کیونکہ خدا کے گھر میں تو بدرجہ اولیٰ احتیاط کی ضرورت ہے وہاں احتیاط نہ کرنا زیادہ رنج وملال کی بات ہے۔ چنانچہ مساجد میں گنبد کو ضروری خیال کرتے ہیں اور استرکاری تو درجہ فرائض میں

سے ہے۔ بلا ان امور کے تو مسجد مسجد ہی نہیں ہو سکتی۔ منارہ کو اس قدر طویل کرتے ہیں کہ جس کا بیان نہیں اور منارہ کی طوالت کی اکثر یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ دور سے نظر آوے کہ مسجد ہے مگر یہ وجہ بھی صحیح نہیں بعض دفعہ آڑ ہوتی ہے وہ طویل منارہ بھی دور سے نظر نہیں آتا۔

علاوہ ازیں، دور سے نظر آنا بھی ضروری نہیں منارہ بنانے کی اصل وجہ تو صرف یہ ہے کہ مسجد دوسری عمارات سے مشتبہ نہ ہو۔ منارہ مسجد ہونے کی علامت ہے اور وہ علامت نفس منارہ ہے نہ کہ منارہ کا اس قدر طول و طویل ہونا۔ سو علامت کے لئے چھوٹے چھوٹے گز گز بھر کے منارے کافی ہیں۔ یا بجائے منارہ کے اور کوئی علامت کر دی جائے۔ بعض لوگ طوالت منارہ کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں شان اسلام ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر یہ بات ہے تو شان کے برابر تو لمبا ہونا چاہیے تھا پھر تو سب مساجد کے منارے کم از کم قطب کی لاٹھ کے برابر تو ہوتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسجد بننا تو دشوار ہی ہو جاتی ہے بس ایک منارہ پر ہی عمریں تمام ہو جاتی ہیں۔

جیسا کہ قطب کی لاٹھ کی بابت مشہور ہے کہ بادشاہ کا مسجد بنانے کا قصد تھا مگر اس وقت تک ایک ہی منارہ بنا تھا کہ بادشاہ صاحب چل بسے دوسرا منارہ نہ بنا اور نہ پوری مسجد بنی ورنہ معلوم نہیں کیا کیا تکلفات ہوتے ہماری ان رسوم سے ہماری مساجد کی واقعی وہی حالت ہو رہی ہے کہ **مساجدهم عامرة و هي خراب** کہ ظاہر میں تو مساجد آباد ہیں مگر باطن میں خراب ہیں۔ ان میں روح نہیں فقط ظاہر ہی ظاہر ہے۔ چنانچہ بمبئی کی یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو وہاں کی مساجد بے حد آباد ہیں لمبے لمبے اور بہت جھاڑ فانوس فرش فروش مگر سنت کے خلاف جماعت میں متفرق طور پر آدمی کھڑے رہتے ہیں اور پورے طور سے صف بندی بھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ مکہ مکرمہ کی تقلید ہے مگر وہاں تو خط مستقیم کھینچنا دشوار ہوتا ہے اس لئے کہ خانہ کعبہ کے رخ پر نماز پڑھتے ہیں اس لئے پورے طور سے صف بندی دشوار ہوتی ہے اس وجہ سے اکثر متفرق طور پر صفوف رہتی ہیں مگر بمبئی میں کوئی عذر نہیں۔ بمبئی والے نماز کے افعال و ہیئت میں اکثر مکہ والوں کی تقلید کرتے ہیں امام و موذن بھی زیادہ تر عرب ہی ہیں مگر یہ سب دین کی ظاہری صورت ہے اور باطنی حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک بدعات میں غرق ہیں۔

ایک ہمارے دوست طالب علم بمبئی میں ملے اور قصہ بیان کیا کہ ان سے کسی نے شیخ سدو کے بکرے کی بابت دریافت کیا انہوں نے ناجائز کہہ دیا بس شور مچ گیا اب جس مسجد میں جاتے ہیں وہاں حکم ہوتا ہے کہ نکالو وہابی ہے اس جہالت کی بھی کوئی حد ہے کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں ہے **ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيها اسمه و سعى فى خرابها** (اور کون شخص اس سے زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے انہیں روکے اور ان کی بربادی میں کوشش کرے) غرض جس جگہ اور جس مسجد میں جاتے ہیں وہابی

وہابی کہہ کر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے ایک مسجد شافعیہ کی تھی وہاں جا کر نماز پڑھی میں نے کہا کہ میاں فتویٰ دینے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہہ دیا ہوتا کہ مجھے معلوم نہیں۔

غرض یہ بہانہ محض لغو ہے کہ مسجد کی زینت و آرائش سے شوکت اسلام بڑھتی ہے اسلام کی شوکت تو اتباع احکام سے بڑھتی ہے اگر ان آرائشوں سے شوکت اسلام بڑھا کرتی تو جس زمانہ میں شوکت اسلام عروج پر تھی اس زمانہ میں ان باتوں کا ضرور وجود ہوتا مگر ان چیزوں کا کہیں پتہ نہیں۔

دیکھئے حضرت عمرؓ کتنے بڑے صاحب شوکت و سلطنت و سیاست تھے اور کس قدر عالی دماغ اور بلند حوصلہ تھے لیکن جب مسجد نبوی بنوانے لگے تو بخاری میں ہے کہ مستری سے فرمایا کہ اکن الناس من الحرو البرد یعنی مسجد ایسی بناؤ کہ گرمی اور بارش سے بچاؤ ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے باوجود کثرت فتوحات کے نقش و نگار کی اجازت نہیں دی۔ تو اس زمانہ میں قلت زینت مساجد کی وجہ سے کیا عروج اسلام میں کچھ کمی آ گئی تھی ہرگز نہیں بلکہ ایسا عروج تھا کہ آج مسلمان اس کو ترستے ہیں۔

تھانہ بھون کے اسٹیشن پر جب مسجد بنی ہے تو معمار نے اس میں نقش و نگار بھی نکالنا شروع کر دیئے تھے۔ خربوزہ اور تربوز بنانے شروع کر دیئے۔ منتظم نے روکا کہ یہ قصہ مت کرو اور میرا حوالہ دیا کہ وہ پسند نہ کرے گا۔ معمار نے کہا کہ اگر وہ پسند نہ کرے گا تو مزدوری نہ دینا۔ منتظم نے کہا کہ یہ تو یقینی امر ہے کہ پسند نہ کریں گے پھر مزدوری بھی یقینی طور پر نہ ملے گی۔ معمار نے اس کو بھی منظور کیا پھر میرا مسجد دیکھنے کی غرض سے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے سب نقش و نگار دھلوا کر صاف کرا دیئے۔ اور معمار کو موافق وعدہ (نیز بوجہ قاعدہ شرعیہ) اجرت نہیں دی گئی۔ کیونکہ اگر مسجد میں اس طرح سے نقش و نگار کئے جاویں تو مسجد مسجد نہیں رہتی بلکہ تماشا گاہ ہو جاتی ہے کہ سیاح اس کو دیکھنے کو آتے ہیں اور نمازی بھی اگر وہاں نماز پڑھتے ہیں تو خیال نقش و نگار کی طرف رہتا ہے نماز کی طرف نہیں رہتا جب مساجد میں ان خرافات کی اجازت نہیں اور مساجد میں یہ خرافات فضول ہیں حالانکہ ان کی زینت یا شوکت میں ایک گونہ دینی مصلحت بھی محتمل ہے تو بقیہ عمارات میں بدرجہ اولیٰ یہ قصہ فضول ہے۔

مکان اور تقویٰ: غرض عمارات میں ریا و تفاخر و اسراف سے تحرز لازم ہے ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کی ضرورت ہے اگر دونوں جمع ہو جائیں۔ سبحان اللہ! ورنہ صرف تقویٰ بھی بدرجہ اولیٰ کافی ہے اور تقویٰ اور رضوان میں جو فرق ہے اس کو بیان کرتا ہوں۔

طلب رضوان جو وجودیات سے ہے اور تقویٰ عدمیات سے یعنی طلب رضوان کا حاصل ثواب کے لئے فعل مامورات ہے خواہ واجب ہوں یا مستحب اور تقویٰ کا حاصل احتراز عن المنہیات ہے پھر تقویٰ اور رضوان کو یہاں لفظ واو سے جمع کیا گیا ہے اور لفظ واو ہر چند کہ جمع کے لئے آتا ہے مگر اجتماع کے لئے نہیں آتا پس ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان کا جمع کرنا ضروری نہیں کیونکہ عمارت کی دو قسمیں ہیں بعض عمارت

جیسے مساجد وغیرہ میں تو رضوان وتقویٰ کا اجتماع ہوتا ہے کیونکہ نیت بھی ثواب کی ہوتی ہے اور خلاف شرع افعال ونیت سے بھی بچنا ضروری ہوتا ہے اور اگر اپنا مکان بناویں تو اس میں تقویٰ تو ہر حال میں ضروری ہے لیکن رضوان وثواب کی رعایت قدرے مشکل ہے اگر اس میں بھی رضوان وثواب کا قصد شرعاً ضروری ہوتا تو ہم اس صورت میں مکان بنانے میں خوشنودی خداوندی کی آخر کیا نیت کرتے تکلف ہی کرنا پڑتا چاہے حق تعالیٰ ہمیں کسی نیک نیت پر جو ہم بہ تکلف کرلیں ثواب دے دیں مگر نیت کرنا خود ہوتا تکلف۔

جیسے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کے ایک مرید نے مکان بنایا تھا تو وہ بزرگ مکان دیکھنے تشریف لائے دریافت کیا کہ بھائی یہ روشندان کیوں رکھا ہے عرض کیا کہ حضور روشنی کے واسطے فرمایا اگر یہ نیت کرلیتے کہ اس میں سے اذان کی آواز آوے گی تو ثواب بھی ملتا اور روشنی تو ہر صورت میں ہوتی ہی ہے۔

مگر سچ یہ ہے کہ ہر فعل میں اس قسم کی نیت ہے مشکل یہ خاص لوگوں کا کام ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ رضوان کی رعایت ہر عمارت میں مامور بہ نہیں۔ ہاں اگر نیت خیر ہو اس کے مستحب ہونے میں کلام بھی نہیں مگر سب میں ایسی ہمت کہاں کہ کھانا کھاوے، چلے پھرے، ہر ایک فعل مباح میں کوئی خاص نیت کرے عوام اگر نیت کریں گے بھی تو محض درجہ لفظ میں ہوگی نہ کہ حقیقۃً بہر حال ہر کام میں ایسی نیت دشوار ہے نتیجہ اس کاوش کا یہ ہوتا کہ غیر ضروری نیت کے ساتھ ضروری نیت بھی چھوٹ جاتی۔

جیسے ایک صاحب کو میں نے دیکھا میزان پڑھانے بیٹھے تو الحمد للہ میں تقریر کرنے لگے کہ الف لام کی چار قسمیں ہیں۔ استغراق اور جنس اور عہد ذہنی اور عہد خارجی وغیرہ۔ حالت یہ تھی کہ وہ بیان کر رہے تھے اور طلباء ان کا منہ تک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ ان پڑھنے والوں کے نزدیک تو الف لام کی ایک ہی قسم ہے یعنی استغراق کیونکہ یہ بیچارے سب مستغرق ہو گئے تو وہ مبتدی جس نے میزان شروع کی ہے ان باتوں کو کیا سمجھ سکتا ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہے۔ بجز اس کے کچھ نہیں کہ جب سمجھ میں نہ آوے تو چھوڑ دے تو نتیجہ اس دشواری کا اکثر ضروری چیز کا بھی ترک ہوتا ہے۔

اکثر واعظین اس قسم کی حکایت عوام کے سامنے بیان کردیتے ہیں اور ان کا درجہ بیان کرتے نہیں عوام ان کو ضروری سمجھ جاتے ہیں جس سے ان سب امور کا نتیجہ ترک عمل ہوتا ہے اگر ہر عمارت میں طلب رضوان وثواب کی نیت کا مکلف بنایا جائے تو عوام تقویٰ کو بھی چھوڑ بیٹھیں گے غرض عمارت کے لئے دو چیزوں میں سے بطور مانعۃ الخلو کے کسی ایک کی ضرورت ہے تقویٰ یا رضوان کی اور اس لفظ واؤ سے تقویٰ اور رضوان کا مجتمعاً پایا جانا ضروری نہیں ہو گیا۔ کیونکہ یہاں تو واؤ سے فقط حکم میں دونوں کو جمع کرنا منظور ہے نہ کہ وجود میں اور وہ حکم ہے خیریت تو یہاں جمع فی الخیریت مراد ہے کہ خیر ہونے میں دونوں شریک ہیں پس ہر شخص کے ذمہ یہ ضروری نہیں کہ ہر عمارت میں تقویٰ اور رضوان دونوں باتوں کو مجتمع کرے بلکہ بعض عمارات میں جہاں رضوان وثواب کی نیت میں تکلیف ہو صرف تقویٰ بھی کافی ہے۔

مکان اور ضرورت: اب تقویٰ کی مختصر فہرست بتلاتا ہوں جس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بے ضرورت مکان نہ بناؤ یہ بھی خلاف تقویٰ ہے جب ضرورت ہی شدید ہو تو مجبوری ہے حدیث میں آیا ہے کہ سب چیزوں میں اجر ملتا ہے مگر عمارات کہ اس میں اجر نہیں ملتا اور تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارات میں زیادتی ہو ہی جاتی ہے اور میں خود اس خبط میں مبتلا ہوں کہیں ذرا سا گوشہ نکلا ہوا برا معلوم ہوتا ہے کہیں نیچا ہے اس کا مساوی کرتا ہے۔ کہیں صرف اس ضرورت سے کہ مقابلہ ٹھیک نہیں ہوتا کوئی چیز بنائی جاتی ہے۔ اگر دروازہ سے پورا تقابل نہیں ہوتا تو مقابلہ میں دروں کے نشان بلا ضرورت ڈالتے ہیں۔ غرض عمارت وبال ہے البتہ ضرورت مستثنیٰ ہے۔ حدیث میں اور بیت یتدخل فیه (یا ایسا گھر جس میں بہ تکلف داخل ہو سکے) وارد ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص کی ضرورت مختلف قسم کی ہوتی ہے اس لئے اختصار بھی ہر اک کے لحاظ سے مختلف ہے۔

جیسے مشہور ہے کہ ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک شخص آٹھ دس روٹی کھایا کرتا تھا لوگوں نے شکایت کی بزرگ نے نصیحت کی کہ بھائی کم کھانا چاہئے۔ خیر الامور اوساطھا اس نے عرض کیا حضرت میری خوراک چالیس روٹیاں ہے اس لئے میرا اوسط یہی ہے بلکہ اوسط سے بھی کم ہے غرض ہر شخص کی ضرورت جدا ہے۔ ایک شخص ہے کہ اس کے گھوڑے وغیرہ بھی ہیں اس کو ان وجوہ سے بڑے مکان کی حاجت ہے اس لئے ہر شخص کا اوسط جدا ہے۔ غرض حد ضرورت میں تعمیر کرنا چاہیے اور ضرورت سے زائد کو ترک کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو آسائش ہے اور ایک آرائش ہے آسائش کی مقدار تک تو مکانوں میں وسعت جائز ہے۔ مگر آرائش کا اہتمام مذموم ہے۔ خصوص جب ساتھ میں نمائش بھی ہو. بس ہر عمارت میں یہ امر ضروری اور قابل لحاظ ہے کہ یہ تعمیر آسائش کے واسطے یا آرائش و نمائش کے واسطے ہے تو جو عمارتیں آرائش و نمائش کے واسطے ہوں وہ تقویٰ کے خلاف ہیں۔ اور اکثر عمارات تو ایسی ہی ہیں جن میں ضرورت کا لحاظ نہیں کیا جاتا چنانچہ بعض مکانوں میں دروازے بہت بلند ہیں بلکہ بعضے مکان تو ایسے ہیں کہ دروازہ تو نہایت عالیشان مگر اندر سے مکان بہت ہی مختصر وہی مثل ہے کہ خوان بڑا خوان پوش بڑا' کھول کے دیکھا تو آدھا بڑا۔ پرانی عمارتوں میں اکثر ایسے دروازے دیکھے جاتے ہیں جو ٹھیک اس شعر کے مصداق ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید ست صنا دید عجم را

(شاہان عجم کے آثار نقش و نگار اور ٹوٹی ہوئی دیواروں سے ظاہر ہیں)

ان مکانوں میں اکثر مکان ایسے بنائے گئے ہیں کہ جس لاگت میں ان کے دروازے بنے ہیں اتنی لاگت میں دو تین حویلیاں تیار ہو سکتی تھیں تو اس کو سوا آرائش بلکہ نمائش کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک عزیز تھے انہوں نے تین سو روپیہ میں ایک حویلی خرید لی جس میں ایسا عالیشان

برج تھا کہ تین سو روپیہ کا تو وہی ہوگا اور اندر سے مکان کچھ بھی نہیں۔ غرض آج کل شان اور فخر سے بہت کام لیا جاتا ہے معمولی مکان بنانے سے عار آتی ہے۔

عشق اور وظیفہ: یہ عار وہ بلا ہے کہ انسان کو تباہ کر دیتی ہے اسی عار ہی کی وجہ سے ابو طالب مقصود سے رہ گئے حالانکہ وہ حضورؐ کے عاشق اور جانثار تھے۔ حضورؐ نے مرتے وقت ان سے فرمایا کہ ایک دفعہ کلمہ کہہ دو۔ احج بها ربی (اپنے رب کے سامنے اس کو محبت میں پیش کروں گا) اس وقت ابو جہل بھی پاس بیٹھا تھا کہنے لگا اترغب عن ملة قريش (کیا تم قریش کی ملت سے اعراض کرتے ہو) تو ابو طالب حضورؐ سے کہنے لگے کہ میرے بھتیجے! میں تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا مگر لوگ کہیں گے کہ ابو طالب نے عذاب کے ڈر سے اپنا دین چھوڑ دیا۔ غرض آخر کلمہ ان کی زبان سے یہ نکلا هو على دين عبدالمطلب (وہ حضرت عبدالمطلب کے دین پر ہیں)

غرض یہ عار وہ بلا ہے جس کی وجہ سے ابوطالب ایمان نہ لا سکے پس اس کا علاج کرو اور اس کا علاج وظیفوں کا پڑھنا نہیں بلکہ عشق پیدا کر لو یہ اس سے ضرور جاتا رہے گا مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد   او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما   اے تو افلاطون و جالینوس ما

جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب اطراف کا علاج ہو جاتا ہے۔ اے عشق تو ہمارے لئے نخوت و ناموس کی دوا ہے تو ہمارے لئے افلاطون و جالینوس ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ

عشق آں شعلہ است کوچوں بر فروخت   ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند   در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت   مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو وہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے لا الٰہ الا اللہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ اس کے بعد دیکھو کہ کیا رہ گیا۔ الا اللہ باقی رہ گیا باقی تمام فنا ہو گئے۔ اے عشق شرکت سوز تجھ پر مرحبا کہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیا۔

اور خود یہ عشق بھی وظیفوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ صحبت سے پیدا ہوتا ہے جیسے خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے پس کی تدبیر یہ ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

قال کو چھوڑو حال پیدا کرو حال پیدا کرنے کے لئے کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرو۔

تو عشق کے پیدا ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ عشاق کی صحبت اختیار کرو یعنی ان کا اتباع اور انقیاد کرو جو تجویز کریں اور تعلیم کریں اس پر عمل کرو یاد رکھو وہ وظیفہ نہ بتاویں گے نہ وہ اپنے پاؤں دبواویں گے بلکہ لوگوں کی خدمت کراویں گے ان امور کو جان ودل سے قبول کرنا چاہیے گو نفس کو ناگوار ہو۔

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق   تا نہ گوید خضر رو ہذا فراق

خضر کے کام میں صبر کرو تا کہ خضر کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ چلتے بنو۔ یہ جدائی ہے۔

مگر یہ سختی چند ہی روز ہوتی ہے پھر ان سے بڑھ کر کوئی شفیق نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آباد میں ایک بزرگ تھے میں ان کی خدمت میں دو دفعہ گیا آخری مرتبہ ان کی ایسی شفقت تھی کہ جب میں روانگی کی اجازت چاہتا تھا فرماتے تھے کیا جلدی ہے مگر اول مرتبہ لہجہ تند تھا اور خفگی نمایاں تھی۔ اکثر خفگی اور تندی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان حضرات کو خلاف سنت سے تنگی ہوتی ہے چنانچہ مسجد میں جاتے وقت کوئی بایاں پیر پہلے رکھ دیتا تو مولانا کو ناگوار ہوتا تھا اور غصہ آجاتا تھا مجھ سے جس مرتبہ تند لہجہ میں بولے تھے اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں رات کو گیا تھا اور حدیث میں رات کو جانے کی ممانعت آئی ہے لہذا خفگی ہوئی مگر میں نے سمجھا کہ یہ خفگی میرے لئے اصلاح ہے۔ اس لئے ذرا ناگوار نہ ہوئی بلکہ دوبارہ پھر حاضر ہوا اس وقت مولانا غایت شفقت سے پیش آئے اور حصن حصین کا درس شروع کرادیا اور حدیث وغیرہ کی اجازت دی اور بہت توجہ فرمائی۔

پس بزرگوں کی خفگی کو چند روز برداشت کرلو تو پھر تم کو وہ اپنی دولت سے رنگ دیں گے اور اگر خفگی کی وجہ سے کوئی ان سے بھاگے تو ان حضرات کا اس میں کیا نقصان ہے اپنا ہی نقصان ہے افسوس عشق کی طلب اور ذرا سی خفگی سے ناگواری۔

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق   تو بجز نامے چہ می دانی ز عشق

تو ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتا ہے تو بجز نام کے عشق کی حقیقت سے واقف نہیں۔

اور خود ان کی یہ شان ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان کو برا بھی کہے تو ان کو اس کی بھی پرواہ نہیں بقول حافظ

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں   مانمی خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ عقلمندوں کے نزدیک بدنامی ہے مگر ہم ننگ و نام کی پرواہ نہیں کرتے۔

نہ یہ تکلفات جانتے ہیں تکلفات کے متعلق ان کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ خرقہ کو بھی تکلف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ   ویں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

یہ خرقہ جو میرے پاس ہے شراب محبت میں گروی رکھنا بہتر ہے یہ دفتر بے معنی محبت الٰہی کی خاص شراب میں ڈبونا بہتر ہے۔ اس شراب سے مراد شراب محبت ہے یعنی اس خرقہ کو شراب محبت میں ڈبونا چاہئے ورنہ بدوں اس کے وہ آگ میں جلانے کے قابل ہے کما قال۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بے غش باشد   اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

صوفی کی موجودہ حالت اگر بالکل درست اور بے غش نہ ہو وہ صوفی ہی نہیں اگرچہ خرقہ پہن لے۔ اے شخص بہت سے خرقے آگ میں جلانے کے قابل ہیں۔

بہت لوگ خرقہ پہن کر عجب و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ حقیقت میں صوفی نہیں ان میں کھوٹ ہے ان کو ابھی مجاہدہ کی ضرورت ہے تاکہ یہ خناس دماغ سے نکلے اگر یہ خناس موجود ہے تو حقیقت میں وہ صوفی نہیں جب یہ خناس نکل جاوے گا تب صوفی ہوگا اس وقت یہ حال ہوگا کہ نہ جاہ کی طلب رہے گی نہ عزت کی بلکہ ہر حال پر راضی ہو کر کہے گا۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں۔ جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں میں آپ سے راضی ہوں۔

جب یہ حالت ہو جاوے گی تب عشق پیدا ہو جاوے گا۔ اور جب عشق پیدا ہوگا اس سے نخوت بخود بخود جاتی رہے گی پس تفاخر کا علاج یہی ہے کہ عشق پیدا کرو اور جب تک عشق پیدا نہ ہوگا اس وقت تک عمارت میں لباس میں وضع قطع میں ہر چیز میں یقیناً تفاخر پیدا ہوگا اور اس سے بچنا دشوار اور قریب بہ محال ہوگا غرض ایک امر تقویٰ کے خلاف تو یہ ہے کہ عمارت فضول اور بے ضرورت بناتے ہیں۔

تواضع اور رحم کا فقدان: دوسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ اپنی عمارت کی اصلاح کے لئے جس کے زمین پاس دیکھی دبالی تاکہ اپنی عمارت نہ بگڑے صاحبو! افسوس ہے کہ پہلے زمانہ میں تو کفار سلاطین بھی ایسا نہ کرتے تھے پھر حیرت ہے کہ ہم مسلمان اور ضعیف القدرۃ ہو کر یہ حرکتیں کریں۔

نوشیرواں بادشاہ تھا جب اس نے اپنا محل بنانا چاہا تو ایک بڑھیا کا مکان محل کے قریب تھا جس کے ملانے کی ضرورت تھی ورنہ محل میں ریخ رہتا تھا مگر اس نے دینے سے انکار کر دیا تو نوشیرواں نے اس پر زور نہ دیا اور نہ جبر کیا بلکہ اپنا مکان ٹیڑھا ہی بنا لیا اور ایک گوشہ کے بگڑنے کا خیال نہ کیا۔

اصل یہ ہے کہ پہلے لوگوں میں طبعاً یا عقلاً خلوص اور تواضع اور حفاظت حدود تھی اسی لئے ان کی تعمیرات پائیدار اور مضبوط اور خوشنما بھی ہیں اور آج کل یہ حالت ہے کہ سب سے پہلے اس پر نظر پڑتی ہے کہ کسی کی زمین پاس ہے اس کو دیکھ کر آدمی باؤلا بن جاتا ہے کہ کسی طرح یہ بھی میرے مکان کے اندر

آجائے اور اگر کسی غریب اور کمزور کی ہے تو روز بروز اپنی عمارت کو تھوڑا تھوڑا ادھر کھسکانا شروع کردیتا ہے سچ یہ ہے کہ آج کل تواضع اور رحم بالکل نہیں اور اس کے فقدان سے آخرت کا تو ضرر ہے ہی مشاہدہ ہے کہ عمارت بھی ناپائیدار ہوتی ہے۔ تواضع کے ذکر پر اس کے متعلق ایک ضروری بات یاد آگئی۔ وہ یہ کہ تواضع سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تم چھوٹوں کو اپنے سر پر بٹھاؤ بلکہ یہ مطلب ہے کہ کسی کو حقیر نہ سمجھو کسی کا حق ضائع نہ کرو نہ کسی کا حق دباؤ اور بعض بزرگوں سے جو ایسے واقعات منقول ہیں کہ انہوں نے چھوٹوں کو سرہانے بٹھلا لیا تو یہ غلبہ حال ہے بعض اہل حال بزرگوں پر تواضع کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب ایک مرتبہ پائنتی بیٹھے تھے حجام خط بنانے کے واسطے آیا تو آپ نے فرمایا کہ سرہانے بیٹھ کر بنادو۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت آپ سرہانے بیٹھ جاویں۔ فرمایا اگر تمہیں خط بنانا ہو تو یہیں بیٹھ کر بنادو ورنہ پھر کسی وقت جب مجھے سرہانے بیٹھا دیکھو اس وقت آکر بنادینا۔ اب تو میں اٹھ کر سرہانے نہیں بیٹھتا وہ حجام مجبور ہوگیا اور سرہانے بیٹھ کر ہی خط بنانا شروع کردیا۔

مگر یہ غلبہ حال ہے اس وقت مولانا پر کوئی خاص کیفیت تھی سب بزرگوں کا ایسا ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض دفعہ بزرگ جن پر اس حالت کا غلبہ نہیں ہوتا اپنے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرتے ہیں کیونکہ انہیں قرائن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر ہم اس درجہ تواضع کریں گے تو چھوٹوں کو تکلیف ہوگی یا گرانی ہوگی یا اس کے لئے مضر ہوگا اس مصلحت سے وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ معاملہ چھوٹوں کا سا کرتے ہیں اور تواضع نہیں کرتے لیکن اگر کوئی بزرگ تواضعاً ایسا کریں بھی تب بھی چھوٹوں کو نہ چاہیے کہ ان کے سرہانے بیٹھیں اور حکم موکدہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر ایسی تواضع کا خاص طور پر مذاق غالب تھا۔ چنانچہ ایک بار مولانا تھانہ بھون تشریف لائے اور آپ کا وعظ ہوا تو مولانا پائنتی بیٹھے تھے اور ہماری قوم کے شیخ زادہ کو دیکھئے کہ وہ مولانا کے سرہانے بیٹھے تھے۔ مولانا تو قوم کے بھی شیخ زادہ تھے اگر مولانا سرہانے نہ بیٹھے تھے تو ان لوگوں کو یہ زیبا تھا کہ اس پلنگ کو خالی چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی نہ بیٹھتا۔ مگر اللہ بچائے ایسی شیخ زادگی سے بھی کہ کسی کی تعظیم وتکریم بھی نہ کریں۔ مگر مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ ان کو اپنے سرہانے کسی کے بیٹھنے سے ذرا ناگواری نہ ہوتی تھی بلکہ وہ تو قصداً پائنتی بیٹھتے تھے مگر بعض کا مذاق دوسرا ہوتا تھا۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ چھوٹوں ہی کا سا معاملہ کرنا چاہئے اس سے ان کا دل خوش ہوتا ہے چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجھے عزیزم میاں اشرف علی لکھا کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا محمود الحسن صاحب خط میں مخدوم مکرم وغیرہ الفاظ لکھتے میں نے ایک مرتبہ عریضہ لکھا کہ حضرت سے یہ تو توقع نہیں کہ حضرت چھوٹوں کے القاب سے مجھے یاد فرماویں اس لئے اگر حضرت عنایت فرما وغیرہ تحریر فرمادیا کریں تو بھی گوارا کرلوں گا پھر اس کے جواب میں جو خط آیا اس میں بھی وہی مخدوم ومکرم وغیرہ القاب موجود تھے۔

حضرت مولانا سلمہ علیہ الرحمۃ پر بھی تواضع کا ذوق غالب تھا اور حکماء شرح پر یہ مذاق غالب ہے کہ اگر کوئی چھوٹا شخص ان کی پائینتوں بیٹھتا ہے تو بیٹھنے دیتے ہیں اہتمام کر کے اس کو اپنے سرہانے نہیں بٹھلاتے لیکن اگر وہ چھوٹا پہلے سے سرہانے بیٹھا ہو تو خود اہتمام کر کے اس کے سرہانے بھی جا کر نہیں بیٹھتے۔ مگر ہماری نخوت کی تو یہ حالت ہے کہ اگر کہیں مجلس میں جائیں اور کوئی غریب آدمی سرہانے کی طرف پہلے سے بیٹھا ہو تو اس کو دھکا کر پائینتی کی طرف کر کے خود سرہانے بیٹھیں گے۔

عبادات اور نخوت: بھلا یہ تو عادات میں نخوت تھی بعض متکبرین تو عبادات میں بھی نخوت کرتے ہیں۔ کالپی کی مسجد میں ایک داروغہ صاحب تشریف لائے اور ایک بچارا گندھی مسافر تاجر بھی اسی مسجد میں آیا داروغہ صاحب نے نماز بہت جلدی جلدی پڑھی جب وہ سلام پھیر چکے تو اس گندھی نے کہا کہ آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی داروغہ جی کو گندھی کی اصلاح بہت ناگوار معلوم ہوئی اور اس کو دھمکایا کہ تو ہمیں اصلاح دیتا ہے گندھی نے کہا صاحب چاہے آپ پٹوا بھی لیجئے مگر نماز کا اعادہ کر لیجئے آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ اور لوگوں نے جو وہاں حاضر تھے ان سے کہا کہ داروغہ جی اس میں آپ کا نقصان ہی کیا ہے آپ نماز کا اعادہ کر لیجئے۔ خیر انہوں نے مجبور ہو کر نماز کا اعادہ کیا اب تو وہ گندھی صاحب مشہور ہو گئے۔ جدھر جاتے ہیں لوگ بلاتے ہیں کہ حضرت یہاں آیئے۔ ہر ایک اپنے پاس آنے کی درخواست کرتا ہے خوب عطر تیل کی بکری ہوئی اور تعظیم تکریم بھی ہوئی اور واقعی ان کی یہ بات تھی بھی تعظیم کے لائق دیکھئے ان داروغہ نے عبادات میں بھی نخوت سے کام لیا۔

ہماری اکثر یہ حالت ہے کہ ظاہر میں تو متواضع ہیں بات بات پر خاکساری ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر کوئی نصیحت کر دے تو یہ حال ہو جاتا ہے۔ **واذا قیل لہ اتق اللّٰہ اخذتہ العزۃ بالاثم** (جبکہ اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر تو اس کو عزت گناہ کے ساتھ پکڑ لیتی ہے) پس ہماری تواضع محض تصنع ہے بقول مولانا۔

کہ گھے آہے دروغے میزنی ۔ از برائے مسکہ دوغے میزنی

تو کبھی کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے۔

مگر بناوٹ سے کام نہیں چل سکتا نہ تصنع حق تعالیٰ پر مخفی رہ سکتا ہے۔

کار با او راست باید داشتن ۔ رایت اخلاص و صدق افراشتن

کام اس کے ساتھ درست رکھنا چاہئے۔ اخلاص اور صدق کا علم بلند کرنا چاہئے۔

غرض یہ نخوت بہت ہی بری چیز ہے اور یہ عشق ہی سے زائل ہوتی ہے اور عشق کے پیدا کرنے کی تدبیر جیسا اوپر مذکور ہوا صحبت عشاق ہے اور جب تک صحبت عشاق میسر نہ ہو اس وقت تک یہ تدبیر کی جاوے کہ

ذلت کے افعال اختیار کیے جائیں اور متواضعین کے طریقہ کو بہ تکلف دستور العمل بنایا جاوے مثلاً کوئی مسجد میں نماز کی غرض سے آوے کسے باشد اس کے واسطے لوٹا بھر کر رکھ دیا یا اس کے جوتے اٹھا کر رکھ دیئے اس لئے کہ

النفس كالطفل ان تهمل شب على حب الزماع وان تفطمع ينفطم

یعنی نفس کی مثال بچہ کی سی ہے اس کو جیسے کاموں کی عادت ڈالو گے اسی کا اثر قبول کرلے گا پس ابتداء ہی میں نفس کو ذلت کے کاموں کا عادی کرو پہلے ہی دن بڑے بننے کی فکر نہ کرو۔ جیسا ابھی مذکور ہوا ابتداء میں یہ کام کرو کہ مسجد میں جا کر فرش بچھا دیا اور اذان کہہ دی۔ کیونکہ آج کل لوگ اذان کہنے کو بھی بہت عیب خیال کرتے ہیں اور موذن کو بہت ذلیل سمجھتے ہیں اس سے نخوت کا علاج ہو جاوے گا۔ جس کی وجہ سے عمارات میں کسی کا حق دبانے کا خیال ہو جاتا ہے اگر تم سب کو اپنے سے بڑا سمجھو تو پھر ایسی بے راہی کی کبھی ہمت نہ ہو۔

تعمیر میں خلوص کا اثر: غرض مکان بنانے میں اس کی رعایت رکھو کہ کسی کی زمین نہ دباؤ۔ کسی کی زمین میں دروازہ مت کھولو کسی کی ملک میں نالی نہ بنالو۔ مجھے ایک مکان کی ضرورت تھی اس لئے میں نے ایک مکان خریدا اس مکان کا جو صدر دروازہ تھا اس کی بابت لوگوں کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ دروازہ دوسرے کی زمین میں بنا ہوا ہے گو صدر دروازہ کے لائق وہی جگہ تھی مگر میں نے اسے بند کرا دیا اور بند بھی اس طرح کرایا کہ اینٹ نکلوا کر بطور اتصال ترپیچ کے ردہ سے ردہ ملوا دیا تا کہ کبھی ملک کا شبہ تک نہ رہے۔ اگر کوئی زمیندار اس مکان کو خریدتا تو ایسے موقع کو غنیمت خیال کرتا مہتمم تعمیر نے اس سمت میں باجازت مالکان زمین موریاں رکھ دی تھیں میں نے ان کو بھی بند کرا دیا کیونکہ اب تو یہ تبرع ہے پھر یہی حق سمجھا جانے لگے گا تو مکان میں ان امور کا لحاظ رکھا جاوے۔

تیسری چیز اس فہرست کی یہ ہے کہ تعمیر میں حرام مال نہ لگایا جاوے ورنہ بروئے حدیث ویرانی کی جڑ یہی ہے تھانہ بھون میں پیر محمد صاحب کی مسجد عالمگیر کے وقت کی ہے جس کی دیواریں اور گنبد گارے کے ہیں۔ مگر پائیداری کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ مال حلال تھا اور نیت میں خلوص تھا اور جو شخص تعمیر میں ان امور کی رعایت نہ کر سکے تو مثل مشہور شعر گفتن چہ ضرور وہ تعمیر ہی نہ کرے اور ان امور کی رعایت تو قدر ضرورت کی تعمیر میں ہے باقی ضرورت سے زیادہ تعمیر تو اصل ہی سے ناپسند ہے اس کی نسبت ختم آیت پر فرماتے ہیں۔

والله لا يهدى القوم الظلمين کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔ یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے آگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں۔

لايزال بنيانهم الذى بنوا ريبةً فى قلوبهم الا ان تقطع قلوبهم والله عليم حكيم۔

ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی (ہاں مگر ان کے دل ہی فنا ہو جائیں) کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ۔ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا ہاں ان کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاویں تو وہ ارمان بھی اس وقت ختم ہو جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ ان کی مخفی شرارتوں کو جانتے ہیں۔ حکمت والے ہیں۔ مناسب سزا دیں گے تو آدمی جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی ہے وہی حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی اور یہ علت بھی مشترک ہے تمام عمارات میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارات ایسے ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہو گئیں اور ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہو گئی۔ چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام نہیں ہوتا۔

اب میں **الا ان تقطع قلوبهم** (ہاں انکے دل فنا ہو جائیں) کے متعلق ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

قلب اور موت: اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان ان لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا بجز اس کے کہ ان کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مر جاویں تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے کیونکہ جب دل ہی نہ رہے گا جو محل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا پس ایک تو یہ توجیہ ہے **الا ان تقطع قلوبهم** کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے راحت ہو جاوے گی۔

ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے۔ کہ **الا ان تقطع قلوبهم** (ہاں ان کے دل فنا ہو جائیں) تاکید ہے وہ الم حسرت اور ارمان کی کہ ان کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹک دور نہ ہو گی کیونکہ قلب کو موت نہیں آ سکتی۔ اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مضغہ صنوبری ہے۔

ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکیم بھی ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب جزا و سزا دیتے ہیں۔

دوسرا قلب حقیقی جو محل ادراکات ہے۔ عقائد وغیرہ کا حصول بھی اسی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقا ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اخلاق جو ناپاک ہیں وہ بھی ہمیشہ باقی رہتے ہیں عشق کا ذب بھی باقی رہتا ہے اس لئے کفر بھی باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوٹتا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے رستگار ہو جانے کا دعویٰ کرتے

پھرتے ہیں، بالکل غلط ہے اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ اس کی کیفیات زائل ہوتی ہیں۔ غرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے تو چونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو بھی دوام رہے گا اس آیہ پر الا ان تقطع قلوبهم میں استثنٰی ایسا ہوگا جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فیهم غیر ان سیوفهم　　بهن فلول من قراع الکتائب
ای ان کان فیهم فهو ذاک!　　وهذا لیس بعیب فلا عیب فیهم اصلا

(اور ان میں کوئی اس لئے کہ انکی تلواروں کی دھار شمشیر زنی سے گر جاتی ہے اگر کوئی عیب ہوتا تو یہ ہوتا لہٰذا ان میں بالکل کوئی عیب نہیں)

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں جب کہ قلب ہلاک ہو جاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہذا دوام حسرت وارمان بھی دواماً ثابت ہے۔

حال یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ ورضوان حق کے لئے ہونے کا تو جو عمارات غیر تقویٰ رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے بانیوں کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس عمارت کی بناء تقویٰ اور رضوان پر ہو وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے۔

واللہ علیم اور اللہ تعالیٰ جاننے والے۔ الحمدللہ! بیان ختم ہوگیا۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں۔

والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلٰی اٰلہ واصحابہ اجمعین

اشرف علی　(۱۳۵۵ھ)

بحمد اللہ